سیدنا صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ

مرتبہ

مولانا سعید احمد اکبر آبادی

شائع کردہ

کتب خانہ انجمن حمایت اسلام، ریلوے روڈ، لاہور

سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ

یعنے

خلیفۃ الرسول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا نہایت مفصل و مبسوط تذکرہ جس میں آپ کے ذاتی حالات و سوانح عظیم الشان کارناموں، دینی اور سیاسی خدماتِ جلیلہ، اخلاق و مکارم اور عہدِ صدیقی کے تمام چھوٹے بڑے واقعات کے علاوہ اس دور کے اہم دینی، سیاسی، فقہی اور تاریخی مباحث و مسائل پر بڑی جامعیت اور تحقیق سے سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

مرتبہ

مولانا سعید احمد اکبر آبادی ایم، اے

شائع کردہ

کتب خانہ انجمن حمایتِ اسلام

ریلوے روڈ، لاہور

نام کتاب ——— صدیق اکبرؓ

مرتبہ ——— مولانا سعید احمد اکبر آبادی

بار اول ——— گیارہ صد (۱۱۰۰)

ضخامت ——— ۴۹۲

مطبع ——— حمایت اسلام پریس، ریلوے روڈ لاہور

طابع ——— الحاج شیخ محمد اسحاق

زیر اہتمام ——— محمد یعقوب

تاریخ طباعت ——— جنوری سنہ ۱۹۸۰ء

ناشر ——— کتب خانہ انجمن حمایت اسلام لاہور

ملنے کا پتہ

کتب خانہ انجمن حمایت اسلام، ریلوے روڈ، لاہور

فہرستِ مضامین صدیقِ اکبر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۝

مقدمہ

اسلام میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا مرتبہ و مقام کیا ہے؟ اُس کا اندازہ حضرت عبداللہ بن مسعود کے اس قول سے ہو سکتا ہے کہ

لقد قمنا بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	ہم سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد
مقاماً کِدنا نھلک فیہ لولا ان اللہ	ایسے حالات میں گھر گئے تھے کہ اگر اللہ نے ابوبکر کے
منّ علینا بابی بکرٍ۔	ذریعہ ہم پر احسان نہ کیا ہوتا تو ہم ہلاک ہو جاتے۔

خلفائے راشدین میں حضرت عمر فاروق کو زیادہ شہرت حاصل ہے لیکن حق یہ ہے کہ اگر خلیفۂ اوّل پورے عرب کو ایک اسلام کے عَلَم کے نیچے لاکر نہ جمع کر دیتے تو حضرت عمر نے جو عظیم کارنامے انجام دئے اُن کیلئے راہ ہموار نہیں ہو سکتی تھی۔

حضرت ابوبکر کی مدّتِ خلافت دو برس اور تین مہینے کے قریب ہے لیکن اس قلیل مدت میں بھی آپ نے جو کام کئے ہیں وہ نوعیت کے اعتبار سے نہایت عظیم الشان ہونے کے ساتھ اس قدر چند در چند اور گوناگوں ہیں کہ مؤرخین متقدمین نے اُن پر ضخیم مجلدات لکھی ہیں۔ چنانچہ حافظ ابن حجر نے اصابہ میں (جلد ۲ ص ۳۳۵) ابن عساکر کی نسبت لکھا ہے کہ انھوں نے حضرت ابوبکر صدیق کے تذکرہ میں ایک ضخیم کتاب لکھی تھی۔ حافظ عماد الدین ابن کثیر نے البدایۃ والنھایۃ میں جہاں

عہدِ صدیقی کے واقعات لکھے ہیں اس موضوع پر خود اپنی ایک مستقل کتاب کا بھی ذکر کیا ہے۔

متقدمین نے اس سلسلہ میں جو کتابیں لکھی ہیں وہ دو قسم کی ہیں:-

(۱) وہ کتابیں جو حضرت ابوبکر صدیق کے تذکرہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یعنی آپ کے تمام حالات وسوانح پر مشتمل ہیں۔

(۲) وہ کتابیں جو عہدِ صدیقی کے بعض خاص خاص اور اہم واقعات مثلاً فتنۂ ارتداد۔ مالک بن نویرہ کا واقعہ وغیرہ پر لکھی گئی ہیں۔

ابن ندیم کی الفہرست خطیب بغدادی اور ابن خلکان وغیرہما کے بیانات سے عہدِ صدیقی سے متعلق جن تالیفات کا سراغ ملتا ہے۔ ہم ذیل میں اُس کا ایک نقشہ پیش کرتے ہیں۔

مصنف کا نام	سالِ وفات	تالیفات
ابو مخنف لوط بن یحییٰ	۱۷۰ھ	کتاب الردہ (الفہرست ص ۱۳۶ مصری)
سیف بن عمر الاسدی التمیمی	خلیفہ ہارون الرشید کے عہد میں وفات ہوئی	کتاب الردہ (الفہرست ص ۱۳۷)
اسحٰق بن بشر	۲۰۶ھ	ابن الندیم نے اس کی کتاب الردہ کا ذکر کیا ہے (الفہرست ص ۱۳۷) اس کے علاوہ اس کی ایک کتاب کا نام کتاب المبتدا بھی ہے۔ (تاریخ بغداد ج ۶ ص ۳۲۶ و میزان الاعتدال ج ۱ ص ۸۶)
ابو عبداللہ محمد بن عمر الواقدی	۲۰۷ھ	ابن الندیم نے عہدِ صدیقی سے متعلق ان کی کئی کتابوں کا ذکر کیا ہے جن کے نام یہ ہیں (۱) کتاب الردہ (۲) کتاب السقیفہ وبیعۃ ابی بکر (۳) کتاب سیرۃ ابی بکر ووفاتہ (الفہرست ص ۱۴۴)
ابوالحسن علی بن محمد المدائنی	۲۱۵ھ	انھوں نے اس موضوع پر دو کتابیں لکھی تھیں ایک کا نام "کتاب الردہ" اور دوسری کا کتاب جمۃ ابی بکر الصدیق" تھا (الفہرست ص ۱۴۸)

مصنف کا نام	سال وفات	تالیفات
ابو اسحٰق اسمٰعیل بن عیسیٰ العطار	سنہ ۲۳۲ھ	اسحٰق بن بشر کا شاگرد اور اس کی کتابوں کا راوی تھا (تاریخ بغداد ج ۶ ص ۲۶۲) ابن الندیم نے اس کی کتاب الردہ کا ذکر کیا ہے۔ (الفہرست ص ۱۵۹)
ابوزید وثیمة بن موسیٰ ابن الفرات الوشاء	سنہ ۲۳۲ھ	ابن خلکان نے اس کی کتاب الردہ کا طویل اقتباس مالک بن نویرہ کے واقعہ کے ذیل میں درج کیا ہے (ج ۵ ص ۶۴ رقم ۷۰۲ مطبوعہ مصر سنہ ۱۹۴۹ء) یہی اقتباس ابن شاکر کی فوات الوفیات میں بعینہٖ منقول ہے (ج ۲ ص ۶۲۵ رقم ۴۷۹ مطبوعہ مصر سنہ ۱۹۵۱ء) حافظ ابن حجر نے کتاب الاصابہ میں اس کتاب کے اقتباسات جگہ جگہ دیئے ہیں، انھیں اقتباسات کو ایک جرمن مستشرق نے کتاب کی شکل میں یکجا مرتب کر دیا ہے۔
ابو محمد احمد بن اعثم الکوفی	تاریخ وفات صحیح معلوم نہیں معتضد باللہ کے آخر عہد تک زندہ تھا	اس کی کتاب کا نام "کتاب الفتوح" ہے۔ اس کے ابتدائی حصہ میں ارتداد عرب کی تاریخ پر مفصل بحث ہے۔ اس کتاب کا فارسی ترجمہ اصل عربی کی بہ نسبت زیادہ مشہور ہے۔
ابو ریاش احمد بن ابی ہاشم القیسی	سنہ ۳۳۹ھ	اس نے حضرت خالد بن الولید اور مالک بن نویرہ کے واقعہ پر ایک مستقل رسالہ لکھا تھا (خزانة الادب ج ۲ ص ۲۳۶) خطیب بغدادی نے بھی اس سے ایک طویل عبارت نقل کی ہے۔ یاقوت نے معجم الادباء ج ۲ میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔

واقدی کی کتاب الردہ کا نسخہ پٹنہ میں | واقدی کو مؤرخین میں جو شہرت و اہمیت حاصل ہے اس کے پیش نظر

نامناسب نہ ہوگا اگر ہم اس کی کتاب الردہ کے متعلق ذرا تفصیل سے گفتگو کریں۔ اس کتاب کی نسبت ارباب علم کے حلقہ میں مشہور ہے کہ اس کا واحد نسخہ کتب خانۂ مشرقیہ بانکی پور پٹنہ جو عام طور پر خدا بخش لائبریری کے نام سے معروف ہے اس میں محفوظ ہے۔ چنانچہ خان بہادر عبد المقتدر خان مرحوم کی فہرست میں زیر شمار ۱۰۴۲ (ج ۱۵ ص ۱۰۸) اس نسخہ کا مفصل حال مذکور ہے اور لوگوں نے اسی کو واقدی کی کتاب الردہ کا نسخہ سمجھ رکھا ہے۔ لیکن اندرون کتاب صفحہ کے اوپر کتاب الردہ کی بجائے ذیل کی سُرخی ملتی ہے:۔

هذا ما كان من اخبار اهل الردة من مسيلمة الكذاب وطليحة وكندة وبنى بكر بن وائل وغيرهم من القبائل -

اس سرخی سے قیاس ہوتا ہے کہ زیر بحث نسخہ مستقل کتاب ہونے کی بجائے کسی بڑی کتاب کا ایک حصہ ہے۔ پھر کتاب کی سند پر غور کیا جائے تو اس قیاس کی مزید تائید ہوتی ہے اور یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ یہ کتاب دراصل واقدی کی کتاب الردہ کا نسخہ نہیں ہے اگرچہ اس میں واقدی کی روایات کا حصہ بھی ضرور شامل رہا ہے۔ یہ سند جس کا ہم نے ذکر کیا حسب ذیل ہے:۔

روى ابو القسم عبد الله بن حفص بن مهران البردعى اعزه الله تعالى قال حدثنى ابو محمد احمد بن اعثم الكوفى قراءة عليه قال حدثنى ابو جعفر بن عبد العزيز بن المبارك قال حدثنى نعيم بن مزاحم النقرى قال حدثنى محمد بن عمر بن الواقد الواقدى السلمى وحدثنى ابراهيم ابن عبد الله بن العلاء القرشى المدنى قال حدثنى احمد بن الحسين الكندى ونصر بن خالد النحوى وابى حمزة[1] القرشى من محمد بن اسحٰق بن يسار المطلبى قال حدثنى الزهرى نريد بن رومان و صالح بن كيسان ويحيى بن عروة عن الزبير بن العوام ومعوذ بن لبيد وعاصم بن عمر بن قتادة كل هذا يذكر انه لما قبض النبى صلى الله عليه وسلم شمتت اليهود والنصارى باهل الاسلام الخ

[1] كذا فى الاصل۔

اس سند سے جن امور کا انکشاف ہوتا ہے وہ یہ ہیں :-

(۱) کتاب کا راوی ابوالقسم عبد اللہ البردعی ہے۔

(۲) راوی کو اس کتاب کی باقاعدہ اجازت احمد بن اعثم الکوفی سے حاصل ہے۔

(۳) اس کتاب میں جو روایتیں درج ہیں وہ احمد بن اعثم کو دو سلسلوں سے پہونچی ہیں۔ پہلا سلسلہ ابو جعفر عبد العزیز بن المبارک کا ہے جو ایک واسطہ سے محمد بن عمر الواقدی کا شاگرد ہے اور دوسرا سلسلہ ابراہیم بن عبد اللہ القرشی المدنی کا ہے جس میں واقدی کا کہیں ذکر نہیں۔ خان بہادر عبد المقتدر مرحوم نے اس سند کو ناقص نقل کیا ہے اور واقدی کے بعد کے سلسلہ کو حذف کر دیا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ صرف فہرست پر اعتماد کرنے والوں کو اس کتاب کے اصل مصنف کے بارہ میں غور کرنیکا موقع نہیں ملتا۔ حالانکہ پوری سند جب سامنے آتی ہے تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اس کتاب سے واقدی کا تعلق مؤلف ہونیکی حیثیت سے ہرگز نہیں ہے بلکہ اس کا مؤلف جس شخص کو قرار دیا جا سکتا ہے وہ در اصل ابو محمد احمد بن اعثم الکوفی ہے جس نے واقدی اور دوسرے متقدمین کی روایات کو اس کتاب میں جمع کر دیا ہے اور اپنے روایتی سلسلوں کو یکجا کتاب میں درج کر دیا ہے۔

افسوس ہے کہ کتاب الفتوح کا عربی نسخہ ہمارے علم میں کہیں موجود نہیں ہے۔ اور اب اس کا فارسی ترجمہ ہی ملتا ہے جو کسی زمانہ میں بمبئی سے شائع ہوا تھا اور اب وہ بھی نایاب ہے۔ البتہ اس کے قلمی نسخے عام طور پر کتب خانوں میں مل جاتے ہیں۔ اس وقت ایشیاٹک سوسائٹی کے دو قلمی نسخے ہمارے پیش نظر ہیں۔ ان دونوں نسخوں کی مدد سے ابن اعثم کی کتاب اور واقدی کی طرف منسوب کتاب الردہ دونوں کے سیاق و سباق کا مقابلہ کیجئے تو ان میں اصل اور ترجمہ کے ناگزیر فرق کے علاوہ کوئی بنیادی فرق نظر نہیں آئیگا۔ ہم ذیل میں کتاب الردہ کی فصول کے متوازی کتاب الفتوح کی سرخیاں درج کرتے ہیں، اس سے ہمارا دعویٰ ثابت ہوگا۔

فصول کتاب الردہ للواقدی نسخۂ پٹنہ	اوراق	فصول کتاب الفتوح لابن اعثم فارسی نسخہ کلکتہ	اوراق
(۱) اخبار سقیفۂ بنی ساعدۃ	2 a	(۱) اخبار سقیفۂ بنی ساعدۃ	2 a
(۲) ذکر اخبار الردۃ	6 a	(۲) ذکر اخبار اہل ردۃ	7 a
(۳) ذکر خروج اسامۃ بن زید	7 a	(۳) قصۂ رفتن اسامہ بشام	8 a
(۴) ذکر فجاءۃ بن عبد یالیل	10 a	(۴) ذکر فجاءۃ عبد یالیل السلمی	11 b
(۵) خبر مالک بن النویرۃ ومسیلمۃ الکذاب	16 a	(۵) الف۔ ذکر رفتن خالد بن الولید بجنگ مالک 16 b ب۔ قصۂ مسیلمہ وجنگہائے کہ خالد بن الولید را با او افتاد۔ 16 b	
(۶) ذکر ارتداد اہل البحرین	25 a	(۶) ذکر مرتد شدن اہل بحرین	22 b
(۷) ذکر ارتداد اہل حضرموت من کندۃ وغیرھا	29 a	(۷) قصۂ مرتد شدن حضرموت وکندہ	25 b
(۸) نبذۃ فی ذکر المثنی بن حارثۃ الشیبانی وھو اول الفتوح بعد قتال اہل الردۃ	40 b - 43 b	(۸) ذکر فتحہا کہ بعد از مرتد شدن این جماعت در بلاد روم و فرس مسلمانان را میسر شد	35 b - 39 a

کتاب الردہ کی آخری فصل خان بہادر مرحوم کی مُرتّبہ فہرست میں اسی طرح ہے لیکن اصل نسخہ میں پوری عبارت یہ ہے:۔

نبذۃ فی ذکر المثنی بن حارثۃ الشیبانی وھو اول الفتوح بعد قتال اہل الردۃ وھو ایضاً من روایۃ الاعثم الکوفی۔

جیسا کہ گزر چکا ہے شروع سند سے ہی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ واقدی کی کتاب در اصل ابن اعثم کی روایات کا مجموعہ ہے جو واقدی کے علاوہ دوسرے طریقوں سے بھی ابن اعثم کو پہونچی تھیں۔ اب کتاب کی آخری فصل کے خط کشیدہ الفاظ سے بھی اس کی تائید ہو جاتی ہے کہ یہ نسخہ واقدی کی

کتاب الردہ یا تنہا اس کی روایات کا مجموعہ نہیں ہے۔ البتہ اس قدر ضرور مسلّم ہے کہ اس نسخہ میں واقدی کی ان روایات کا ضروری حصہ بھی شامل ہے جس سے واقدی کی اصل کتاب الردہ خالی نہیں ہوسکتی لیکن اس امرِ واقعی کی بنیاد پر زیرِ بحث نسخہ کو واقدی کی کتاب الردہ کا نسخہ سمجھ لینا قطعاً درست نہیں۔

واقدی کی کتاب الردہ اور کتاب الفتوح لابن اعثم کی عبارتوں کا اگر تقابلی مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت اور نکھر کر سامنے آجاتی ہے لیکن بہر حال اصل اور ترجمہ میں جو ناگزیر فرق ہوتا ہے اُس کے علاوہ قلمی نسخوں کے جملہ اختلافی اسباب و علل کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے۔ بد قسمتی سے کتاب الردہ کا یہ واحد نسخہ جدید الخط ہونیکے ساتھ نقص و فتور سے بھی پُر ہے اور دوسری طرف ابن اعثم کی کتاب الفتوح کے پیشِ نظر نسخے بھی کچھ اسی قسم کے ہیں۔ اب آپ عبارتوں کا تقابلی مطالعہ کیجیے۔

نسخہ کتاب الردہ کی عبارتیں	فتوح ابن اعثم کی فارسی عبارتیں
(۱) لما قبض النبی صلی اللہ علیہ وسلم	بے دینان وضیفِ یقینان
شمتت الیہود والنصاری باھل	از ہر طرف در گفتگو وجستجوئے
الاسلام وظہر النفاق فی المدینۃ	آمدند و فرصت جویان از مکمن
ممن کان یخفیہ قبل ذالک	حسد وجائے غرض بیروں جستند
وماج الناس واضطربوا واقبل	و بہر جائے مجلسے و بہر گوشہ
مالک بن التیہان الانصاری متی	محفلے پدید آمد۔ در مجمعے کہ وجوہ
وقف علی قومہ فقال یا معشر الانصار	مہاجر و انصار حاضر بود
انصتوا واسمعوا مقالتی وتفھموا	ابوالہیثم التیہان برخاست
ما القیہ الیکم اعلموا انہ قد	و برحسب ایں فتور وحادثہ
شمتت الیہود والنصاری بموت نبینا	شعرے فصیح برخواند کہ ترجمۂ
محمد صلی اللہ علیہ وسلم	آن اینست ....

وقد ظهرت حسيكة	و در حوادث با علیہ الصلوٰۃ
اهل الردة وعظم المصائب	والسلام کفار که گردن
علینا ان مسیلمة الکذاب	فرو شکستہ بودند امروز
بارض الیمامة یرعد ویبرق	سر برآوردند و سینہا پر کینہ
وقد تعلمون انه یدعی النبوة	کردند۔ خصوصاً ایں سہ طائفہ
فی حیاة نبینا محمد صلی الله	یکے جہودان دوم ترسایان
علیه وسلم - والاٰن قد	سوئم منافقان وازیں جماعت
بلغنی ان طلیحة بن خویلد	مسیلۂ کذاب می جوشد و جوشن
الاسدی. ایضاً قد ادعی النبوة	محاربت ومقاتلت می پوشد و
ببلاد نجد (اس کے بعد ابن التیہان	بقدر امکان بدست و زبان
کے بارہ شعر درج ہیں جو فتوح ابن اعثم	می کوشد وطلیحۃ بن خویلد
میں بھی موجود ہیں۔)	کاسۂ ادمی لیسد۔

(۲) حضرت ابوبکر صدیق کے ہاتھ پر حضرت علی کی بیعت کی بحث میں آخری الفاظ یہ ہیں۔

قال فانصرف علی الی منزله فلم	علیؑ بیعت ناکردہ از مجلس بازگشت
یبایع حتی توفیت فاطمة ثم بایع	جماعتے گویند کہ بعد از وفاتِ فاطمہ
بعد خمس وسبعین لیلة من	بدو نیم ماہ بیعت کرد و از عائشہ
وفاتها وقیل الی بعد ستة اشهر	روایت کنند کہ بعد از شش ماہ
والله اعلم ای ذالك كان فهذا	بیعت کرد۔ باقی واللہ اعلم
اکرمك الله ما كان من	وانیجا سخن بسیارست کہ روافض
سقیفة بنی ساعدة وهذا روایة	وغیر آنہا برسبیل غلو ومبالغہ گویند
العلماء ولم اردان اکتب ههنا	واز ایراد آں جز تعرض

شيئاً من زيادات الرافضة فيقع
هذا الكتاب في يد غيرك فتنسب
انت الى امر من الامور والله يوفقك
(ورق ٦ ظ)

تہمت فائدہ نہ بینند
خدائے تعالیٰ نویسندہ و خوانندہ
را از آنچہ خلاف رضائے
اوست نگاہ دارد۔

(۳) کتاب الردہ کے آخری الفاظ یہ ہیں۔

قال كان خالد بن الوليد
كلما افتتح موضعاً
من العراق اخرج من غنائمه
الخمس فيوجه به الى المدينة
الى ابي بكر الصديق ويقسم
باقي المغنم في اصحابه
قال الى ان تحركت الروم
بارض الشام فنرجع الآن
الى ذكر فتوح الشام بعون الله
وكرمه ان شاء الله تعالى
(ورق ۴۳ ب)

و ہر موضعے کہ مسلم شدے
خمس از غنائم آن
بیرون کردے و نزدیک
صدیق فرستادے
وباقی بر لشکر بر قضیت
شرع غنیمت کردے وہم
برایں روزگارے گزشت
ولشکر بر ہر طرف می گماشت
ذکر در حرکت آمدن
لشکر روم در ولایت
شام۔ الخ

احادیث سیرت الصدیق کے ماخذ کی حیثیت سے

عہدِ نبوت یا عہدِ صدیقی کے لئے ماخذ اصولاً دو ہیں — ایک کتب حدیث اور دوسرے تاریخ و سیر کی کتابیں۔ اُن میں ظاہر ہے اوّل نمبر کتب حدیث کا ہے۔ چنانچہ ہم نے بھی اسی کو مقدم رکھا ہے اور جہاں تک ہم احادیثِ صحیحہ سے مدد حاصل کر سکتے تھے اس میں کوتاہی نہیں کی ہے۔ لیکن اس موقع پر یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ جن احادیث میں کوئی تاریخی واقعہ بیان کیا گیا ہے اُن کی نوعیت اور حیثیت

اُن احادیث سے کسی قدر مختلف ہے جن میں کوئی شرعی حکم یا اس سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی قول یا عمل بیان کیا گیا ہے۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ تمام صحابہ اپنے طبائع، رجحانات اور مزاج کے اعتبار سے یکساں نہیں تھے، اس بنا پر بعض معاملات میں ان کا باہم دگر مختلف الرائے ہونا ضروری تھا۔ اور اس اختلاف کے باعث کبھی لب و لہجہ میں تلخی یا شکوہ و شکایت کا موقع بھی پیدا ہو جاتا تھا۔ اس قسم کی احادیث کو دیکھ کر ایک نکتہ رس محقق محسوس کر سکتا ہے کہ روایت میں کتنی بات درست ہے اور کتنی بات محض باہمی اختلاف کے باعث روایت میں جگہ پا گئی ہے۔

اس بنا پر اس نوع کی احادیث سے استدلال کرتے وقت ایک صاحبِ تحقیق کا فرض ہے کہ اصولِ روایت کے علاوہ درایت کے ان اصول کو بھی پیشِ نظر رکھے۔

(۱) واقعہ کا جو اصل راوی ہے اسکے تعلقات صاحبِ واقعہ یعنی جس کے متعلق وہ واقعہ بیان کیا گیا ہے اُس کے ساتھ کس قسم کے تھے۔

(۲) جو واقعہ اُس کی نسبت بیان کیا گیا ہے کیا اُس کے مسلّمہ اوصاف و کمالات کے پیشِ نظر اس واقعہ کا صدور اُس سے ہو سکتا تھا۔

(۳) نفسِ واقعہ کی نوعیت کیا ہے؟ صاحبِ واقعہ کی شخصیت سے قطعِ نظر کیا وہ واقعہ اُس ماحول میں پیش بھی آ سکتا تھا۔

(۴) اگر واقعہ کو صحیح مان لیا جائے تو طبعاً اس پر جو نتائج مرتب ہونے چاہئیں وہ ہوئے یا نہیں بہر حال ایک تاریخی واقعہ کے نقد و جرح کے جو اصول ہیں انکا اطلاق اُس واقعہ پر بھی ہونا چاہیے جو کسی صحیح حدیث میں مذکور ہو۔ اگرچہ وہ روایت صحیحین ہی میں ہو۔ کیونکہ راوی یا رواۃ کے بہمہ وجوہ ثقہ اور معتبر ہونیکے باوجود یہ ممکن ہے کہ راوی کو اس کے متعلق اشتباہ پیش آ گیا ہو اور اسلئے اُس واقعہ کو اپنی دانست میں سچا سمجھ کر ہی نقل کر دیا ہو۔ مؤرخ کا فرض یہ ہے کہ وہ کسی واقعہ کو محض اس بنا پر قبول نہ کرے کہ حدیث کی کتاب میں وہ مندرج ہے بلکہ اُسے اصُول نقد و جرح کی کسوٹی پر پرکھے

اس سلسلہ کی جملہ روایات کو پیش نظر رکھے اور پھر اس باب میں کسی قطعی فیصلہ تک پہونچنے کی کوشش کرے۔

ہم نے کسی واقعہ کے لئے حدیث سے استدلال کرتے وقت انھیں اصول کو پیش نظر رکھا ہے مثلاً حضرت ابوبکر صدیق سے حضرت علی کی بیعت کے سلسلہ میں محدثین اور مورخین سب میں عام طور پر یہ مشہور ہے کہ حضرت علی نے حضرت فاطمہ کی وفات کے بعد جبکہ حضرت ابوبکر کی خلافت پر چھ ماہ گزر چکے تھے بیعت کی۔ اس خیال کی اصل بنیاد صحیح بخاری کی وہ روایت ہے جو حضرت عائشہ سے منقول ہے۔ لیکن اس سے قطع نظر کہ یہ روایت صحیح بخاری میں ہے اس روایت کو دیکھ کر ایک محقق کے ذہن میں قدرتی طور پر حسب ذیل سوالات پیدا ہوتے ہیں۔

(۱) حضرت عائشہ اور حضرت علی کے تعلقات کس قسم کے تھے ؟

(۲) کیا حضرت ابوبکر کی بیعتِ عامہ کے وقت حضرت عائشہ خود موجود تھیں ؟

(۳) حضرت علی کا بیعت نہ کرنا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ اس کا چرچا اور شہرہ عام ہونا چاہئے تھا تو پھر کیا حضرت عائشہ کے علاوہ چند اور صحابہ سے بھی یہ روایت منقول ہے ؟

(۴) تاخیر بیعت کا جو سبب روایت میں بیان کیا گیا ہے یعنی یہ کہ خلافت کے معاملہ میں اُن سے مشورہ نہیں لیا گیا۔ کیا یہ چیز حضرت علی کی بے نفس اور پاکباز و پاک طینت شخصیت کے ساتھ مطابقت رکھتی ہے۔ ؟

(۵) حضرت علی کا بیعت نہ کرنا مسلمانوں کی اجتماعیت کے لئے سب سے بڑا حادثہ ہو سکتا تھا تو کیا اُس وقت جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ہی فوراً اسلام کی مخالفت کا طوفان اُمنڈ پڑا تھا حضرت علی جیسی عظیم المرتبت شخصیت یہ کبھی گوارا کر سکتی تھی کہ اُن کے کسی فعل سے مسلمانوں کی اجتماعی وحدت میں کسی قسم کا کوئی رخنہ پیدا ہو۔ ؟

(۶) حضرت ابوبکر صدیق کا اسلام میں جو مرتبہ تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ پر

جو اعتماد و اعتبار تھا جس کے باعث آپ نے حضرت ابوبکر صدیق کی خلافت کی طرف قولاً و عملاً اپنا رجحان ظاہر فرمایا تھا۔ حضرت علی سے زیادہ ان سب سے اور کون واقف ہو سکتا تھا اس بنا پر کیا حضرت علی سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ بایں ہمہ وہ بیعت عامہ کے وقت سب مسلمانوں سے الگ رہیں۔ حضرت ابوبکر تو ابوبکر! حضرت علی کا کیرکٹر تو یہ ہے کہ حضرت عمر اور حضرت عثمان کی بیعتِ خلافت کے وقت بھی عام مسلمانوں سے الگ نہیں رہے اور اپنے لئے کوئی دعویٰ یا مطالبہ نہیں کیا رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ۔

(۷) اگر یہ مان لیا جائے کہ حضرت علی نے واقعی چھ ماہ تک بیعت نہیں کی تھی تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس مدت میں جو اہم واقعات و حوادث پیش آئے اور جو درحقیقت اسلام کیلئے زندگی اور موت کا سوال تھے۔ حضرت علی اُن سب سے بے تعلق رہے اور انھوں نے حضرت ابوبکر کے ساتھ کوئی تعاون اور اشتراکِ عمل نہیں کیا تو کیا واقعات سے اس کی تائید ہوتی ہے؟

(۸) اچھا اگر مان بھی لیا جائے کہ حضرت علی نے بیعت نہیں کی تو کیا حضرت ابوبکر اس گومگو کی صورت کو برداشت کر کے اسلامی وحدت کی دیوار میں یہ ایک رخنہ کھلا رہنے دے سکتے تھے۔؟ کیونکہ آپ اچھی طرح جانتے تھے کہ حضرت علی کا بیعت نہ کرنا اُن کو کم از کم بنو ہاشم کی حمایت و نصرت سے محروم کر دیتا ہے۔

(۹) کیا صحیح بخاری کی اس روایت کے بالمقابل کچھ اور روایات ایسی ہیں جو اگرچہ صحیح بخاری میں نہ ہوں لیکن اور کتب حدیث میں ہوں اور اُن سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ حضرت علی نے بیعتِ عامہ کے دن ہی حضرت ابوبکر سے بیعت کی تھی۔

اس میں شبہ نہیں کہ صحیحین کا مرتبہ کتبِ حدیث میں سب سے اونچا ہے لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ یہ حکم بحیثیتِ مجموعی اور اکثریت کے اعتبار سے ہے۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ صحیحین کی ہر روایت دوسری کتب حدیث کی ہر روایت سے زیادہ صحیح ہے۔ وجوہ قبول اگر غیر صحیحین کی روایت کے ساتھ زیادہ ہوں تو بیشک اس کو ترجیح ہونی چاہئے۔

چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی صحیحین کی اُن چند احادیث کا جن پر بعض ائمہ حدیث نے کلام کیا ہے، تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

فان هذه المواضع متنازعٌ فی صحتها فلم یحصل لها من التلقی ماحصل لمعظم الکتاب وقد تعرض لذالك ابن الصلاح فی قوله الامواضع یسیرةً انتقد ها علیه الدارقطنی وغیرہٗ وقال فی مقدمة شرح مسلم له ما اخذ علیهما یعنی علی البخاری ومسلم وقدح فیه معتمدٌ من الحفاظ فهو مستثنی مما ذکرنا لعدم الاجماع علی تلقیه بالقبول۔

(مقدمہ فتح الباری مطبوعہ مصر ۱۳۰۱ھ ص ۳۴۴)

پس یہ مقامات ایسے ہیں کہ ان کی صحت میں اختلاف ہے، کیونکہ کتاب (صحیح بخاری) کے ایک بڑے حصہ کو امت نے جس طرح قبول کیا ہے (اُن کی صحت پر اتفاق کیا) ان مقامات کو قبول نہیں کیا اور ابن الصلاح نے بھی یہ کہکر بخاری کے اُن چند مقامات کو چھوڑ کر جن پر دارقطنی وغیرہ نے تنقید کی ہے؛ اسی بات کی طرف اشارہ کیا ہے اور انھوں نے اپنی شرح مسلم کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ ہم نے جو یہ دعویٰ کیا ہے کہ صحیحین کو تلقی بالقبول حاصل ہے تو اس سے بخاری اور مسلم کی وہ روایات مستثنیٰ ہیں جن پر گرفت کی گئی ہے اور جن میں کسی لائقِ اعتماد حافظ حدیث نے قدح کی ہے۔ کیونکہ ان روایات کے تلقی بالقبول پر اجماع نہیں ہے۔

اگر ہمارے مؤرخین روایات کا ان اصول کے ماتحت جائزہ لیں تو اغلب یہ ہے کہ بعض اکابر صحابہ سے تاریخ میں جو چند ایسی باتیں منسوب ہو گئی ہیں جو اُن کی شایانِ شان نہیں ہیں اُن سب کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ حضرت علی کی بیعت کی بحث میں قارئین دیکھیں گے کہ صحیح بخاری کی روایت کو ہم نے ساقط الاعتبار یا موضوع نہیں کہا ہے بلکہ حافظ عماد الدین ابن کثیر نے اس کی جو تاویل کی ہے اور اس طرح انھوں نے اس روایت میں اور اس کی مخالف دوسری روایات میں جو تطبیق دی ہے ہم نے بھی اُسی کو اختیار کیا ہے۔ اور ہمارے نزدیک اس قسم کے مواقع پر محتاط طریقہ یہی ہے۔ البتہ جہاں تاویل کی گنجائش ہی نہ ہو وہاں نقد و جرح کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

احادیث کے بعد دوسرا منبر کتبِ تاریخ کا ہے۔ ہم نے اس سلسلہ میں کسی روایت کو صرف اس

بنا پر قبول نہیں کیا کہ وہ کسی متقدم مؤرخ کی روایت ہے۔ کیونکہ ہوسکتا ہے کہ کوئی مؤرخ متقدم ہونے کے باوجود کسی خاص معاملہ میں کوئی عصبیت رکھتا ہو یا وہ روایات کو نقد و جرح کے بغیر یوں ہی جمع کردینے کا عادی ہو۔ اور اس کے برخلاف دوسرا مؤرخ جو اگرچہ عہد کے اعتبار سے پہلے سے متاخر ہو لیکن اُس کی بہ نسبت زیادہ محتاط اور نقّاد ہو۔ تو ظاہر ہے اس صورت میں اسکی روایت زیادہ معتبر اور لائقِ اعتماد ہوگی۔ قارئین کتاب میں جابجا اس کی مثالیں دیکھیں گے۔

اردو زبان میں مولانا شبلی کی کتاب "الفاروق" جو خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروق کے سوانح حیات اور آپ کے کارناموں کا محققانہ تذکرہ ہے۔ اُردو زبان کے ادب میں ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے اور جب تک یہ کتاب موجود ہے مولانا کا نام روشن رہے گا۔ اگرچہ ترتیب اور اہمیت کے اعتبار سے مولانا کو پہلے حضرت ابو بکر صدیق کا تذکرہ لکھنا چاہئے تھا لیکن حضرت عمر کے دَور میں جو عظیم الشان فتوحات حاصل ہوئیں اور پھر دَہ سالہ مدتِ خلافت میں آپ نے سیاسی نظم ونسق۔ اجتماعی و تمدنی۔ اقتصادی اور سماجی مسائل کے حل کے سلسلہ میں جو عظیم الشان کارنامے انجام دیئے۔ ان سب کے پیشِ نظر مولانا نے ہیروز آف اسلام کی تاریخ کا جو پروگرام بنایا تھا اس کیلئے سب سے زیادہ کشش حضرت عمر کے تذکرہ میں ہی تھی اور مولانا نئی نسل کو اسلام کی تاریخ سے متاثر کرنیکا جو جذبہ رکھتے تھے خلفائے راشدین میں اس جذبہ کی تکمیل کا سامان غالباً سب سے زیادہ "الفاروق" سے ہی ہوسکتا تھا۔

مولانا کی وفات کے بعد اُردو میں متعدد اہلِ علم نے حضرت ابو بکر صدیق کا بھی تذکرہ لکھا۔ چنانچہ حاجی معین الدین احمد صاحب ندوی مرحوم نے "خلفائے راشدین" میں اور پھر اُنھیں کے ہم نام مولانا شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی نے .... تاریخ اسلام کی جلد اوّل میں خلیفۂ اوّل کے حالات و سوانح اور آپ کے کارنامے لکھے یہ دونوں کتابیں دار المصنفین اعظم گڈھ سے شائع ہوئی ہیں۔ لیکن چونکہ یہ تذکرہ ضمنی تھا اس لئے مکمل اور مفصل نہیں ہوسکتا تھا۔ اس کے علاوہ بعض حضرات نے خاص

حضرت ابوبکر پر ہی جو کتابیں لکھی ہیں اُن میں سے جو کتابیں ہماری نظر سے گزری ہیں اُن کے نام یہ ہیں۔

(۱) "سیرت الصدیق" از مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی مرحوم۔
اصل کتاب اُردو میں تھی۔ بعد میں ڈاکٹر سید معین الحق نے اس کا انگریزی میں ترجمہ بھی کر دیا تھا جس کو شیخ محمد اشرف لاہور نے شائع کیا۔

(۲) "العتیق" کے نام سے بھی ایک بزرگ نے ایک کتاب لکھی تھی۔

(۳) چند سال ہوئے عطامحی الدین صاحب ملک نے انگریزی زبان میں "ابوبکر" کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جو لاہور سے شائع ہو چکی ہے۔

(۴) ابھی حال میں مصر کے مشہور فاضل محمد حسین ہیکل کے قلم سے بھی ایک کتاب .... "الصدیق ابوبکر" کے نام سے نکلی ہے اور اُردو میں اس کا ترجمہ بھی چھپ چکا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ "الفضل للمتقدم" کے مطابق اِن سب حضرات کو خاکسار راقم الحروف پر شرفِ تقدم وفضیلتِ سبقت حاصل ہے لیکن بایں ہمہ سیرتِ صدیق اکبرؓ پر ایک ایسی کتاب کی ضرورت باقی تھی جس میں تمام حالات وواقعات مستند حوالوں کے ساتھ درج ہوں۔ جس میں روایات کو یوں ہی جُوں کا توں قبول نہ کر لیا گیا ہو۔ بلکہ علمی اصولِ تنقید کی روشنی میں اُن پر بحث وگفتگو ہو۔ جس میں حضرت ابوبکرؓ کے رُوحانی اور مادی دونوں قسم کے فضائل وکمالات یکساں طور پر اُجاگر کیے گئے ہوں۔ سیرتِ صدیقؓ کے سلسلہ میں جو بعض روایات مشہور چلی آرہی ہیں اُن کی تحقیق وتنقیح کی گئی ہو۔ اور اس ذیل میں جو بعض اہم مسائل پیدا ہوئے اُن کا صحیح حل پیش کیا گیا ہو۔ اور جس میں حضرت ابوبکرؓ سے متعلق جزئی واقعات کا حتی الوسع استقصاء کیا گیا ہو۔ یہ کتاب جو آپ کے پیشِ نظر ہے اسی ضرورت کی تکمیل کی غرض سے لکھی گئی ہے۔ لیکن یہ ضرورت

کس حد تک ۔ پوری ہوئی ؟ اس کا فیصلہ قارئین کرام ہی کریں گے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

سعید احمد اکبر آبادی
کلکتہ ۲۴ر ستمبر ۱۹۵۷ء

مقدمۂ طبعِ دُوم

صدیقِ اکبر کا پہلا اڈیشن شائع ہوا تو خدا کا شکر ہے انڈو پاک کے علمی اور اسلامی حلقوں میں اُس کا پُرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ اخبارات و رسائل میں اُس پر طویل تبصرے ہوئے۔ اہلِ علم نے خطوط کے ذریعہ اور زبانی بھی مصنف کی حوصلہ افزائی کی۔ بعض اکابر مشائخ نے اپنی خاص مجلسوں میں اسے حرفاً حرفاً پڑھوا کر سنا اور دعائیں دیں۔ علاوہ ازیں یورپ کے بعض اسلامیات کے اساتذہ نے اُس کا مطالعہ کر کے داد لکھی اور بعض مباحث سے خاص طور پر استفادہ کا اعتراف کیا۔ لیکن کچھ مصنف کے سبقتِ قلم سے اور کچھ تصحیح کا پورا اہتمام نہ ہو سکنے کے باعث کتاب میں جو غلطیاں رہ گئی تھیں۔ راقم الحروف کو جب اُن کا علم ہوا تو سخت ندامت ہوئی اور ان کو نوٹ کر لیا کہ دوسرے اڈیشن میں تصحیح کر دی جائے گی۔ پھر میں نے مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی کو جن سے بڑھ کر فنِ حدیث و اسماء الرجال کا محقق و مبصر میرے نزدیک آج انڈو پاک میں کوئی عالم نہیں ہے۔ دیرینہ نیازمندی کی بنا پر خط لکھا کہ "اگر آپ 'صدیقِ اکبر' کو ایک مرتبہ ملاحظہ فرمالیں اور اُس میں جو غلطیاں ہیں اُن کی نشاندہی فرما دیں تو مجھے اطمینان ہو جائے۔" مولانا نے ازراہِ شفقتِ بزرگانہ اس درخواست کو بڑی خوشی سے قبول فرمایا اور کتاب کا ایک ایک لفظ پڑھ کر غلطیوں سے مطلع فرمایا۔ میں نے نظرِ ثانی میں مولانا کے خط سے مکمل استفادہ کیا ہے اور اس غیر معمولی توجہ اور زحمت فرمائی کے لئے صمیمِ قلب سے شکر گزار ہوں۔

اس کے علاوہ مولانا سید فضل اللہ شاہ صاحب سابق صدر شعبۂ دینیات عثمانیہ یونی ورسٹی حیدر آباد دکن اور مولانا سجاد حسین صاحب کرتپوری صدر مدرس مدرسۂ عالیہ فتحپوری دہلی۔ ان دونوں حضرات کا بھی شکر گذار ہوں کہ انھوں نے بہ طور خود صدیق اکبر کا بالاستیعاب مطالعہ کیا اور غلطیوں کی نشاندہی کر کے مجھے اُن سے مطلع کیا۔ ان میں سے اکثر و بیشتر غلطیاں وہ تھیں جنھیں میں خود نظر ثانی کے وقت اپنی یادداشت میں لکھ چکا تھا۔ پھر بعض مقامات ایسے بھی تھے جن میں میں اُن حضرات کے ساتھ اتفاق نہیں کر سکا۔ تاہم تھوڑا بہت استفادہ میں نے اُن حضرات کی تحریروں سے بھی کیا ہے اس لئے یہ حضرات بھی میرے دلی شکریہ کے مستحق ہیں فجزاھم اللہ عنی احسن الجزاء۔

کوئی انسانی کام نہ مکمل ہوتا ہے اور نہ احتمالِ خطا و نسیان سے بالکل محفوظ۔ اس لئے یہ دعوی تو نہیں کیا جا سکتا کہ کتاب کے اس دوسرے اڈیشن میں اب کوئی غلطی باقی نہیں رہی ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ پہلے اڈیشن میں جن غلطیوں کا علم ہوا، اُن کی تصحیح اس دوسرے اڈیشن میں خاص اہتمام اور توجہ سے کر دی گئی ہے واللہ ھو المستعان وعلیہ التکلان۔

سعید احمد اکبر آبادی

علی گڑھ ـــــ ۱۹ر اپریل ۱۹۶۱ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نام عبداللہ نام۔ ابوبکر کنیت اور عتیق و صدیق لقب تھا۔ والد کا نام عثمان اور کنیت ابو قحافہ تھی، والدہ ماجدہ کا نام سلمیٰ اور کنیت ام الخیر تھی۔ خاندانی رشتہ سے اپنے شوہر کی چچا زاد بہن بھی ہوتی تھیں[1]

نسب حضرت ابوبکرؓ قریش کی ایک شاخ تیم سے تعلق رکھتے تھے۔ والد کی طرف سے شجرۂ نسب یہ ہے:۔ عبداللہ بن عثمان بن عامر بن عمرو بن کعب بن سعد بن تیم بن مرۃ بن کعب بن لوی بن غالب بن فہر بن مالک بن النضر بن کنانہ۔ اور والدہ کا نسب نامہ یہ ہے۔ سلمیٰ بنت صخر بن عمرو بن کعب۔[2]

ابو قحافہ حضرت ابوبکر کے والد ابو قحافہ مکے کے معزز لوگوں میں سے تھے اور کافی عمر رسیدہ تھے۔ ان کی تین اولادیں تھیں۔ ایک ابوبکر۔ اور دو لڑکیاں۔ جن کے نام ام فروۃ اور قریبہ ہیں۔ ام فروہ کا نکاح پہلے قبیلۂ ازد کے ایک شخص سے ہوا تھا جس سے ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ پھر ان کا نکاح تمیم الداری سے ہوا جو پہلے عیسائی تھا۔ پھر سنہ ۹ھ میں مدینہ آکر مسلمان ہوا۔ حضرت ام فروہ نے جب اسلام قبول کر لیا تو میاں بیوی میں تفریق ہوگئی اور اس کے بعد ان کا نکاح اشعث بن قیس سے ہوگیا۔ جن کا ذکر آگے آئے گا۔ حضرت ابوبکر کی دوسری بہن قریبہ کی شادی حضرت قیس بن سعد بن عبادۃ الانصاری سے ہوئی تھی جو بلند پایہ صحابی اور اپنے عہد کے بڑے مدبر اور شجاع تھے۔ صحیح بخاری میں ان کا تذکرہ ہے۔ اسلام کی دعوت کا چرچا ہوا اور حضرت ابوبکر نے اس کو لبیک کہا تو ابو قحافہ اس کو جوانی کی ایک اپج سمجھتے تھے چنانچہ عبداللہ (غالباً عبداللہ بن مسعود) کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے ارادہ سے جب غارِ ثور چلے گئے تو میں آپ کی خبر معلوم کرنے کی غرض سے ابوبکر کے گھر آیا۔ وہاں ابو قحافہ موجود تھے۔ مجھ کو دیکھتے ہی غصہ میں بھرے ہوئے عصا بدست باہر نکل آئے اور بگڑ کر بولے۔ "یہ بھی انھیں لونڈوں میں سے ہے جنھوں نے میرے بیٹے (ابوبکر) کو

---

[1] طبقات ابن سعد تذکرۂ حضرت ابوبکر [2] ابن جریر طبری ج ۲ ص ۶۱۵

بگاڑ دیا ہے [۱]

فتح مکہ کے بعد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف رکھتے تھے۔ حضرت ابو بکر اپنے والد ابو قحافہ کو لیکر خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اس وقت تک ان کے سر اور ڈاڑھی کے بال بگلہ کی طرح بالکل سپید ہو چکے تھے۔ رحمت عالمؐ نے دیکھا تو حضرت ابو بکر سے فرمایا "تم نے ان کو کیوں تکلیف دی میں خود اُن کے پاس جاتا" آپ نے عرض کیا "یارسول اللہ! وہ خود چل کر آپ کے پاس آتے یہ ان کیلئے اس سے بہتر تھا کہ آپ ان کے پاس تشریف لیجاتے" اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انکے سینہ پر ہاتھ پھیرا اور انکو مشرف باسلام کیا۔ انھوں نے بڑی طویل عمر پائی۔ ۱۴ھ میں ۹۷ برس کی عمر میں وفات ہوئی اس طرح ابو قحافہ پہلے شخص ہیں جو ایک خلیفہ کے وارث ہوئے۔ [۲]

حضرت ابو بکر کی والدہ | حضرت ام الخیر سلمی بنت صخر اپنے شوہر سے بھی پہلے اسلام لے آئی تھیں ان کے اسلام کا پورا واقعہ آگے آتا ہے۔ انھوں نے بھی طویل عمر پائی۔ حضرت ابو بکر کے بعد لیکن ابو قحافہ سے پہلے وفات ہوئی [۳]

ولادت | حضرت ابو بکر کی ولادت عام فیل کے ڈھائی برس بعد ہوئی یعنی سن ہجری کے آغاز سے پچاس برس چھ مہینے قبل۔ آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کم وبیش تین برس چھوٹے تھے۔ اس حساب سے ۵۷۱ء آپ کا سن پیدائش قرار پاتا ہے۔

عتیق کہلانے کی وجہ | طبری نے ایک روایت نقل کی ہے کہ حضرت ابو بکر تین بھائی تھے اور اُن کے نام عتیق، معتق اور عُتَیق تھے لیکن اصل یہ ہے کہ عتیق نام نہیں بلکہ لقب تھا۔ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو دیکھا تو فرمایا "انت عتیق اللہ من النار [۴] (تم اللہ کی طرف سے دوزخ سے آزاد ہو") اسی وقت سے اُن کا لقب عتیق پڑگیا۔ اس کے علاوہ حضرت عائشہ سے

---

[۱] الاصابہ ج ۲ حرف عین ص ۴۵۳ [۲] الاصابہ ج ۲ ص ۴۵۴ [۳] الاصابہ ج ۴ حرف الخاء المعجمۃ ص ۴۹۲ [۴] ترمذی ج ۲ ص ۲۱۴

بھی صاف تصریح ہے کہ عتیق آپ کا لقب ہی تھا[1]

صدیق کہلانے کی وجہ آپ کا دوسرا لقب صدیق تھا۔ بعض لوگ اس کی وجہ یہ بتلاتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ نے اسلام سب سے پہلے قبول کیا تھا لیکن جیسا کہ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے اس کی زیادہ صحیح وجہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شب معراج میں جبرئیل امین سے پوچھا کہ میری قوم میں اس واقعہ کی تصدیق کون کرے گا۔ انھوں نے جواب دیا کہ "ابوبکرؓ آپ کی تصدیق کریں گے وہ صدیق ہیں[2]

تجارت قریش اگرچہ عزت و منصب اور مرتبہ و مقام کے اعتبار سے نہایت سربلند و سرفراز تھے۔ لیکن آزاد ذریعۂ معاش اختیار کرنے کو برا نہیں جانتے تھے۔ اور اس سلسلہ میں معمولی سے معمولی کام کرنے میں بھی ان کو عار نہیں آتی تھی۔ چنانچہ حضرت عمرؓ سوداگری کرتے تھے۔ سعد بن ابی وقاصؓ تیر بناتے تھے۔ عثمان بن عفانؓ بزازی کا پیشہ کرتے تھے۔ عمرو بن العاصؓ قصاب تھے۔ اور حد یہ ہے کہ حضرت علیؓ دوسروں کیلئے کنوئیں سے پانی بھر کر اپنی معاش پیدا کرتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ عہد جاہلیت میں بڑے پیمانہ پر کپڑے کی تجارت کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں شام اور یمن کے متعدد سفر بھی کئے تھے۔ پہلا سفر اٹھارہ برس کی عمر میں کیا جس کا تذکرہ الاصابہ اور اسد الغابہ میں ہے۔

عہد جاہلیت میں بلند مرتبہ عرب قبائل میں باقاعدہ کوئی بادشاہ نہیں ہوتا تھا۔ قریش سب سے ممتاز تھے اس لئے اس قبیلہ کی مختلف شاخوں نے مختلف خدمات اپنے ذمہ لے رکھی تھیں۔ حضرت ابوبکرؓ عقل و فہم۔ اصابت رائے اور حلم و بردباری میں مشہور تھے اس لئے اشناق کی خدمت انکے سپرد تھی یعنی اگر کوئی واقعہ قتل ہو جاتا تھا تو قاتل سے دیت یا خون بہا لینے کا معاملہ حضرت ابوبکرؓ سے متعلق ہوتا تھا۔ اگر آپ قاتل کی طرف سے ضامن بن جاتے تو اس کا اعتبار ہوتا تھا کسی اور کی ضمانت معتبر نہیں تھی۔ علم الانساب والاخبار کے ماہر تھے۔ ایک روایت ہے کہ شعر بھی کہتے تھے مگر اسلام کے بعد شعر گوئی ترک کر دی تھی۔ ابن سعد نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مرثیہ میں آپ کے کچھ شعر نقل

[1] طبری ج ۲ ص ۶۱۵ [2] طبقات ابن سعد تذکرۂ ابوبکرؓ۔

کئے ہیں۔

سلامت فطرت | حضرت ابوبکر کی فطرت شروع سے ہی سلیم تھی۔ چنانچہ آپ کو اسلام سے پہلے بھی بُت پرستی سے نفرت تھی اور شراب نوشی کو بُرا جانتے تھے۔ جلال الدین سیوطی نے تاریخ الخلفا میں ابونعیم کے حوالہ سے حضرت عائشہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ۔

لقد حرّمَ ابوبکر الخمر	ابوبکر نے عہد جاہلیت میں بھی شراب
علیٰ نفسہ فی الجاھلیۃ	اپنے اوپر حرام کر رکھی تھی۔

آپ کا مزاج اور افتادِ طبع۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلقِ عظیم سے کس درجہ مشابہ اور قرین تھا؟ اس کی دلیل اس سے زیادہ اور کیا ہوگی کہ جیسا کہ آگے ذکر آئیگا۔ ایک موقعہ پر ابن الدغنہ نے آپکے وہی اوصاف وکمالات بیان کئے ہیں جو حضرت خدیجہؓ نے پہلی وحی کے نزول کے موقع پر خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کئے ہیں۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دوستی | ہم عمری کے ساتھ اسی ہم طبعی اور مزاجی توافق کا نتیجہ تھا کہ آپ میں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں دوستی تھی۔ حافظ ابن حجر نے میمون بن مہران کا قول نقل کیا ہے کہ ابوبکر تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بحیرا راہب کے واقعہ کے بعد سے ہی ایمان لے آئے تھے۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ غالباً حضرت ابوبکر بھی سفر شام میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے۔ اس کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت خدیجہ میں نکاح کی جو گفتگو ہوئی تھی اس میں بھی حضرت ابوبکر واسطہ تھے[1] اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر دونوں کے دوستانہ تعلقات دیرینہ تھے۔ بعض مورخین نے لکھا ہے کہ نبوت سے صرف ایک سال پہلے دونوں میں دوستی ہوئی۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ اسلام کے بعد یہ تعلق اس قدر گہرا ہوگیا کہ حضرت عائشہ فرماتی ہیں "ہم پر کوئی دن ایسا نہیں گزرا جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے گھر صبح وشام نہ آئے ہوں[2]

[1] الاصابۃ ج ۲ حرف العین ص ۳۳۵ [2] صحیح بخاری مطبوعہ مطبع مجتبائی ج ۱ ص ۵۵۲

قبول اسلام | حضرت ابو بکر کے قبول اسلام سے متعلق اُسد الغابہ میں مختلف روایات نقل کی گئی ہیں جن میں سے بعض دور از کار اور بعید از قیاس ہیں۔ صحیح بات اس قدر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جب پہلی مرتبہ وحی نازل ہوئی تو حضرت ابو بکرؓ اس وقت تجارت کی غرض سے یمن گئے ہوئے تھے۔ جب واپس آئے تو سرداران قریش ملنے گئے۔ حضرت ابو بکر نے پوچھا "کوئی نئی بات؟" ان لوگوں نے کہا "ہاں ایک نئی بات یہ ہے کہ ابو طالب کا یتیم بچہ نبوت کا دعویٰ کرتا ہے۔" یہ سن کر حضرت ابو بکر کا دل تڑپ اٹھا۔ سرداران قریش رخصت ہو گئے تو سیدھے خدمت نبوی میں حاضر ہوئے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بعثت کے بارے میں سوال کیا اور اسی جلسہ میں مشرف باسلام ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ فرمایا کہ میں نے جس کسی کے سامنے اسلام پیش کیا اس نے تھوڑی بہت جھجک ضرور محسوس کی لیکن جب ابو بکر کے سامنے اسلام پیش کیا تو انھوں نے جھجک کے بغیر اس کو قبول کر لیا۔

پہلے مسلمان کی بحث | سب سے پہلا مسلمان کون ہے؟ اس میں مختلف روایتیں ہیں بعض روایتوں میں حضرت علی اور بعض میں زید بن حارثہ کو یہ شرف دیا گیا ہے۔ محدثین نے تطبیق اس طرح دی ہے کہ مردوں میں سب سے پہلے حضرت ابو بکر، عورتوں میں حضرت خدیجہ۔ بچوں میں حضرت علی اور غلاموں میں حضرت زید بن حارثہ سب سے پہلے اسلام لائے چنانچہ عمار بن یاسر کا بیان ہے کہ میں نے جب پہلی مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو اس وقت آپ کے ساتھ صرف پانچ غلام دو عورتیں اور ایک ابو بکر تھے [1] حافظ ابن حجر نے مقدمہ فتح الباری میں ان پانچ غلاموں اور دو عورتوں کے نام یہ بتائے ہیں:۔

بلال۔ زید بن حارثہ۔ عامر بن فہیرہ۔ ابو فکیہہ۔ یاسر۔ خدیجہؓ اور سمیہؓ والدہ عمار بن یاسر

لیکن ابھی ایک اشکال یہ باقی رہتا ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص کا دعویٰ اپنے متعلق یہ ہے کہ جس روز میں نے اسلام قبول کیا اس روز کوئی بھی اسلام نہیں لایا تھا اور میں سات دن اس طرح رہا کہ

[1] صحیح بخاری جلد ا ص ۵۱۶

میں تین مسلمانوں میں سے ایک تھا[۱] اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سعد کا اسلام حضرت ابوبکر کے اسلام پر بھی مقدم ہے۔

علامہ کرمانی نے اس اشکال کا جواب اس طرح دیا ہے کہ ممکن ہے حضرت ابوبکر اُسی دن صبح کو اسلام لائے ہوں اور حضرت سعد بن ابی وقاص نے شام کو اسلام قبول کیا ہو اور ان کو حضرت ابوبکر کے اسلام لانیکی اطلاع نہ ہو[۲]

بہرحال ہمارے نزدیک صبح و شام کا فرق کوئی چیز نہیں ہے ممکن ہے کہ اس اعتبار سے حضرت سعد کو یا کسی اور کو بھی حضرت ابوبکر پر تقدم حاصل ہو[۳] تاہم حضرت ابوبکر کے فخر کے لئے یہی کیا کم ہے کہ خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بے چون وچرا اسلام قبول کر لینے کی داد دی ہے چنانچہ ایک مرتبہ جب آپ کو معلوم ہوا کہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمرؓ دونوں میں کسی بات پر ان بن ہو گئی ہے اور اُس سے حضرت ابوبکرؓ کو رنج پہونچا ہے تو آپ نے غصہ کے لب ولہجہ میں فرمایا "اللہ نے مجھ کو تم لوگوں کی طرف مبعوث کیا مگر تم نے مجھ کو جھٹلایا اور ابوبکر نے تصدیق کی اور اپنے نفس اور مال کیساتھ میری غم گساری کی تو کیا تم پھر بھی میرے ساتھی (ابوبکر) کو میری خاطر نہ چھوڑ دگے؟ یعنی اُن کو کوئی تکلیف نہ پہونچاؤ گے راوی کا بیان ہے کہ حضور نے یہ جملہ دو مرتبہ فرمایا[۱]

ابتلاء و آزمائش حضرت ابوبکرؓ نے اسلام کی پہلی صدائے توحید پر ہی لبیک کہا تھا جبکہ مکہ کی پوری سرزمین اس دعوتِ ربانی کی مخالفت اور اس کے داعی و حامی کی دشمنی کے نعروں سے گونج اٹھی تھی چند غلاموں اور عورتوں کے مسلمان ہو جانے سے دشمنوں کو کیا خطرہ ہو سکتا تھا۔ حضرت ابوبکر ایسی با اثر اور ذی وجاہت شخصیت بھی جب اس دینِ حق اور اُس کے داعی کی حمایت و نصرت کیلئے سامنے آگئی تو اب مخالفوں اور دشمنوں کا جتنا بھی غیظ و غضب حضرت ابوبکر پر ہوتا کم تھا۔

---

[۱] صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۴۴ [۲] حاشیہ نمبر ۵ صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۴۴ [۳] یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ بعض روایتوں میں یہ ہے کہ خود سعد بن ابی وقاص حضرت ابوبکر کی ترغیب و تحریک پر اسلام لائے تھے۔

[۱] صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۱۷

شیخ المحب الطبری نے حضرت عائشہ رضؓ کی روایت نقل کی ہے

کہ جب (ابتدائے اسلام میں) مکہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ۳۹ مسلمان ہو گئے تو ابوبکر نے اصرار کیا کہ اپنے آپ کو ظاہر کیا جائے مگر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہم ابھی تھوڑے ہیں۔ حضرت ابوبکر نے پھر اصرار کیا اور آں حضرتؐ نے پھر انکار فرمایا یہاں تک کہ آنحضرتؐ آمادہ ہو گئے اب جتنے مسلمان تھے مسجد میں آکر بیٹھ گئے۔ ابوبکر خطبہ دینے کھڑے ہوئے۔ آں حضرتؐ بیٹھے ہوئے تھے اتنے میں مشرکوں کو خبر ہو گئی انھوں نے مسجد میں گھس کر حملہ کر دیا اور مسلمانوں کو نہایت ظالمانہ طریقہ پر زدوکوب کرنا شروع کیا۔ عتبۃ بن ربیعۃ ایک نہایت ظالم و شقی شخص تھا وہ حضرت ابوبکر کی طرف متوجہ ہوا اور آپ کو اس بے دردی کے ساتھ مارنا شروع کیا کہ ناک چپٹی ہو کر چہرہ سے مل گئی۔ بنو تیم کو جو حضرت ابوبکر کا قبیلہ تھا خبر ہوئی تو دوڑے ہوئے مسجد میں آئے اور مشرکوں کو وہاں سے ہٹا کر حضرت ابوبکر کو اُن کے گھر لے گئے۔ ان لوگوں کو اب حضرت ابوبکر کی موت میں کوئی شک نہیں تھا۔ ابوبکر بیہوش پڑے ہوئے تھے تھوڑی دیر میں اُن کو ہوش آیا اور بنو تیم اور ان کے والد ابو قحافہ نے ان سے بات کرنی چاہی تو انھوں نے پوچھا "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حال کیا ہے؟ بنو تیم کو اس پر غصہ آگیا اور وہ ان کو ملامت کرتے ہوئے چلدئے اب حضرت ابوبکر نے اپنی والدہ ام الخیر سے یہی سوال کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیسے ہیں؟ مگر ان کو بھی پتہ نہیں تھا۔ آخر حضرت عمر کی بہن ام جمیل آئیں اور ان سے یہ معلوم ہوا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بخیر و عافیت ہیں اور دار ارقم میں ہیں تو اطمینان ہوا لیکن ساتھ ہی فرمایا کہ میں اُس وقت تک کچھ کھاؤں پیوں گا نہیں جب تک خود چل کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی آنکھ سے نہیں دیکھ لوں گا میں نے اس کی قسم کھالی ہے چنانچہ اُسی حالت میں حضرت ابوبکر ام جمیل اور اپنی والدہ ام الخیر کے سہارے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ چہرۂ انور دیکھتے ہی گر پڑے اور اسے بوسہ دیا آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر کی یہ حالت دیکھی تو آپ کا بھی دل بھر آیا۔ آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم کے چچا حضرت حمزہ اور حضرت ابوبکر کی والدہ ام الخیر نے بھی اسی دن اسلام قبول کیا۔[1]

ہجرت حبش کا ارادہ کفارِ قریش کے ظلم وستم کا پارۂ حرارت جب بجائے گھٹنے کے بڑھتا ہی رہا اور حالت یہ ہوگئی کہ جان نثارانِ اسلام برملا خدا کا نام بھی نہیں لے سکتے تھے تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو حبش کی ہجرت کا حکم دیا[2] حضرت ابوبکر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جدائی گوارا نہیں کر سکتے تھے لیکن چونکہ یہ ہجرت مصائب وشدائد سے بچنے کیلئے نہیں بلکہ آزادی کے ساتھ عبادتِ الٰہی کرنیکی غرض سے تھی اس بنا پر حضرت ابوبکر نے بھی حبش کی ہجرت کا ارادہ کرلیا لیکن ابھی برک الغماد جو مکہ سے یمن کی جانب پانچ دن کی مسافت پر ہے وہاں پہونچے ہی تھے کہ ابن الدغنہ سے جو قبیلہ قارہ[3] کا سردار تھا ملاقات ہوگئی۔ ابن الدغنہ نے پوچھا "کہاں کا ارادہ ہے؟ حضرت ابوبکر نے کہا "میری قوم نے مجھ کو نکال دیا ہے تو اب چاہتا ہوں کہ سیاحت کروں اور اپنے رب کی عبادت کروں" ابن الدغنہ بولا "تمہارے جیسے شخص کو کیسے شہر بدر کیا جاسکتا ہے۔ تم غریبوں کی مالی امداد کرتے ہو صلہ رحمی کرتے ہو۔ اپاہجوں کا سہارا ہو اور حق کیطرف سے حوادث کا مقابلہ کرتے ہو۔ چلو میں تم کو اپنی پناہ میں لیتا ہوں وہاں تم خدا کی عبادت کرنا۔

---

[1] الریاض النضرہ فی مناقب العشرۃ ج ۱ ص ۴۶ [2] یاد رکھنا چاہئے کہ ہجرت کا یہ حکم اس لئے نہیں تھا کہ سرفروشانِ اسلام میں قریش کے مظالم کو سہنے کی طاقت نہیں رہی تھی بلکہ اس میں ایک حکمت تو یہ تھی کہ اس بہانہ اسلام کی دعوت دوسرے ملکوں میں پھیلے گی اور غالباً اسی وجہ سے مہاجرین کی فہرست میں اُن ناموران قریش کے نام نظر آتے ہیں جو اپنی شخصیت، طرز گفتگو اور عقل وفہم سے اسلام کی تبلیغ کا حق ادا کر سکتے تھے۔ دوسری حکمت یہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ سبق دینا تھا کہ مسلمانوں پر اگر کہیں اس قدر ظلم کیا جائے کہ ان کو خدا کا نام لینے تک کی اجازت نہو تو پھر بھی مسلمانوں کو وہیں پڑا رہنا چاہئے بلکہ وہاں سے ہجرت کر کے کسی دوسری محفوظ جگہ میں اپنی تنظیم کرنی اور قوت بڑھانی چاہیے [3] یہ بنو الہون بن خزیمہ بن کنانہ کا قبیلہ ہے تیر اندازی میں ضرب المثل تھا کہتے ہیں۔ انصف القارۃ من راماھا یعنی جس نے قبیلہ قارہ کے ساتھ تیر اندازی میں مقابلہ کیا اس نے اسکے ساتھ انصاف کیا۔ النہایہ لابن الاثیر وتاج العروس ج ۳ ص ۵۱۰

چنانچہ ابن الدغنہ حضرت ابو بکر کو اپنے ساتھ مکہ لایا اور حضرت ابو بکر کے جو اوصاف اس نے اوپر بیان کئے ہیں انہیں کا حوالہ دیکر کہا کہ کیا غضب ہے تم ایسے شخص کو شہر میں رہنے نہیں دیتے۔ قریش نے کہا کہ اگر وہ چھپ کر عبادت کریں تو ہم ان سے تعرض نہیں کریں گے۔ وہ یہاں رہیں تم نے جو اُن کو پناہ دی ہے وہ ہمیں اس شرط پر منظور ہے۔ اس عہد کے مطابق حضرت ابو بکر کچھ دنوں تک تو پوشیدہ طور پر ہی عبادت کرتے رہے لیکن آخر نہ رہا گیا۔ اپنے گھر کے صحن میں ایک مسجد بنالی یہاں نماز پڑھتے تھے اور قرآن مجید کی تلاوت کرتے اور روتے تھے ایک تو کلام الٰہی اور پھر حضرت ابو بکر کی دردِ آفریں و اثر انگیز آواز جب قرآن کی تلاوت کرتے تو قریش کی عورتیں اور نوجوان ارد گرد جمع ہو جاتے اور اثر پذیر ہوتے، قریش نے ابن الدغنہ سے شکایت کی کہ ابو بکر معاہدہ کی خلاف ورزی کر رہے ہیں اُن سے کہو کہ اگر ان کو تمہاری پناہ میں رہنا ہے تو معاہدہ کے مطابق عبادت اور تلاوت چھُپ کر کریں اور اگر وہ اس پر رضامند نہ ہوں تو تمہاری پناہ سے دست کش ہو جائیں ابن الدغنہ نے حضرت ابو بکر سے یہی بات کہی تو آپ نے فرمایا "مجھ کو تمہاری پناہ کی ضرورت نہیں اب میں اللہ کی پناہ میں آتا ہوں"[1]

اسلام کے لئے ایثار و فداکاری یہ دور پیروانِ اسلام کے لئے نہایت پُر آشوب اور حد درجہ صبر آزما تھا۔ خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھ آپکے جاں نثاروں کو اس قدر شدید تکلیفیں پہونچائی جاتی تھیں کہ آج اُن کے تصور سے بھی جسم پر لرزہ طاری ہوتا ہے لیکن اسلام وہ نشہ نہیں تھا جس کو جسمانی تکلیفوں کی ترشی اتار سکتی۔ حضرت ابو بکر کو اپنی تو چنداں فکر نہیں تھی اس بات کا البتہ برابر دھیان رکھتے تھے کہ حضور سرورِ عالم کو کوئی تکلیف نہ پہونچنے پائے۔ جب کبھی ایسا کوئی واقعہ پیش آتا فوراً موقع پر پہنچ جاتے اور آپ کی مدد کرتے چنانچہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ میں تقریر کر رہے تھے کہ مشرکین آپ پر چل پڑے اور اس قدر گستاخی کی کہ آپ بیہوش ہو گئے۔ حضرت ابو بکر نے بڑھ کر کہا "کم بختو! کیا تم صرف

---

[1] صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۵۲ - ۵۵۳ -

اس لئے ان کو قتل کر دوگے کہ یہ ایک خدا کا نام لیتے ہیں [۱]

ایک دفعہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم خانہ کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے کہ عقبۃ بن ابی معیط ادھر آنکلا۔ اُس نے اپنی چادر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی گردن میں ڈال کر اس کو اس طرح بل دیا کہ سردارِ دو عالم کا دم گھٹنے لگا۔ اتنے میں حضرت ابوبکرؓ بھی پہونچ گئے عقبہ کو کاندھوں کے بل دھکا دیکر وہاں سے ہٹایا اور بولے "ارے ظالمو! کیا تم اُس کو قتل کرنا چاہتے ہو جو کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے۔[۲]

مسند بزار میں حضرت علیؓ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ قریش نے آپ کو گھیر رکھا تھا کوئی آپ کو پکڑ کر کھینچتا۔ کوئی دھکا دیتا اور سب یہ کہتے جاتے تھے کہ تو وہی ہے جس نے سب خداؤں کو ملا کر ایک کر دیا ہے۔ حضرت علیؓ کا بیان ہے کہ یہ منظر اس قدر بھیانک تھا کہ ہم میں سے کسی کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ البتہ ہاں ابوبکرؓ آگے بڑھے اور انھوں نے قریشیوں میں سے کسی کو مارا۔ کسی کو دھکا دیا کسی کو پیچھے ہٹایا یہ سب کچھ کرتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے "بدبختو کیا تم اس کو قتل کر دوگے جو اللہ کو اپنا رب کہتا ہے" راوی کا بیان ہے کہ یہ کہکر حضرت علیؓ نے اپنی چادر اٹھائی اور رونے لگے۔ یہاں تک کہ ڈاڑھی تر ہوگئی۔ اسی حالت میں لوگوں سے پوچھا اچھا بتاؤ! آلِ فرعون کا مومن اچھا تھا یا ابوبکر؟ لوگ خاموش رہے۔ آپ نے دریافت فرمایا "کیا تم مجھ کو جواب نہیں دوگے؟ اس کے بعد ارشاد ہوا کہ بخدا! ابوبکرؓ کا ایک لمحہ آلِ فرعون کے مومن جیسے شخص کے ہزاروں لمحوں سے بہتر ہے۔ اس لئے کہ یہ شخص ایمان پوشیدہ رکھتا تھا اور ابوبکرؓ اپنے ایمان کا اعلان کرتے تھے۔

غلاموں پر قریش کے مظالم اور حضرت ابوبکرؓ کی داد رسی

دعوتِ اسلام کے اس پُر آشوب دَور میں حضرت ابوبکر صدیقؓ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ راست اور قوتِ بازو

[۱] فتح الباری ج ۱ ص ۱۲۹ [۲] صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۴۴

تھے جنھوں نے زندگی کا ہر سانس دعوتِ ربانی کی نشر و اشاعت اور اس کے استحکام و تقویت کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ ایک طرف وہ ناموران قریش کو، جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، کھینچ کھینچ کر اسلام کی طرف لاتے تھے اور دوسری جانب اُن غریب و بےکس غلاموں کی دادرسی اور گلو خلاصی اپنے مال سے کرتے تھے جو دعوتِ حق کو قبول کر لینے کے جرم میں قریش کے ظلم و ستم کا سب سے بڑا نشانہ تھے۔ ہم نے ان غلاموں کے حالات "غلامانِ اسلام" میں تفصیل سے لکھے ہیں ذیل میں ان کے نام مع مختصر تعارف کے لکھتے ہیں۔

حضرت بلال حبشی | اسلام کے سب سے پہلے مؤذن ہیں اور کیا عجب بات ہے کہ ارباب سیر انھیں کے متعلق لکھتے ہیں اول من اظہر الاسلام، یہی سب سے پہلے شخص ہیں جنھوں نے اپنے اسلام کا اظہار کیا نسلاً حبشی اور امیہ بن خلف کے غلام تھے۔ امیہ ٹھیک دوپہر کے وقت جبکہ عرب کی زمین آگ کا توا بن جاتی تھی۔ حضرت بلال کو اسی توے پر لٹا دیتا اور پھر پتھر کی ایک چٹان سینہ پر رکھتا کہ جنبش نہ کر سکیں۔ اور ان سے کہتا کہ اسلام سے توبہ کرو ورنہ اسی طرح تڑپ تڑپ کر مر جائیگا لیکن بااین ہمہ حضرت بلال فرماتے " احد احد " خدا ایک ہے ایک ہے اب یہ شقی آپ کے گلے میں ایک رسی باندھ کر چھوکروں کے حوالہ کرتا جو اس حالت میں اُن کو شہر میں گشت کراتے پھرتے لیکن اس عالم درد و کرب میں بھی زبان پر نعرہ تھا تو یہی "احد احد" حضرت ابوبکر صدیق نے جب یہ مظالم دیکھے تو امیہ بن خلف سے حضرت بلال کو خرید کر اللہ کے لئے آزاد کر دیا۔ حضرت عمر فاروق فرمایا کرتے تھے " ابوبکر سیدنا واعتق سیدنا[1] ابوبکر ہمارے سردار ہیں اور انھوں نے ہمارے سردار کو آزاد کیا۔

عامر بن فہیرہ | طفیل بن عبداللہ جو حضرت عائشہ کے اخیافی (ماں شریک) بھائی تھے اُن کے غلام تھے۔ حضرت بلال۔ حضرت عمار اور حضرت مصعب بن عمیر کے ساتھ عامر بن فہیرہؓ نے بھی اسلام قبول کیا اور ان کو بھی سخت شدائد و مصائب کا سامنا کرنا پڑا لیکن یہ اسلام پر مضبوطی اور

[1] صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۳۰

استقلال کیساتھ جمے رہے۔ حضرت ابوبکر صدیق کو ان حالات کا علم ہوا تو ان کو بھی خرید کر آزاد کیا اُن کا ذکر آگے ہجرتِ مدینہ کے سلسلہ میں بھی آئے گا[۱]

حضرت ابوفکیہ | قبیلۂ ازد سے تعلق رکھتے تھے۔ صفوان بن امیہ کے غلام تھے اسلام کی صدائے کفر شکن مکہ میں بلند ہی ہوئی تھی کہ حضرت بلال اور حضرت صہیب کی طرح فوراً مسلمان ہوگئے اُن پر بھی سخت مظالم کئے جاتے تھے۔ صفوان آتش خیز دوپہر میں تپتے ہوئے ریت پر منہ کے بل زندہ لٹا دیتا اور پھر کمر پر ایک بھاری پتھر رکھ دیتا کہ جنبش نہ کرسکیں۔ حضرت ابوفکیہ تاب نہ لاکر بیہوش ہوجاتے۔ اس بدبخت کو پھر بھی رحم نہ آتا۔ اسی حالت میں پاؤں میں بیڑیاں ڈال کر ان کو گھسیٹتا پھرتا۔ ایک دن صفوان نے حضرت ابوفکیہ کو گرم ریت پر ڈال کر اُن کو اس بے رحمی و بے دردی سے مارا کہ اُن کے مرجانے میں کوئی کسر باقی نہیں رہی تھی۔ اتنے میں حضرت ابوبکرؓ ادھر سے گزر ہوا۔ حضرت ابوفکیہ کو اس حالت میں دیکھ کر بیساختہ جی امڈ آیا۔ فوراً اُن کو خریدا اور آزاد کردیا[۲]

حضرت لُبینہ | حضرت عمر فاروقؓ کے گھرانہ کی باندی تھیں۔ ابھی حضرت عمر اسلام نہیں لائے تھے کہ یہ مشرف باسلام ہوچکی تھیں حضرت عمر کی درشت مزاجی مشہور ہے۔ اس غریب کو اس بے دردی سے مارتے تھے کہ مارتے مارتے تھک جاتے تو کہتے تھے "میں ذرا دم لے لوں تو پھر ماروں گا" لیکن حضرت لُبینہ نہایت استقلال و پامردی سے جواب دیتیں" اگر تم نے اسلام قبول نہیں کیا تو اللہ اس کا بدلہ لیگا[۳]

حضرت زنیرہ | یہ بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے گھرانہ کی باندی تھیں۔ اسلام سے قبل حضرت عمر ان کو بھی بہت ستاتے اور پریشان کرتے تھے۔ ابوجہل نے ایک مرتبہ اُن کو ایسا مارا کہ ان کی آنکھیں جاتی رہیں۔

حضرت لُبینہ اور حضرت زنیرہ کے لئے کیا یہ شرف کچھ کم ہے کہ اُن کو حضرت عمر فاروقؓ ایسے اپنے آقا پر بھی قبولِ اسلام کے معاملہ میں تقدم حاصل ہے۔ حضرت ابوبکر کو اُن

[۱] اسد الغابہ ج ۳ ص ۹۰ [۲] اصابہ تذکرۂ حضرت ابوفکیہ۔ [۳] استیعاب تذکرۂ عمر بن الخطاب

غریبوں کے مصائب و شدائد کا علم ہوا تو ان کو بھی خرید کر آزاد کر دیا۔

حضرت نہدیہ اور ام عبیس

یہ دونوں بھی کنیزیں تھیں قبولِ اسلام کے جرم میں ان پر بھی سخت جبر و تشدد کیا جاتا تھا۔ آخر صدیقی جود و کرم کے دستِ غریب نواز نے ان ستم رسیدوں کو بھی غلامی سے نجات دلائی۔

طبرانی نے حضرت عروہ سے روایت کی ہے کہ حضرت ابوبکر نے جن غلاموں اور کنیزوں کو اپنے روپیہ سے خرید کر آزاد کیا اُن کی تعداد سات ہے لیکن ہمارے خیال میں اس خاص معاملہ میں حضرت ابوبکر کو جو عام شہرت حاصل تھی وہ اس بات کی دلیل ہے کہ اصل تعداد سات سے کہیں زیادہ ہوگی۔ لیکن چونکہ اور دوسرے غلاموں اور باندیوں کو یہ شہرت حاصل نہیں ہو سکی اس بنا پر وہ شمار میں نہیں آئے [1]

حضرت ابوبکر کی یہ فیاضیاں خالصۃً لوجہ اللہ تھیں ایک مرتبہ اُن کے والد ابو قحافہ نے کہا "ابوبکر تم زیادہ تر عورتوں اور اُن میں بھی بوڑھیوں کو خرید خرید کر آزاد کرتے ہو۔ بھلا یہ تمہارے کس کام آئیں گی۔ اگر ان کے بجائے تم تندرست و توانا غلام مردوں کو خرید کر آزاد کرو تو کبھی وقت پڑنے پر وہ تمہاری مدد بھی کر سکتے ہیں"

حضرت ابوبکر نے کہا "ابا! میں تو یہ سب کچھ انعام خداوندی حاصل کرنیکے لئے کرتا ہوں"[2]

اسلام جس نے آگے چل کر اقوام عالم کی تاریخ کے دفتر الٹ دئے اس کے سب سے پہلے علمبردار، حامی اور جاں نثار کون تھے؟ یہی چند غلام اور کنیزیں جن میں سے کئی ایک پروردۂ احسانِ صدیقی تھے۔ رحمتِ عالم کو ان کی دل جوئی اس حد تک منظور تھی کہ اگر حضرت ابوبکر

---

[1] اصابہ اور اسد الغابہ دونوں میں حضرت ابوبکر کے آزاد کردہ غلاموں کی تعداد تو سات ہی لکھی ہے لیکن ایک تو ان سات غلاموں کا وصف یہ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں ان کو عذاب دیا جاتا تھا اور دوسرے یہ کہ دونوں کتابوں میں تعداد کے ایک ہونے کے باوجود ناموں میں اختلاف ہے۔ یہ دونوں باتیں بھی اس امر کا قرینہ ہیں کہ حضرت ابوبکر کے آزاد کردہ غلاموں کی اصل تعداد سات سے زیادہ ہوگی۔ [2] ابن جریر طبری۔

کی زبان سے بھی ان کے حق میں کبھی کوئی بات ایسی نکل جاتی جو ان کے لیے آزردگی کا باعث ہوتی تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر کو فوراً متنبہ فرمادیتے تھے چنانچہ ایک مرتبہ ابوسفیان (مسلمان ہونے سے پہلے) حضرت سلمان فارسی۔ حضرت بلال حبشی اور حضرت صہیب رومی کے پاس سے گزر رہا تھا کہ ان تینوں نے اُس کو دیکھ کر کہا "اللہ کی تلوار نے اس دشمن خدا کی گردن نہیں اڑائی" اس وقت حضرت ابوبکر بھی کہیں پاس ہی تھے یہ سنکر بولے "تم لوگ قریش کے بزرگ کی نسبت ایسا کہتے ہو؟" پھر جب ابوبکر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس واقعہ کا ذکر فرمایا تو آپ نے فرمایا "ابوبکر! تم نے شایدان (غلاموں) کو خفا کر دیا۔ اگر ایسا ہے تو گویا تم نے خدا کو ناراض کر دیا۔ حضرت ابوبکر یہ سنکر فوراً پلٹے اور ان تینوں سے آکر کہا۔ میرے پیارے بھائیو! کیا میں نے تم کو ناراض کر دیا ہے" انھوں نے جواب دیا "نہیں! ہم خفا نہیں ہیں"۔ اے بھائی! اللہ تعالیٰ تمہاری مغفرت فرمائے [1]

حضرت ابوبکر کے انفاقِ مال کی اہمیت

اسلام اس وقت حد درجہ غریب اور بے برگ و نوا تھا ایک طرف ان غلاموں کے استقلال اور ان کی پامردی نے مکہ کی سرزمین میں اسلام کے قدم جمائے تو دوسری جانب حضرت ابوبکر نے اللہ کی راہ میں اپنی دولت خرچ کر کے ان قدموں میں توانائی اور مضبوطی پیدا کی چنانچہ جیسا کہ تم نے ابھی دیکھا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم جہاں ان غلاموں کی دل جوئی اور دل دہی فرماتے تھے حضرت ابوبکر کے انفاق مال کی اہمیت کا بھی سپاس گزارانہ اعتراف کرتے تھے حدیث اور تاریخ و سیر کی کتابوں میں اس قسم کے متعدد مواقع کا ذکر ہے۔ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا۔

ما نفعنی مال احد قط ما	ابوبکر کے مال نے مجھ کو جو نفع پہونچایا ہے کسی
نفعنی مال ابی بکر [2]	اور کے مال نے اتنا نہیں پہونچایا۔

[1] التاج الجامع الاصول ج ۳ ص ۲۲۴ [2] جامع ترمذی مناقب ابی بکر الصدیق۔

ایک دوسرے موقع پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت زیادہ امتنان و تشکر کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا۔

انہ لیس من الناس احدٌ اَمَنُّ علیّ فی نفسہ ومالہ من ابی بکرٍ

"بے شبہ جان و مال کے لحاظ سے ابو بکر سے زیادہ مجھ پر کسی اور کا احسان نہیں ہے۔"

تو حضرت ابو بکر رونے لگے اور عرض کیا "یارسول اللہ! یہ جان اور مال کیا کسی اور کیلئے بھی ہے"[1]

قرآن مجید کا اعتراف اسی بنا پر خود قرآن نے اُن مخلصوں کو جو فتح مکہ سے قبل اپنے جان و مال سے اسلام کی مدد کرتے تھے (اور کوئی شبہ نہیں کہ ان میں حضرت ابو بکر کا نام سرِ فہرست ہے) اُن لوگوں کے مقابلہ میں خاص عظمت و برتری کا مستحق قرار دیا ہے جو فتح مکہ کے بعد ایسا کرتے تھے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

لَا یَسْتَوِیْ مِنْکُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ اُولٰٓئِکَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِیْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقَاتَلُوْا۔ (سورۃ الحدید)

تم میں سے وہ لوگ جو فتح مکہ سے پہلے خرچ کرتے تھے اور قتال کرتے تھے وہ درجہ کے اعتبار سے بہت بڑے ہیں اُن لوگوں سے جنھوں نے فتح مکہ کے بعد خرچ کیا اور قتال کیا۔

حضرت ابو بکر جب اسلام لائے تھے ان کے پاس چالیس ہزار درہم تھے لیکن جب مدینہ پہونچے ہیں تو صرف پانچ ہزار درہم رہ گئے تھے[2] باقی رقم سب کی سب اللہ کے راستہ میں خرچ کر دی۔

حضرت عائشہ کے ساتھ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح قریش آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جن جن طریقوں سے ستا رہے تھے اُن سب کے باوجود آپؐ کی زوجہ محترمہ حضرت خدیجہ جو قریش کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتی تھیں اور ابو طالب جو آپؐ کے چچا تھے اور

[1] کنز العمال ج ۶ ص ۳۱۶ [2] اصابہ مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ج ۲ ص ۸۳۱

قریش میں بڑی بااثر شخصیت رکھتے تھے ان دونوں کے وجود سے آپ کو بڑی قوت اور دلجمعی تھی لیکن سنا ؁ نبوی میں چند روز کے آگے پیچھے سے دونوں کی وفات ہوگئی طبعی طور پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حادثہ کا اس قدر ملال ہوا کہ آپ اس سال کو عام الحزن یعنی غم کا سال کہتے تھے اور اکثر اداس اور غم گین نظر آتے تھے۔ اسی اثنا میں خولہ بنت حکیم نے حضرت عائشہ کے ساتھ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح کی تحریک کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک خواب کے ذریعہ اس قران السعدین کی اطلاع پہلے ہی دی جا چکی تھی[1] اس لئے آپ راضی ہوگئے۔ اب خولہ نے حضرت عائشہ کی والدہ ام رومان سے اس کا ذکر چھیڑا انھوں نے حضرت ابوبکر سے تذکرہ کیا۔ وہ بولے کہ میں جبیر بن مطعم کو زبان دے چکا ہوں لیکن جب جبیر بن مطعم سے اس معاملہ میں بات چیت کی گئی تو اس نے انکار کر دیا۔ اب حضرت ابوبکر آزاد تھے۔ چنانچہ آپ نے چار سو درہم پر حضرت عائشہ کا نکاح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کر دیا۔ اس وقت صرف نکاح ہوا تھا اور حضرت عائشہ کی عمر چھ[6] برس کی تھی۔ غرض کہ اس رشتۂ مصاہرت کے قائم ہو جانے سے حضرت ابوبکر صدیق کی نسبی شرف و مجد میں ایک اور تمغۂ زرین کا اضافہ ہوا اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے ایک ایسی رفیقۂ حیات کا انتظام ہوگیا جو آگے چل کر اسلامی احکام و مسائل کی تشریح و توضیح اور دینِ حق کی تبلیغ و اشاعت میں آپ کی دست و بازو ثابت ہوئیں۔

[1] صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۵۱

ہجرتِ مدینہ

مدینہ میں اسلام کی مقبولیت | اسلام کا جو آفتاب جہاں تاب مکہ کے افق سے طلوع ہوا تھا اس کی کرنیں مدینہ کو منور کرنے لگی تھیں۔ یہاں سے مختلف قبیلوں کے لوگ جو ہر سال حج کرنے کیلئے مکہ معظمہ آتے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے پاس پہونچکر قرآن مجید کی آیتیں سناتے اور دین حق کی دعوت دیتے۔ اکثر موقعوں پر حضرت ابوبکر بھی ہمراہ ہوتے۔ یہ لوگ یہودیوں کے ساتھ اختلاط و ارتباط رکھنے کی وجہ سے دینِ الٰہی کے تصور سے بے بہرہ نہیں تھے اور ساتھ ہی توراۃ کی پیش گوئی کے باعث ایک پیغمبر موعود کی بعثت کے منتظر تھے اس بنا پر اب انھوں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا اور آپ کی زبانِ حق ترجمان سے قرآن مجید سُنا تو ان کو اسلام کی دعوت قبول کرنے میں زیادہ پس و پیش نہیں ہوا بلکہ انھوں نے جلدی اس لئے کی کہ کہیں مدینہ کے یہودی اس سعادت اندوزی میں ان پر سبقت نہ لے جائیں یہ حجاج خود مسلمان ہوتے تھے اور پھر چونکہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُنکی خواہش کے مطابق اپنے مبلغین بھی مدینہ میں بھیجنے شروع کر دئے تھے جو وہاں رہکر دینِ حق کی نشر و اشاعت کا فرض انجام دے رہے تھے اس بنا پر اسلام جو خود اپنے وطن میں غریب الوطن تھا مدینہ کی سرزمین میں سرسبز و شاداب ہو رہا تھا اور وہاں روز بروز اسکی مقبولیت و پذیرائی بڑھتی جارہی تھی۔

قریش کا ناپاک منصوبہ | قریش نے جب دیکھا کہ اب تک انھوں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے جاں نثاروں کو ستانے۔ ڈرانے اور پریشان کرنے کی جتنی بھی تدبیریں کی ہیں اُن

میں سے ایک تدبیر بھی کارگر نہیں ہوئی۔ یہاں تک کہ تین برس تک آلِ ہاشم شعبِ ابی طالب میں محصور رہے اور اس مدت میں بھوک اور پیاس کی کوئی تکلیف ایسی نہ تھی جو انھوں نے اٹھائی نہ ہو۔ مگر اس کا نتیجہ بھی کچھ نہیں نکلا۔ بلکہ اور الٹا اثر یہ ہو رہا ہے کہ اسلام مدینہ میں پھیل رہا ہے اور اپنی جڑیں مضبوط کرتا جا رہا ہے تو اب ان لوگوں نے دارالندوہ میں جو اُن کا دارالمشورہ تھا اپنا ایک اجتماع کیا اور باہم مشاورت کی کہ اب انہیں کیا کرنا چاہیئے۔ اس اجتماع میں نامور زعمائے قریش شریک تھے۔ مختلف رائیں پیش ہوئیں آخر ابو جہل نے کہا: "ہر قبیلہ سے ایک ایک آدمی چنا جائے اور سب لوگ ایک ساتھ مل کر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر تلواروں سے حملہ کر کے ان کا کام تمام کر دیں، اس صورت میں ان کا خون تمام قبیلوں میں بٹ جائیگا اور آلِ ہاشم کے لئے ان کا اکیلے مقابلہ کرنا آسان نہ ہوگا۔"

اس رائے پر سب کا اتفاق ہو گیا۔

ہجرت نبوی کے لئے حکمِ ربانی کا انتظار

ادھر مدینہ میں اسلام کی پذیرائی کی وجہ سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اکثر جاں نثاروں کو پہلے ہی مدینہ کی ہجرت کا حکم دے دیا تھا اور اکثر صحابہ وہاں جا کر آباد ہو گئے تھے۔ حضرت ابو بکر صدیق بھی مدینہ پہونچنے کی جلدی کر رہے تھے لیکن ان کی قسمت میں رفیقِ غارِ ثور ہونے کی سعادت لکھی تھی اس بنا پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم انہیں ٹال رہے تھے اور خود اپنے لئے حکمِ خداوندی کے منتظر تھے۔ آخر وہ وقت بھی آ گیا۔ ادھر دارالندوہ میں یہ قرارداد منظور ہو رہی تھی کہ رحمتِ عالم کے وجودِ مسعود سے عالم کو محروم کر دیا جائے اور ادھر ربّ السمٰوٰت والارض نے اپنے حبیب پاک کو یہاں سے ہجرت کر جانے کا حکم دیا اور اعلان کر دیا "اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ" اگر تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مدد نہیں کرتے تو نہ کرو اللہ اُن کی مدد کرے گا۔ امام بخاری نے حضرت عائشہ کی زبانی یہ پوری داستان بڑی تفصیل سے سنائی ہے۔ چونکہ اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ عظمت و توکل علی اللہ، اور حضرت ابو بکر صدیق کی ذاتِ اقدس

کے ساتھ غیر معمولی محبت اور شیفتگی اور ساتھ ہی حسن انتظام ۔ نفاست پسندی اور لطافت طبع پر روشنی پڑتی ہے اس لئے ہم اس کو بعینہ نقل کرتے ہیں ۔ اصل روایت میں کہیں کہیں دوسری روایات سے مدد لیکر اضافہ بھی کر دیا گیا ہے تاکہ پورا واقعہ ایک ہی جگہ آجائے۔

یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ حضرت عائشہ اگرچہ اس وقت کم سن تھیں لیکن ظاہر ہے ان کی یہ روایت گویا خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا حضرت ابوبکر صدیق کی روایت ہے۔[1]

حضرت عائشہ فرماتی ہیں۔

حضرت ابوبکر کی ہجرت کی نیت سے تیاری

" جب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں سے فرمایا کہ مجکو تم لوگوں کا مقام ہجرت دکھا دیا گیا ہے اور وہ ایسا اور ایسا ہے تو بہت سے لوگوں نے مدینہ جانا شروع کر دیا یہاں تک کہ جو مسلمان حبش چلے گئے تھے انہوں نے بھی وہاں سے واپس آکر مدینہ کا رخ کیا ۔ حضرت ابوبکر نے بھی تیاری کر لی لیکن آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا " ابھی ذرا ٹھہرو " میں امید کرتا ہوں کہ مجھ کو عنقریب اجازت ملے گی ۔ ابوبکر بولے " میرا باپ آپ پر قربان ! کیا آپ کو اس کی امید ہے ؟ ارشاد ہوا " ہاں " یہ سنکر حضرت ابوبکر نے طے کر لیا کہ بس اب وہ حضور پرنور کے ساتھ ہی چلیں گے ، ان کے پاس دو اونٹنیاں تھیں ان کو چار مہینے پہلے سے ببول کی پتیاں کھلانا شروع کر دیں تاکہ سفر ہجرت میں کام آئیں ۔

ہجرت کے لئے روانگی

چار مہینے اسی طرح گزر گئے ایک دن دوپہر کا وقت تھا ۔ ہم سب لوگ اپنے گھر میں بیٹھے تھے کہ ایک شخص نے حضرت ابوبکر سے کہا " وہ دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سر ڈھانکے ہوئے تشریف لا رہے ہیں ۔ یہ وقت تو حضور کے یہاں آنے کا نہیں ہے حضرت ابوبکر نے سرکار دو عالم کو دیکھا تو بولے " میرے ماں باپ آپ پر قربان ! اس ناوقت آپ

---

[1] چنانچہ امام بخاری نے باب مناقب المہاجرین وفضلہم کے ماتحت واقعات ہجرت سے متعلق خود حضرت ابوبکر کی بیان کردہ ایک طویل روایت نقل کی ہے ہم نے یہ روایت اور حضرت عائشہ رضہ کی بیان کردہ روایت جو امام بخاری نے باب ہجرۃ النبی واصحابہ الی المدینۃ کے ماتحت بیان کی ہے ان دونوں کو ملا کر ہجرت کی روئیداد مرتب کی ہے ۔

ضرور کسی اہم کام کے لئے تشریف لا رہے ہیں۔ اتنے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پہونچ ہی گئے، دروازہ پر کھڑے ہو کر اجازت مانگی، اجازت دیدی گئی تو آپ گھر میں داخل ہوئے اور حضرت ابوبکر سے فرمایا "جو لوگ اس وقت تمہارے پاس ہیں ان کو ہٹا دو" حضرت ابوبکر نے جواب دیا "حضور! یہاں آپ کا غیر کون ہے" اب آپ نے فرمایا "مجھ کو ہجرت کا حکم مل گیا ہے۔ حضرت ابوبکر نے پوچھا "تو میں بھی ساتھ چلوں گا؟" ارشاد ہوا "ہاں" اب حضرت ابوبکر نے کہا "تو آپ میری ان دو اونٹنیوں میں سے کوئی ایک اونٹنی لے لیجئے"۔ ارشاد ہوا۔ "اچھا! مگر قیمت کے ساتھ"[1]

اب جلدی جلدی سفر کی تیاری ہونے لگی۔ کئی دن کی راہ تھی اس کے لئے کھانا پکا کر ناشتہ دان (سُفرہ) میں رکھا گیا۔ ناشتہ دان کے مُنہ پر باندھنے کے لئے کچھ نہیں تھا حضرت ابوبکر کے حکم سے ان کی بڑی صاحبزادی حضرت اسماءؓ نے اپنے نطاق یعنی کمربند[2] (پٹکہ) کے دو ٹکڑے کئے اور اس سے ناشتہ دان کا مُنہ باندھا۔ اسی بنا پر اُن کو ذات النطاقین کہا جاتا ہے۔

غارِ ثور میں پوشیدگی ادھر دارالندوہ کی قرارداد کے مطابق قریش کے لوگوں نے جو قتل کے ارادے سے آئے تھے سرِ شام پہونچکر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کا محاصرہ کر لیا تھا قریش زنان خانہ میں گھسنا بہت معیوب سمجھتے تھے اس لئے اس تاک میں تھے کہ حضورؐ باہر تشریف لائیں گے تو یہ اپنا منصوبہ پورا کریں گے حضورؐ کے پاس بہت سے لوگوں کی امانتیں

---

[1] غور کرو حسنِ معاملہ کی انتہا ہے کہ اس نازک وقت میں بھی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ابوبکر ایسے جاں نثار کی اونٹنی کو مفت میں قبول کر لینے کے لئے تیار نہیں اور ادھر حسنِ ادب واطاعت کی حد یہ ہے کہ حضرت ابوبکر کو قیمت لینے میں انکار نہیں چنانچہ واقدی کے بیان کے مطابق اس اونٹنی کی قیمت آٹھ سو درہم تھی۔ [2] نطاق کے معنی پٹکہ ہیں اور عرب میں عام دستور تھا کہ عورتیں پٹکہ باندھتی تھیں تعجب ہے کہ مولانا عبداللہ العمادی نے کیونکر نطاق کا ترجمہ دوپٹہ لکھدیا ہے (دیکھو ترجمہ طبقات ابن سعد جزء ثانی حصہ اول ص ۵) حالانکہ دوپٹہ کے لئے عربی میں خمار کا لفظ بولا جاتا ہے۔

تھیں ان کی واپسی کا انتظام کرنا ضروری تھا۔ اس لئے وہ سب حضرت علی کے سپرد کیں[1] اور رات کا ایک حصہ گزر جانے کے بعد جب ان محاصرین کی پلک جھپک گئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مکان سے نکل کر حضرت ابوبکر کے گھر پہونچے[2] اور وہاں سے دونوں نے مکہ کو الوداع کہا اور روانہ ہوگئے۔ مکہ سے تین میل بجانب جنوب ایک پہاڑ ہے جس کا نام ثور ہے یہاں پہونچے اور ایک غار میں رُوپوش ہوکر بیٹھ گئے۔ غار میں تین شب قیام رہا۔ حضرت ابوبکر کے صاحبزادہ عبداللہ جو نوجوان مگر نہایت فہیم اور سمجھ دار تھے وہ شب غار میں بسر کرتے تھے اور علی الصباح منہ اندھیرے مکہ آکر قریش سے گھُل مِل جاتے تھے یہاں قریش میں باہم جو مشورہ یا منصوبہ ہوتا اسے محفوظ کر لیتے اور جب اندھیرا ہو جاتا پھر غارِ ثور پہونچکر دونوں کو اس سے باخبر کر دیتے تھے۔ ابن سعد نے لکھا ہے کہ عبداللہ بن ابی بکر گھر سے کھانا بھی لاتے تھے۔ عامر بن فہیرہ حضرت ابوبکر صدیق کے آزاد کردہ غلام تھے۔ یہ رات گئے بکری چرا کر لاتے اور رفیقانِ غارِ ثور دونوں اُس پر گزارہ کرتے۔ مُنہ اندھیرے عامر بن فہیرہ نکل جاتے اور شام ہونے پر پھر واپس آجاتے تینوں دن یہی معمول رہا۔

ادھر صبح کے وقت قریش کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بچ نکلنے کی خبر ہوئی تو انہیں اپنے منصوبہ کی ناکامی کا بے حد افسوس ہوا اور بڑے جز بز ہوئے چاروں طرف آپ کی تلاش میں آدمی دوڑا دئیے یہاں تک کہ ایک مرتبہ غار کے دہانہ تک پہونچ گئے ان کی آہٹ پاکر حضرت ابوبکر کو بڑی تشویش ہوئی اور عرض کیا "حضور! یہ لوگ اگر اپنے قدموں کی طرف دیکھیں تو ہم ان کو نظر آجائیں گے۔ سرکارِ دو عالم نے فرمایا۔

---

[1] طبقات ابن سعد تذکرہ حضرت علی۔ [2] بخاری میں صرف آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر کے خروج من مکہ کا ذکر ہے۔ لیکن واقدی کا بیان ہے کہ حضرت ابوبکر کے مکان کی پُشت میں جو کھڑکی تھی یہ خروج اُس سے ہوا تھا۔ ہم نے دونوں بیانات کو جمع کر دیا ہے۔

ماظنک یا ابابکر باثنین اللہ ثالثہما[1]۔ اے ابوبکر! اُن دو کے متعلق تمہارا گمان کیا ہے جن کا تیسرا ساتھی اللہ ہو۔

عبداللہ بن اریقط جو عبد بن عدی کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور مسلمان نہیں ہوا تھا مگر اس کی امانت و دیانت پر اعتماد تھا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے ہی رہنمائی کے لئے اُس کو اُجرت پر مقرر کر لیا تھا اور دونوں اونٹنیاں اس کے حوالہ کر دینے کے بعد اس سے یہ بات طے کر لی تھی کہ وہ تین شب گزرنے کے بعد صبح کو اونٹنیاں لیکر غار ثور پر پہونچ جائیگا۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔ اب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم۔ حضرت ابوبکر اور عامر بن فہیرہ۔ عبداللہ بن اریقط کی رہنمائی میں روانہ ہوئے۔

ایک دن اور ایک رات مسلسل چلنے کے بعد دوسرے دن دوپہر کے وقت دھوپ بہت تیز ہوگئی تو حضرت ابوبکر نے چاروں طرف نظر دوڑائی کہ کہیں کوئی سایہ ملے تو وہاں ٹھہریں۔ اتفاق سے ایک چٹان نظر آئی اس کے نیچے سایہ تھا۔ حضرت ابوبکر نے اس جگہ کو ہموار کیا۔ فرش بچھایا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے استراحت فرمانے کی درخواست کی۔ حضور لیٹ گئے اب حضرت ابوبکر یہ دیکھنے نکلے کہ کہیں کوئی شخص تعاقب میں تو نہیں آرہا ہے۔ یہ اس تلاش میں اِدھر اُدھر پھر ہی رہے تھے کہ ایک چرواہا نظر آیا جو سایہ کی جستجو میں اسی چٹان کی طرف اپنی بکریاں ہانکے چلا آرہا تھا۔ حضرت ابوبکر نے پوچھا "تم کون ہو"؟ اس نے قریش کے ایک آدمی کا نام لیا جس کو حضرت ابوبکر پہچانتے تھے اور کہا کہ میں اُس کا نوکر ہوں" حضرت ابوبکر نے پوچھا "تیری بکریوں میں دُودھ ہے؟ وہ بولا "ہاں" پھر دریافت کیا "کیا تو ہمارے لئے دُودھ دودھ دے گا"؟ اُس نے کہا "جی ہاں"

اب لڑکے نے حضرت ابوبکر کی فرمائش پر دودھ دوہنے کے لئے ایک بکری کو اپنے قابو میں کیا تو حضرت ابوبکر نے (ازراہِ نفاست پسندی وحُبِ نبویؐ) کہا کہ پہلے ان تھنوں کو

---

[1] بخاری ج ۱ ص ۵۱۶ (باب مناقب المہاجرین)

غبار سے تو پاک و صاف کرلے اُس کے بعد خود اس سے کہا کہ تیرے ہاتھ غبار آلود ہیں ان کو بھی جھاڑ اور ساتھ ہی اپنا ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ پر مار کر بتایا کہ اس طرح۔ لڑکے نے جب ایسا کر لیا تو اس نے دودھ دوھا۔ حضرت ابو بکر خاص آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک چمڑہ کا برتن لیکر آئے تھے۔ دُودھ اس میں انڈیلا۔ برتن پر کپڑا باندھا۔ اور اُسے لیکر خدمتِ اقدسؐ میں حاضر ہوئے۔ اس وقت آپ کچھ نیند لے کر بیدار ہو چکے تھے۔ عرض کیا "حضور دُودھ پی لیں" آپؐ نے درخواست قبول فرمائی تو حضرت ابو بکر کے دل کی باچھیں کھل گئیں اب حضرت ابو بکر نے کہا "یا رسول اللہؐ چلنے کا وقت ہوگیا ہے"۔ ارشاد ہوا "بہت بہتر"! چنانچہ اب یہاں سے روانگی شروع ہوگئی۔

سراقہ بن جعشم کا واقعہ ادھر اُدھر تلاش کے بعد جب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر کا کہیں پتہ نہیں چلا تو قریش نے چاروں طرف قاصد روانہ کر کے اعلان کرا دیا کہ جو کوئی شخص آں حضرتؐ یا حضرت ابو بکر کو قتل کرے گا یا زندہ گرفتار کرے گا اُس کو فی کس ایک خوں بہا (سو اونٹ) کے برابر انعام دیا جائے گا۔ سراقہ بن جعشم جو بنو مدلج سے تعلق رکھتا تھا اس نے یہ اعلان سنا تو ایک شخص کے آنا پتہ بتانے پر وہ گھوڑے پر بیٹھ اور نیزہ ہاتھ میں لے ان دونوں کی تلاش میں چل پڑا۔ گھوڑا دوڑاتا ہوا چلا آرہا تھا کہ گھوڑے کے ٹھوکر لگی اور گر پڑا۔ اب اُس نے ترکش سے فال کے طور پر تیر نکالے کہ مجھ کو تعاقب کرنا چاہیئے یا نہیں؟ جواب مرضی کے مطابق نہیں نکلا۔ مگر لالچ بُری بلا ہے وہ پھر دوبارہ گھوڑے پر سوار ہوا اور بالکل ہی قریب پہونچ گیا حضرت ابو بکر نے اُسے دیکھا تو گھبرا کر بولے "یا رسول اللہؐ! یہ ہماری طلب میں آگیا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا (توبہ) [1] گھبراؤ نہیں! اللہ بے شبہ ہمارے ساتھ ہے۔

---

[1] یہ الفاظ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غارِ ثور میں بھی کہے تھے جیسا کہ قرآن میں صاف طور پر مذکور ہے۔ اس لئے روایات میں ان دونوں موقعوں کے لئے یہ الفاظ ملتے ہیں۔ البتہ قرآن نے صرف واقعۂ غارِ ثور کا ذکر کیا ہے (باقی ص۲۴ پر)

خود سراقہ کا جو بعد میں مسلمان ہوگیا تھا۔ بیان ہے کہ میں ان دونوں کے اس قدر قریب پہونچ گیا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ پڑھنے کی آواز سن رہا تھا اور پھر وہ یہ بھی کہتا ہے کہ میں نے اس وقت دیکھا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم التفات نہیں کر رہے تھے۔ لیکن حضرت ابو بکرؓ (فرطِ اضطراب میں) اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے چلتے تھے۔ اب گھوڑے کے دونوں اگلے پاؤں گھٹنوں تک زمین میں دھنس گئے۔ سراقہ نیچے گر پڑا۔ گھوڑے پر چیخا چلّایا۔ گھوڑا چاہتا تھا کہ اُٹھے مگر وہ زمین سے اپنے پاؤں نہیں نکال سکا۔ اس مرتبہ سراقہ نے پھر فال لی اور وہی جواب ملا تو سمجھ گیا کہ یہ کوئی اور ہی معاملہ ہے۔ اب اُس نے امان طلب کی۔ نبیؐ و صدیقؓ کا یہ قافلہ ٹھہر گیا۔ امان پاکر سراقہ پھر سوار ہوا اور یہاں پہنچ کر اس نے قریش کے اعلان اور اُن کی جستجو کی روئیداد سنائی۔ کھانے پینے کا جو سامان اپنے ساتھ لایا تھا وہ پیش کیا اور اپنے لئے ایک پروانۂ امن کا خواستگار ہوا۔ عامر بن فہیرہ نے چمڑہ کے ایک ٹکڑے پر یہ پروانہ لکھ اس کے حوالہ کیا۔

اتفاق سے حضرت زبیرؓ مسلمان تاجروں کے ایک قافلہ کے ساتھ شام سے آرہے تھے۔ یہاں اُن کی ملاقات آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوئی۔ حضرت زبیر نے چند بیش قیمت سفید کپڑے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکرؓ کی خدمت میں پیش کئے۔ یہ پیش کش اس بے سروسامانی کے عالم میں بہت غنیمت تھی۔ ابن سعد نے حضرت زبیرؓ کی بجائے طلحہؓ بن عبید اللہ کا نام لکھا ہے۔ ممکن ہے یہ دونوں واقعے الگ الگ ہوں یا طلحہؓ بن عبید اللہ خود حضرت زبیرؓ کے شریکِ تجارت ہوں۔

اب یہ قافلہ پھر روانہ ہوا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ عمر میں حضرت

(صفحہ ۲۳ سے آگے) اور سراقہ کے واقعہ سے ساکت ہے۔

ابوبکرؓ سے بڑے تھے لیکن صورت شکل سے نسبتہً کم عمر اور جوان اور حضرت ابوبکرؓ بوڑھے نظر آتے تھے۔ تجارت کی تقریب سے چونکہ حضرت ابوبکرؓ کا باہر آنا جانا رہتا تھا اس لئے راستہ میں اُن کے شناسا ملتے جاتے تھے۔ ان میں سے جو کوئی ان سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق پوچھتا کہ یہ کون ہیں؟ وہ توریہ وایہام کی زبان میں جواب دیتے: "یہ میرے راہنما ہیں" [1]

[1] صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۵۶

مدینہ طیبہ میں ابتدائی زندگی

کوکبۂ نبویؐ کا مدینہ میں داخلہ

مکہ سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روانگی کی خبر مدینہ میں پہنچ چکی تھی اور یہاں آپ کی آمد آمد کا غلغلہ بلند تھا۔ انصار کا بچہ بچہ ہمہ تن چشم شوق بنا ہوا تھا۔ مدینہ سے تین میل کے فاصلہ پر ایک بالائی آبادی ہے جسکو حرۃ یا قبا کہتے ہیں دیوانگان جمال محمدیؐ صبح سویرے یہاں پہونچ جاتے اور گردن اٹھا اٹھا کر دیکھتے کہ کوکبۂ نبوی کے راستہ کی اڑتی ہوئی گرد نظر آجائے تو چشم انتظار کے لئے اس کو توتیا بنا کر رکھ لیں۔ دوپہر کو جب دھوپ تیز ہو جاتی تو حسرت و افسوس کے ساتھ گھر واپس لوٹ جاتے، روز کا۔ یہی معمول تھا۔ ایک دن اسی طرح گھر واپس آچکے تھے کہ ایک یہودی جو ایک اونچے ٹیلہ پر سے کھڑا دیکھ رہا تھا اچانک اس کی نگاہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے رفقا پر پڑی جو سفید لباس زیب تن کئے ہوئے تھے اس سے ضبط نہ ہو سکا اور بیساختہ پکارا "لو اے عرب کے لوگو! جن کا تم کو انتظار تھا وہ آگئے"۔ انصار نے سنا تو جوش مسرت میں قابو سے باہر ہو گئے اور ہتھیار سج سجا استقبال کیلئے آگے بڑھے۔ حرۃ کی پشت پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات ہوئی۔ یہاں عمرو بن عوف کا ایک ممتاز خاندان آباد تھا۔ شہنشاہ دو عالم نے سب سے پہلے اس کو ہی میزبانی کا شرف عطا فرمایا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو سواری سے اتر کر خاموش بیٹھ گئے۔ حضرت ابوبکر لوگوں سے بات چیت کے لئے کھڑے رہے انصار کے جن لوگوں نے اب تک آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں دیکھا تھا وہ آتے تھے

توحضرت ابوبکر کو ہی پیغمبر آخرالزماں سمجھ کر سلام کرتے تھے۔ اتنے میں دھوپ ذرا تیز ہوگئی تو حضرت ابوبکر صدیق آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی چادر کا سایہ کرکے کھڑے ہوگئے اس سے ان لوگوں کو معلوم ہوا کہ درصل ان کا گوہر مقصود کون ہے۔[۱]

امام بخاری کی روایت کے مطابق آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قبا میں قیام چودہ دن رہا۔ یہیں آپ نے وہ مسجد تعمیر کی جس کا ذکر قرآن مجید میں "لمسجد اُسس علی التقوی" کے عنوان سے ہے۔

ورودِ مدینہ کی تاریخ حافظ ابن حجر کے بیان کے مطابق آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم دوشنبہ کے دن مکہ سے روانہ ہوکر تین دن غار ثور میں رہے اور پنجشنبہ کو یہاں سے روانہ ہوئے امام بخاری نے ورودِ قبا کا دن دوشنبہ اور مہینہ ربیع الاوّل کا بتایا ہے۔ لیکن تاریخ میں اختلاف ہے کسی نے پہلی یا دوسری۔ کسی نے سات۔ کسی نے بارہ۔ کسی نے تیرہ۔ اور کسی نے پندرہ تاریخ لکھی ہے۔[۲] لیکن یہ ظاہر ہے کہ امام بخاری کی روایت کے مطابق اگر دن دوشنبہ کا متعین ہوجائے جیسا کہ مولانا شبلی نے لکھا ہے کہ جدید حساب سے بھی یہی دن بیٹھتا ہے۔[۳] تو ان مذکورہ بالا تاریخوں میں سے کوئی ایک تاریخ بھی درست نہیں ہوسکتی۔ پروفیسر فلپ ہٹی نے سن عیسوی کے لحاظ سے ۲۴ ستمبر ۶۲۲ء تاریخ لکھی ہے۔[۴]

قبا میں دو ہفتہ قیام کے بعد آپ اور حضرت ابوبکر شہر مدینہ کے لئے روانہ ہوئے اور حضرت ابوایوب انصاری کو شرف میزبانی عطا فرمایا۔ لیکن حضرت ابوبکر صدیق نے مدینہ کے قریب دجار میں سُنح نام ایک جگہ ہے وہاں خارجہ بن زید بن ابی زہیر کے پاس قیام کیا اور یہیں تجارت کا کاروبار پھر شروع کردیا۔ بعد میں خارجہ کی بیٹی حبیبہ سے نکاح بھی کرلیا اور ایک مستقل مکان

---

[۱] بخاری ج ۱ ص ۵۵۹ [۲] حاشیہ ۳ صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۵۵ [۳] سیرت النبی ج ۱ ص ۲۷۷ حاشیہ نمبر ۲

[۴] عربوں کی تاریخ چوتھا اڈیشن ص ۱۱۶

میں رہنے لگے چند روز کے بعد حضرت ابو بکر کی بیوی ام رومان۔ اُن کے صاحبزادہ حضرت عبداللہ اور صاحبزادیاں حضرت اسماء اور حضرت عائشہ بھی مدینہ پہونچ گئے۔ حضرت ابو بکر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد چھ ماہ تک اسی جگہ رہتے رہے[1]

مدینہ کی آب و ہوا کی عدم موافقت اور دعاء نبویؐ

یہاں پہونچنے کے کچھ دنوں کے بعد حضرت ابو بکر شدید تپ لرزہ میں مبتلا ہو گئے۔ حضرت عائشہ اس حالت میں باپ کی مزاج پرسی کرنے آئیں تو یہ شعر وردِ زباں تھا۔

كُلُّ امرِئٍ مُصَبَّحٌ فی اهلہ والموت ادنیٰ من شراك نعلہ

ہر شخص اپنے بال بچوں میں دائمی طرب بتیا کر حالانکہ موت اسکے جوتہ کے تسمہ سے بھی زیادہ قریب ہے

حضرت عائشہ گھبرا کر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور باپ کا حال عرض کیا۔ آپؐ نے بارگاہ ایزدی میں دعا کی کہ "اے اللہ تو مدینہ کو بھی ہمارے نزدیک ایسا ہی محبوب بنا دے جیسا کہ مکہ تھا بلکہ اس سے بھی زیادہ یہاں کی آب و ہوا کو صحت بخش کر دے اور یہاں کے ناپ تول میں برکت عطا فرما اور بخار کو یہاں سے منتقل فرما۔[2]

انہیں دنوں میں ایک مرتبہ حضرت عائشہ کو بخار آ گیا تو حضرت ابو بکر بڑے پریشان ہوئے۔ گھر میں آتے بیمار بیٹی کو پیار کرتے اور پوچھتے "بیٹا! تم اب کیسی ہو"؟[3]

حضرت ابو بکر۔ حضرت عائشہ کے علاوہ اور مہاجرین کو بھی مدینہ کی آب و ہوا موافق نہیں آئی تھی۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کا اثر یہ ہوا کہ آج مدینہ طیبہ پورے حجاز میں آب و ہوا کے لحاظ سے بہترین جگہ ہے۔

عقد مواخات | مہاجرین جو محض اللہ کے راستہ میں اپنا وطن۔ گھر بار سب کچھ چھوڑ کر گئے تھے مدینہ میں بے خانماں تھے ٹھہرنے کا ٹھکانہ تو کسی کا بھی نہ تھا۔ بہت سے تہیدست و

[1] طبقات ابن سعد تذکرۂ حضرت ابو بکر [2] بخاری ج ا ص ۵۵۹ [3] بخاری ج ا ص ۵۵۷

بے ساز و سامان بھی تھے اہلِ مدینہ جو بعد میں انصار کہلائے انھوں نے ان راہِ حق کے پردیسیوں کی مہمان داری جس فیاضی اور عالی حوصلگی کیساتھ کی ہے وہ تاریخ کا مشہور واقعہ ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ پہونچکر مہاجرین اور انصار دونوں میں باہمی مواخات کا رشتہ قائم کیا۔ یعنی ایک کو دوسرے کا بھائی بنا دیا۔ یہ بھائی سگے بھائیوں سے بھی بڑھ چڑھ کر تھے۔ انصار نے یہاں تک کیا کہ ایک انصاری اپنے بھائی مہاجر کو گھر لے گئے اور اپنی تمام جائداد و املاک کا جائزہ دینے کے بعد بولے "اب میری ہر چیز آدھی میری ہے اور آدھی تمہاری۔ یہاں تک کہ دو بیویاں تھیں۔ تو بولے کہ ایک کو طلاق دیتا ہوں تم اس سے عدت کے بعد نکاح کر لینا۔ مہاجر بھائی نے جواب دیا" آپ کی جائداد و املاک اور بیویاں آپ کو مبارک! مجھ کو ان میں سے کچھ درکار نہیں غرض کہ اس عقدِ مواخات کے ماتحت مہاجرین کی آبادکاری کا مسئلہ بڑی آسانی سے حل ہوگیا۔

عقدِ مواخات قائم کراتے وقت آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم طرفین کی حیثیت کا لحاظ رکھتے تھے۔ چنانچہ حضرت عمر فاروق کو عتبان بن مالک جو قبیلۂ بنو سالم کے سردار تھے ان کا بھائی قرار دیا اور حضرت ابوبکر صدیق کو حضرت خارجہ بن زید انصاری جو مدینہ سے قریب ایک مقام سنح میں قیام رکھتے تھے اور تجارت پیشہ تھے ان کا بھائی بنایا [1]

تعمیر مسجد مدینہ طیبہ پہونچنے کے بعد ضروری تھا کہ ایک مسجد تعمیر کی جاتی تاکہ سب مسلمان ایک ساتھ جمع ہو کر عبادتِ خداوندی بجا لاتے اور جہاں اور دوسرے اہم دینی اور اجتماعی امور کا بھی فیصلہ ہوتا۔ اس مقصد کے لئے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین کا جو ٹکڑا منتخب کیا وہ سہل اور سہیل نام کے دو یتیم بچوں کی ملکیت تھا۔ یہ بچے سعد بن زرارہ کی سرپرستی میں تھے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قطعۂ زمین کا معاملہ

[1] مقدمۂ فتح الباری ص ۳۲۱

کیا تو دونوں نے کہا " یہ آپ کی نذر ہے۔ اے اللہ کے رسولؐ! لیکن آپ نے نذر قبول کرنے سے انکار فرمایا اور آخر قیمتہً اس کو خرید کر لیا[1] قطعۂ زمین کی یہ قیمت جو بعض روایات کے مطابق دس دینار تھی۔ اس کے ادا کرنے کی سعادت بھی حضرت ابو بکر صدیق کو حاصل ہوئی۔ آپ نے صرف قیمت ہی ادا نہیں کی بلکہ جب سرورِ دو عالم خود مزدوروں کی طرح تعمیر مسجد کے کام میں شریک تھے اور اینٹیں اٹھا اٹھا کر دے رہے تھے تو یہ کیونکر ممکن تھا کہ رفیقِ غارِ ثور اُس میں آپ کا شریک نہ ہوتا۔[2]

حضرت عائشہؓ کی رخصتی پہلے گزر چکا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح حضرت عائشہ کے ساتھ مکہ میں ہو چکا تھا۔ اب مدینہ پہونچنے کے بعد حضرت ابو بکر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خود رخصتی کی درخواست کی تو آپ نے فرمایا "میرے پاس مہر ادا کرنے کو نہیں ہے" حضرت ابو بکر نے مہر کی رقم خدمتِ اقدس میں حاضر کر دی۔[3] ادر ادھر حضرت ام رومان نے حضرت عائشہ کو نہلا دھلا اور نہایت سادہ طریقہ پر دُلہن بنا کر حرم نبوی میں داخل کر دیا اس وقت حضرت عائشہ کی عمر خود اُن کے بیان کے مطابق نو سال تھی۔[4]

[1] صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۵۵ [2] فتح الباری ج ۷ ص ۱۹۳ [3] مستدرک حاکم واستیعاب بحوالہ ازالۃ الخفا ج ۲ ص ۱۱ [4] بخاری باب تزویج عائشہ

غزوات میں شرکت اور دوسرے کارنامے قبل از خلافت

مکہ کی زندگی مصائب و آلام کا مرقع تھی حلقہ بگوشانِ اسلام عبادتِ خداوندی کھلے بندوں کیا بجالا سکتے انھیں سانس لینا بھی مشکل تھا۔ طرح طرح کی اذیتیں دی جاتی تھیں۔ قسم قسم کے بھیانک اور درد انگیز مظالم کئے جاتے تھے لیکن بہر حال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو انھیں مصائب و آلام کی بھٹی سے گذار کر کندن بنانا تھا اور ان سے تزکیۂ نفس تطہیر قلب اور مسلمانوں کو ایمان میں مستحکم اور عمل میں پختہ کار بنانے کا کام لینا تھا۔ اس بنا پر اس دور میں صرف کامل انقیاد و اطاعت۔ صبر و تسلیم اور ضبطِ نفس جیسے اوصاف و کمالات درکار تھے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں جتنی مکی سورتیں ہیں ان میں جگہ جگہ استعانت بالصبر والصلوٰۃ اور مصائب کے وقت رجوع الی اللہ کی تعلیم دی گئی ہے۔

لیکن اب مدینہ طیبہ پہونچکر وہ وقت آیا جبکہ اسلام کی پہلی اسٹیٹ قائم ہو رہی تھی۔ اس اسٹیٹ کے ماتحت مسلمانوں کو دشمنوں سے جنگ کرنی تھی۔ اپنی منتشر طاقتوں کی شیرازہ بندی کرنی تھی۔ غیر قوموں کے ساتھ معاہدے کرنے تھے اور خود اپنی اجتماعی اور قومی تنظیم کا ایک دستور مرتب کرنا تھا اور چونکہ حضرت ابو بکر تمام معاملات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست راست تھے اس بنا پر اب موقع تھا کہ حضرت ابو بکر کے دوسرے اوصاف و کمالات یعنی اصابتِ رائے حسنِ تدبیر۔ دُور بینی اور دانش وری بھی بروئے کار آئیں۔

چنانچہ ہجرت مدینہ کے بعد سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک جتنے غزوات

ہوئے۔ مہیں پیش آئیں اور اہم معاملات و مسائل سامنے آئے ان سب میں حضرت ابوبکر صدیق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ برابر شریک رہے۔ گو حیثیتیں مختلف تھیں مثلاً میدان رزم میں وہ ایک نہایت بہادر سپاہی نظر آتے ہیں اور مشورہ کے وقت ایک اعلیٰ درجہ کے مشیر اور وزیر باتدبیر ناموافق حالات میں پتھر کی چٹان کی طرح مضبوط اور سازگار حالات میں نہایت حلیم و باوقار۔ یہی دوگونہ اوصاف و کمالات ہیں جن کے اجتماع کے باعث مسٹر ڈبلیو۔ منٹگمری واٹ کے بیان کے مطابق حضرت ابوبکر جہاں ایک طرف اونچے درجہ کے فرماں بردار و مطیع تھے۔ ساتھ ہی ایک بلند پایہ لیڈر اور قائد بھی [1]

غزوۂ بدر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کی ہجرت نے قریش کی آتش غیظ و غضب کو اور مشتعل کر دیا تھا وہ صاف دیکھ رہے تھے کہ مدینہ طیبہ میں ایک ایسی طاقت پیدا ہو رہی ہے جو سارے عرب پر مستولی ہو جائے گی اور ان کا اقتدار ختم کر دیگی اس بنا پر اس طاقت کو ختم کرنے کے لئے جو کچھ بھی وہ کر سکتے تھے اُس کے کرنے میں انھوں نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی مدینہ کے ان لوگوں کو جو ان کے زیر اثر تھے برابر اکساتے رہتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وہاں سے نکال دیں۔ مدینہ کے قرب و جوار میں جو آبادیاں تھیں وہاں اپنی ٹولیاں بھیجتے رہتے تھے کہ اسلام کی دعوت سے جو لوگ متاثر ہو رہے ہیں۔ وہ پریشان ہوں۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کے توڑ میں چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بھیجتے رہتے تھے جن کو ارباب سیر کی اصطلاح میں سرایا کہا جاتا ہے۔

لیکن قریش کو جلد ہی یقین ہو گیا کہ اس طرح کی چھوٹی حرکتوں سے کام نہیں چلے گا۔ اس بنا پر اب انھوں نے بڑے ساز و سامان کے ساتھ مدینہ طیبہ پر حملہ کرنے کا منصوبہ باندھا لیکن اس منصوبہ کو عمل میں لانے کے لئے سب سے مقدم ضرورت سرمایہ کے فراہمی کی تھی

---

[1] انسائیکلو پیڈیا آف اسلام جدید ایڈیشن ج ۱ ص ۱۱۰

اس کے لئے انھوں نے ترکیب یہ کی کہ ابو سفیان (حضرت امیر معاویہ کے والد جو بعد میں مسلمان ہو گئے تھے) کی سرکردگی میں ایک عظیم الشان تجارتی قافلہ شام بھیجا تاکہ اس سے جو آمدنی ہو اس سے دینِ حق کے مٹانے کا کام لیا جائے۔ ادھر سرمایہ کے فراہمی کی یہ تدبیر کی گئی تھی اور ادھر مکہ میں جوانانِ و نبرد آزمایانِ قریش مدینہ پر حملہ کرنے کے جوش میں فوجی تیاریاں کر رہے تھے۔

ابو سفیان شام میں اپنا مقصد حاصل کر لینے کے بعد جب مکہ کے لئے واپس روانہ ہوا ہے تو اس تزک و احتشام کے ساتھ کہ حسب روایات اُس کے جلو میں ایک ہزار اُونٹ تھے جن پر پچاس ہزار دینار لدے ہوئے تھے اور قافلہ چالیس یا ساٹھ آدمیوں پر مشتمل تھا۔

ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ عظیم منافع تجارت درحقیقت گولہ بارود کا ایک میگزین تھا جو صرف اس غرض کے لئے فراہم کیا گیا تھا کہ اس سے اسلام اور اس کے جاں نثاروں کو برباد و ہلاک کیا جائیگا اس بنا پر اس وقت آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے صرف جائز ہی نہیں بلکہ سیاسی اعتبار سے نہایت ضروری تھا کہ اس سامان کو مکہ تک نہ پہونچنے دیا جائے[1]

چنانچہ صحیح بخاری میں ہے۔

[1] سخت تعجب اور حیرت کی بات ہے کہ اتنی سادہ حقیقت مولانا شبلی کی سمجھ میں نہیں آئی اور انھوں نے سیرت النبی جلد اوّل میں غزوۂ بدر پر ایک نہایت مبسوط و مفصل گفتگو کر کے تمام محدثین و ارباب سیر کے خلاف اس واقعہ کی تغلیط کی ہے۔ آج کل کی مہذب دنیا میں کیا نہیں ہوتا؟ فریقِ محارب کے لئے رسل و رسائل اور رسد کے ذرائع بند کر دیے جاتے ہیں۔ اقتصادی ناکہ بندی کی جاتی ہے۔ تجارتی منڈیوں پر بم باری کر کے انہیں برباد کیا جاتا ہے۔ مال سے لدے ہوئے جہاز جہاں کہیں مل جاتے ہیں ان کو لوٹ لیا جاتا ہے۔ قریش نے جب ہجرت کے بعد بھی پیچھا نہیں چھوڑا اور وہ ایک فیصلہ کن جنگ کی تیاری پوری قوت اور بڑے زور شور سے کر رہے تھے اور یہ قافلہ تجارت اسی کا مقدمۃ الجیش تھا تو ان حالات میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ مہم بین الاقوامی قانونِ جنگ کے رُو سے بالکل درست اور حق بجانب تھی اور کوئی شبہ نہیں کہ یہ آپ کی سیاسی بیدار مغزی و دوراندیشی کی روشن دلیل ہے۔

انما خرج رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یُرِیدُ عِیرَ قریش (باب قصۃ غزوۃ بدر) آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے قافلہ کے ارادہ سے نکلے۔

قریش کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو وہ فوجی ساز و سامان کیساتھ لیس تو بیٹھے ہی تھے فوراً مکہ سے روانہ ہو گئے۔ ادھر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے تین سو تیرہ جانبازوں کے ساتھ ۱۲ رمضان ۲ھ کو مدینہ سے روانہ ہوئے اور ۱۷ رمضان کو مقام بدر کے قریب پہونچ کر خیمہ زن ہو گئے۔

یوں تو قریش اور دوسرے قبائل کے ساتھ اس سے پہلے بھی متعدد جھڑپیں ہو چکی تھیں۔ لیکن حق و باطل اور اسلام و کفر کا یہ سب سے پہلا معرکہ تھا جس کے فیصلہ پر تاریخ عالم میں ایک نئے انقلاب کا دارومدار تھا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک طرف قریش کی تعداد اُن کے ساز و سامان اور ان کی جنگی تیاریوں کا جائزہ لیا اور دوسری طرف اسلام کے اُن سر فروش مجاہدوں کو دیکھا جن کے گھوڑوں کو زینیں بھی نصیب نہیں تھیں اور جو تعداد کے لحاظ سے بھی دشمن کے ⅓ حصہ تھے تو بیساختہ جی بھر آیا اور بارگاہِ ایزدی میں قبلہ رُخ ہو کر ہاتھ پھیلا پھیلا کر دعا کی کہ

"اے خدا تو نے مجھ سے جو وعدہ کیا ہے اسے پُورا کر۔ اے خدا اگر مسلمانوں کی یہ جماعت ہلاک ہو گئی تو تیرا پوجنے والا کوئی نہ رہے گا"

آپؐ ہاتھ پھیلا کر یہ دعا کرتے جاتے تھے اور فرطِ بیقراری میں چادر بار بار شانۂ مُبارک سے گر گر پڑتی تھی۔ حضرت ابو بکر نے چادر اٹھائی آپ کے کندھے پر ڈال دی اور اُس کے بعد سرکارِ دو جہاںؐ کی پشت سے لپٹ کر[1] کہنے لگے "حضور! اب بس کیجیے۔!

[1] میں نے یہ واقعہ صحیح مسلم کتاب الجہاد والسیر سے لیا ہے۔ امام بخاری نے بھی اولاً کتاب الجہاد میں اور پھر باب غزوۂ بدر میں اس کو نقل کیا ہے۔ لیکن اس میں "فاخذ ابو بکر بیدہٖ" یعنی ابو بکر نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ پکڑ لیا" کے الفاظ ہیں۔

اللہ تعالیٰ اپنا وعدہ ضرور پورا کرے گا" فوراً وحی آئی اور اذ تستغیثون ربکم فاستجاب لکم انی ممدکم بالف من الملائکۃ مردفین۔ کا مژدۂ جاں فزا سنا گئی۔ بخاری میں ہے کہ حضرت ابوبکر کے یہ کہنے کے بعد ہی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سیھزم الجمع ویولون الدبر۔ کفار کی فوج جلد شکست کھائیگی اور یہ اُلٹے پاؤں واپس جائیں گے۔ فرمایا اور باہر تشریف لے آئے۔

موقع کی نزاکت دیکھ کر صحابۂ کرام نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک سائبان بنا دیا تھا کہ آپ وہاں تشریف رکھیں اور مسلمانوں کو وہاں سے ہدایات دیتے رہیں۔ اس سائبان میں رفاقت اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نگرانی اور حفاظت کا شرف بھی حضرت ابوبکر کو ہی حاصل ہوا۔[1] مسند بزار میں حضرت علی سے روایت ہے کہ اس دن حضرت ابوبکر تلوار نیام سے باہر نکالے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا پہرہ دے رہے تھے جو کوئی حضورؐ کی طرف بڑھتا حضرت ابوبکر اس پر پل پڑتے تھے۔ اس واقعہ کو بیان کرنے کے بعد حضرت علی فرماتے ہیں۔

فھو اشجع الناس تو ابوبکر سب سے زیادہ بہادر انسان ہیں۔

کفر و اسلام کا یہ پہلا معرکہ اس اعتبار سے بڑا صبر طلب اور درد انگیز تھا کہ دونوں فوجیں ایک دوسرے کے مقابلہ میں صف آرا ہوئیں تو اچانک نظر آیا کہ باپ بیٹے کے ساتھ نبرد آزما تھا۔

حضرت ابوبکر کے بڑے بیٹے عبدالرحمٰن اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ اور اس وجہ سے مکہ میں ہی رہ گئے تھے۔ بدر میں قریش کی فوج کے ایک سپاہی وہ بھی تھے۔ انھوں نے میدانِ جنگ میں بڑھ کر پکارا کہ میرے مقابلہ میں کون آتا ہے

---

[1] اسد الغابہ قسم اول جزء ثالث ص ۲۱۲

حضرت ابوبکرؓ خود تلوار کھینچ کر مقابلہ کو نکلے۔ لیکن رحمتِ عالمؐ کو یہ گوارا نہ ہوا۔ فوراً حضرت ابوبکرؓ کو روکا اور فرمایا۔

متعنی بنفسك — تم مجھ کو اپنی ذات سے متمتع ہونے دو[1]

ایک اور روایت میں لا نفجعنا بنفسك کے الفاظ ہیں۔ اُن کا مطلب بھی یہی ہے۔

جنگ ختم ہوئی تو مالِ غنیمت کے علاوہ ستر قیدی ہاتھ آئے جن میں حضرت عباسؓ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد (حضرت زینبؓ کے شوہر) ابو العاص بھی تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مشورہ کیا کہ ان کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے۔ حضرت عمرؓ بولے کہ قیدیوں کو قتل کر دینا چاہئے لیکن حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا کہ "یہ سب اپنے ہی عزیز و قریب ہیں۔ ان کے ساتھ رحم و کرم کا معاملہ ہونا چاہئے اس بنا پر زرِ فدیہ لیکر ان کو رہا کر دیا جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رائے پسند فرمائی اور اسی پر عمل کیا گیا[2]۔

اس موقعہ پر یہ جتا دینا بھی ضروری ہے کہ عام تاریخوں میں اور بعض روایات میں بھی مذکور ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی رائے کے مطابق آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسیرانِ بدر کو زرِ فدیہ لیکر آزاد کر دینا اور انہیں قتل نہ کرنا بارگاہِ ایزدی میں پسندیدہ نہیں ہوا اور اس پر یہ آیت بہ طور عتاب نازل ہوئی۔

لَوْلَا كِتَابٌ مِّنَ اللَّهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ (انفال)

اگر خدا کا لکھا پہلے سے موجود نہ ہوتا تو جو کچھ تم نے لیا اس پر تم کو بڑا عذاب ہوتا"

---

[1] اسد الغابہ جزء ثالث ص ۲۰۵ ذرا نطقِ مبارک کی بلاغت پر غور کرو۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل مقصد حضرت ابوبکرؓ کو بیٹے کے مقابلہ میں جانے سے روکنا تھا لیکن چونکہ حضرت ابوبکرؓ اسلام کے جوشِ حمایت میں جا رہے تھے اسلئے ممکن تھا کہ اگر صرف سادہ طریقہ پر حضور پُر نور اُن کو اس سے روکتے اور یہ فرماتے کہ نہیں تم یہیں رہو تو اُن پر اثر نہ ہوتا یا ہوتا مگر وہ بددلی محسوس کرتے۔ اس لئے آپ نے ایک ایسی بات کا ذکر کیا جو حضرت ابوبکرؓ کے نزدیک خود بہت اہم تھی یعنی حضور کے پاس ہی رہ کر آپ کی حفاظت کرنا۔ اس لئے آپ نے متعنی بنفسك فرمایا جس کے لفظی معنی ہیں "تم اپنی ذات سے مجھکو فائدہ پہونچاتے رہو"۔ [2] صحیح مسلم باب الامداد بالملائکۃ فی غزوۃ بدر و اباحۃ الغنائم۔

اس میں شک نہیں کہ یہ آیت عتابِ الٰہی پر دلالت کرتی ہے لیکن عتاب کا اصل سبب قیدیوں کو قتل نہ کرنا اور زرِ فدیہ لیکر ان کو رہا کر دینا نہیں بلکہ مالِ غنیمت کے لُوٹنے میں مصروف ہو جانا ہے۔ درانحالیکہ اب تک مالِ غنیمت سے متعلق احکام نہیں آئے تھے۔ چنانچہ امام مسلم نے اس واقعہ سے متعلق حضرت عمر فاروق کی جو روایت نقل کی ہے اس میں یہ صاف الفاظ ہیں۔

فانزل اللہ عزوجل ماکان لنبی ان یکون لہٗ اسریٰ حتی یثخن فی الارض الی قولہ فکلوا مما غنمتم حلالاً طیباً فاحلّ اللہ الغنیمۃ لھم (باب الامداد بالملائکۃ فی بدر)

پھر جب اللہ تعالیٰ نے آیت ماکان لنبی ان یکون لہٗ اسریٰ حتی یثخن فی الارض سے لیکر فکلوا مما غنمتم حلالاً طیباً نازل کی تو اللہ تعالیٰ نے مالِ غنیمت ان کے لئے حلال کر دیا۔

غزوۂ اُحد[1] ۳ھ

بدر کی شکست نے قریش کو اور برافروختہ کر دیا۔ اور اب انھوں نے اس شکست کا بدلہ لینے کی تیاریاں بہت بڑے پیمانہ پر شروع کیں۔ شاعروں نے اپنی آتش بیانی سے آس پاس کے تمام قبیلوں میں آگ لگا دی اور ادھر عورتوں نے مقتولین بدر کا نوحہ کر کر کے قریش کے ایک ایک نوجوان کو جوشِ انتقام سے اس طرح بھرپور کر دیا کہ ہر شخص کی زبان پر الثار الثار تھا۔ ابو سفیان کی سرکردگی میں جو کاروانِ تجارت شام سے واپس آیا تھا اس کا عظیم منافع اگرچہ تقسیم کر دیا گیا تھا لیکن بہ طور امانت محفوظ تھا۔ عورتوں کی ایک بڑی جمعیت کا ساتھ ہونا اس کی دلیل تھا کہ اس مرتبہ قریش یہ طے کر کے چلے تھے کہ یا وہ اپنے مقتولین بدر کا انتقام لیں گے اور یا وہیں میدانِ جنگ میں لڑ لڑ کر ختم ہو جائیں گے۔ حضرت عباس جو اگرچہ اسلام لے آئے تھے لیکن جاسوسی کے خیال سے مکہ ہی واپس آ گئے تھے۔ انھوں نے ایک تیز رَو قاصد کے ذریعہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش کی ان تیاریوں کی اطلاع کر دی۔ آپؐ نے اس خبر کی تصدیق اور مفصل حالات سے آگاہی حاصل کرنے کی غرض سے انس اور مونس دو آدمیوں

[1] مدینہ منورہ کے شمالی جانب تقریباً تین میل (ایک فرسخ) کی مسافت پر ایک پہاڑ کا نام ہے۔

کو بھیجا تو انھوں نے خبر دی کہ قریش کا لشکر مدینہ کے اس قدر قریب آگیا ہے کہ ان کے گھوڑوں نے عریض چراگاہ کو صاف کر دیا قریش جبل احد پر خیمہ ڈالے پڑے تھے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سات سو جاں نثاروں کیساتھ مدینہ سے روانہ ہوئے اور احد کی پشت پر پہونچ کر صفیں آراستہ کیں۔

جب عام جنگ شروع ہوئی تو حضرت حمزہ۔ حضرت علی اور حضرت ابو دجانہ اس بے جگری سے لڑے کہ دشمن کی فوج میں گھس کر ان کی صفیں الٹ دیں۔ قریش کے علمبردار ایک ایک بڑھتے تھے اور سرمستان بادۂ توحید کی ضرب کاری سے خاک کا ڈھیر ہو ہو جاتے تھے۔ آخر فوج کے پاؤں اکھڑ گئے اور بھاگنا شروع کر دیا۔ مسلمان یہ دیکھ کر مال غنیمت کے جمع کرنے میں لگ گئے قریش کا ایک دستہ جو کوہ احد پر تھا اس نے میدان خالی دیکھ کر عقب سے اس زور کا حملہ کیا کہ اب جنگ کا نقشہ ہی کچھ اور تھا۔

یہ وقت اسلام کے لئے بے حد نازک تھا اسلامی فوج کے بڑے بڑے تبر آزماؤں کے پاؤں اکھڑ گئے تھے۔ عام افراتفری میں خود مسلمانوں کی تلواریں مسلمانوں پر پڑ رہی تھیں۔ دشمنوں نے خبر اڑا دی کہ سرور عالم شہید ہو گئے۔ یہ سن کر حضرت عمر جیسے شیر بیشۂ شجاعت کا دل چھوٹ گیا لیکن آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم میدان جنگ کے ایک گوشہ میں اپنے چند جاں بازوں کے ساتھ کھڑے تھے جن میں ایک حضرت ابو بکر بھی تھے۔ قریش کا دستہ تیر برسا رہا تھا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم گردن اٹھا اٹھا کر دیکھتے تو حضرت ابو طلحہ فرماتے "آپ پر میرے ماں باپ قربان! آپ گردن نہ اٹھائیں۔ دشمن تیر برسا رہے ہیں۔ میرا سینہ ان کا نشانہ بننے کے لئے حاضر ہے"[1] اسی حالت میں آپ مجروح ہو گئے تو آپ کے جاں نثار پہاڑ پر لے آئے۔ یہاں ابو سفیان بھی پہونچ گیا اور اس نے

---

[1] صحیح بخاری باب غزوۂ احد۔

پکار کر پوچھا "لوگو! کیا تم میں محمد ہیں؟ کوئی جواب نہیں ملا تو اس نے پھر دریافت کیا ابو بکر ہیں؟ اس کا بھی جواب نہ ملا تو اس نے حضرت عمر کا نام لیا۔[1] اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قریش بھی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابو بکر کو ہی مسلمانوں کا لیڈر تسلیم کرتے تھے

مسلمانوں کو جب معلوم ہو گیا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں تو ان کا حوصلہ بڑھا اور انھوں نے اپنی منتشر طاقتوں کو سمیٹ کر پھر اس جوش و خروش کے ساتھ جنگ کی کہ بہادرانِ قریش کے چھکے چھڑا دئے اور وہ میدانِ جنگ چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا "ان کا تعاقب کون کریگا" ستّر صحابہ نے اپنے نام پیش کئے۔ امام بخاری نے حضرت ابو بکر اور حضرت زبیر کے ناموں کی تصریح کی ہے۔[2]

یہ یاد رکھنا چاہئے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو جنگیں کی ہیں ارباب سیر کی اصطلاح میں وہ دو قسم کی ہیں ایک کو غزوہ کہتے ہیں اور دوسری کا نام سریہ ہے۔ عام طور پر ان میں فرق یہ ہے کہ غزوہ اسے کہتے ہیں جس میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بذاتِ خود شرکت فرمائی ہو اور سریہ جس کے لفظی معنی ٹولی یا گروہ کے ہیں اسے کہتے ہیں جس میں آپ بنفسِ نفیس شریک نہ ہوئے ہوں۔

حضرت ابو بکر چونکہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ راست اور مشیرِ خاص تھے اس بنا پر آپ عموماً سرایا کی مہم پر نہیں بھیجے جاتے تھے اور مدینہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس رہ کر ہی ان کا بندوبست اور انتظام کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت حذیفہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میں چاہتا ہوں کہ اطراف واکناف میں لوگوں کو فرائض وسنن کی تعلیم دینے کی غرض سے اپنے آدمی بھیجوں جیسا کہ حضرت عیسیٰ اپنے حواریوں کو بھیجا کرتے تھے۔ کسی نے عرض کیا" آپ ابو بکر اور عمر

---

[1] صحیح بخاری باب غزوۂ احد۔ [2] صحیح بخاری ج ۲ ص ۵۸۴

کو کیوں نہیں بھیجتے۔ ارشاد ہوا "میں ان دونوں سے بے نیاز نہیں ہو سکتا یہ دین کے کان اور آنکھیں ہیں"[1]

غزوۂ خندق یہودِ مدینہ کا ایک قبیلہ بنو نضیر جو مدینہ سے نکل کر خیبر آ گیا تھا اُس کے رؤسا نے قریش۔ بنو غطفان۔ بنو سلیم اور بنو اسد وغیرہ قبائل میں گھوم پھر کر اسلام کیخلاف ایک عظیم جنگ پر ان کو آمادہ کر دیا اور دس ہزار کا ایک لشکر جرار مدینہ پر حملہ کے ارادہ سے روانہ ہوا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین ہزار صحابہ کے ساتھ شہر سے نکل کر خندق کھودی اور قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئے۔ یہ واقعہ ماہ ذوقعدہ ۵ھ میں پیش آیا۔ اس غزوہ میں بھی ایک دستہ فوج کی کمان حضرت ابوبکر صدیق کے سپرد تھی۔ حضرت شاہ ولی اللہ الدہلوی لکھتے ہیں کہ جس مقام پر حضرت ابوبکر صدیق نے اپنے دستہ کو لیکر پڑاؤ ڈالا تھا وہاں مسجد صدیق کے نام سے اب تک ایک مسجد ہے جو اسی واقعہ کی یادگار ہے۔[2]

غزوۂ بنی مصطلق اسی سنہ میں غزوۂ بنی مصطلق جس کو غزوۃ المریسیع[3] بھی کہتے ہیں پیش آیا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ حارث بن ضرار جو بنو مصطلق کا سردار تھا اُس نے اپنے قبیلہ میں گھوم پھر کر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیساتھ جنگ کرنے کا بڑا شدید جذبہ پیدا کر دیا تھا اور اپنے ساتھ جو عرب اس کو مل سکتے تھے ان کو بھی ملا لیا تھا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان حالات کا علم ہوا تو بریدۃ بن الحصیب الاسلمی کو تفتیش کیلئے روانہ فرمایا۔ بریدہ خود حارث سے ملے اور گفتگو کی اور حارث جنگ کی جو تیاریاں کر رہا تھا اُس کی اطلاع دی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ سنکر مسلمانوں کا ایک لشکر اپنے ساتھ لے روانہ ہوئے تو حضرت ابوبکر اس غزوہ میں بھی آپ کے ہمرکاب تھے اور

---

[1] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۷۴ [2] ازالۃ الخفا ج ۲ ص ۱۳ [3] مریسیع مسعودی اور طبری کے بیان کے مطابق کسی تالاب یا کنوئیں کا نام تھا اور چونکہ یہ غزوہ یہاں ہوا تھا اس لئے اس کو غزوۃ المریسیع بھی کہتے ہیں۔

مہاجرین کا علم آپ کے ہی ہاتھ میں تھا۔ مقام مریسیع پہونچکر جنگ ہوئی۔ کچھ دیر تک دونوں جانب سے تیر اندازی ہوتی رہی آخر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے مسلمانوں نے اپنی تمام طاقت یکجا جمع کرکے اس زور کا حملہ کیا کہ دشمن کے پاؤں اُکھڑ گئے اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور ہوگیا [1]

یہی وہ غزوہ ہے جس سے واپسی پر وہ واقعہ پیش آیا جو حدیث افک کے نام سے مشہور ہے۔ اس کو یہاں بیان کرنے کا موقع نہیں ہے۔ البتہ اس واقعہ کی یہ خصوصیت لائق ذکر ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں

اِنَّ الَّذِیْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ (الآیۃ) تم میں سے وہ لوگ جنھوں نے بہتان طرازی کی ہے۔

فرماکر ان لوگوں کی پردہ دری کی ہے جو خود یا بالواسطہ اس واقعہ میں ملوث ہوگئے تھے اور جیسا کہ خود اس آیت میں ہے یہ شر غالباً اسی لئے پیدا کیا گیا تھا کہ اس بہانہ کتاب الٰہی کو جگر گوشۂ حضرت ابو بکر صدیق کی عصمت و عفت پر مہر تصدیق ثبت کرنیکا موقع میسر آجائے وکفیٰ بہ فخراً۔

اس کے علاوہ حدیث افک میں جو لوگ ملوث تھے اُن میں ایک شخص مسطح بن اثاثہ بھی تھا۔ حضرت ابوبکر اس شخص کی مالی امداد کرتے رہتے تھے لیکن جب یہ افک کا واقعہ پیش آیا تو آپ نے اس کی امداد سے دست کشی اختیار کرلی۔ پروردگار عالم کو صدیق اکبر کی یہ ادا پسند نہیں آئی اور وَلَا یَأْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ فرماکر اُن کو تنبیہ کی گئی۔ چنانچہ حضرت ابو بکر کو بڑی ندامت ہوئی اور آپ نے مسطح کی مالی سرپرستی پھر شروع کر دی۔

نزول آیت تیمم کے متعلق ایک اہم بحث

اس موقعہ پر یہ تنبیہ کردینا ضروری ہے کہ حدیث افک میں جس طرح حضرت عائشہ کے ہار کے گم ہونے اور اس کی تلاش کا تذکرہ ہے ٹھیک اسی طرح کا ایک اور واقعہ ہے جس کو امام بخاری نے اولاً کتاب التیمم

[1] زاد المعاد ج ۲ ص ۱۱۲

میں اور پھر باب مناقب المہاجرین وفضائلہم میں روایت کیا ہے یہ واقعہ خود حضرت عائشہ سے مروی ہے۔ فرماتی ہیں۔

"ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیساتھ ایک سفر میں گئے ہوئے تھے۔ جب ہم مقام بیدا (مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک مقام کا نام ہے) یا ذات الجیش (یہ بھی ایک مقام کا نام ہے) میں پہونچے تو میرا ہار گم ہوگیا۔ اُس کو تلاش کرنے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑاؤ ڈال دیا اور آپکے ساتھ جو لوگ تھے وہ بھی وہاں ٹھہر گئے اس جگہ پانی کہیں نہیں تھا۔ اور نہ ہمارے قافلہ میں کسی کے پاس تھا۔ اس بنا پر ابوبکر آئے اور اُس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنا سر میری ران پر رکھے ہوئے سو رہے تھے۔ ابوبکر نے آتے ہی مجھ سے کہا کہ تو نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور لوگوں کو ایسے مقام پر رُکوا دیا ہے جہاں پانی نہیں ہے۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں" ابوبکر غصہ میں بھرے ہوئے تھے اس لئے جو اُن کی زبان پر آیا مجھے کہتے رہے اور ساتھ ہی اپنے ہاتھ سے میری کمر میں کچوکے بھی مارتے رہے لیکن میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نیند کے اُچٹ جانے کے ڈر سے ذرا حرکت نہیں کی اور چپ چاپ بیٹھی رہی۔ آخر صبح کے وقت جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیدار ہوئے اور پانی نہیں ملا تو تیمم کی آیت نازل ہوئی اور سب لوگوں نے تیمم کیا۔ اس پر اُسید بن الحضیر نے کہا" اے آلِ ابی بکر یہ تمہاری پہلی ہی برکت نہیں ہے۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ اب ہم نے اونٹ کو اٹھایا جس پر میں سوار ہوئی تھی تو دیکھا کہ ہار اُس کے ہی نیچے پڑا ہوا تھا۔[1]

حافظ ابن حجر نے ابن سعد۔ ابن حبان اور ابن عبدالبر سے نقل کیا ہے کہ یہ دونوں واقعات ایک ہی ہیں اور تیمم کا حکم غزوہ بنی مصطلق میں نازل ہوا تھا۔ یہ حال تو محدثین کا ہے۔[2] ان کے علاوہ یاقوت حموی نے بھی ذات الجیش کے جغرافیہ کے ذیل میں لکھا ہے کہ

---

[1] صحیح بخاری ج ۱ ص ۴۸ و ۵۱۸ [2] فتح الباری ج ۱ ص ۳۶۵ کتاب التیمم

یہی وہ مقام ہے جہاں غزوۂ بنی مصطلق سے واپس ہوتے ہوئے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کیساتھ حضرت عائشہ کے گم شدہ ہار کی تلاش میں قیام فرمایا تھا اور یہیں آیت تیمم نازل ہوئی تھی۔[1]

لیکن اگر دونوں واقعوں کو ایک مان لیا جائے تو بڑا اشکال یہ وارد ہوتا ہے کہ غزوۂ بنی مصطلق کے واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہار تلاش کرنے کے لئے حضرت عائشہ تن تنہا رہ گئی تھیں اور پورا قافلہ بہت آگے چلا گیا تھا۔ چنانچہ اسی وجہ سے بدزبانوں کو تہمت طرازی کا بہانہ ملا۔ اس کے برخلاف آیت تیمم والے واقعہ کی روئداد سے ثابت ہوتا ہے کہ ہار کی تلاش کے لئے حضرت عائشہ تن تنہا نہیں رہی تھیں بلکہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھ صحابہ بھی اسی مقام پر فروکش ہو گئے تھے۔ اس کے علاوہ غزوۂ بنی مصطلق کے واقعہ میں کسی بے آب مقام کا کوئی تذکرہ نہیں ہے اور تیمم والی آیت میں ایسے مقام کا تذکرہ موجود ہے جہاں پانی دُور دُور تک نہیں تھا۔ پس اگر دونوں واقعے ایک ہی تھے تو پھر روایتوں کے اس اختلاف کو رفع کرنے کی صورت کیا ہوگی۔

اس کے علاوہ یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ طبری کے ہاں حدیث افک کا ذکر مفصل ملتا ہے۔ لیکن اس کے ضمن میں آیت تیمم کی طرف اشارہ بھی نہیں کیا گیا۔ پھر صحیحین کی روایات سے بھی ثابت نہیں ہوتا کہ تیمم کا حکم غزوۃ المریسیع میں نازل ہوا۔

اس سب سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ دراصل حضرت عائشہ کے ہار کے گم ہونے کا واقعہ دو مرتبہ پیش آیا ہے اور مذکورۂ بالا دونوں واقعات ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں جو مختلف اوقات میں پیش آئے۔ اس کی تائید آیت تیمم والے واقعہ میں حضرت اُسید بن الحضیر کے اس فقرہ سے بھی ہوتی ہے کہ "اے آل ابی بکر یہ تمہاری پہلی ہی برکت نہیں ہے کہ تمہاری شان میں یا تمہاری وجہ سے قرآن کا کوئی حکم نازل ہوا ہو"۔

---

[1] معجم البلدان ج ۴ ص ۵۱۵

علاوہ بریں حافظ ابن قیم نے معجم طبرانی کے حوالہ سے خود عائشہ کی جو ایک روایت نقل کی ہے اُس سے بات بالکل صاف ہو جاتی ہے روایت یہ ہے :-

عن عائشة قالت ولما كان من	حضرت عائشہ سے روایت ہے
امر عقدي ما كان قال اهل الافك	فرماتی ہیں کہ پہلے میرے ہار کا جو معاملہ
ما قالوا فخرجتُ مع النبي صلى الله	ہوا اور اُس پر اہل افک نے جو کچھ کہا وہ تو
عليه وسلم في غزوة اخرى فسقط	کہا ہی تھا ایک اور واقعہ یہ ہوا کہ میں ایک اور
ايضاً عقدي حتى حبس التماسهُ	غزوہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ گئی
الناس ولقيتُ من ابي بكر ما شاء	اور اس سفر میں بھی میرا ہار گر پڑا جسکو تلاش کرنیکی
وقال : يا بنية في كل سفر تكونين	وجہ سے لوگوں کو رکنا پڑا اور اس وجہ سے
عناءً وبلاءً وليس مع الناس ماءٌ	ابوبکر کے جی میں جو کچھ آیا میں اس سے دوچار
فانزل الله الرخصة في التيمم[1]	ہوئی اور ابوبکر نے کہا

اس روایت میں حضرت ابوبکر کا بگڑ کر حضرت عائشہ سے یہ فرمانا کہ بیٹی! تم ہر سفر میں مصیبت بن جاتی ہو۔ اس بات کا کھلا قرینہ ہے کہ یہ سفر جس میں آیتِ تیمم کا نزول ہوا غزوہ بنی مصطلق جس میں واقعۂ افک پیش آیا اُس کے علاوہ ہے چنانچہ علامہ ابن قیم معجم طبرانی کی یہ روایت نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں :-

وهذا يدل على ان قصة العقد	اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہار کا واقعہ جسکی
التي نزل التيمم لاجلها بعد هذه	وجہ سے تیمم کا حکم نازل ہوا اس غزوہ (بنی
الغزوة وهو الظاهر ولكن فيها كانت	مصطلق) کے بعد پیش آیا ہے اور یہی ظاہر ہے
قصة الافك بسبب فقد العقد	لیکن چونکہ اس غزوہ میں ہار کی گم شدگی اور اس
والتماسه فالتبس على بعضهم احدى	کی تلاش کی وجہ سے افک کا واقعہ پیش آیا تھا۔
القصتين بالاخرى .[2]	اس لئے بعض کے نزدیک ان واقعے خلط ملط ہوگئے۔

[1] زاد المعاد ج ۲ ص ۱۱۳ [2] ایضاً۔

حافظ ابن حجر - ابن سعد - ابن حبان اور ابن عبد البر کا مذکورۂ بالا قول نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ "ہمارے بعض شیوخ نے اس کو مستبعد جانا ہے کہ یہ دونوں واقعات ایک ہی ہوں کیوں کہ مریسیع قدید اور ساحل کے درمیان مکہ کے نواح میں ہے اور یہ واقعہ خیبر کے اطراف میں پیش آیا ہے۔ کیونکہ اس واقعہ میں بیدا یا ذات الجیش کا ذکر ہے اور یہ دونوں مقامات۔ جیسا کہ امام نووی نے یقین کیساتھ لکھا ہے مدینہ اور خیبر کے درمیان میں واقع ہیں۔ [1]

پھر اس بحث کے آخر میں امام بخاری کے متعلق بھی یہی لکھتے ہیں کہ اُن کا رجحان بھی تعدد واقعہ کی طرف معلوم ہوتا ہے۔

لیکن تعجب ہے کہ ان سب وجوہ کے باوجود حافظ ابن حجر کی اپنی رائے اس کے خلاف ہے، چنانچہ لکھتے ہیں۔

وما تقدم من اتحاد القصة فهو اظهر [2] اور قصہ کے ایک ہونا جو مذکور اوپر ہوا ہے وہ زیادہ ظاہر ہے

صلح حدیبیہ [3] صلح حدیبیہ کا واقعہ جو ماہ ذی قعدہ ۶ھ میں پیش آیا۔ اسلام کی تاریخ کا نہایت اہم اور عظیم الشان واقعہ ہے جس پر آگے چل کر بڑے دور رس نتائج مرتب ہوئے۔ چنانچہ قرآن مجید میں اُس کو فتح مبین (اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا) فرمایا گیا ہے۔ اس بنا پر یہ کیوں کر ممکن تھا کہ صدیق اکبر اس میں شریک نہ ہوتے۔

اصل یہ ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم چودہ سو (۱۴۰۰) اور بہ روایت دیگر پندرہ سو (۱۵۰۰) صحابہ کے ساتھ عمرہ کے ارادہ سے مکہ معظمہ روانہ ہوئے۔ مقام ذوالحلیفہ میں پہونچکر جو اہل مدینہ کا میقات یعنی احرام باندھنے کی جگہ ہے۔ آپ نے احرام باندھا۔ اور ایک خزاعی شخص کو جاسوسی کی

---

[1] فتح الباری ج ۷ ص ۳۶۵ [2] فتح الباری ج ۷ ص ۳۶۹ [3] مکہ معظمہ سے بیس کیلومیٹر کی مسافت پر ایک کنواں ہے جس کا نام حدیبیہ ہے۔ چونکہ صلح نامہ یہیں لکھا گیا تھا اس لئے اس کو صلح حدیبیہ کہتے ہیں۔

غرض سے پہلے سے روانہ کر دیا۔ غدیر الاشطاط جو حدیبیہ کے سامنے ہے آپ وہاں
پہونچے ہی تھے کہ جاسوس مل گیا۔ اُس نے بتایا کہ قریش آپ کو زیارتِ بیت اللہ نہیں کرنے
دیں گے۔ اور انھوں نے آپ کیساتھ جنگ کرنیکی پوری تیاری کرلی ہے۔ آں حضرت صلی اللہ
علیہ وسلم نے مشورہ کیا کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔ حضرت ابو بکر نے عرض کیا "اے اللہ کے
رسول! آپ تو بیت اللہ کی زیارت کے لئے نکلے ہیں۔ آپ نہ کسی کو قتل کرنا چاہتے ہیں اور
نہ کسی سے جنگ کا ارادہ رکھتے ہیں اس لئے آپ بیت اللہ کا رُخ کیجیے۔ اگر اُن لوگوں میں سے
کسی نے ہم کو روکا اور مزاحم ہوا تو ہم اُس سے جنگ کریں گے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ
وسلم نے یہ سُن کر فرمایا "تو بسم اللہ! چلو۔" [1]

اب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم روانہ ہوئے اور مقام حدیبیہ میں فروکش ہو کر بُدیل
بن ورقاء الخزاعی کی معرفت قریش کو کہلا بھیجا کہ ہم جنگ کے ارادہ سے نہیں آئے ہیں۔ بلکہ
مقصد صرف عُمرہ کرنا ہے اس لئے بہتر یہی ہے کہ مصالحت کرلو۔ ورنہ خدا کی قسم جس کے ہاتھ
میں میری جان ہے میں اس وقت تک لڑونگا جب تک کہ میری گردن تن سے جدا ہو جائے۔

مسلسل جنگوں اور اُن میں پیہم شکستوں کے باعث قریش کے دَم خم پہلے سے ہی
ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ کچھ حیص بیص کے بعد انھوں نے منظور کرلیا اور مصالحت کی گفتگو
کرنے کے لئے عُروہ بن مسعود کو جو قریش کا تجربہ کار اور نہایت چالاک شخص تھا اپنا نمائندہ
بنا کر روانہ کیا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عروہ سے بھی وہی فرمایا جو بُدیل کے ذریعہ
پہلے کہلا بھیجا تھا۔ عروہ بولا "اے محمد (صلعم) اگر آپ نے جنگ کی اور قریش کا خاتمہ کر دیا
تو آپ نے کیا اپنے سے پہلے بھی کسی ایسے شخص کا نام سُنا ہے جس نے خود اپنی قوم کا قلع قمع
کر دیا ہو۔ اور اگر جنگ کا نتیجہ دوسرا ہوا (یعنی آپ کو شکست ہوئی) تو میں آپ کے ساتھیوں
میں ایسے میلے جھلے آدمی دیکھتا ہوں جو آپ کو تنہا چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہونگے

[1] صحیح بخاری ج ۲ باب غزوۃ الحدیبیہ۔

حضرت ابوبکر بڑے حلیم اور بردبار تھے لیکن عروہ کی زبان سے یہ سن کر برہم ہوگئے اور بولے "بدمعاش! کیا ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر بھاگ سکتے ہیں"؟ عروہ نے یہ تیور دیکھ کر پوچھا "یہ کون ہیں؟" لوگوں نے کہا "ابوبکرؓ" اب عروہ نے حضرت ابوبکر سے مخاطب ہوکر کہا "قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے۔ اگر تمہارا مجھ پر احسان نہ ہوتا جس کا بدلہ میں اب تک نہیں چکا سکا ہوں تو میں تم کو جواب دیتا"[1]

آخر معاہدہ کی بات چیت شروع ہوئی اور جب عہد نامہ لکھا جانے لگا تو اس کی بعض دفعات جو قریش کی طرف سے پیش کی گئی تھیں مسلمانوں کے لئے بڑی ہی صبر آزما تھیں چنانچہ فاروق اعظم سے نہ رہا گیا اور انہوں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شدتِ جذبات میں ایسے لب و لہجہ میں گفتگو کی جس کا ملال آخر دم تک ان کے دل سے نہیں نکلا۔ اسی حالت میں وہ حضرت ابوبکر کے پاس بھی پہونچے۔ اور بولے کہ بھلا قریش سے دب کر صلح کیوں کر ہو سکتی ہے۔ لیکن صدیق اکبر نے جواب دیا کہ رسول اللہ! جو کچھ کرتے ہیں۔ اللہ کے حکم سے کرتے ہیں۔ یقیناً اُسی میں بھلائی ہوگی۔ اللہ ان کو کبھی ہلاک نہ کرے گا۔ اس کے بعد آیتِ فتح نازل ہوئی اور حضرت عمر کو بھی تسکین و طمانیت ہوگئی[2]

غزوۂ خیبر سنہ ۶ھ کے اواخر یا ۷ھ کے شروع میں غزوۂ خیبر کا اہم معرکہ پیش آیا۔ خیبر عرب میں یہودیوں کا سب سے بڑا مرکز تھا جو متعدد مضبوط قلعوں پر مشتمل تھا۔ ایک قلعہ جس کا نام قموص تھا عرب کے مشہور پہلوان مرحب کے زیر سرکردگی تھا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مختلف قلعوں کی فتح کرنے کی غرض سے متعدد دستے متعین کئے۔ اور ہر دستہ کا جدا جدا ایک امیر مقرر کیا تو قلعۂ قموص کی سرانجام دہی حضرت ابوبکر کے سپرد ہوئی۔ لیکن اس کو فتح کرنے کی سعادت شیر خدا حضرت علی مرتضیٰ کے لئے مقدر ہو چکی تھی۔ اس لئے اولاً حضرت ابوبکر اور پھر حضرت عمر دونوں اس مہم

---

[1] صحیح بخاری باب الشروط فی الجہاد والمصالحۃ مع اہل الحرب ج ۱ ص ۳۷۸ [2] صحیح مسلم ج ۲ ص ۱۰۶ باب صلح الحدیبیہ

میں کامیاب نہ ہوسکے۔[1]

فتح مکہ | ۸ھ میں فتح مکہ کی مہم پیش آئی۔ یہ اسلامی تاریخ کا نہایت عظیم الشان واقعہ ہے۔ ایک مرتبہ صلح حدیبیہ کے معاہدہ کی خلاف ورزی کرنیکے بعد جب ابوسفیان قریش کے نمائندہ کی حیثیت سے مدینہ منورہ آیا اور تجدید معاہدہ کی درخواست پیش کی تو اس معاملہ میں اُس نے پہلے حضرت ابوبکر کو اپنا سفارشی بنانا چاہا لیکن جب انھوں نے صاف انکار کردیا کہ میں کچھ نہیں کرسکتا تو پھر وہ حضرت عمر کے پاس گیا۔ بہرحال معاہدہ کی تجدید نہیں ہوسکی اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دس ہزار جاں نثاروں کے ساتھ قریش پر چڑھائی کرکے مکہ فتح کرلیا حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں داخل ہوکر عورتوں کو دیکھا کہ دوپٹوں سے گھوڑوں کے منہ پر طمانچے مار رہی ہیں تو آپ نے حضرت ابوبکر کی طرف دیکھ کر تبسم فرمایا اور پوچھا "ابوبکر تم کو حسان بن ثابت کے وہ شعر یاد ہیں جنھیں انھوں نے اس منظر کا ذکر کیا ہے؟" حضرت ابوبکر کو یہ شعر یاد تھے فوراً پڑھ کر سنادئے۔[2]

غزوۂ حنین | حنین مکہ مکرمہ اور طائف کے درمیان ایک وادی کا نام ہے عرب کا مشہور بازار ذوالمجاز اسی کے پاس لگتا تھا۔

مکہ مکرمہ کی فتح اور قریش کے مغلوب ہونے کے باعث دوسرے قبائل کا بھی زور ٹوٹ گیا اور انھوں نے اسلام قبول کرنا شروع کردیا۔ لیکن ہوازن اور ثقیف یہ دو قبیلے جو فنونِ سپہ گری و جنگ جوئی کے میدان کے شہ سوار تھے اسلام کی عداوت میں اور سخت ہوگئے اور انھوں نے بڑے زور شور سے دوبارہ حملہ کی تیاری شروع کردی۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ہوئی اور بعد میں اپنا جاسوس بھیجکر آپ نے اس کی تصدیق بھی کرلی تو صحابۂ کرام کو جنگ کی تیاری کا حکم دیا۔ چنانچہ ماہِ شوال ۸ھ میں

[1] ازالۃ الخفا ج ۲ ص ۱۴ [2] ازالۃ الخفا ج ۲ ص ۱۶

یعنی فتح مکہ کے فوراً بعد ہی اسلامی فوج نے جس کی تعداد بارہ ہزار تھی حنین کیطرف پیش قدمی کی جنگ شروع ہوئی تو پہلے معرکہ میں مسلمانوں کو فتح ہوئی۔ لیکن وہ مال غنیمت کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ہوازن جو نامور قدر انداز تھے انھوں نے تیر برسانے شروع کر دیے۔[1] جس سے اسلامی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم چند جاں نثاروں کیساتھ تنہا رہ گئے۔ ان میں سے طبری نے بتصریح جن کا نام لیا ہے ان میں حضرت ابوبکر صدیق کا نام سر فہرست ہے۔[2]

آخر کار آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پکار پر انصار اور مہاجرین جو منتشر ہو گئے تھے پھر جمع ہوئے۔ اور اس مرتبہ انھوں نے جم کر اس زور کا حملہ کیا کہ دشمن کی صفیں اکھڑ گئیں اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔

اب مال غنیمت جمع ہونا شروع ہوا تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان کیا کہ مَنْ قَتَلَ قَتِيلاً فَلَهُ سَلَبُهُ (جو شخص کسی کا قاتل ہو گا مقتول کا سامان (اسلحہ وغیرہ جو جنگ کے وقت اس کے ساتھ ہوں) اُسی کو ملے گا۔ حضرت ابو قتادہ نے ایک مشرک کو جو بڑا بہادر اور طاقت ور تھا قتل کیا۔ اب ان کو شہادت کی ضرورت ہوئی لیکن کوئی شاہد نہیں ملا تو انھوں نے اصل واقعہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا۔ ایک شخص بولا "ہاں" یہ (قتادہ) سچ کہتے ہیں اور جس شخص کو انھوں نے قتل کیا ہے اس کا متروکہ (سلب) میرے پاس ہے۔ اب یہ آپ مجھ کو ہی دیدیجئے۔ حضرت ابوبکر صدیق پاس ہی بیٹھے تھے۔ یہ سنکر بولے "نہیں قسم اللہ کی یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے ایک بجو کو (یعنی ایسے بزدل آدمی کو جس نے جنگ میں حصہ نہیں لیا ہے۔) مقتول کا سامان دیدیں اور اللہ کے اُس شیر کو نہ دیں جس نے اللہ اور رسول کی خاطر جنگ کی ہے (اور اُس شخص کو قتل کیا ہے) آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ابوبکر سچ کہتے ہیں"۔

[1] صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۱۷ [2] طبری ج ۲ ص ۳۴۷

چنانچہ وہ سامان ابو قتادہ کو ہی دیا گیا[1]

غزوۂ طائف | حنین کی شکست خوردہ فوج طائف میں جو ایک نہایت محفوظ مقام تھا قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم حنین کے اموال غنیمت وغیرہ کو مقام جعرانہ میں چھوڑ کر طائف کے لئے روانہ ہوئے اور قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن اہل قلعہ بڑے ساز و سامان کے ساتھ تھے۔ انھوں نے قلعہ سے اس زور کی تیر باری کی کہ مسلمانوں کو پیچھے ہٹنا پڑا اور قلعہ سر نہ ہو سکا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکر سے فرمایا۔ "میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ کسی نے مجھ کو ایک لبالب پیالہ نذر کیا ہے لیکن ایک مرغے نے اس میں ٹھونگ ماردی اور جو کچھ پیالہ میں تھا وہ گر پڑا۔ حضرت ابو بکر نے عرض کیا" اس خواب سے تو یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ آپ کو اس محاصرہ میں کامیابی نہیں ہوگی"۔ ارشاد ہوا " ہاں! میں بھی یہی سمجھتا ہوں"[2] چنانچہ محاصرہ اٹھا لیا گیا۔

اسی محاصرہ میں حضرت ابو بکر صدیق کے صاحبزادہ حضرت عبداللہ ایسے زخمی ہوئے کہ حضرت ابو بکر کے عہد خلافت کے ابتدائی دنوں میں یہی زخم ان کی موت کا سبب ہوا۔[3]

غزوۂ موتہ | موتہ شام میں ایک مقام کا نام ہے جو بلقاء سے قریب ہے۔ یہاں کی تلواریں مشہور ہیں بلقاء کا رئیس ایک عرب شرحبیل بن عمرو تھا جو مذہباً عیسائی اور قیصر روم (ہرقل) کے ماتحت تھا۔ اس نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک نامہ بر حضرت حارث بن عمیر کو قتل کر دیا تھا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قصاص لینے کیلئے ایک

---

[1] صحیح بخاری باب غزوۃ حنین [2] طبری ج ۲ ص ۳۵۵ مطبوعہ مطبعۃ الاستقامۃ بالقاہرہ سنہ ۱۹۳۹ء کتاب میں غلطی سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب وانا لا اری ذالک چھپ گیا ہے جس کے معنی "میں ایسا نہیں سمجھتا ہیں حالانکہ درحقیقت یہ لا اری نہیں بلکہ لَأُرَی ہے جس کے معنی تاکید کے ساتھ اثبات کے ہیں چنانچہ سیاق سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے اور حضرت شاہ ولی اللہؒ نے بھی اس کو اسی طرح پڑھا ہے۔ دیکھو ازالۃ الخفا ج ۲ ص ۱۶۔

[3] اصابہ تذکرۂ عبداللہ بن ابی بکر الصدیق۔

فوج روانہ کی جس میں اکابر مہاجرین و انصار شامل تھے۔ لیکن اس لشکر کا امیر آپ نے حضرت زید بن حارثہ کو نامزد کیا جو آزاد کردہ غلام تھے۔ بعض لوگوں نے اس پر نکتہ چینی کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سُنا تو سخت ناراض ہوئے۔ انہیں اکابر مہاجرین میں حضرت ابو بکر بھی تھے لیکن کیا مجال کہ ان کے تیور پر ایک شکن بھی پڑی ہو بلکہ اطاعت و انقیاد کا یہ عالم تھا جیسا کہ اپنے موقع پر بیان ہوگا کہ خلیفہ منتخب ہونے کے بعد آپ نے پہلا کام یہی کیا کہ حضرت زید کے صاحبزادہ حضرت اسامہ کو جو غلام زادہ بھی تھے اور کم عمر بھی۔ امیر لشکر بنا کر شام کی مہم پر روانہ کیا۔ اسلام کی مساوات کا یہ بھی ایک عجیب رُوح پرور مظاہرہ ہے کہ حضرت سلمۃ بن الاکوع نے ایک مرتبہ فرمایا "میں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سات غزوات میں شرکت کی ہے علاوہ ان کے نو اور مہموں میں شریک ہوا ہوں۔ ان میں ہمارا امیر لشکر کبھی حضرت ابو بکر ہوتے تھے اور کبھی حضرت اُسامہ[1] یہ غزوہ موتہ بھی ۸ھ میں ہوا تھا لیکن فتح مکہ۔ حنین اور طائف سے پہلے۔ لیکن چونکہ اس غزوہ کا رشتہ غزوۂ تبوک سے ملتا ہے جو ۹ھ میں ہوا تھا اس بنا پر ہم نے اس کا ذکر مؤخر کر دیا ہے۔

غزوۂ ذات السلاسل | ذات اطلاح شام کا ایک علاقہ ہے جہاں قبیلۂ قضاعۃ کے لوگ رہتے تھے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرو بن کعب الغفاری کی زیر سرکردگی پندرہ آدمیوں کا ایک دستہ ان لوگوں کو دعوتِ اسلام دینے کے لئے بھیجا تھا انھوں نے سب لوگوں کو قتل کر دیا تھا عمرو بن کعب سلامت بچے اور مدینہ پہونچ سکے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کی سرزنش کے لئے ماہ جمادی الآخر ۸ھ میں تین سو صحابہ کی ایک جماعت حضرت عمرو بن العاص کی امارت میں روانہ کی۔ اس کے بعد معلوم ہوا کہ تین سو آدمی کم ہیں تو آپ نے دو سو مہاجرین و انصار کا ایک اور دستہ حضرت ابو عبیدۃ بن الجراح کی سرکردگی میں روانہ کیا۔ اس دستہ میں حضرت ابو بکر بھی شامل تھے۔ (طبری ج ۲ ص ۳۱۵)

[1] صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۱۲

غزوۂ موتہ میں مسلمانوں کو شدید نقصان پہونچا تھا۔ یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب ترین غلام حضرت زید بن حارثہ۔ حضرت جعفر طیار جو حضرت علی مرتضیٰ کے سگے بھائی اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب تھے۔ اور حضرت عبداللہ بن رواحہ جو مشہور انصاری تھے یہ سب یکے بعد دیگرے شہید ہو گئے تھے۔ چنانچہ جب اسلامی لشکر واپس آیا ہے تو مدینہ منورہ پورا ماتم کدہ بنا ہوا تھا۔ اس بنا پر عرب اور شام کی درمیانی سرحد پر جو عرب قبائل آباد تھے اور جو عیسائی ہونے کیساتھ قیصر روم کے زیر اثر تھے اُن کا حوصلہ بڑھا اور قیصر روم نے مزید حوصلہ افزائی کر کے ان میں اور جرأت پیدا کر دی۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطلاعات پہونچیں تو آپ نے ایک فوج گراں ترتیب دی اور ماہ رجب ۹ھ میں اس کو خود لیکر تبوک پہونچے جو مدینہ اور دمشق کے درمیان مدینہ سے چودہ منزل کی مسافت پر ایک مشہور مقام ہے۔

اکابر مہاجرین و انصار کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیق بھی اس غزوہ میں شریک تھے لیکن آپ کی شرکت کا نمایاں اور امتیازی وصف یہ تھا کہ چونکہ یہ سال خشک سالی اور عام مالی تنگدستی و زبوں حالی کا تھا جس کی وجہ سے جیسا کہ فتح الباری میں ہے حضرت ابو موسیٰ اشعری اس لشکر کو جیش العسرۃ اور ابن عقیل اس کو غزوۃ العسرۃ کہتے تھے۔ اس بنا پر آنحضرتؐ نے صحابۂ کرام سے چندہ کی پُر زور اپیل کی۔ اس کے جواب میں حضرت عثمان غنی نے اس فیاضی سے کام لیا کہ سب سے آگے نکل گئے[۱] لیکن اس کے باوجود جو شرف حضرت ابوبکر صدیق کو حاصل ہوا وہ کسی کو نہ ہو سکا۔

---

[۱] تاریخ ابن عساکر ج ۱ ص ۱۰۱ - ابن عساکر کا بیان ہے کہ اس لشکر جرار کی تیاری اور اس کے ساز و سامان پر جتنا خرچ ہوا تھا حضرت عثمان نے اس کا ایک تہائی خرچ اپنے ذمہ لیا تھا۔ اس کے بعد کوئی ضرورت لشکر کی ایسی نہیں تھی جو پوری نہ ہو گئی ہو۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرطِ مسرت میں ارشاد فرمایا کہ اب اس کے بعد عثمان جو بھی کریں ان کو نقصان نہیں پہونچے گا۔ مایضر عثمان ما فعل بعد

حضرت عمر بن الخطاب کا بیان ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب چندہ کی اپیل کی تو اس وقت میرے پاس کافی مال تھا میں اُس کا نصف لیکر خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا اور اپنے دل میں کہا کہ اگر میں کسی دن ابوبکر پر بازی لیجا سکتا ہوں تو وہ دن آج کا ہی ہے۔ لیکن جب ابوبکر آئے تو جو کچھ اُن کے پاس تھا وہ سب اُٹھا لائے۔ حضورؐ نے پوچھا۔ "ابوبکر! تم نے اپنے گھر والوں کے لئے کیا چھوڑا؟ انھوں نے عرض کیا "بس! میں نے اُن کے لئے اللہ اور اس کے رسول کو چھوڑا ہے۔" حضرت عمر فرماتے ہیں" اب مجھکو یقین ہو گیا کہ میں حضرت ابوبکر سے کبھی سبقت نہیں لے جا سکتا۔[1]

ابن عساکر نے حضرت ابوبکر کے اس چندہ کی مقدار چار ہزار درہم بتائی ہے۔[2]

حضرت شاہ ولی اللہ الدہلوی لکھتے ہیں کہ اس غزوہ میں حضرت ابوبکر کی شرکت کی مندرجہ ذیل خصوصیات بھی ہیں۔

(۱) اسلامی فوج کا جائزہ لینے اور اس کی امارت کی خدمت آپ کے سپرد تھی۔

(۲) اثنائے سفر میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چند لوگوں کیساتھ ایک جگہ شب باشی کی اور لشکر سے دُور ہو گئے اس حالت میں زبان مبارک سے ارشاد فرمایا" اگر لشکر صدیق اور فاروق کی پیروی کرے گا تو راہ یاب ہوگا۔

اخرجہ مسلمؒ و قصۂ آں طولے دارد[3]

سریۂ بنو فزارہ جیسا کہ ہم پہلے لکھ آئے ہیں عام طور پر سرایا جو بھیجے جاتے تھے حضرت ابوبکر صدیق ان میں شریک نہیں ہوتے تھے اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہی مدینہ میں قیام فرماتے تھے۔ لیکن یہ کلیہ نہیں ہے بعض سرایا جو کسی حیثیت سے اہم ہوتے تھے

---

[1] جامع ترمذی باب مناقب ابی بکر الصدیق و ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ۔

[2] تاریخ ابن عساکر جلد اول ص ۱۱۰ [3] ازالۃ الخفا مقصد دوم ص ۱۶، ۱۷

حضرت ابوبکر کی سرکردگی میں جاتے تھے چنانچہ سنہ ۶ھ میں بنو فزارہ قبیلہ کی طرف جو سریہ گیا تھا عام روایت تو یہ ہے کہ حضرت زید بن حارثہ کی امارت میں گیا تھا لیکن سلمہ بن الاکوع سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت ابوبکر اس کے امیر تھے اور کامیاب واپس آئے تھے۔ قیدیوں میں فزارہ قبیلہ کی ایک عورت بھی تھی جو بہت خوبصورت تھی حضرت ابوبکر صدیق نے اس کو سلمہ بن الاکوع کو دے دیا تھا لیکن مدینہ پہونچنے پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت کو سلمہ سے مانگ لیا تھا اور جو مسلمان قیدی مکہ میں تھے ان کے فدیہ میں ان کو مکہ مکرمہ بھیجدیا۔ بنو فزارہ نہایت سرکش تھے اس سے پہلے حضرت زید بن حارثہ اور ان کے ساتھیوں کیساتھ نہایت برا معاملہ کرچکے تھے یہ سریہ اُن کی سرکوبی کرنیکے لئے گیا تھا[1]

اسی سال شعبان کے مہینہ میں بنو کلاب کی سرزنش کے لئے ایک سریہ بھیجا گیا۔ حضرت ابوبکر صدیق اس کے بھی امیر تھے۔[2]

امارتِ حج

مکہ مکرمہ سنہ ۸ھ میں فتح ہوا لیکن چونکہ اس کے بعد ہی غزوۂ حنین و طائف کی مہم پیش آگئی تھی اس بنا پر اس سال حج خالص اسلامی طریقہ پر ادا نہیں ہو سکا تھا۔ سنہ ۹ھ میں سب سے پہلا موقع تھا کہ کعبۃ اللہ کو کفر و شرک کی ظلمتوں سے بالکل پاک و صاف کردیا جائے اور ارکانِ حج سنتِ ابراہیمیؑ کے مطابق ادا ہوں۔ چنانچہ اس سال ذی قعدہ کے آخر یا ذی الحجہ کے اوائل میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین سو (۳۰۰) مسلمانوں کا ایک کاروان حج کے لئے روانہ فرمایا۔ حضرت ابوبکر اس کے میر کارواں یا امیر الحج تھے۔ کارواں کے ساتھ بیس اونٹ اور خود حضرت ابوبکر کے اپنے پانچ اونٹ بھی قربانی کے لئے ساتھ تھے۔

حضرت ابوبکر ابھی مقام عرج تک پہونچے تھے کہ انہیں پیچھے سے آنحضرت صلی اللہ

[1] طبری ج ۲ ص ۲۰۸ و صحیح مسلم باب التفصیل وفداء المسلمین بالاساری [2] زرقانی ج ۲ ص ۳۸۷

علیہ وسلم کی ناقہ حدعاد کے بلبلانے کی آواز آئی۔ کان تو اس مرکوب حبیب کی آواز سے آشنا تھے ہی۔ فوراً پہچان گئے۔ مڑ کر دیکھا تو حضرت علی ناقہ پر سوار چلے آرہے ہیں۔ حضرت ابوبکر کو خیال گزرا کہ شاید مدینۂ منورہ سے اُن کی روانگی کے بعد کوئی وحی آئی ہو اور اس کی وجہ سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امارت حج سے متعلق اپنا پہلا فیصلہ بدل دیا ہو۔ اس لئے حضرت علی سے پوچھا کہ آپ امیر ہو کر آئے ہیں یا قاصد بن کر" حضرت علی نے جواب دیا۔ "قاصد ہو کر' سورۂ برأت کی چالیس آیتیں ہیں جن کے ساتھ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو بھیجا ہے تاکہ میں حج کے موقعہ پر اُن کا اعلان کر دوں" [1]

اب سب لوگ روانہ ہوئے حج کا زمانہ آیا تو حضرت ابوبکر نے یوم ترویہ (۸ ذی الحجہ) یوم عرفہ (۹ ذی الحجہ) اور یوم نحر (۱۰ ذی الحجہ) تینوں دن امیر حج کی حیثیت سے خطبہ پڑھا اور حضرت علی نے سورۂ براءۃ کی آیتوں کا اعلان عام کیا۔ منادی کرنیوالوں میں حضرت ابوہریرہ بھی تھے جو اس زور سے منادی کرتے پھرتے تھے کہ گلا بیٹھ بیٹھ جاتا تھا اعلانِ عام کے الفاظ یہ تھے۔

اس سال کے بعد نہ تو کوئی مشرک حج کریگا اور نہ کوئی برہنہ ہو کر طواف کرے گا۔ [2]

---

[1] طبری ج ۲ ص ۳۸۲ پر ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت ابوبکر مقام ذوالحلیفہ سے خود واپس ہو کر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہونچے اور دریافت کیا کہ کیا میرے متعلق کوئی وحی آئی ہے۔ ارشاد ہوا کہ نہیں لیکن جس چیز (یعنی سورۂ براوت کی وہ ابتدائی آیات جن میں فرمایا گیا ہے کہ جن مشرکوں کیساتھ معاہدہ ہے اور انھوں نے نقض عہد بھی نہیں کیا ہے ان کو چار مہینہ کی مہلت دیجاتی ہے۔ اس کے بعد ان کو مکہ میں رہنے اور طواف کرنے کی اجازت نہیں دیجائیگی) کی تبلیغ ضروری ہو تو یا تو میں خود اُس کی تبلیغ کروں گا یا میرا ہی کوئی اپنا کریگا۔ اے ابوبکر کیا تم اس پر راضی نہیں ہو۔ درانحالیکہ تم میرے رفیق غار ہو اور حوض پر (قیامت کے دن) میرے ساتھی ہو' حضرت ابوبکر نے عرض کیا "کیوں نہیں یا رسول اللہ" اسکے بعد حضرت ابوبکر امیر حج اور حضرت علی نقیب بنکر روانہ ہو گئے۔ [2] صحیح بخاری ج ۲ ص ۲۶۶ و ص ۶۷۱ و سنن نسائی ج ۲ ص ۴۲

حجۃ الوداع نبوی | ماہ ذی قعدہ ۱۰ھ میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم حج کیلئے تشریف لے گئے جس کو حجۃ الوداع بھی کہتے ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق بھی اس سفر میں ہم رکاب تھے اور خصوصیت یہ تھی کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سامان سفر حضرت ابوبکر کی اونٹنی پر ہی بار تھا۔ حضرت اسماءؓ اس سفر کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتی ہیں کہ ہم سب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیساتھ حج کرنے جارہے تھے اور ایک ہی اونٹ تھا۔ جس پر حضورؐ اور ہم سب کا سامان لدا ہوا تھا۔ مقام عرج میں پہونچے تو حضور سواری سے اُتر کر بیٹھ گئے۔ حضرت عائشہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں بیٹھی ہوئی تھیں اور میں اپنے والد کے پہلو میں تھی۔ جس اونٹ پر سامان بار تھا وہ حضرت ابوبکر کے ایک ملازم کی تحویل میں تھا۔ کافی انتظار کے بعد جب یہ ملازم منزل پر پہنچا تو حضرت ابوبکر نے پوچھا "اونٹ کیا ہوا؟" وہ بولا "گزشتہ شب میں گم ہوگیا۔ حضرت ابوبکر نے فرمایا" ایک ہی تو اونٹ تھا وہ بھی تو نے گم کردیا" اور یہ کہہ کر اُسے مارنا شروع کردیا آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ دیکھ کر مسکراتے جاتے اور فرماتے جاتے تھے کہ ذرا اُس مُحرِمْ (حج کا احرام باندھنے والا) کو تو دیکھو کیا کر رہا ہے[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف اسی قدر فرمایا اور وہ بھی مسکراتے ہوئے اور حضرت ابوبکر کو مارنے سے منع نہیں فرمایا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ضرب شدید نہیں تھی۔ اور حضرت ابوبکر نے یوں ہی معمولی طریقہ پر دو چار طمانچے لگا دیئے ہوں گے۔

[1] مسند امام احمد بن حنبل ج ۶ ص ۳۴۴

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات

اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ

تکمیلِ فرض کا اعلان | حجۃ الوداع کے موقع پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نہایت عظیم الشان خطبہ ارشاد فرمایا جس میں اسلامی دستورِ حیات کے نہایت اہم اصولوں کی روشنی ڈالی تھی اور ان پر سختی سے عمل پیرا ہونے کی تاکید کی تھی یہ گویا نبوت کے فرض کی تکمیل کا اعلان تھا۔ چنانچہ خطبہ کے آخر میں آپ نے دریافت فرمایا۔

"کیا میں نے خدا کے احکام تم تک پہونچا دئے ہیں؟" سب نے یک زبان ہو کر کہا "بیشک" آپ نے فرمایا۔ "اللھم اشھد" اے اللہ تو گواہ رہ۔[1] اسی دن عرفات میں یہ آیت اُتری۔[2]

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ	آج میں نے تمہارا دین تمہارے لئے مکمل کر دیا اور
عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ	اپنی نعمت تمہارے اُوپر پوری کر دی اور تمہارے دین
الْاِسْلَامَ دِیْنًا" (مائدہ)	کے اعتبار سے اسلام کو پسند کیا ہے۔

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۵ ص ۱۹۶ مناقب ابی بکر عبداللہ بن ابی قحافہ۔

[2] صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۶۲

حضرت ابوبکر کا اندیشہ

مدینہ طیبہ واپس آکر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خطبہ دیا جس میں یہ بھی ارشاد فرمایا "اللہ نے ایک بندہ کو دُنیا میں اور اُس چیز میں جو اللہ کے پاس ہے اختیار دیا کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو پسند کرلے۔ اس بندہ نے مَا عِنْدَ اللّٰہِ یعنی قربِ خداوندی کو اختیار کرلیا۔

حضرت ابوبکر یہ سنتے ہی رونے لگے۔ صحابۂ کرام کو سخت حیرت ہوئی کہ اس میں رونے کی کیا بات تھی؟ لیکن حضرت ابوبکر صدیق جو کہ محرمِ اسرارِ نبوت اور رمز شناسِ کلامِ رسالت تھے [1] فوراً سمجھ گئے تھے کہ یہ بندہ خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارک ہے اور اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آپ کی دنیا سے رحلت کا وقت قریب آپہونچا ہے۔

آغازِ مرض

چنانچہ اس واقعہ کے چند روز بعد ہی ایک دن آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم جنت البقیع سے تشریف لائے تو آپ کے سر میں شدید درد تھا۔ گھر میں داخل ہو کر حضرت عائشہ کو دیکھا کہ اتفاق سے وہ بھی دردِ سر کے مارے کراہ رہی ہیں۔ لیکن اس حالت میں بھی آپ ہر بیوی کے ہاں باری باری سے جاتے رہے۔ آخر حضرت میمونہ کی باری کے دن تکلیف زیادہ شدید ہوگئی تو ازواجِ مطہرات نے حضور کا ایما پاکر آپ کو حضرت عائشہ کے حجرہ میں ہی قیام فرمانے کی اجازت دیدی۔ لیکن اسوقت تک ضعف اس قدر بڑھ گیا تھا کہ آپ یہاں تشریف لائے تو اس طرح کہ سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ چلا جاتا نہیں تھا اور دو شخص حضرت فضل بن عباس اور حضرت علی آپ کو تھامے ہوئے تھے۔ [2]

حضرت ابوبکر کو امامتِ صلوٰۃ کا حکم

جب تک آمد و رفت کی طاقت رہی آپ مسجد میں نماز پڑھانے تشریف لاتے رہے لیکن جب اس سے بھی معذوری ہوگئی تو حضرتِ عائشہ

---

[1] بخاری ج ۱ ص ۵۱۶ [2] البدایہ والنہایہ ج ۵ ص ۲۲۴

سے فرمایا ابوبکر سے کہو کہ نماز پڑھائیں" حضرت عائشہ نے عرض کیا "ابوبکر رقیق القلب ہیں۔ جب وہ آپ کی جگہ کھڑے ہوں گے تو فرطِ گریہ سے ان کی آواز کسی کو سنائی نہ دیگی۔ اس لئے عمر کو حکم کیجئے کہ وہ نماز پڑھائیں۔ ساتھ ہی حضرت عائشہ کے کہنے پر حضرت حفصہ نے بھی اپنے والد حضرت عمر کی سفارش کی۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی عذر قبول نہیں فرمایا اور پھر اصرار کے ساتھ حکم دیا کہ ابوبکر سے ہی کہو نماز پڑھائیں اور حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ سے بگڑ کر فرمایا "تم انھیں عورتوں میں سے ہو جنھوں نے یوسف کو جُل دیا تھا"

حضرت حفصہ نے حضرت عائشہ سے یہ سنکر کہا "بھلا مجھ کو تمہاری طرف سے کوئی خیر کیوں پہونچنے لگا؟"[1]

اس حکم کے مطابق حضرت ابوبکر تین دن تک[2] نماز پڑھاتے رہے۔ آخر ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ افاقہ محسوس ہوا، حجرہ سے باہر نکل کر خود تشریف لائے۔ حضرت ابوبکر نماز شروع کر چکے تھے۔ حضور کو دیکھ کر پیچھے ہٹنے لگے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ سے منع فرمایا اور خود حضرت ابوبکر کے پہلو میں بیٹھ گئے۔ اب حضرت ابوبکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی، اور دوسرے نمازی حضرت ابوبکر کی اقتدا کر رہے تھے۔

ایک روز حسب معمول نماز پڑھانے کے لئے حضرت ابوبکر آگے بڑھ رہے تھے کہ دفعۃً حجرۂ نبوی کا پردہ اٹھا اور حضور پُر نور کا روئے مبارک دا نو نظاہر ہوا۔ شمعِ رسالت کے پروانوں کی خوشی کی حد نہ رہی۔ حضرت ابوبکر پیچھے ہٹنے لگے۔ حضور نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور انھوں نے نماز پڑھانی شروع کر دی۔ حضور باہر تشریف لانا چاہتے تھے لیکن ایسا کرنا ممکن

---

[1] صحیح بخاری ج ۱ ص ۹۳ [2] یہ صحیح بخاری کی روایت ہے ابن سعد نے فضیل بن عمرو الفقیمی سے ایک روایت نقل کی ہے کہ حضرت ابوبکر نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں تین مرتبہ نماز پڑھائی۔ لیکن اس روایت کو نقل کرنیکے بعد ابن سعد خود ہی فرماتے ہیں کہ ان تین نمازوں سے وہ نمازیں مراد ہیں جن میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود حضرت ابوبکر کی اقتدا کی تھی ورنہ یوں تو انھوں نے سترہ مرتبہ نماز پڑھائی (ابن سعد تذکرہ حضرت ابوبکر)

نہ ہوسکا۔ پھر واپس اندر چلے گئے اور پردہ گرا لیا[1] حافظ عماد الدین ابن کثیر نے لکھا ہے کہ یہ آخری نماز جو حضرت ابوبکر نے پڑھائی نمازِ فجر تھی[2]

وصالِ نبویؐ صحابۂ کرام جن کے دل محبوبِ انس و جان کی شدید علالت کے باعث مرجھائے ہوئے تھے۔ رُوئے منور کی ایک جھلک دیکھ کر خوشی سے شگفتہ ہو گئے لیکن انہیں کیا خبر تھی کہ یہ آخری جلوۂ عام اور آفتاب لبِ بام تھا۔[3]

حضرت ابوبکر نماز سے فارغ ہو کر حضرت عائشہ کے حجرہ میں آئے۔ چونکہ حضور کو قدرے افاقہ تھا اور درد کی شدت میں کمی محسوس ہوتی تھی اس لئے حضرت عائشہ سے اجازت لیکر مقام سنح چلے گئے جہاں اُن کی بیوی حبیبہ بنت خارجہ رہتی تھیں۔ یہاں جب چاشت چڑھی تو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم رحلت گزائے عالم جاودانی ہو کر رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے۔ سالم بن عبید کے ذریعہ حضرت ابوبکر کو اس حادثۂ فاجعہ کی خبر پہونچی فوراً گھوڑے پر سوار ہو کر مدینہ آئے۔ یہاں مسجدِ نبوی میں لوگوں کا ہجوم تھا۔ آپ نے کسی سے کوئی بات نہیں کی۔ سیدھے گھر میں تشریف لائے جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک یمنی نقش و نگار کی چادر اوڑھے استراحت فرما تھے۔ جسدِ اطہر کے قریب کھڑے ہو کر رُخِ روشن سے چادر اُٹھائی۔ اس پر جھکے بوسہ دیا اور روئے اور پھر آپؐ کو خطاب کر کے اس طرح گویا ہوئے۔

بابی انت وامی طبت حیاً ومیتاً	میرے ماں اور باپ دونوں آپ پر فدا ہوں۔ آپ
والذی نفسی بیدہ لا	زندگی میں بھی پاک صاف ہے اور اب موت کے بعد بھی
یذیقك اللہ الموتتین ابداً	پاک و صاف ہیں جس کے ہاتھ میں میری جان ہے
اما الموتۃ التی کتب اللہ	اس کی قسم کہ اللہ آپ کو ہرگز دو موتیں نہیں دیگا۔ وہ
علیك فقد مُتّھا	موت جو اللہ نے آپکے لئے مقدر کی تھی وہ تو آپ کو آہی گئی۔

[1] صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۴۰۔ [2] البدایۃ والنہایۃ ج ۵ ص ۲۳۴ [3] صحیح بخاری ج ۱ ص ۹۴

اس کے بعد مسجد میں تشریف لائے تو یہاں عجیب کہرام مچا ہوا تھا۔ حضرت عمرؓ کھڑے ہوئے قسم کھا کھا کر کہہ رہے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات نہیں ہوئی۔ جیسا کہ خود اُن کا بیان ہے انہیں یہ بات یاد ہی نہیں ہوتی تھی کہ حضور کی وفات ہو بھی سکتی ہے۔ حضرت ابوبکر نے انہیں سمجھایا اور کہا کہ بیٹھ جاؤ۔ مگر وہ نہ مانے۔ پھر کہا مگر وہ اب بھی نہیں مانے آخر حضرت ابوبکر نے فرمایا "اے قسم کھانے والے! ذرا ٹھہر اور جلدی نہ کر" حضرت عمرؓ اب بیٹھ گئے تو آپ نے تقریر شروع کی۔ پہلے اللہ کی حمد وثنا بیان کی اور پھر فرمایا

اَلا من کان یعبد محمداً	جو شخص محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پوجا کرتا تھا
فَاِن محمداً صلی اللہ علیہ	وہ سُن لے کہ بے شبہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی موت
وسلم قد مات ومن کان	واقع ہوگئی۔ مگر ہاں جو شخص اللہ کی بندگی کرتا ہے
یَعبُدُ اللّٰہ فان اللّٰہ حی لا یموت	تو بیشک اللہ زندہ ہے اور اُس کیلئے موت نہیں ہے۔

اس کے بعد آپ نے حسب ذیل آیات تلاوت کیں۔

(۱) اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ ۔ اے محمدؐ آپ کو بھی موت آنی ہے اور بے شبہ وہ بھی مرنے والے ہیں۔

(۲) وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ	اور محمدؐ نہیں ہیں مگر اللہ کے ایک رسول جن سے پہلے بھی اور
مِنْ قَبْلِہِ الرُّسُلُ اَفَاْئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ	رسول گزر چکے ہیں پس اگر ان کو موت آجائے یا وہ قتل کردئیے
انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓی اَعْقَابِکُمْ وَمَنْ یَّنْقَلِبْ	جائیں تو کیا تم اپنی ایڑیوں کے بل پیچھے کو لوٹ جاؤگے اور
عَلٰی عَقِبَیْہِ فَلَنْ یَّضُرَّ اللّٰہَ شَیْئاً	جو شخص ایسا کرے گا تو وہ اللہ کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتا
وَسَیَجْزِی اللّٰہُ الشَّاکِرِیْنَ ۔	اور اللہ شکر کرنے والوں کو عنقریب جزا دے گا۔

یہ سُن کر لوگ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے مگر ساتھ ہی ایسا محسوس ہوا کہ گویا یہ آخری آیت انہیں معلوم ہی نہیں تھی۔ اب حضرت ابوبکر نے اس کی تلاوت کی تو ان کی آنکھوں سے پردہ اُٹھ گیا اور اس قدر موثر و دل نشین ثابت ہوئی کہ ہر شخص اسکو ہی پڑھ رہا تھا [۱]

[۱] امام بخاری نے اس روایت کو جو حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کچھ لفظوں کے ردو بدل (باقی ص۶۲ پر دیکھئے)

سقیفۂ بنی ساعدہ | یہاں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز و تکفین کی تیاریاں ہو رہی تھیں اور اُدھر منافقین کی ریشہ دوانی نے یہ گل کھلایا کہ انصار سقیفۂ بنی ساعدہ میں جو ان کا دار المشورہ یا دار الندوہ تھا جمع ہوئے اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشین کی بحث چھیڑ دی۔ سعد بن عبادہ مشہور انصاری ہیں۔ غزوات میں انصار کا علَم انہیں کے ہاتھ میں رہتا تھا انصار کا خیال تھا کہ خلیفۂ رسولؐ ان کو ہونا چاہیے۔ ان کے علاوہ کچھ اور لوگ تھے جو کہتے تھے کہ بجائے ایک امیر کے دو امیر ہوں۔ ایک انصار سے اور دوسرا مہاجرین سے۔

ظاہر ہے کہ یہ دوسری شکل تو کسی طرح بھی قابلِ عمل نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کے قبول کرنے سے اسلامی وحدت کا شیرازہ ہمیشہ کیلئے منتشر ہو جاتا۔ اب رہی پہلی صورت تو اس میں اشکال یہ تھا کہ قریش جو عرب میں سب سے زیادہ با اقتدار تھے اور جن میں موروثی طور پر امارت و ریاست کے اوصاف و کمالات بہ نسبت دوسروں کے زیادہ پائے جاتے تھے یہاں تک کہ خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے الائمۃ من قریش ۔ امام تو قریش میں ہی پیدا ہوتے ہیں" فرما کر قریش کی اس خصوصیت و امتیاز پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی تھی۔ وہ امارت سے محروم ہو جاتے اور اس کا نقصان یقیناً اسلامی معاشرہ کو پہنچتا۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ انصار نے اسلام کی اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جو خدمات انجام دی تھیں وہ بھی بہت عظیم الشان تھیں اور اُن کے فضائل و مناقب کا باب بہت وسیع تھا۔ پھر مہاجرین میں بھی قریش کا ایک گروہ جس میں ابو سفیان تھے اپنے سامنے کسی کو نظر میں نہیں لاتا تھا۔ جہاں تک انصار کا تعلق ہے ان میں بھی دو قبیلے تھے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۱) اور کمی بیشی کے ساتھ اپنی صحیح میں دو جگہ نقل کیا ہے۔ ایک باب الدخول علی المیت بعد الموت اذا ادرج فی اکفانہ کے تحت اور دوسرے باب مناقب المہاجرین و فضائلہم کے زیرِ عنوان۔ ہم نے دونوں کو جمع کر دیا ہے۔

اوس اور خزرج ان میں باہمی رقابت اور منافست مدت سے چلی آرہی تھی اسلام قبول کرنیکے بعد یہ کم ضرور ہوئی تھی لیکن معدوم نہیں ہوئی اس بنا پر اسلام کی وحدتِ اجتماعی کے لیئے یہ انتہائی نازک وقت تھا اور خلافت کے معاملہ کو کامیابی کے ساتھ حل کرلینے پر ہی اس کی بقا کا دار و مدار تھا۔ آخر اس عقدہ لاینحل کی گرہ کشائی بھی حضرت ابوبکر صدیق کے ناخنِ تدبیر سے ہوئی اور اسلام میں جو رخنہ اور فتنہ پیدا ہو رہا تھا اس کا سد باب ہوگیا۔

چنانچہ[1] حضرت ابوبکر صدیق کو اس ہنگامہ آرائی کی اطلاع ہوئی تو سب کو چھوڑ چھاڑ حضرت عمر اور حضرت ابو عبیدۃ بن الجراح جو امین ہٰذا الامۃ کے لقب سے سرفراز تھے ان کو ساتھ لے سقیفۂ بنی ساعدہ پہونچے یہاں دیکھا کہ عجیب ہنگامہ اور شور و غل برپا ہے جب یہ تینوں بیٹھ گئے تو انصار کا ایک خطیب کھڑا ہوا اور اس نے کہنا شروع کیا۔

"ہم اللہ کے انصار اور اسلام کے لشکر ہیں اور اے مہاجرین تم ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی (رھط) ہو۔ لیکن اب تم ہم سے برگشتہ ہوگئے ہو اور جو ہمارا مقام ہے اس سے ہم کو الگ کرنا چاہتے ہو۔"

یہ تقریر ختم ہوئی تو حضرت عمر نے بولنا چاہا لیکن حضرت ابوبکر صدیق نے انہیں روکدیا اور خود کھڑے ہوکر ایک تقریر کی جس کا ہر ہر لفظ فصاحت و بلاغت کی جان تھا۔ خود

---

[1] فتح الباری ج ۷، ص ۲۲ پر مسند ابویعلی سے روایت ہے کہ حضرت ابوبکر۔ حضرت عمر اور سب آلِ بیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز و تکفین میں مصروف تھے کہ ایک شخص نے دیوار کے پیچھے سے حضرت عمر کو آواز دیکر کہا کہ ذرا باہر تو آیئے فاروق اعظم نے جواب دیا "چلو ہٹو"! ہم آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ ہم کو فرصت نہیں اب یہ شخص بولا "ارے دیکھیے بڑا غضب ہوگیا۔ انصار سقیفۂ بنی ساعدہ میں جمع ہیں۔ آپ ذرا چل کر ان کی خبر لیجئے قبل اس کے کہ وہ کوئی ایسی چیز کھڑی کردیں جو جنگ کا باعث ہو" یہ سن کر حضرت عمر نے صدیق اکبر سے کہا چلئے اور وہ روانہ ہوگئے۔

حضرت عمرؓ کا بیان ہے کہ میں اس موقعہ کیلئے ایک بہت اچھی تقریر سوچ ساچ کے اور پہلے سے اس کو اپنے دماغ میں تیار کر کے گیا تھا اور خیال یہ تھا کہ ابو بکرؓ ایسی تقریر نہیں کر سکیں گے لیکن جب ابو بکرؓ خود کھڑے ہوئے تو انھوں نے وہ سب باتیں فی البدیہہ اور انتہائی بلاغت کے ساتھ کہہ ڈالیں جن کو میں غور و فکر کے بعد اپنے دماغ میں جما کرلے گیا تھا۔

حضرت ابو بکر کی تقریر | حضرت ابو بکر صدیقؓ نے حمد و صلوٰۃ کے بعد اپنی تقریر میں پہلے تو مہاجرین کے فضائل اسلام کے لئے ان کی غیر معمولی قربانیوں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیساتھ رشتہ و قرابت کا ذکر کیا اور اس کے بعد فرمایا "اے انصار تم جو کچھ اپنے متعلق کہتے ہو بیشک تم اس کے اہل ہو اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیساتھ بھی تم کو بڑا گہرا تعلق تھا آپکی بعض عزیز ازواج مطہرات تم ہی میں سے تھیں[1] لیکن عرب اس معاملہ میں سوائے قبیلۂ قریش کے اور کسی کی اطاعت قبول نہیں کریں گے۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ اور حضرت ابو عبیدہؓ کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا کہ لو ان میں سے کسی ایک کے ہاتھ پر بیعت کر لو۔[2]

---

[1] ابن جریر طبری ج ۲ ص ۴۵۷۔ طبری نے سقیفۂ بنی ساعدہ کے اس جلسہ کی اور اس میں جو تقریریں ہوئیں ان سب کی مفصل روداد قلم بند کی ہے لیکن ہم نے غیر ضروری تفصیلات کو نظر انداز کر دیا ہے۔ [2] صحیح بخاری جلد دوم ص ۱۰۰۹ امام بخاری نے یہ ساری داستان خود حضرت عمر فاروقؓ کی زبانی سنائی ہے۔ حضرت ابو بکرؓ نے خلافت کے لئے جب حضرت عمرؓ کا نام پیش کیا تو خود حضرت عمرؓ کا بیان ہے کہ میرے لئے یہ حد درجہ ناگوار بات تھی۔ خدا کی قسم! بغیر کسی گناہ کے میری گردن اڑا دی جاتی یہ بات میرے لئے بہت آسان تھی۔ بہ نسبت اس کے کہ میں ایک ایسی قوم کا امیر بنتا جس میں کہ ابو بکرؓ موجود ہوں۔ حضرت ابو بکرؓ نے دوسرا نام حضرت ابو عبیدہ بن الجراحؓ کا پیش کیا تھا۔ ان کے متعلق ابن سعد نے ایک روایت نقل کی ہے کہ جب بعض لوگوں نے ان سے بیعت کرنی چاہی تو انھوں نے فرمایا ——— "تم لوگ میرے پاس آتے ہو حالانکہ تم میں ثالث ثلاثہ (رفاقت غار ثور کی طرف اشارہ ہے) یعنی حضرت ابو بکرؓ موجود ہیں۔ (ابن سعد تذکرۂ حضرت ابو بکرؓ) صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۱۸ باب مناقب المہاجرین)

اس پر شور و شغب زیادہ بڑھنے لگا اور انصار کی طرف سے حباب بن منذر نے سخت کلامی کی تو حضرت عمرؓ نے پیش قدمی کر کے حضرت ابو بکرؓ سے کہا کہ نہیں! ہم آپ کے ہاتھ پر بیعت کریں گے۔ کیونکہ آپ ہم سب سے بہتر ہیں ہمارے سردار ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ آپ سے ہی محبت کرتے تھے۔ یہ کہکر حضرت عمرؓ نے حضرت ابو بکرؓ کا ہاتھ پکڑ لیا اور بیعت کی۔ حضرت عمرؓ کا بیعت کرنا تھا کہ مہاجرین اور انصار سب نے ہاتھ بڑھا دیئے[1]

ابن اسحاق کی ایک روایت ہے کہ بشیر بن سعد الانصاری نے حضرت عمرؓ سے بھی پہلے بیعت کی تھی[2] لیکن دونوں روایتوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ کیونکہ اس قدر ہجوم کے موقع پر اوّل تو اس کا ٹھیک پتہ چلنا مشکل ہے کہ کس نے سبقت کی اور پھر یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت عمرؓ مہاجرین میں سب سے پہلے بیعت کرنیوالے ہوں اور حضرت بشیر بن سعد نے انصار میں سب سے پہلے بیعت کی ہو۔

سقیفۂ بنی ساعدہ کے ہنگامہ سے فارغ ہو کر کاشانۂ اقدس پر حاضر ہوئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تدفین میں شریک ہوئے۔ یہاں صحابۂ کرام میں اختلاف تھا کہ کہاں دفن کیا جائے۔ حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث سُنی ہے جس کو میں نہیں بھولا ہوں اور وہ یہ ہے کہ

ما قبض اللہ نبیاً الا فی الموضع الذی	اللہ کسی نبی کی روح اسی جگہ قبض کرتا ہے
یُحب ان یدفن فیہ	جہاں اس کو دفن ہونا محبوب ہوتا ہے۔

اس کے بعد آپ نے فرمایا " ادفنوہ فی موضع فراشہ " تم لوگ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کی اسی خواب گاہ میں دفن کرو" چنانچہ ایسا ہی ہوا۔[3]

---

[1] صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۱۸ وجلد دوم ص ۱۰۰۹ باب رجم الحبلی من الزنا اذا احصنت [2] البدایۃ والنہایۃ ج ۵ ص ۲۴۷

[3] شمائل ترمذی مطبوعہ کانپور ص ۳۰۔

بیعتِ عامہ سقیفۂ بنی ساعدہ میں تو چند لوگوں نے بیعت کی تھی۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے دوسرے دن یعنی بروز سہ شنبہ ۱۳ ربیع الاول ۱۱ھ مطابق ۲۸ مئی ۶۳۲ء مسجد نبوی میں بیعتِ عامہ کا انتظام کیا گیا۔ سب مسلمان جمع ہوئے پہلے حضرت عمر فاروق نے منبر پر بیٹھ کر خطبہ دیا اور فرمایا کہ "میں امید کرتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم لوگوں کے بعد تک زندہ رہیں گے لیکن اب اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) وفات پا گئے ہیں تو خیر! اللہ نے تمہارے سامنے ایک ایسا نور رکھ دیا ہے جس سے تم وہی ہدایت حاصل کر سکتے ہو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کرتے تھے۔ بے شبہ ابوبکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی اور غار کے رفیق ہیں مسلمانوں میں سب سے زیادہ بہتر تم لوگوں کے معاملات کی سربراہی کے لئے وہ ہی ہیں۔ پس کھڑے ہو اور ان سے بیعت کرو" حضرت عمر تقریر سے فارغ ہوئے تو حضرت ابوبکر سے جو خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ بولے "آپ منبر پر تشریف لائیے لیکن صدیق اکبر کو جنبش نہ ہوئی۔ آخر جب کئی مرتبہ کہا تو آپ منبر پر چڑھے اور مسلمانوں نے آپ سے بیعت کی[1] یہ بیعت عامہ تھی۔

پہلا خطبہ اس کے بعد آپ نے ایک خطبہ ارشاد فرمایا۔ جس کی نسبت ابن سعد نے نقل کیا ہے کہ ایسا خطبہ پھر کبھی کسی کی زبان سے سننے میں نہیں آیا۔ اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء اور درود وسلام کے بعد فرمایا۔

اما بعد ایها الناس فانی قد ولیت علیکم	لوگو! میں تمہارا امیر بنا دیا گیا ہوں، حالانکہ میں تم سے بہتر
ولست بخیرکم فان أحسنت فاعینونی	نہیں ہوں۔ پس اگر میں اچھا کروں تو تم میری مدد کرو اور
وان أسات فقوّمونی - الصدق امانۃ	اگر برا کروں تو مجھ کو سیدھا کر دو۔ سچائی ایک امانت ہے،

۱؎ صحیح بخاری ج ۲ ص ۱۰۷۲ باب الاستخلاف۔

والكذب خيانة - والضعيف	اور جھوٹ خیانت ہے تم میں جو کمزور ہے وہ
منكم قوى عندى حتى أزيح علته	میرے نزدیک قوی ہے۔ چنانچہ میں اس کا شکوہ
ان شاء الله - والقوى فيكم ضعيف	دُور کر دوں گا۔ اور تم میں جو قوی ہے وہ میرے
حتى آخذ منه الحق ان شاء الله	نزدیک کمزور ہے۔ چنانچہ میں اس سے حق لوں گا۔
لا يدع قوم الجهاد فى سبيل الله	جو قوم جہاد کو چھوڑ دیتی ہے اللہ اس پر ذلت کو
الا ضربهم الله بالذل - ولا يشيع	مسلط کر دیتا ہے اور جس قوم میں بُری باتیں عام
قوم قط الفاحشة الا عمهم الله	ہو جاتی ہیں اللہ اُن پر مصیبت کو مستولی کر دیتا ہے
بالبلاء - اطيعونى ما اطعت الله	جب تک میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت
ورسوله - فاذا عصيت الله ورسوله	کروں تم میری اطاعت کرو۔ اور جب میں اللہ اور اُس کے
فلا طاعة لى عليكم قوموا الى	رسول کی نافرمانی کروں تو تم پر میری کوئی اطاعت
صلوتكم - يرحمكم الله [1]	فرض نہیں ہے۔ اچھا اب جاؤ نماز پڑھو اللہ تم پر رحم فرمائے۔

متخلفین

سیر و تاریخ کی کتابوں میں بعض ایسی شخصیتوں کے نام بھی ملتے ہیں جن کی نسبت مورخین عام طور پر لکھتے ہیں کہ انھوں نے حضرت ابوبکر سے اُس دن بیعت نہیں کی تھی ان میں سب سے اہم نام حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کا ہے ان کے بعد دوسرے نمبر پر حضرت زبیر بن عوام اور مشہور انصاری حضرت سعد بن عبادہ کے نام ہیں۔ اگرچہ یہ ایک نہایت اہم معاملہ ہے جو دین کے لئے بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن نہایت افسوس کی بات ہے کہ مورخین نے اس کو چنداں اہمیت نہیں دی اور وہ اس پر سرسری

[1] البداية والنهاية ج ۵ ص ۲۴۸

کلام کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ ہم ان تینوں بزرگوں میں سے ہر ایک کی نسبت الگ الگ کلام کرتے ہیں۔

حضرت علی کی بیعت

حضرت علی کی نسبت عام خیال یہ ہے کہ آپ نے چھ ماہ یعنی حضرت فاطمہ کی وفات تک خلیفۂ اول سے بیعت نہیں کی اور ناراض ہوئے گھر میں بیٹھے رہے۔ آخر جب حضرت فاطمہ بھی رہ گزائے عالم آخرت ہوگئیں تو آپنے اور آپ کے ساتھ بنی ہاشم نے جو حضرت علی کے مکان میں مقیم تھے، حضرت ابوبکر کو مکان میں بلایا۔ یہاں حضرت علی اور حضرت ابوبکر دونوں میں گفتگو ہوئی۔ شکوے شکایت ہوئے اور آخر جب صلح صفائی ہوگئی تو حضرت علی نے بیعت کی۔ مسلمانوں کو جب یہ خبر ملی تو بڑے خوش ہوئے

عام مورخین اور ارباب سیر کی اس روایت کا سرچشمہ دراصل صحیح بخاری کی روایت ذیل ہے۔

عن عائشہ ان فاطمۃ بنت النبی	حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ فاطمہ نے
صلی اللہ علیہ وسلم ارسلت	ابوبکر کے پاس پیغام بھیجا کہ وہ چیزیں
الی ابی بکر تسئلہ میراثہا من	جو اللہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	مدینہ میں دی تھیں اور فدک اور خیبر کے ⅕
مما افاء اللہ علیہ بالمدینۃ	کا جو کچھ بچا ہوا ہے اُن میں سے جو
وفدک وما بقی من خمس خیبر	میری میراث ہے وہ مجھ کو دید یجئے۔
فقال ابوبکر ان رسول اللہ صلی اللہ	حضرت ابوبکر نے جواب دیا کہ آنحضرت
علیہ وسلم قال۔	صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ہمارا کوئی وارث
لا نورث ما ترکنا صدقۃ انما	نہیں۔ جو کچھ ہم چھوڑ جائیں گے وہ صدقہ ہوگا

يأكل آلُ محمّد في هذا المال وانّي
والله لا أغيّرُ شيئاً من صدقة رسول
الله صلى الله عليه وسلّم عن حالها
التي كان عليها في عهد رسول الله
صلى الله عليه وسلم ولأعملن فيها
بما عمل به رسول الله صلى الله عليه
وسلم فابى ابوبكر ان يدفع الى
فاطمة منها شيئاً فوجدت فاطمة
على ابي بكر في ذالك فهجرته فلم
تكلمه حتى توفيت وعاشت
بعد النبي صلى الله عليه وسلم
ستة اشهر فلما توفيت دفنها
زوجها علي ليلاً ولم يؤذن بها
ابابكر وصلى عليها وكان لعلي وجهٌ
حياةَ فاطمة فلما توفيت استنكر
علي وجوه الناس فالتمس مصالحة
ابي بكر ومبايعته ولم يكن يبايع
تلك الاشهر فارسل الى ابي بكر
ان ائتنا ولا يأتنا احدٌ معك
كراهيةً ليحضر عمر فقال عمر لا
والله لا تدخل عليهم وحدك

اور آلِ محمد بھی اُسی میں سے کھائیں گے۔
قسم اللہ کی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا
صدقہ آپکی زندگی میں جس حالت پر تھا میں اُس
میں کوئی تغیر نہیں کروں گا۔ اور میں اُس سے
متعلق وہی عمل کروں گا جو آں حضرت صلی اللہ
علیہ وسلم نے کیا تھا۔ یہ کہہ کر ابوبکر نے فاطمہ
کو اُن چیزوں میں سے کوئی بھی چیز دینے سے
انکار کردیا۔ اس پر فاطمہ ابوبکر سے ناراض ہوگئیں
انھوں نے اُن کو چھوڑ دیا اور وفات پانے
تک اُن سے کلام نہیں کیا۔ فاطمہ آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد چھ مہینے زندہ رہیں
جب اُن کی وفات ہوئی تو اُن کے شوہر علی
نے رات ہی کو انہیں دفن کردیا اور ابوبکر کو
اسکی خبر نہیں کی اور علی نے انکی نماز پڑھی۔ فاطمہ کی
زندگی میں علی کا بڑا وقار تھا لیکن جب فاطمہ کی وفات
ہوگئی تو علی نے محسوس کیا کہ اب لوگوں کے دلوں میں
وہ پہلی سی بات نہیں رہی۔ اسلئے انہوں نے ابوبکر
سے صلح کرلینی اور ان سے بیعت کرنی چاہی اور
انھوں نے ان مہینوں میں بیعت نہیں کی تھی۔
چنانچہ علی نے ابوبکر کو گھر بلایا اور ساتھ ہی یہ بھی
کہلا بھیجا کہ آپ کیساتھ کوئی اور نہ آئے کیونکہ

فقال ابو بكر وما عسيتهم ان
يفعلوا بي والله لآتينهم فدخل
عليهم ابو بكر فتشهد علي فقال
انا قد عرفنا فضلك وما اعطاك
الله ولم ننفس عليك خيرا
ساقه الله اليك ولكنك استبددت
علينا بالامر وكنا نرى لقرابتنا
من رسول الله صلى الله عليه وسلم
نصيبا حتى فاضت عينا ابي بكر
فلما تكلم ابو بكر قال والذي نفسي
بيده لقرابة رسول الله صلى الله
عليه وسلم احب الي ان اصل
من قرابتي واما الذي شجر
بيني وبينكم من هذه الاموال
فاني لم آل فيها عن الخير ولم
اترك امرا رأيت رسول الله
صلى الله عليه وسلم يصنعه
فيها الا صنعته فقال علي
لابي بكر موعدك العشية
للبيعة - فلما صلى ابو بكر
الظهر رقي على المنبر فتشهد

وہ اس بات کو پسند نہیں کرتے تھے کہ اُن کے
ساتھ عمرؓ آئیں۔ عمرؓ نے ابوبکرؓ کو مشورہ دیا کہ وہ تنہا نہ
جائیں۔ ابوبکرؓ نے کہا کہ مجھ کو اُن (بنو ہاشم) سے
یہ امید نہیں کہ وہ میرے ساتھ ایسا ویسا معاملہ
کرینگے۔ بخدا میں اُن کے پاس ضرور جاؤں گا۔ چنانچہ
ابوبکرؓ انکے پاس آئے تو علیؓ نے کلمۂ تشہد پڑھا اور پھر کہا کہ
ہم آپکے فضل کو اور جو کچھ اللہ نے آپ کو دیا ہے اس کو
پہچانتے ہیں اور جو خیر (خلافت) اللہ نے آپکو بخشی ہے ہم
اُسمیں آپکی ریس نہیں کرتے لیکن ہاں آپنے خلافت
کا معاملہ خود ہی طے کرلیا۔ حالانکہ آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم کیساتھ قرابت کی وجہ سے ہم بھی اُس میں اپنا حصہ
سمجھتے تھے۔ ابوبکرؓ یہ سنکر آبدیدہ ہوگئے پھر جب انہوں نے
بولنا شروع کیا تو کہا "قسم ہو اُس ذات کی جس کے
قبضہ میں میری جان ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت
مجکو اس سے زیادہ محبوب ہے کہ میں اپنے اعزہ کیساتھ
صلہ رحمی کروں رہا وہ اختلاف جو میرے اور تمہارے
درمیان اُن اموال کے بارے میں رونما ہو گیا ہے تو میں نے
خیر کے کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی ہے اور میں نے کوئی
ایسا کام جسکو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہو
اُسکو کئے بغیر نہیں چھوڑا۔ یہ سنکر علیؓ نے ابوبکرؓ سے کہا کہ
اچھا! آپ بیعت کیلئے دوپہر بعد آئیے۔ پھر جب ابوبکرؓ

وذكر شان علي وتخلفه
عن البيعة وعذره بالذي
اعتذر اليه ثم استغفر و
تشهد علي فعظم حق ابي بكر
وحدث انه لم يحمله على الذي
صنع نفاسة على ابي بكر ولا
انكاراً للذي فضله الله به
ولكنا كنا نرى لنا في
هذا الامر نصيباً واستبد علينا
فوجدنا في انفسنا فسر بذلك
المسلمون وقالوا اصبت وكان
المسلمون الى علي قريباً حين
راجع الامر بالمعروف۔ [1]

نے ظہر کی نماز ادا کرلی تو انھوں نے کلمۂ تشہد پڑھا اور
علی کا حال اور بیعت سے اُن کی علیحدگی اور اسکا جو
عذر انھوں نے بیان کیا تھا وہ سب بیان کیا۔ پھر
استغفار پڑھا اس کے بعد علی نے تشہد پڑھا۔ ابوبکر کے
حق کی بڑائی بیان کی اور انہوں نے کہا کہ میں نے جو کچھ کیا تھا
اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ میں ابوبکر پر حسد کرتا تھا اور
اللہ نے ان پر جو انعامات کیے ہیں ان کا منکر تھا لیکن
بات یہ ہے کہ ہم لوگ بھی خلافت کے معاملہ میں اپنا کچھ حصہ
سمجھتے تھے ابوبکر نے اُس میں ہماری بات ہی نہیں پوچھی
اس لئے ہمارے دل میں اسکا ملال تھا یہ سنکر سب مسلمان
بہت خوش ہوئے اور انھوں نے کہا "آپ نے
درست فرمایا" اور مسلمان علی سے قریب ہو گئے جب
وہ امر بالمعروف کی طرف لوٹ آئے۔

اس کے علاوہ صحیح مسلم میں بھی امام زہری سے روایت ہے کہ کسی شخص نے ان سے بیان کیا کہ حضرت علی نے حضرت ابوبکر سے حضرت فاطمہ کی وفات کے وقت تک بیعت نہیں کی تو انھوں نے کہا کہ نہیں! حضرت علی ہی نے نہیں بلکہ بنو ہاشم میں سے کسی نے بھی نہیں کی۔ لیکن حافظ ابن حجر نے بیہقی سے نقل کیا ہے کہ یہ روایت ضعیف ہے کیونکہ زہری نے اُس کی سند نہیں بیان کی [2] بیہقی نے اس روایت کی جو وجہ ضعف بیان کی ہے اس کے علاوہ اس روایت کا یہ جزء بھی تمام روایات کے خلاف ہے کہ بنو ہاشم میں سے کسی نے بھی بیعت نہیں کی

[1] صحیح بخاری ج ۲ ص ۹ و ۶۰۸ باب غزوہ خیبر۔ [2] فتح الباری جلد ۷ ص ۳۷۹

اب رہ گئی صحیح بخاری کی روایت تو اس پر اشکال یہ ہے کہ حضرت علی کا چھ ماہ تک بیعت نہ کرنا ایک ایسی بات ہے جو حضرت علی کی شان سے بھی بعید ہے اور حضرت ابو بکر کا اتنے دنوں تک اُس پر صبر کرنا خود حضرت ابو بکر سے مستبعد ہے۔

اس میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا کہ حضرت ابو بکر کو صحابۂ کرام میں جو بلند مرتبہ و مقام حاصل تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان پر جو خصوصی اعتماد و اعتبار تھا اور جس کی وجہ سے آپ نے صراحۃً واشارۃً (جس کا ذکر آگے آئیگا) حضرت ابو بکر کی خلافت کی طرف ایما فرمایا تھا حضرت علی اس سے ناواقف نہیں ہو سکتے تھے، علاوہ بریں خود حضرت علی درویشی و بے نفسی اور ولایت و انابت الی اللہ کے جس مرتبۂ اعلیٰ و ارفع پر متمکن تھے وہ بھی کوئی پوشیدہ حقیقت نہیں ہے اس بنا پر یہ قطعی ناممکن ہے کہ حضرت علی حضرت ابو بکر کو مستحق خلافت یا خلیفۂ برحق نہ سمجھتے ہوں۔ چنانچہ صحیح بخاری کی اسی روایت میں حضرت علی صاف لفظوں میں حضرت ابو بکر کے فضائل و مناقب اور ان کے استحقاق خلافت کا اعتراف کرتے ہیں اور یہ بھی صراحت فرماتے ہیں کہ ان کو خلافت کے معاملہ میں حضرت ابو بکر کے ساتھ نہ کچھ اختلاف تھا اور نہ وہ اس پر اُن کے ساتھ کوئی منافست رکھتے تھے۔

بعض لوگوں نے اپنی پرانی عصبیت کی بنا پر اس وقت غیر ذمہ دارانہ گفتگو کر کے حضرت علی کو مشتعل کرنا بھی چاہا تو آپ نے سختی کے ساتھ اُن کو ڈانٹ دیا۔ چنانچہ ایک مرتبہ ابو سفیان نے جو حضرت امیر معاویہ کے والد تھے حضرت علی کو عار دلائی اور اُن کو حضرت ابو بکر کی مخالفت پر برانگیختہ کرنے کی غرض سے کہا کہ "یہ دیکھئے! قریش میں جو گھٹیا درجہ کا قبیلہ ہے۔ خلافت اس میں چلی گئی۔ خدا کی قسم اگر آپ اس کے خواہاں ہوں تو میں مدینہ کو سوار اور پیادہ فوج سے بھر دوں گا۔ حضرت علی یہ سنتے ہی برہم ہو گئے اور بگڑ کر فرمایا۔ اے ابو سفیان تم اسلام اور مسلمانوں کے پرانے دشمن ہو۔ تم ایسی باتوں سے اسلام کو کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتے۔ ہم نے ابو بکر کو خلافت کا اہل پایا ہے"[1]

[1] ابن جریر طبری ج ۲ ص ۴۴۹۔ یہ روایت طبری کی ہے لیکن کنز العمال میں یہ واقعہ دو سندوں سے مذکور ہے۔ جن میں سے ایک سند کے آخری راوی سوید بن غفلہ ہیں جو ٹھیک اس وقت مدینہ میں حاضر ہوئے جب لوگ دفن نبوی سے فارغ ہو کر ہاتھ جھاڑ رہے تھے اور وہ حضرت علی کے اصحاب خاص میں سے ہیں۔ دوسری سند کے آخری راوی حضرت علی کے پوتے (باقی صفحہ ۱۳ پر)

ایک روایت میں تو یہاں تک ہے کہ ابوسفیان نے حضرت علی سے کہا "ابسط یدک حتی ابایعک" اپنا ہاتھ پھیلائیے تاکہ میں آپ سے بیعت کروں لیکن حضرت علی نے شدت کے ساتھ انکار فرمایا اور ابوسفیان کو جھڑک دیا" [۵]

حضرت ابوبکر تو ابوبکر تھے حضرت علی کی شان تو یہ ہے کہ حضرت عمر اور حضرت عثمان کے مقابلہ میں بھی اپنے لئے خلافت کا دعویٰ نہیں کیا اور کبھی جمہور اُمت سے اس معاملہ میں الگ نہیں ہوئے چنانچہ ایک مرتبہ کسی شخص نے حضرت علی سے دریافت کیا کہ یہ کیا بات ہے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کی خلافت پر مسلمانوں میں اختلاف نہیں ہوا لیکن آپکی خلافت پر وہ متفق نہیں ہیں تو حضرت علی نے جواب دیا کہ ابوبکر و عمر میرے جیسے مسلمانوں پر والی تھے اور میں تم جیسے مسلمانوں کا والی ہوں" [۶]

ان بیانات سے صاف ظاہر اور ثابت ہے کہ حضرت علی کو حضرت ابوبکر کی خلافت پر کوئی اعتراض نہیں تھا اور وہ اس معاملہ میں ان کے مخالف نہیں تھے البتہ ہاں جیسا کہ بخاری کی اسی روایت اور دوسری روایات میں ہے حضرت علی کو حضرت ابوبکر کیطرف سے ملال ضرور تھا جسکی ایک وجہ تو یہ تھی کہ عین اُس وقت جبکہ حضرت علی اور دوسرے آل بیت نبوی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز و تکفین میں مصروف تھے حضرت ابوبکر سقیفہ بنو ساعدہ کی خبر سُنتے ہی حضرت عمر اور حضرت ابوعبیدہ بن جراح کو ساتھ لے وہاں پہنچ گئے اور خلافت کا معاملہ طے کر آئے اور حضرت علی سے اس بارے میں کوئی مشاورت نہیں کی اس کے علاوہ دوسری وجہ حضرت فاطمہ کا حضرت ابوبکر کی طرف سے تکدر خاطر تھا جو بربنائے بشریت پیدا ہوگیا تھا لیکن ظاہر ہے کہ حضرت علی کے ملال کی یہ دونوں وجہیں محض ذاتی اور شخصی تھیں اس بنا پر ان کا اثر یہ تو ہو سکتا تھا کہ حضرت علی اور حضرت ابوبکر کے تعلق باہمی میں وہ شگفتگی نہ ہو جو معاشرتی

(صفحہ ۷۲ سے آگے) زین العابدین ہیں۔ ان دونوں روایتوں میں ابوسفیان کے الفاظ تو وہی ہیں جو طبری میں ہیں لیکن حضرت علی کے جواب کے الفاظ بدلے ہوئے ہیں اور وہ یہ ہیں بلا واللہ ما اریدان تملاھا علیہ خیلاً ورجالاً ولولا انا رأینا ابابکر لذالک اھلاً ما خلیناہ وایاھا یا ابا سفیان۔ ان المومنین قوم نصحۃ بعضھم لبعض متوادون وان بعدت دیارھم وابدانھم وان المنافقین غششۃ بعضھم لبعض۔ کنز العمال مطبوعہ حیدر آباد جلد ۳ ص ۱۴۰۔ ۱۴۱

[۵] تاریخ یعقوبی جلد دوم ص ۲۴۰ [۶] تاریخ ابن خلدون ج ۱ ص ۱۷۶

زندگی میں ہونی چاہیے تھی۔ لیکن چونکہ خلافت ایک قومی اور اجتماعی مسئلہ تھا اس بنا پر اس ذاتی رنجش کا نتیجہ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا تھا کہ حضرت علیؓ سرے سے بیعت ہی نہ کرتے اور تفرق بین المسلمین کا سبب بنتے۔ حضرت علیؓ کی جمہوریت پسندی اور رائے عامہ کے احترام کی کیفیت تو یہ تھی کہ جب حضرت ابوبکرؓ نے اپنے مرض الموت میں حضرت عمرؓ کا نام اپنی جانشینی کے لئے تجویز کیا تو اگرچہ حضرت علی ذاتی طور پر اس سے متفق نہیں تھے چنانچہ انھوں نے اپنی اس رائے کا اظہار کر بھی دیا تھا۔ لیکن آخر جب حضرت عمرؓ نامزد ہو ہی گئے تو پھر کوئی مخالفت نہیں کی اور سب مسلمانوں کے ساتھ انھوں نے بھی بیعت کر لی۔ پس جب ان کی یہ فطرت تھی تو پھر یہ کیونکر ممکن ہو سکتا تھا کہ بیعتِ عامہ ہو جانیکے باوجود حضرت علیؓ سب مسلمانوں سے الگ رہتے اور بیعت نہ کرتے۔

مازری اور اشعری نے حضرت علیؓ کے تخلف عن البیعۃ کا ایک عذر یہ بھی بیان کیا ہے کہ خلیفہ سے فرداً فرداً ہر مسلمان کا بیعت کرنا ضروری نہیں ہے۔ ہزاروں مسلمان بیعت کر ہی چکے تھے اس لئے اگر ایک حضرت علیؓ نے بیعت نہیں کی تو اس کو مخالفت پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔[1]

لیکن ہمارے نزدیک یہ عذر صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ حضرت علیؓ اپنی ذات سے تنہا ایک شخص نہیں تھے بلکہ پوری ایک جماعت۔ ایک قوم اور ایک گروہ تھے اُن کا بیعت نہ کرنا اسلامی وحدت کے لئے عظیم ترین رخنہ کا باعث ہو سکتا تھا اور اپنی اس حیثیت سے یقیناً وہ خود بھی بے خبر نہیں تھے۔[2]

---

[1] فتح الباری ج ۷ ص ۳۷۸ وفیض الباری ج ۴ ص ۱۴۲ [2] جلال الدین سیوطی نے اتقان میں ایک روایت نقل کی ہے جس کی انھوں نے تصحیح بھی کی ہے کہ حضرت علی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ایک خطبہ دیا اور فرمایا کہ میں جب تک قرآن کو جمع نہیں کر لوں گا گھر سے نہیں نکلوں گا۔ بعض حضرات نے اس جمع قرآن کو حضرت علی کی تاخیر بیعت نہ کرنیکا عذر بتایا ہے لیکن اس میں شبہ نہیں ہو سکتا کہ اگر یہ کوئی عذر ہے بھی تو عذر بارد ہے چند منٹ کے لئے بیعت کے واسطے آ جانا جمع قرآن کے کام میں کیونکر خلل انداز ہو سکتا تھا۔

صحیح بخاری کی روایت پر ہم نے اشکال کی جو تقریر سطور بالا میں کی ہے وہ درایت کے اعتبار سے تھی۔ روایتی حیثیت سے تحقیق کی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس روایت کے مقابلہ میں چند ایسی روایتیں بھی ہیں جن سے چھ مہینے تک بیعت نہ کرنیکی تردید ہوتی ہے اس سلسلہ میں سب سے اہم وہ روایت ہے جسکو حاکم نے مستدرک میں نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ اگرچہ امام بخاری اور امام مسلم نے اس روایت کو صحیحین میں درج نہیں کیا ہے لیکن ان دونوں کی شرط پر ہے اور اس لئے صحیح ہے۔ روایت یہ ہے:۔

ان عبد الرحمن بن عوف	عبدالرحمٰن بن عوف بھی عمر بن الخطاب
كان مع عمر بن الخطاب رضي الله	کے ساتھ تھے اور محمد بن مسلمہ نے زبیر کی
عنه وان محمد بن مسلمة كسر	تلوار توڑ دی تھی پھر ابوبکر کھڑے ہوئے
سيف الزبير ثم قام ابو بكر	انھوں نے خطبہ دیا اور معذرت چاہتے
فخطب الناس واعتذر اليهم	ہوئے کہا۔ اللہ کی قسم مجھکو امارت
وقال والله ما كنت حريصاً	کا لالچ کسی دن یا کسی رات بالکل بھی
على الامارة يوماً ولا ليلة	نہیں تھا اور نہ مجھ کو اس کی کوئی رغبت
قط ولا كنت فيها راغباً	تھی اور نہ میں نے پوشیدہ طور پر یا
ولا سألتها الله في سر وعلانية	علانیہ طور پر اس کا اللہ سے سوال
ولكني اشفقت من الفتنة	کیا تھا۔ لیکن ہاں! میں فتنہ سے ڈرتا تھا
ومالي في الامارة من راحة	اور امارت میں میرے لئے کوئی راحت
ولكن قلدت امراً عظيماً	نہیں ہے۔ بلکہ میرے گلے میں ایک اتنے
مالي به من طاقة ولا يد الا	بڑے کام کا طوق ڈال دیا گیا ہے جسکی بجز
بتقوية الله عز وجل ولوددت	توفیق الٰہی کے مجھ میں طاقت نہیں ہے۔ میں
ان اقوى الناس عليها مكاني	چاہتا تھا کہ کوئی مجھ سے زیادہ قوی آدمی

اليوم فقبل المهاجرون منه ما قال وما اعتذر به۔ قال علی والزبیر ما غضبنا الا لانا قد اخرنا من المشاورة وانا نری ابابکر احق الناس بها بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہ لصاحب الغار وثانی اثنین وانا لنعلم بشرفہ وکبرہ ولقد امرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالصلاۃ بالناس وھو حی۔

(المستدرک جلد ۳ ص ۶۶)

آج میری جگہ پر ہوتا۔ ابوبکر نے جو کچھ کہا تھا مہاجرین نے اس کو قبول کر لیا۔ علی رضی اللہ عنہ اور زبیر نے کہا "ہم کو صرف اس بات پر غصہ تھا کہ مشورہ کے وقت ہمیں پس پشت ڈال دیا گیا۔ ورنہ ہم بے شبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امارت کا سب سے زیادہ مستحق ابوبکر کو ہی سمجھتے تھے۔ وہ صاحبِ غار اور ثانی اثنین ہیں اور ہم ان کے شرف اور عظمت کو جانتے ہیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو نماز پڑھانے کا حکم اپنی حیات میں ہی دیا تھا۔

اب ایک اور پہلو سے غور کرو تو معلوم ہوگا کہ بالفرض حضرت علی بیعت نہ کرتے تو حضرت ابوبکر ان معاملات میں جس قدر سخت تھے اس کے پیشِ نظر ان سے یہ بالکل بعید بات تھی کہ وہ صبر کرکے خاموش بیٹھے رہتے اور فتنہ کے اس دروازہ کو کھلا چھوڑ دیتے۔ چنانچہ اس ذیل میں ہم ایک اور روایت نقل کرتے ہیں جس سے بیعت کے معاملہ میں حضرت ابوبکر اور حضرت علی دونوں کے طرزِ عمل پر ایک ساتھ روشنی پڑتی ہے۔ یہ روایت حضرت ابو سعید الخدری کی ہے۔ سقیفہ بنی ساعدہ کے واقعہ کے ابتدائی اجزاء بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں :-

فلما قعد ابوبکر علی المنبر نظر فی وجوہ القوم فلم یر علیاً

جب ابوبکر منبر پر بیٹھ گئے تو انھوں نے لوگوں پر ایک نظر ڈالی اور جب علی کو نہیں دیکھا

فسال عنه فقام ناس من الانصار فاتوا به فقال ابوبكر ابن عم رسول الله صلى الله عليه وسلم وختنه اردت ان تشق عصا المسلمين فقال لا تثريب يا خليفة رسول الله صلى الله عليه وسلم فبايعه هذا الحديث صحيح على شرط الشيخين ولم يخرجاه[1]

تو اُن کی نسبت پوچھا اس پر کچھ انصاری کھڑے ہوئے اور جاکر علی کو لے آئے۔ اب ابوبکر نے اُن سے کہا کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی اور داماد بھی ہیں کیا آپ مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنا چاہتے ہیں۔ علی نے کہا اے خلیفۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ملامت نہ کیجئے اس کے بعد علی نے ابوبکر سے بیعت کرلی۔ امام حاکم فرماتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ شرط شیخین پر ہے اور انھوں نے صحیحین میں اس کو درج نہیں کیا ہے۔

ابنِ سعد میں حضرت حسن سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علی نے فرمایا۔ جب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو ہم نے خلافت کے معاملہ میں غور و خوض کیا۔ اور ہم نے دیکھا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر کو نماز میں آگے کر دیا تھا۔ اس بنا پر ہم اپنی دنیا کے واسطے اس شخص سے راضی ہو گئے۔ جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دین کے لئے راضی ہوئے تھے۔ اب ہم نے بھی ابوبکر کو آگے کر دیا یعنی بالاتفاق انہیں خلیفہ بنا دیا۔[2]

اب ان تمام روایات کو سامنے رکھو ان سب پر یک جائی نگاہ ڈالو۔ حضرت ابوبکر اور حضرت علی دونوں کی جلالت شان اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اُن کا قرب و اختصاص۔ پھر نفسِ خلافت کی اہمیت اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اس وقت تبلیغ و اشاعت اور استحکامِ اسلام کے لئے باہمی اتفاق و

[1] المستدرک للحاکم ج ۳ ص ۷۶ [2] ابن سعد تذکرۂ حضرت ابوبکر۔

اتحاد کی سخت ضرورت۔ ان سب کو بھی پیش نظر رکھو اور بتاؤ کہ کیا نتیجہ نکلتا ہے؟
صاف نظر آتا ہے کہ حضرت علی نے حضرت ابوبکر سے ایک مرتبہ نہیں دو مرتبہ بیعت کی ہے۔ پہلی بیعت بیعتِ خلافت ہے جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے دوسرے ہی دن مسجد نبوی میں بیعتِ عامہ کے موقع پر کی گئی۔ اور دوسری بیعت بیعتِ رضا ہی جو آپ نے حضرت فاطمہ کی وفات کے بعد کی ہے۔ اس بیعت کا مقصد آپسمیں صلح صفائی کرنا اور باہمی تعلقات کو پھر از سرِ نو خوشگوار کر لینا تھا۔
چنانچہ حافظ ابن حجر حضرت ابوسعید الخدری کی روایت جو مستدرک کے حوالہ سے اوپر گزر چکی ہے اور جس سے حضرت علی کا پہلے ہی موقع پر بیعت کر لینا ثابت ہوتا ہے۔ اس کو اصح بتاتے ہیں اور پھر فرماتے ہیں۔

وجمع غیرہ بانہ بایعہ	اور دوسرے لوگوں نے دونوں روایتوں میں تطبیق
بیعۃً ثانیۃً مؤکدۃً للاولی	اس طرح دی ہے کہ حضرت علی نے حضرت ابوبکر سے
لازالۃ ما کان وقع بسبب	پہلی ہی بیعت کو موکد کرنے کی غرض سے دوسری
المیراث۔ کما تقدم وعلی ھذا	بیعت کی تھی تاکہ میراث کی وجہ سے جو تکدر پیدا ہو گیا تھا
قول الزھری لم یبایعہ علی	وہ جاتا رہے۔ اس قول کی بنا پر زہری جو یہ کہتے ہیں کہ حضرت
فی تلک الایام علی ارادۃ الملازمۃ	علی نے بیعت نہیں کی تھی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ حضرت علی
لہٗ والحضور عندہٗ وما	حضرت ابوبکر کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے اور ان کے پاس آتے جاتے نہیں
اشبہ ذالک فان فی انقطاع	تھے۔ کیونکہ جو شخص حقیقتِ حال سے واقف نہیں تھا وہ حضرت
مثلہ عن مثلہ ما یوھم من	علی جیسے شخص کو حضرت ابوبکر جیسی شخصیت سے کنارہ کش
لا یعرف باطن الامر انہ بسبب	دیکھ کر یہی سمجھتا تھا کہ حضرت علی کا یہ طرزِ عمل اس بنا پر ہے
عدم الرضا بخلافتہ فاطلق	کہ وہ حضرت ابوبکر کی خلافت سے راضی نہیں ہیں۔ پس
من اطلق ذالک وبسبب ذالک	جس نے بیعت کی نفی کی ہے اسی وہم اور غلط فہمی کی وجہ سے

اظهر على المبايعة التي بعد موت فاطمة عليها السلام لازالة هذه الشبهة [1]

کی ہے اور حضرت فاطمہ کی وفات کے بعد حضرت علی نے جو بیعت کی تھی وہ درحقیقت اسی غلط فہمی کو دُور کرنے کے لئے کی تھی۔

تاریخِ اسلام کے نہایت مشہور محقق اور نقاد حافظ عماد الدین ابن کثیر المتوفی ۷۷۴ھ حضرت ابو سعید الخدری کی مذکورۂ بالا روایت اور اسی مضمون کی دوسری روایات کو نقل کرنیکے بعد فرماتے ہیں۔

وھذا اللائق بعلی رضی اللہ عنہ والذی یدل علیہ الآثار من شھودہ معہ الصلوٰۃ وخروجہ معہ الی ذی القصۃ بعد موت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کما سنوردہ وبذلہ لہ النصیحۃ والمشورۃ بین یدیہ [2]

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے شایانِ شان یہی تھا اور اس پر دوسرے آثار بھی دلالت کرتے ہیں۔ مثلاً حضرت علی کا حضرت ابوبکر کے ساتھ نمازوں میں شریک ہونا۔ ذوالقصہ کے معرکہ میں جس کا بیان آگے آئیگا اور جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے فوراً بعد پیش آیا تھا حضرت علی کا حضرت ابوبکر کے ساتھ رہنا اور ان کو مشورہ دینا اور نصیحت کرنا۔

اس کے بعد حضرت فاطمہ کی وفات کے بعد بیعت کرنے کی روایت کی توجیہ اسطرح کرتے ہیں۔

واما مایاتی من مبایعتہ ایاہ بعد موت فاطمۃ ۔ وقد ماتت بعد ابیھا علیہ السلام بستۃ اشھر ۔ فذالک محمول علی انھا

اور رہی وہ روایت جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی نے فاطمہ کی وفات کے بعد بیعت کی تھی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ دوسری بیعت تھی جس نے اُس باہمی تکدر اور شکر رنجی کا ازالہ کر دیا جو میراث

---

[1] فتح الباری ج ۷، ص ۳۷۹ [2] البدایۃ والنہایۃ ج ۶ ص ۳۰۲ ۔ اس عبارت میں حضرت علی کا جس ذوالقصہ کی مہم میں حضرت ابوبکر کیساتھ شرکت کا ذکر ہے اس کا تذکرہ اپنے موقع پر آئندہ آئے گا اسے وہاں دیکھنا چاہیئے۔

بیعة ثانیة ازالت ماکان قد وقع من وحشة بسبب الکلام فی المیراث۔ کے بارہ میں گفتگو سے پیدا ہو گئی تھی
حضرت علیؓ کا تکدرِ طبع جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے اپنی جگہ مسلّم! لیکن اس کا اثر یہ ہرگز نہیں ہو سکتا تھا کہ خالص دین کے معاملہ میں حضرت علیؓ کی طرف سے کسی طرح کی مداہنت صادر ہوتی۔ امام قرطبی فرماتے ہیں :۔ " حضرت علیؓ اور حضرت ابوبکرؓ کے درمیان جو شکر رنجی ہوئی اور بعد میں حضرت علیؓ نے اس کے لئے جو معذرت خواہی کی جو شخص بھی اس کی پوری داستان پر غور و خوض کرے گا اس کو اس میں کوئی شبہ نہیں رہے گا کہ دونوں میں سے ہر ایک کو دوسرے کے فضل و کمال کا اعتراف تھا اور دونوں میں ایک دوسرے کی محبت اور احترام تھا۔ اگرچہ بشری طبیعت کبھی کبھی غالب آجاتی تھی لیکن دیانت اس کو رد کر دیتی تھی ۔"[2]

جہاں تک حضرت عائشہؓ کی روایت کا تعلق ہے جو صحیح بخاری میں ہے یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ حضرت عائشہؓ نے جو واقعہ بیان کیا ہے اس کا آغاز اس وقت سے ہوتا ہے جبکہ حضرت فاطمہؓ نے میراث کا مطالبہ کیا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ مطالبہ ٹھیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے یا بیعتِ عامہ کے دن نہیں ہوا ہو گا بلکہ چند روز کے بعد جبکہ حضرت ابوبکرؓ بحیثیت خلیفۂ اوّل کے معاملات و امورِ خلافت کو باقاعدہ انجام دینے لگے ہوں گے۔ اس بنا پر عین بیعتِ عامہ کے دن حضرت فاطمہؓ کی رنجش کے باعث حضرت علیؓ کا بیعت سے الگ رہنا کوئی معنی ہی نہیں رکھتا۔ کیونکہ وجہ رنجش اب تک پیدا ہی نہیں ہوئی تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ حضرت علیؓ حضرت ابوبکرؓ کیساتھ گفتگو کے وقت اپنی رنجش کی وجہ میراث کے معاملہ کو نہیں بتاتے بلکہ اُس کا سبب یہ بیان کرتے ہیں کہ وہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تعلق خصوصی

---

[1] البدایة والنہایة ج ۶ ص ۳۰۲ [2] بحوالۂ فتح الباری ج ۷ ص ۳۷۹

کے باعث اس کو اپنا حق سمجھتے تھے کہ خلافت کا معاملہ طے کرتے وقت حضرت ابوبکر حضرت علی کو بھی اپنے اعتماد میں لیتے اور جس طرح انھوں نے حضرت عمر اور حضرت ابوعبیدہ کو اس موقع پر اپنے ساتھ رکھا تھا حضرت علی کو بھی ساتھ رکھتے اور اُن کی غیر موجودگی میں بالا ہی بالا سقیفہ بنی ساعدہ میں خلیفہ کے انتخاب کا مرحلہ طے نہ کرتے۔ اس سے آپ کو پتہ چل سکتا ہے کہ اس میں حضرت ابوبکر کا کتنا قصور تھا۔ لیکن اصل یہ ہے کہ حضرت علی کی کشیدگی کی اصل وجہ حضرت فاطمہ کا ہی تکدرِ طبع تھا۔ لیکن جب حضرت ابوبکر نے میراث کے متعلق آنحضرت صلعم کا ارشادِ گرامی پڑھ کر سنا دیا تو اب حضرت علی کیلئے گنجائش نہ تھی کہ وہ میراث کے معاملہ کو اپنی رنجش کا سبب قرار دیں۔ اس بنا پر جب صلح صفائی کا وقت آیا تو حضرت علی نے اس کا کوئی تذکرہ نہیں کیا بلکہ صرف امرِ خلافت کے بارہ میں اُن کی بات نہ پوچھنے کا گلہ کیا۔ یہ وہی بات ہے جس کو اربابِ معانی کی زبان میں نکتہ بعد الوقوع کہتے ہیں۔

پھر یہ بھی دیکھو کہ حضرت عائشہ حضرت علی کے بیعت نہ کرنے کو "وما کان بایعہ" وغیرہ صاف لفظوں سے بیان نہیں فرماتیں جیسا کہ امام زہری کی روایت میں ہے بلکہ "ولم یکن بایع تلک الاشہر" جیسے غیر واضح لفظوں میں بیان فرماتی ہیں تو کیا اسکا مطلب یہ نہیں ہے کہ حضرت عائشہ دراصل فرمانا یہ چاہتی ہیں کہ حضرت علی نے بیعت تو کرلی تھی لیکن چونکہ اس کے بعد ہی رنجش پیدا ہوگئی اور اس کی وجہ سے وہ کنارہ کش ہوکر بیٹھ گئے اس لئے ان کا بیعت کرنا نہ کرنا دونوں برابر تھے۔ انھوں نے رسمی طور پر اگرچہ بیعت کرلی تھی مگر عملاً ایسا تھا کہ گویا بیعت کی ہی نہیں تھی۔ اس کے علاوہ طبری کی مندرجہ ذیل دو روایتیں بھی دیکھو۔

قال عمرو بن حریث لسعید بن زید اشہدت وفاۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال نعم۔

عمرو بن حریث نے سعید بن زید سے پوچھا کہ کیا آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت موجود تھے۔

قال فمتى بويع ابوبكر قال يوم
مات رسول الله كرهوا ان
يبقوا بعض يوم وليسوا في
جماعةٍ قال فخالف عليه احدٌ
قال لا الا مرتد او من قد كاد ان
يرتد لولا ان الله عز وجل
ينقذهم من الانصار قال
فهل تعد احدٌ من المهاجرين
قال لا تتابع المهاجرون على
بيعته من غير ان يدعوهم [1]

انھوں نے فرمایا ہاں پھر پوچھا کہ ابوبکر سے بیعت
کب کی گئی؟ تو بولے کہ جس دن آنحضرتؐ کی
وفات ہوئی اُسی دن۔ صحابہ اسکو اچھا نہیں
سمجھتے تھے کہ دن کا ایک حصہ بھی اس طرح گزاریں
کہ وہ جماعت کیساتھ منسلک نہوں۔ اب عمرو بن حریث نے
پوچھا کہ کیا ابوبکر کی کسی نے مخالفت کی تھی؟ سعید بن زید
نے جواب دیا کہ نہیں البتہ مرتد نے یا انصار میں سے اُس
شخص نے مخالفت کی جو قریب تھا کہ مرتد ہوجاتا اگر
اللہ تعالیٰ اُسکو ارتداد سے بچا نہ لیتا۔ اس کے بعد عمرو حریث نے
دریافت کیا کہ کیا مہاجرین میں سے بھی کسی نے بیعت پہوتی
——— کی تھی۔ سعید بن زید نے کہا کہ نہیں، مہاجرین تو دعوت بیعت کے بغیر ہی بیعت کیلئے

اس روایت میں تو عام مہاجرین کی بیعت کا تذکرہ ہے جن میں خود حضرت علی بھی شامل تھے لیکن جہاں تک خاص حضرت علی کی ذات کا تعلق ہے اس کا ذکر بھی ایک اور روایت میں ہے اور اس قدر وضاحت وصراحت کے ساتھ کہ اس سے زیادہ ممکن نہیں۔

حدثنا عبيد الله بن سعيد ....
قال اخبرني عمي قال اخبرني ....
سيفٌ عن عبد العزيز بن ....
سياه عن حبيب بن ابي ......

حبیب بن ابی ثابت سے مروی ہے کہ

ثابت قال كان علي في بيته
اذ اُتي فقيل له قد جلس

علی اپنے گھر میں تھے کہ ایک شخص اُن کے
پاس آیا اور ان سے کہا کہ ابوبکر بیعت

[1] طبری ج ۲ ص ۴۴۶

ابو بکر للبیعۃ فخرج فی	لینے کے لئے بیٹھے ہیں علی یہ سنتے ہی فوراً قمیص پہنے ہی
قمیص ما علیہ ازار ولا	باہر نکل آئے اُس وقت اُن کے بدن پر نہ چادر تھی اور
رداء عجلاً کراھیۃ ان	نہ تہبند اُن کو جلدی اس لئے تھی کہ وہ بیعت
یبطئ عنہا حتی بایعہ ثم	میں پیچھے رہ جانے کو پسند نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ
جلس الیہ وبعث الی ثوبہ	انھوں نے ابو بکر سے بیعت کی پھر اُنکے پاس جا کر
فاتاہ فتجللہ ولزم	بیٹھ گئے۔ اور اپنے کپڑے منگوائے جب وہ آگئے
مجلسہ۔ [۱]	تو انہوں نے کپڑے پہنے اور ابو بکر کی مجلس میں بیٹھے رہے۔

اس پوری بحث سے یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ حضرت علی صدیق اکبر سے بیعت کے معاملہ میں عام مسلمانوں سے نہ الگ رہے اور نہ پیچھے رہے۔ لیکن آگے چلکر جو سیاسی اختلافات پیدا ہوئے اُن کا اثر روایات پر بھی پڑا اور اس کی وجہ سے ایک واقعہ کچھ تھا اور اختلافِ تعبیر و ادا سے کچھ سے کچھ ہو گیا۔

حضرت زبیر بن عوام | حضرت علی کے بعد دوسرا نام حضرت زبیر کا ہے جو اس بحث میں لائقِ ذکر ہے۔ حضرت زبیر آں حضرت اور حضرت علی کے پھوپی زاد بھائی تھے اُنکی والدہ عبد المطلب کی بیٹی صفیہ تھیں۔ آٹھ یا بارہ برس کے تھے کہ اسلام لائے۔ جن دس صحابہ کو اس زندگی میں ہی جنت کی خوش خبری دیدی گئی تھی اُن میں ایک حضرت زبیر بھی ہیں ان کا لقب حواریِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھا جو خود حضور نے اُن کو عطا فرمایا تھا۔ [۲]

روایت ہے کہ حضرت زبیر نے حضرت ابو بکر کی بیعت کا حال سُنا تو تلوار میان سے باہر نکال لی اور بولے "لا أغمدہ حتی یُبایَعَ علیٌّ" میں اُسوقت تک اُسکو میان میں نہیں رکھوں گا جب تک علی کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی جائیگی۔ حضرت زبیر کی یہی وہ تلوار تھی جس کو محمد بن مسلمہ نے توڑ دیا تھا۔

---

[۱] طبری ج ۲ ص ۴۴۷ - [۲] اصابہ ج ۱ ص ۵۲۶ (مطبوعہ مصر)

لیکن مستدرک حاکم کی وہ روایت جو حضرت علی کی بحث میں گذر چکی ہے اسی میں حضرت زبیر کا بھی ذکر ہے۔ صفحہ اُلٹ کر دیکھو معلوم ہوگا کہ جب حضرت ابوبکر نے تقریر کی اور فرمایا کہ میں ہرگز خلافت کا متمنی نہیں تھا لیکن البتہ اس سے ڈرتا تھا کہ کہیں مسلمانوں میں پھوٹ نہ پڑ جائے تو حضرت علی اور حضرت زبیر دونوں کھڑے ہوئے اور بولے کہ ہم کو اس بات کا رنج ضرور تھا کہ خلافت کے معاملہ میں جو مجلسِ مشاورت ہوئی اُس میں ہم کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا۔ ورنہ ہماری رائے میں ابوبکر تمام لوگوں میں خلافت کے سب سے زیادہ مستحق ہیں۔[1]

اس کے بعد جلد سوئم ص ۷۶ پر جو روایت ہے اُس میں جہاں حضرت علی کا ذکر ہے حضرت زبیر کا بھی ہے۔ حضرت ابوبکر نے بیعتِ عامہ کے دن حضرت زبیر کو نہیں دیکھا تو پوچھا کہاں ہیں؟ جب لوگ جا کر اُن کو لے آئے تو حضرت ابوبکر نے اُن کو خطاب کرکے فرمایا۔ "آپ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حواری ہیں تو کیا پھر بھی آپ مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنا چاہتے ہیں؟ حضرت زبیر نے اس کے جواب میں پہلے تو وہی کہا جو حضرت علی نے کہا تھا اور اُس کے بعد فرمایا کہ" اے خلیفۂ رسولؐ! اب ملامت نہ کیجیے"۔ پھر جہاں حضرت علی نے بیعت کی حضرت زبیر نے بھی کر لی۔

حضرت سعد بن عُبادہ مدینہ کے قبیلہ خزرج سے تعلق رکھتے تھے۔ امام بخاری کے بیان کے مطابق انھوں نے غزوۂ بدر میں بھی شرکت کی تھی اگرچہ بعض دوسری روایتوں سے اسکی تردید ہوتی ہے۔ بہر حال اس میں شبہ نہیں کہ کبارِ صحابہ میں سے ہیں۔ جن غزوات میں یہ شریک ہوئے انصار کا عَلَم انھیں کے ہاتھ میں رہا۔ اس بنا پر یہ انصار کے اور خصوصاً خزرج کے سردار سمجھے جاتے تھے۔ بیحد سخی اور فیاض تھے۔ لیکن متعدد واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ مزاج میں کسی قدر تشدد تھا اور اپنی رائے پر انہیں اصرار بھی ہوتا تھا۔ سقیفۂ بنو ساعدہ کی مجلس میں انصار نے انھیں کو خلیفہ بنانا چاہا تھا اور انھوں نے انصار کے فضائل و مناقب پر ایک بڑی

---

[1] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۶۶

پُرجوش اور ولولہ انگیز تقریر کی تھی لیکن جب حضرت ابوبکر منتخب ہو گئے تو ان میں (سعد بن عُبادہ میں) اور حضرت عمر میں بڑی تلخ و گرم گفتگو ہوئی جس کی تفصیل طبری میں موجود ہے۔

حضرت سعد بن عُبادہ خلافتِ صدّیقی میں ہی مُلک شام میں جاکر آباد ہو گئے تھے اور وہیں مقام حوران میں ۱۵ھ میں وفات پائی۔ سقیفہ بنو ساعدہ میں ان میں اور حضرت عمر میں جو سخت کلامی ہوئی تھی اور پھر وہ شام چلے گئے۔ اس سے مؤرخین نے قیاس کیا ہے کہ انھوں نے حضرت ابوبکر سے بیعت نہیں کی تھی۔ اور تو اور خود حافظ ابن حجر کو مغالطہ ہو گیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

وقصتہ فی تخلفہ عن بیعۃ ابی بکرٍ مشہورۃ[1] ابوبکر سے ان کی بیعت نہ کرنے کا قصہ مشہور ہے

ابو محمد نے کلبی سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر نے سعد بن عبادہ کے پاس شام آدمی بھیجا اور تاکید کی کہ جس طرح بھی ممکن ہو اُن کو بیعت کرنے پر آمادہ کیا جائے۔ اس شخص نے شام پہنچکر مقام حوران میں ایک باغ میں سعد بن عبادہ سے ملاقات کی اور اُن کو بیعت کرنے کی دعوت دی۔ انھوں نے کہا "میں ایک قریشی سے کبھی بیعت نہیں کروں گا" اس شخص نے کہا "تو میں آپ سے جنگ کروں گا" سعد بن عبادہ بولے "اگرچہ تم مجھ سے جنگ کرو۔ وہ بولا "کیا امت جس پر اتفاق کر چکی ہے آپ اُس سے باہر رہیں گے"؟ انھوں نے جواب دیا۔ ہاں میں بیعت کے معاملہ میں تو امت سے الگ ہی رہونگا" اس پر اس شخص نے تیر مار کر سعد بن عبادہ کو قتل کر دیا"[2]

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ محض افسانہ ہی ہے۔ اصل یہ ہی ہے کہ حضرت زبیر اور حضرت علی کی طرح حضرت سعد بن عبادہ نے بھی بیعت کر لی تھی۔ طبری میں جابر سے روایت ہے کہ ایک دن سعد بن عبادہ نے حضرت ابوبکر سے کہا کہ اے گروہ مہاجرین تم نے میری امارت پر حسد کیا اور اے ابوبکر آپ نے اور میری قوم نے مجھ کو بیعت پر مجبور کر دیا۔ اس

---

[1] الاصابہ جلد ۲ ص ۲۸ ۔ [2] العقد الفرید ج ۵ ص ۱۲

پر مہاجرین نے جواب دیا کہ اگر ہم آپ کو افتراق پر مجبور کرتے مگر آپ اتحاد کی حمایت کرتے تو آپ کے لئے بڑی گنجائش ہوتی (یعنی آپ حق پر ہوتے) لیکن ہم نے تو آپ کو اتحاد پر مجبور کیا ہے اس لئے اس پر معذرت خواہی کی ضرورت نہیں ہے اسکے بعد ان سے کہا گیا۔

لئن نزعت یداً من طاعۃ او فرقت جماعۃ — اگر آپ طاعت سے دست کشی کرتے یا جماعت میں

لنضربن الذی فیہ عیناک [1] — پھوٹ ڈالتے تو البتہ ہم آپ کا سر اڑا دیتے۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سعد بن عبادۃ نے حضرت ابو بکر سے بیعت تو کر لی تھی لیکن کسی قدر ناگواری کے ساتھ۔ لیکن اس سے بھی زیادہ واضح اور صاف مسند امام احمد بن حنبل کی روایت ذیل ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت سعد بن عبادہ نے بطیب خاطر بیعت کی تھی۔

حضرت ابو بکر نے سقیفہ بنی ساعدہ میں جب خطبہ دیا تو انصار کی کوئی فضیلت نہ تھی جو آپ نے بیان نہ کی ہو۔ اس کے بعد سعد بن عبادہ کو خطاب کر کے فرمایا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب قریش ولاۃ ھذا الامر یعنی قریش امر خلافت کے سربراہ ہوں گے فرمایا تھا تو اے سعد آپ اُس وقت بیٹھے ہوئے تھے۔ آپکو یاد ہے نا۔؟ سعد بولے "جی ہاں! آپ سچ فرماتے ہیں" اس کے بعد سعد بن عبادہ نے کہا۔ نحن الوزراء وانتم الامراء ہم یعنی انصار وزیر ہوں گے اور آپ لوگ یعنی قریش امیر۔ یاد ہو گا کہ یہ بعینہ وہی بات ہے جو سقیفہ کی مجلس میں حضرت ابو بکر نے انصار کو خطاب کر کے کہی تھی۔ مسند امام احمد کی اس روایت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت ابو بکر کی تقریر کے بعد حضرت سعد بن عبادہ بالکل صدیق اکبر کے ہم نوا ہو گئے تھے اور دونوں میں کوئی اختلاف باقی نہیں رہا تھا۔ چنانچہ علامہ ابن حجر الہیثمی اس کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ ابن عبد البر نے جو یہ لکھا ہے کہ سعد بن عبادہ نے حضرت ابو بکر سے بیعت نہیں کی

[1] طبری ج ۲ ص ۴۶۰

یہاں تک کہ اُن کی وفات ہوگئی۔ اس روایت سے اسکی تغلیط ہوتی ہے[1] بلکہ طبری میں تو ایک روایت میں بالکل صاف صاف ہے کہ تتابع القوم علی البیعۃ وبایع سعدؓ
(طبری ج ۲ ص ۴۵۹)

حافظ ابن حجر اور ابن عبد البر کا بیان ہے کہ حضرت سعد بن عبادہ حضرت ابوبکر کے عہد خلافت میں ہی اُن سے ناراض ہو کر شام میں جا بسے تھے۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ حضرت عمر کے عہد خلافت میں شام گئے ہیں۔

اس بحث سے یہ معلوم ہوا ہو گا کہ انصار اور مہاجرین میں کوئی لائق ذکر شخصیت ایسی نہیں تھی جس نے حضرت ابوبکر سے بیعت نہ کی ہو۔ اور اس معاملہ میں جمہور اُمت سے الگ اپنے لئے کوئی دوسرا راستہ اختیار کیا ہو۔ البتہ ہاں اس میں شک نہیں کہ کچھ لوگ ایسے ضرور تھے جو کھلم کھلایا در پردہ صدیق اکبر کے انتخاب پر نکتہ چینی کرتے اور اس ذریعہ سے مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن یہ وہ ہی لوگ تھے جو محض برائے بیعت۔ یعنی کسی غرض کیلئے مسلمان ہوئے تھے۔ ورنہ حقیقت میں مسلمان نہیں تھے۔ یہ ہی لوگ ہیں جو بعد میں مرتد کہلائے۔ ان کا ذکر آگے آتا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق انہیں کی نکتہ چینی کے جواب میں فرمایا کرتے تھے۔

اَلَسْتُ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ[2] کیا میں وہ نہیں ہوں جس نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا تھا۔

ایک شبہ کا ازالہ کسی خوش فہم کو یہ شبہ نہیں ہونا چاہئے کہ انتخاب کے وقت خلیفہ اول نے جو خطبہ دیا تھا اس میں تو صاف صاف فرمایا تھا کہ میں اپنے آپ کو تم سب سے زیادہ خلافت کا مستحق نہیں سمجھتا۔ پھر اب انھوں نے کیسے احق بالخلافۃ ہونیکا دعوٰی کیا؟ اصل یہ ہے کہ خطبہ میں جو کچھ ارشاد فرمایا وہ صدیق اکبر کا طبعی انکسار تھا لیکن اشارہ چشم وابروئے نبوت کا رازداں آپ سے بڑھ کر کون ہو سکتا تھا۔ آپ نے خلافت کا

---

[1] الصواعق المحرقہ ص ۷ [2] ترمذی ج ۲ ص ۲۱۳

بارِ گراں محض اُن اشارات و ایماءاتِ نبوی کی تعمیل کے جذبہ میں اپنا فرض سمجھ کر برداشت کیا تھا جو آپ کی خلافت کے بارہ میں تھے اور جو کسی پر بھی مخفی نہیں تھے پس جب آپ نے خلافت کو قبول فرمالیا تو اب بحیثیتِ خلیفہ آپ کا فرض تھا کہ اپنی اس خلافت کو حق ثابت کریں اور اس طرح کسی شخص کو بھی فتنہ انگیزی کا موقع نہ دیں۔ ورنہ جس شخص کو خود اپنے اوپر اعتماد نہ ہو وہ دوسروں سے وفاداری کا مطالبہ کیونکر کر سکتا ہے ؟

خلافت

بیعتِ عامہ کے بعد حضرت ابو بکر بالکل بجا اور حق طور پر خلیفہ منتخب ہو گئے۔ لیکن خلافتِ صدیقی کی تاریخ اور اس کے کارناموں کی تفصیل بیان کرنے سے قبل ضروری ہے کہ خلافت کی تعریف، اس کا مرتبہ و مقام اور اس کے لئے جن اوصاف و کمالات کی ضرورت ہے ان سب پر کلام کیا جائے اور ساتھ ہی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکر کی خلافت کی طرف قولاً و عملاً جو اشارے کیے تھے اُن کا بھی ذکر کیا جائے۔

خلافت کی تعریف خلیفہ کا لفظ خلافت سے مشتق ہے۔ خلافت کے لغوی معنی نیابت جانشینی اور کسی کی قائم مقامی ہیں۔ خلیفہ کو خلیفہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قائم مقام نائب اور جانشین ہوتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ خلیفہ اللہ تعالیٰ کی نیابت کرتا ہے۔ اور اُن کا استدلال آیاتِ ذیل سے ہے۔

(۱) اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً	یاد کر اُس وقت کو جب کہ تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں۔
(۲) وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ	اور وہ خدا وہی ہے جس نے تمکو زمین میں خلیفہ بنایا۔

حضرت داؤدؑ کو خطاب کر کے ارشاد ہوا

یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ	اے داؤد ہم نے البتہ تم کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے۔

اس بنا پر ان علماء کے نزدیک ایک خلیفہ کو اگر خلیفۃ اللہ کہہ کر پکارا جائے تو جائز ہے

لیکن جمہور علماء اس کو ناجائز اور کسی کو خلیفۃ اللہ کہکر پکارنے والے کو فاسق اور فاجر کہتے ہیں ان کا استدلال یہ ہے کہ قائم مقامی کسی غائب کی ہوتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ تو ہر وقت حاضر و ناظر ہے۔ پھر اس کی نیابت کیونکر ممکن ہوسکتی ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ کسی شخص نے حضرت ابوبکر صدیق کو یا خلیفۃ اللہ کہکر خطاب کیا تو آپ نے فرمایا۔

"میں اللہ کا خلیفہ نہیں ہوں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خلیفہ ہوں" [۱]

خلیفہ کا منصب اور اس کے فرائض و واجبات

چونکہ ایک خلیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نائب اور قائم مقام ہوتا ہے اس بنا پر پہلے یہ معلوم کرلینا چاہیے کہ آپ کا منصب کیا تھا اور آپ کے فرائض و واجبات کیا تھے۔؟

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ جو فرائض تھے اصولی طور پر وہ دو قسم کے تھے

(۱) اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کے ذریعہ احکام و ہدایات لینا اور انکو امت تک پہنچانا
(۲) اُمت کے لئے ایک ایسا مرکزِ اطاعت و فرماں برداری بنناکہ خواہ کسی قسم کا کوئی معاملہ ہو معاد سے متعلق ہو یا معاش سے، مادی زندگی سے اس کا تعلق ہو یا روحانی، کوئی سیاسی امر ہو یا سماجی، کوئی اخلاقی مسئلہ ہو یا اقتصادی۔ ہر ایک میں آپ کا قول ایک آخری اور قطعی حکم کا مرتبہ رکھتا تھا۔ جس سے انحراف و سرتابی جائز نہیں تھی۔ قرآن مجید کا اعلان ہے۔

وَمَآ اٰتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم کو جو کچھ دیں اُسے لو اور جس کسی چیز سے تمکو روکیں رُک جاؤ۔

ظاہر ہے کہ پہلا فرض صرف آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات کے ساتھ مخصوص تھا۔ آپ خاتم النبیین تھے جب آپ کی وفات ہوئی تو وحی کا سلسلہ بھی منقطع ہوگیا اور اب کسی شخص کو بھی یہ مرتبہ حاصل نہیں ہوسکتا۔

---

[۱] الاحکام السلطانیہ للماوردی ص ۱۴

البتہ ہاں دُوسرا فرض وہ برابر قائم ہے اور قائم رہے گا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جب وفات ہوئی تو الیوم اکملت لکم دینکم۔ کے ارشاد کے مطابق شریعت کی تکمیل ہو چکی تھی۔ احکام و مسائل کی قانونی تنقیحات متعین ہو چکی تھیں اور اب آپ کے بعد والوں کا یہ فرض تھا کہ وہ اس قانون کی روشنی میں امت کی رہنمائی کریں پھر اس دوسرے فرض کے دو پہلو ہیں۔ ایک احکام الٰہی کی تبلیغ و اشاعت اور دوسرے ان احکام کا اجرا اور اُن کی تنفیذ تبلیغ و اشاعت ہر صحابی کا فرض تھا۔ لیکن احکام کی تنفیذ اور اُن کا اجرا بغیر سیاسی طاقت و اقتدار کے ممکن نہیں تھا۔ پس اس سیاست کا جسکو ہم سیاستِ شرعیہ بھی کہہ سکتے ہیں جو مرکز ہوگا وہی خلیفہ یا امام کہلائے گا۔

ایک خلیفہ اپنے عہد میں پوری اُمت کا مرکز اطاعت ہوتا ہے اور اس کو مسلمانوں پر روحانی اور جسمانی۔ سیاسی اور اخلاقی ہر قسم کا اقتدار حاصل ہوتا ہے۔ چونکہ اس کی حیثیت قانون کے شارح[1] اور احکام کو نافذ کرنیوالے کی ہوتی ہے اس بنا پر اُن کا ہر قول قولِ فیصل اور اُس کا ہر حکم واجب الاتباع ہوتا ہے اس سے بغاوت کرنا یا اُس کی نافرمانی ایسا ہی گناہ ہے جیسا کہ خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی۔ چنانچہ قرآن میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے ساتھ جن " اولو الامر " کی اطاعت کا حکم ہے اُن سے مراد وہی لوگ ہیں جو منصبِ خلافت پر سرفراز ہوں۔

صحیح بخاری میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

---

[1] یہ واضح رہنا چاہئے کہ خلیفہ کی حیثیت صرف قانونِ شریعت کے شارح کی ہے۔ خود قانون ساز کی نہیں ہے۔ قانون وہ ہی ہے جو اللہ اور اس کے رسول نے مقرر کر دیا ہے چنانچہ اگر کوئی خلیفہ اسلامی شریعت کے مُسلّمہ قانون (معروف) کے خلاف کوئی حکم دے تو چونکہ اُس نے یہ کام اپنی حدود سے متجاوز ہو کر کیا ہے اس بنا پر اس کی اطاعت کا حکم نہیں ہے۔ صحیح حدیث میں ہے لا طاعۃ الا فی معروف۔

من اطاعنی فقد اطاع اللّٰہ	جو شخص میری اطاعت کرتا ہے اس نے اللہ کی
ومن عصانی فقد عصی اللّٰہ	اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے
ومن اطاعَ امیری فقد اطاعنی	اللہ کی نافرمانی کی اور جس شخص نے میرے امیر کی اطاعت
ومن عصی امیری فقد عصانی	کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے میرے
(کتاب الاحکام)	امیر کی نافرمانی کی اس نے خود میری نافرمانی کی۔

اس حدیث میں لفظِ امیر سے بھی خلیفہ ہی مراد ہے۔ چنانچہ امام بخاری نے جس باب کے ماتحت اس روایت کو نقل کیا ہے اُس کا ترجمہ اطیعوا اللّٰہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم مقرر کیا ہے۔

خلیفہ کیلئے ضروری اوصاف وکمالات

چونکہ سوائے وحیِ الٰہی کے اور تمام پیغمبرانہ فرائض کی انجام دہی خلیفہ کے ذمہ ہوتی ہے اس بنا پر ظاہر ہے اس کو ان روحانی، جسمانی اور اخلاقی کمالات وفضائل سے متصف ہونا چاہئے جن سے ایک پیغمبر متصف ہوتا ہے اگرچہ یہ ظاہر ہے کہ ان کمالات کے ساتھ اس کا درجۂ اتصاف وہ نہیں ہو سکتا جو ایک پیغمبر کا ہوگا کیونکہ اصل بہرحال اصل ہے اور فرع بہرحال فرع۔ تاہم ان پیغمبرانہ اوصاف وشمائل کا عکس اُس کے اندر ضرور ہونا چاہئے۔

اسی حقیقت کا تجزیہ وتحلیل کر کے علماء نے خلافت وامامت کے شرائط کا تعین اپنے اپنے مذاق کے مطابق کیا ہے۔ علامہ ابن خلدون کے نزدیک اس منصبِ جلیل وعظیم کے لئے چار شرطیں ہیں۔

(۱) علم:- جب تک خلیفہ کو احکام ومسائلِ شریعت اور اُن کے منابع وماخذ کا علم نہ ہوگا وہ احکامِ خداوندی کا اجرا کیونکر کر سکتا ہے۔ علاوہ بریں علامہ کی رائے میں صرف عالم ہونا کافی نہیں ہے بلکہ اس کو صاحبِ اجتہاد بھی ہونا چاہئے کیونکہ تقلید نقص ہے اور امامت چاہتی ہے کہ اوصاف واحوال میں کمال ہو۔

(۲) عدالت :- چونکہ خلافت ایک منصب دینی ہے اس بنا پر خلیفہ میں عدالت۔ یعنی راست بازی اور نکوکاری کا ملکہ راسخہ ہونا ضروری ہے۔ اگر خلیفہ ممنوعات و محرماتِ شرعیہ کا ارتکاب کرتا ہے تو عدالت بالاتفاق ختم ہو جائیگی۔ البتہ اعتقادی بدعتوں میں مبتلا ہونے کی صورت میں اختلاف ہے۔

(۳) کفایت :- اس سے یہ مراد ہے کہ خلیفہ میں حدودِ شرعیہ کو قائم کرنے، مملکتِ اسلامی کی سرحدوں کی حفاظت اور دشمنوں کیساتھ جنگ کرنے کے لئے جس سمجھ بوجھ حسنِ تدبیر عزم و ہمت اور استقلال و جفاکشی کی ضرورت ہے یہ سب اُس میں پائے جائیں۔

(۴) سلامتِ حواس و اعضاء جس کی وجہ سے اس کی کسی رائے اور عمل پر کوئی بُرا اثر نہ پڑے۔ یعنی خلیفہ کو آنکھ ناک کان ہاتھ پاؤں غرض ہر جسمانی عضو و جارحہ کے اعتبار سے تندرست و توانا اور صحیح و سلامت ہونا چاہئے۔ اسی طرح باطنی قوتوں یعنی ذہانت و فطانت۔ حسن تدبیر اور اعتدالِ مزاج و طبیعت کے زیور سے بھی آراستہ ہونا چاہئے۔[1]

امام ابوالحسن الماوردی المتوفی ۴۵۰ھ نے انہیں اوصاف و شروط کو ذرا پھیلا کر لکھا ہے تو نسب کو چھوڑ کر جس کی بحث آگے آئی ہے چھ کر دیا ہے۔[2]

مذکورۂ بالا اوصاف و شروط تو وہ ہیں جن پر سب کا اتفاق ہے۔ ان کے علاوہ ایک اہم بحث یہ ہے کہ کیا خلیفہ کے لئے نسب کی بھی شرط ہے؟ اور اگر ہے تو کیا اس کو خاندانِ نبوت میں سے ہونا چاہئے۔ یا صرف قریشی ہونے کی شرط ہے۔

نہایت افسوس کی بات ہے کہ تاریخ اسلام کے ابتدائی دور میں ہی سیاسی اعتبار سے کچھ ایسی صورتِ حالات پیدا ہو گئی کہ یہ مسئلہ نہایت اہم بن گیا۔ ورنہ درحقیقت

---

[1] تاریخ ابن خلدون ج ۱ ص ۱۶۱ [2] الاحکام السلطانیہ ص ۴

بات بالکل واضح اور صاف ہے

خلافت کے لئے قرابتِ رسول کی شرط

جہاں تک خلافت کیلئے قرابت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شرط کا تعلق ہے تو ہر شخص جس نے اسلام کا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا مطالعہ کیا ہے جانتا ہے کہ آپ نے اپنے خاندان والوں کیساتھ مرتبۂ ومنصب، راحت وآسائش یا دولت وثروت کے اعتبار سے کبھی کوئی امتیازی سلوک نہیں برتا۔

آپ کو حضرت فاطمہ زہرا کے ساتھ جو محبت تھی اہل بیت میں کسی کے ساتھ نہیں تھی اور پھر حضرت علی ابن عم بھی تھے اور چہیتی بیٹی کے شوہر بھی ایک شہنشاہ کونین اگر چاہتا تو ان دونوں کے لئے کیا کچھ نہیں کر سکتا تھا لیکن جس ذاتِ قدسی صفات نے کونین کی شہنشاہی کے باوجود فقر کو اپنے لئے فخر کہا ہو اس سے اس کے سوا اور کیا توقع ہو سکتی تھی کہ جب اُس کی جگر گوشہ (حضرت فاطمہ) نے شکایت کی کہ چکی چلاتے چلاتے ہاتھ میں گٹے پڑ گئے ہیں تو کسی غلام یا باندی کا انتظام کرنے کے بجائے ایک تسبیح بتا دی۔

پھر چونکہ اسلام ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم (اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ معزز وہی ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہے) کی حقیقت کو دنیا میں ثابت اور قائم کرنا چاہتا تھا اس بنا پر رنگ ونسل اور حسب ونسب کے امتیازات کا خاتمہ کرنا اس کے لئے ضروری تھا آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پھوپی زاد بہن حضرت زینب کا نکاح ایک غلام زید بن حارثہ سے کر کے اور پھر حضرت زید کی طلاق کے بعد خود اُن کو اپنی زوجیت میں قبول فرما کر اسلام کی اس تعلیم کے لئے ایک نمونہ قائم کر دیا تھا۔ اس بنا پر یہ کیونکر باور کیا جا سکتا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خلافت کے معاملہ میں اپنے خاندان کی تخصیص کی ہو۔

صرف یہ نہیں کہ آپ نے اس معاملہ میں کوئی تصریح ہی نہیں کی۔ بلکہ روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت علی کو اس بات کا اندیشہ تھا کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آل بیت میں سے کسی کی خلافت کے بارہ میں دریافت کیا جاتا تو آپ نفی میں جواب دیتے۔ چنانچہ حضور کے مرضِ وفات میں ایک مرتبہ حضرت عباس حضرت علی سے ملے تو کہا کہ مجھ کو آثار و قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس مرض سے جاں بر نہیں ہوں گے۔ تو ذرا آپ سے دریافت کرلو کہ کیا آپ کے بعد خلافت ہم کو یعنی بنو ہاشم کو ملے گی۔ اگر ایسا ہوگا تو حضور بیان فرمادیں گے۔ حضرت علی نے جواب دیا کہ میں ہرگز آپ سے دریافت نہیں کروں گا کیونکہ اگر آپ نے اس وقت انکار فرمادیا تو پھر کبھی ہم کو خلافت کی توقع نہیں ہوسکتی [1]

علاوہ ازیں خلافت ایک عالم گیر دینی منصب ہے اور خلیفہ کو پورے عالم اسلام میں اپنے روحانی۔ اور جسمانی و اخلاقی کمالات و اوصاف کے اعتبار سے بلند تر ہونا چاہئے پھر یہ کیوں کر ممکن تھا کہ اُس کو کسی ایک خاص خاندان کے ساتھ۔ خواہ وہ اپنے بانی اور مورثِ اعلیٰ کی طرف نسبت کی وجہ سے کتنا ہی موقر و ممتاز اور سرفراز و سربلند ہو۔ مخصوص کردیا جاتا۔ ایسا کرنا اسلامی نظامِ حکومت کی جمہوری، اسپرٹ کے سرتاسر خلاف تھا اور اس سے اسلام ایسا عملی مذہب پاپائیت کی شکل اختیار کرلیتا۔

اہلِ بیت میں سے اگر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی کو خلافت کے لئے نامزد فرماتے تو وہ حضرت علی مرتضیٰ کے سوا دوسرا کون ہوسکتا تھا۔ جامۂ خلافت فاتحِ خیبر کے قامتِ موزوں پر راست آتا تھا اور وہ بجا طور پر اُس کے مستحق بھی تھے لیکن آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا نہیں کیا۔ جس کا اعتراف خود حضرت علی اور بنو ہاشم کو بھی تھا۔ کیوں؟ اس میں دو مصلحتیں تھیں۔

[1] طبری ج ۲ ص ۳۳۴

(۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ سمجھتے تھے کہ اگرچہ آپ حضرت علیؓ کا استخلاف اُن کے ذاتی اوصاف وکمالات کی بنا پر کریں گے لیکن مسلمانوں کو اس سے یہ اشتباہ ہو سکتا ہے کہ خلافت خاندانِ نبوت میں محدود ہوگئی اور یہ چیز قطعاً اسلام کی اصل روح اور اس کی تعلیمات کے خلاف تھی۔ پھر
اس بات کی کون ضمانت لے سکتا تھا کہ خاندانِ نبوت میں ہمیشہ اسد اللہ الغالب ہی پیدا ہوتے رہیں گے۔

(۲) آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی چشمِ دُور بین سے دیکھ لیا تھا کہ آپکی وفات کے بعد ہی فتنہ وفساد اور کفر وارتداد کا ایک عظیم طوفان اُمنڈنے والا ہے۔ اور اس کا مقابلہ کرنیکے لئے نہ فقط جلالِ فاروقی کافی ہو سکتا ہے اور نہ صرف شجاعت حیدری بلکہ دلبری کے ساتھ قاہری، جوش کے ساتھ ہوش۔ اور نرمی کیساتھ گرمی ملکر ہی اس زہر کا تریاق ہو سکتا تھا۔ حضرت عمر فاروق کے جاہ وجلال۔ رعب و داب اور طاقت وقوت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔ لیکن سقیفۂ بنی ساعدہ میں حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کا نام خلافت کے لئے پیش کیا اور فرمایا کہ تم مجھ سے زیادہ قوی ہو تو فاروقِ اعظم نے جواب میں کس قدر بلیغ فقرہ ارشاد فرمایا۔
ان قوتی لک مع فضلک[1] "میری ساری قوت تو آپکے لئے ہی وقف ہے اور آپ میں تو فضل بھی ہے۔

---

[1] ابن سعد بحوالۂ الصواعق المحرقہ ص ۷۔ حضرت ابوبکرؓ کی نرمی اور رقتِ قلب کا یہ عالم تھا کہ حضرت فاطمہؓ اپنے مکان پر اپنی کبیدہ خاطری کا اظہار فرماتی ہیں اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے ساتھ جو محبت تھی اسکا حوالہ دیتی ہیں تو بیساختہ رونے لگتے ہیں اور ہچکی بندھ جاتی ہے۔ حضرت علیؓ انکی طرف سے اپنے ملال کا اظہار کرتے ہیں تو پیشانی پر بل نہیں پڑتا بلکہ لجا لجا کر معذرت پیش کر رہے ہیں۔ سعد بن عبادہ کیساتھ حضرت عمرؓ تلخ کلامی کرتے ہیں تو اُن کو روک رہے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی قہر کا عالم یہ ہے کہ مانعینِ زکوٰۃ سے قتال کرنے کے بارہ میں فاروقِ اعظم ذرا پس وپیش کرتے ہیں تو حضرت ابوبکر ان کو طعنہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں: "اجبار فی الجاھلیۃ وخوار فی الاسلام" واہ کیا خوب اسلام سے پہلے آپ بڑے سخت اور متشدد تھے۔ مگر اب اسلام کے عہد میں یہ کمزوری۔

خلافت کے لئے قریشی ہونیکی شرط	اسی سلسلہ میں ایک اہم بحث یہ ہے کہ کیا خلیفہ کے لئے قریشی ہونیکی شرط ہے؟ اس مسئلہ کا تعلق دراصل علم الفقہ سے ہے اور وہ علم الکلام

کے دائرۂ بحث میں نہیں آتا۔ لیکن جیسا کہ ہم نے شروع میں کہا ہے۔ چونکہ اس مسئلہ کو غیر معمولی اہمیت دیدی گئی اس بنا پر اُس کی حیثیت بجائے جزئی مسئلہ ہونیکے اصولی مسئلہ کی ہوگئی ہے اور اسی وجہ سے اس کو علمائے کلام نے فقہ کے دائرہ سے نکال کر علم الکلام کے مباحث میں شامل کرلیا ہے۔

ماوردی نے خلافت کے لئے جو شروطِ معتبرہ گِنائی ہیں اُن میں ساتویں شرط قریشیت بیان کی ہے اور اس کو متفق علیہ کہا ہے۔[1] علامہ ابنِ خلدون نے بھی اس شرط کا ذکر کیا ہے لیکن اسکو مختلف فیہ کہتے ہیں۔

واختلف فی شرطٍ خامس وھو النسب القرشی۔[2]	اور پانچویں شرط یعنی قریشی النسب ہونا اس میں اختلاف کیا گیا ہے۔

اور صحیح بھی یہی ہے۔ چنانچہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک خلیفہ کے لئے قریشی ہونا ضروری نہیں ہے۔ حضرت الاستاذ مولانا السید محمد انور شاہ الکشمیریؒ مواہب الرحمن سے نقل کرتے ہیں کہ

انھا لیست بشرطٍ عند امامنا۔	قریشیت ہمارے امام صاحب کے نزدیک امارت کیلئے شرط نہیں ہے

اس کے بعد "تحریر المختار فی المناقضات علی رد المحتار" کے حوالہ سے فرماتے ہیں کہ امام ابویوسف کی رائے بھی یہی ہے۔[3]

ابن خلدون کی رائے اور ان کے دلائل	ابن خلدون نے اگرچہ اس کو مختلف فیہ بتایا ہے لیکن وہ خود اس شرط کی حمایت میں ہیں اور خلافت و امامت کے لئے اس کو لازمی قرار

[1] الاحکام السلطانیہ ص ۴ [2] تاریخ ابن خلدون ج ۱ ص ۱۶۱ [3] فیض الباری ج ۴ ص ۴۹۰

دیتے ہیں۔

موصوف نے اس سلسلہ میں جو دلائل پیش کئے ہیں اگر اُن کو ترتیب وار بیان کیا جائے تو وہ حسب ذیل ہوں گے۔

(۱) آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "الائمۃ من قریش"

(۲) سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار نے حضرت سعد بن عبادہ کو خلیفہ بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن جب ابوبکر صدیق نے اُن کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مذکورۂ بالا ارشادِ گرامی یاد دلایا تو سب خاموش ہو گئے اور انھوں نے اپنا فیصلہ واپس لے لیا۔ اس وقت کسی نے بھی حضرت ابوبکر کی تردید نہیں کی۔ اس سے ثابت ہوا کہ صحابۂ کرام کا قریشیت کی شرط پر اجماع تھا اور وہ سب ارشادِ نبوی الائمۃ من قریش سے واقف تھے۔

(۳) صحیح حدیث میں ہے کہ یہ امر یعنی خلافت ہمیشہ قریش میں رہے گا۔

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ "اسی طرح کی دلیلیں کثرت سے ہیں لیکن جب قریش کے حالات کمزور ہو گئے اور راحت پسندی و آرام طلبی میں پڑ جانے کی وجہ سے انکی عصبیت (خاندانی خصوصیت) پارہ پارہ ہو گئی تو وہ خلافت کا بوجھ اُٹھانے کے قابل نہیں رہے اُن پر عجمی غالب آگئے اور وہ ہی ارباب حل وعقد بن گئے۔ اس سے اکثر محققین کو اشتباہ پیدا ہو گیا اور وہ سرے سے قریشیت کی شرط کے ہی منکر ہو گئے۔[۱]

علامہ ابن خلدون کے دلائل پر بحث

غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ابن خلدون کی تینوں دلیلوں میں سے کوئی ایک دلیل بھی ایسی نہیں ہے جس پر کوئی اعتراض یا اشکال وارد نہ ہوتا ہو۔ سب سے زیادہ موثر اور قوی پہلی دلیل ہے اس پر چند وجوہ سے اشکال وارد ہوتا ہے۔

[۱] تاریخ ابن خلدون ج ۱ ص ۱۹۲

الف) الائمۃ من قریش کا مطلب کیا ہے؟ یعنی یہ انشا ہے یا خبر۔

ب) اگر خبر ہے اور اس کی مراد یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اطلاع دے رہے ہیں کہ اُمت میں جو امام پیدا ہوں گے وہ قریش میں سے ہی ہوں گے تو ظاہر ہے کہ یہ خبر صادق نہیں ہے۔ تاریخِ اسلام میں سب نہ سہی وقتاً فوقتاً ایسے خلفاء ضرور پیدا ہوتے رہے ہیں جو اقامتِ دین کا فرض ادا کرتے تھے اور جملہ شرائطِ امامت کے جامع تھے لیکن قریشی نہیں تھے۔

ج) اگر انشا ہے اور مراد یہ ہے کہ حضور حکم دے رہے ہیں کہ جو امام منتخب کیا جائے اُس کے لئے قریشی ہونا ضروری ہے تو پھر اُن روایات کا کیا جواب ہوگا جن میں فرمایا گیا ہے کہ اگر ایک عبدِ حبشی بھی تمہارا امام ہو تو اس کی اطاعت کرو۔

عن انس بن مالک قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسمعوا واطیعوا ان استعمل علیکم عبد حبشی کان راسہٗ زبیبۃ [1]	انس بن مالک سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے تم سمع وطاعت سے کام لو اگرچہ تمہارا امام ایک حبشی غلام ہو جس کا سر ایک کشمش کے دانہ کی طرح نظر آتا ہو یعنی بدصورت و کریہ المنظر ہو۔

ایک غیر قریشی کی امامت اگر منعقد ہی نہیں ہو سکتی تو پھر اُسکی اطاعت کا حکم کیسا؟

یہ واضح رہنا چاہیئے کہ امام بخاری نے اسی روایت کو کتاب الصلوٰۃ میں "باب امامۃ العبد والمولیٰ" کے ماتحت بھی درج کیا ہے جس سے مقصد اس بات کیطرف

---

[1] صحیح بخاری ج ۲ ص ۱۰۵۷ کتاب الاحکام۔ کسی کو یہ شبہ نہیں ہونا چاہیئے کہ حدیث میں "استعمل" کا لفظ ہے نہ کہ "استخلف" کیونکہ امام بخاری نے اس روایت کو جس باب کے ماتحت درج کیا ہے اُس کا ترجمہ "السمع والطاعۃ للامام مالم تکن معصیۃ" ہے اس سے معلوم ہوا کہ "استعمال" سے مراد استخلاف ہے۔

اشارہ کرتا ہے کہ جب ایک عبد کو امامتِ کبریٰ کا مقام حاصل ہو سکتا ہے تو وہ امامتِ صغریٰ یعنی نماز میں امام بننے کا اہل کیوں نہیں ہو گا؟

علاوہ ازیں صحیح بخاری میں ہے۔

ان ھذا الامر فی قریش	جب تک قریش دین کی اقامت کرتے رہیں گے
لا یعادیھم احدٌ الا کبّہ	یہ امر (خلافت) انہیں میں رہے گا جو کوئی
اللہ علی وجھہ ما اقاموا	اس میں اُن سے جھگڑا کرے گا اللہ اس کو
الدین [1]	ذلیل کرے گا۔

اب فرض کرو۔ اس حدیث کے مطابق۔ اور جیسا کہ خود تاریخ سے ثابت ہے ——— ایک ایسا وقت آگیا جبکہ قریش اقامتِ دین کے قابل نہیں رہے تو اب سوال یہ ہے کہ چونکہ منصبِ امام پوری اُمت پر فرضِ کفایہ ہے اس لئے ایسی صورت میں امام کا انتخاب کیونکر کیا جائے گا؟ جو قریشی ہے وہ اقامتِ دین سے عاجز ہے اور جو اقامتِ دین کر سکتا ہے وہ بدقسمتی سے قریشی نہیں۔ ان دونوں میں کس کو امام بنایا جائے؟ اگر قریشی کو ہی تو پھر "ما اقاموا الدین" کا مطلب کیا ہوا؟ اور اگر غیر قریشی کو تو پھر ظاہر ہے کہ الائمۃ من قریش انشاکے لئے نہیں ہوا اور اس سے مراد ہرگز یہ نہیں ہوئی کہ امام وخلیفہ کے لئے قریشی النسب ہونا ضروری ہے۔

سالم حضرت ابو حذیفہ کے غلام تھے۔ قرآن مجید کی تلاوت عجیب خوش الحانی سے کرتے تھے جب یمامہ کی جنگ میں شہید ہوئے تو لوگ کہتے تھے ذھب ربع القرآن [2] حضرت عمر فاروق کو اُن کے ساتھ بڑی محبت اور عقیدت تھی۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ لو کان سالم حیا لو لیتہ، اگر سالم زندہ ہوتے تو میں اُن کو امیر بناتا۔ حضرت عمر خود اَجلۂ قریش میں سے تھے اور حضرت ابو بکر نے سقیفۂ بنی ساعدہ میں جب حدیث

[1] کتاب الاحکام باب الامراء من قریش۔ [2] المستدرک للحاکم ج ۳ ص ۲۲۶

الائمۃ من قریش" پڑھی تھی تو اس وقت وہ خود موجود بھی تھے۔ لیکن اس کے باوجود حضرت عمر فاروق کا ایک غلام کی نسبت یہ فرمانا اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت عمر حدیث زیر بحث کا مطلب یہ ہرگز نہیں سمجھتے تھے کہ امام کا قریشی ہونا ضروری ہے' اور اس کے بغیر امامت کا انعقاد ہو ہی نہیں سکتا۔

اب سوال یہ ہے کہ اچھا! جب الائمۃ من قریش نہ انشا ہے اور نہ خبر تو پھر آخر اسکا مطلب کیا ہے؟ اصل یہ ہے کہ جس طرح ہر خاندان کی کوئی نہ کوئی خصوصیت ہوتی ہے اور عام بول چال میں اُس خصوصیت کو اُس خاندان کے لوگوں میں محدود کر کے بولتے ہیں۔ مثلاً ہم یوں کہیں کہ علماء تو دیوبندیوں' یا فرنگی محلیوں میں ہوتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ علماء دیوبند اور فرنگی محل کے علاوہ کہیں اور پیدا ہی نہیں ہوتے۔ اسی طرح آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا منشاء یہ ہے کہ امامت کے لیے جن اوصاف وکمالات کی ضرورت ہے مثلاً تدبیر' شجاعت شہامت۔ قیادت کی صلاحیت یہ سب قریش میں پائے جاتے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ اوصاف قریش کے علاوہ کسی اور خاندان یا قبیلہ کے کسی شخص میں پائے ہی نہیں جا سکتے۔ بہرحال مدارِ امامت وہ اوصاف وکمالات ہوئے۔ جو قریش کا طغرائے امتیاز تھے' نہ کہ خود قریشی النسب ہونا۔

علامہ ابن خلدون کے کلام میں تضاد

عجیب بات ہے کہ علامہ ابنِ خلدون جنھوں نے شرطِ قریشیت کی بڑی پُرزور حمایت کی ہے اسی بحث میں جب اس شرط کی حکمت پر گفتگو کرتے ہیں تو ایسی تقریر کر جاتے ہیں جس سے شرطِ قریشیت کی نفی ہوتی ہے اور اگرچہ پیرایۂ بیان بدلا ہوا ہے لیکن اس تقریر کا حاصل بھی وہ ہی نکلتا ہے جو ہم نے ابھی حدیث زیر بحث کی توجیہ میں لکھا ہے۔ چونکہ اس تقریر میں بعض بڑی اہم باتیں بھی قلم سے نکل گئی ہیں اس لئے کسی قدر طویل ہو جانے کے باوجود ہم اسی کو بجنسہ نقل کرتے ہیں' لکھتے ہیں۔

"اب ہم امامت وخلافت میں نسب (قریشیت) کی شرط کی حکمت پر کلام کرتے ہیں

تاکہ ان مذاہب میں جو حق ہے وہ ظاہر ہو جائے اور ہم کہتے ہیں کہ تمام احکامِ شرعیہ کے مقاصد بھی ہوتے ہیں اور ان کی حکمتیں بھی ہوتی ہیں۔ جہاں تک قریشی النسب ہونے کی شرط کا تعلق ہے تو اس میں شارع کی حکمت صرف اس قدر ہی نہیں ہے کہ اس ذریعہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت سے برکت وسعادت حاصل کی جائے۔ اگرچہ یہ برکت بھی حاصل ہو جاتی ہے لیکن تبرک مقاصدِ شرعیہ میں سے نہیں ہے۔ جب ہم غور وفکر کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ نسب کی شرط لگانے میں حکمت اور مقصدِ شارع یہ ہے کہ اس ذریعہ سے امت میں استحکام اور مضبوطی رہے اور ان میں آپس میں گروہ بندی اور تفرق وتشتت پیدا نہ ہونے پائے۔ کیونکہ قریش مُضَر سے زیادہ طاقت وسطوت اور دبدبۂ ورعب رکھتے تھے اور پورا عرب اُنکی سیادت وعظمت کو تسلیم کرتا تھا۔ اس کے برعکس قبائلِ مُضَر میں یہ بات نہیں تھی اس لئے اگر خلافت غیر قریش میں چلی جاتی تو پھوٹ پڑ جاتی اور وحدت کلمہ باقی نہیں رہتی۔ ابن اسحٰق نے بھی کتاب السیر وغیرہ میں یہی لکھا ہے۔ پس جب یہ ثابت ہوگیا کہ قریشیت کی شرط دفع تنازع اور اتحادِ کلمہ کی بقا کی غرض سے ہے اور ہم کو یہ بھی معلوم ہوگیا کہ شارع اپنے احکام کسی گروہ۔ زمانہ یا قوم کے ساتھ مخصوص نہیں کرتا ہے تو اس سے یہ صاف ظاہر ہوگیا کہ قریشیت کی شرط کا دراصل مفہوم وہی ہے جو کفایت[1] کا ہے۔ اسی بنا پر جو شخص بھی کہ مسلمانوں کا والی یا امام ہو اُس کے لئے ہم نے اس بات کی شرط لگائی ہے کہ وہ ایک ایسی جماعت یا ایسے خاندان سے تعلق رکھتا ہو جس کی سیادت اور عظمت مسلم ہو۔ اور مسلمانوں میں جسکو اعتبار ووقار حاصل ہو، جیسا کہ قریش کو عرب میں حاصل تھا۔"[2]

---

[1] کفایت کی تعریف اس بحث کے شروع میں ہی گزر چکی ہے اسے پھر دیکھ لیا جائے۔ [2] تاریخ ابن خلدون جلد اوّل صفحہ ۱۶۲ - ۱۶۳ -

اس تقریر کے اخیر فقروں کو غور سے پڑھو اور بتاؤ کہ کیا اس کا حاصل اور مطلب ٹھیک ٹھیک وہی نہیں ہے جو ہم نے اوپر لکھا ہے یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کو بطور تمثیل پیش کیا ہے اور مقصد یہ ہے کہ امام اپنے زمانہ میں ایک ایسی با اقتدار جماعت کا فرد ہو جیسا کہ قریش عہدِ نبوت و خلافت میں تھے۔ تاکہ اس میں امامت کے اوصاف و کمالات بدرجۂ اتم پائے جائیں تو گویا اصل مقصد وہ اوصاف و کمالات ہیں جن کے مظہر اس زمانہ میں قریش تھے نہ کہ محض نسبتاً قریشی ہونا۔ فشتان ما بینھما۔

سطورِ بالا میں ہم نے جو کچھ لکھا ہے اُس سے یہ بھی واضح ہو گیا ہو گا کہ سقیفۂ بنی ساعدہ میں حضرت ابو بکر صدیق نے الائمۃ من قریش سے جو استدلال کیا تھا اور صحابۂ کرام اس پر خاموش رہے تھے تو اُس وقت اس سے ان کی مراد کیا تھی؟ بے شبہ ان کا مطلب صرف اس قدر تھا کہ اس وقت کی سوسائٹی میں اور اُن حالات میں قریش کو ہی یہ مرتبہ و مقام حاصل تھا کہ مسندِ امامت پر متمکن ہوں۔ غیر قریشی کے امام بننے سے ملّتِ اسلامی میں استحکام اور اجتماعیت کا قیام ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ اس موقع پر حضرت ابو بکر نے جو تقریر کی تھی اُس میں آپ نے فرمایا تھا۔

وان العرب لا تعرف هذا الامر الا لهذا الحیّ من قریش [1]	اور عرب اس قبیلۂ قریش کے سوا کسی اور کی ولایت و امارت سے آشنا ہی نہیں ہیں۔

اور کون کہہ سکتا ہے کہ جب خود قریش میں ابو بکر و عمر اور عثمان و علی جیسی شخصیتیں موجود ہوں تو پھر وہاں کسی اور کو بھی امامت و خلافت کا استحقاق ہو سکتا ہے۔؟

اب رہی یہ بات کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ خلافت ہمیشہ قریش میں رہے گی" تو اوّل تو یہ ارشاد مطلقاً نہیں ہے بلکہ "ما عدلوا" یا "ما اقاموا الدین"

[1] ابن جریر طبری جلد دوم ص ۴۴۶ ان الفاظ کے ساتھ ساتھ بعض روایات میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ اگر اوس میں سے کوئی خلیفہ ہوا تو خزرج والے نہیں مانیں گے اور اگر خزرج میں سے کوئی ہوا تو اوس نہیں مانے گا۔

کی قید کے ساتھ ہے اور اس قید کیساتھ اس کا جو مطلب ہو وہ ظاہر ہی ہے۔ اس
کے علاوہ ہر چیز کا بقا اس کے اوصاف و خصائص کی بنا پر ہوتا ہے
ارشادِ گرامی کا منشا یہ ہے کہ جب تک قریش قریش رہیں گے یعنی اپنے امتیاز و اوصاف
پر قائم رہیں گے ان میں خلافت رہے گی اور کوئی شبہ نہیں کہ اگر قریش میں ابوبکر و عمر برابر
پیدا ہوتے رہتے تو پھر کس کی مجال تھی کہ ان سے خلافت سلب کر سکتا۔
خلیفہ کے انتخاب کا طریقہ اس سلسلہ میں دوسرا اہم مسئلہ انتخاب خلیفہ کا ہے کہ اس کے لیے کیا
طریقہ ہونا چاہیے۔ قرآن مجید یا حدیث میں صراحت کیساتھ اس بارہ میں کوئی حکم نہیں البتہ
چند اشارات ہیں جن سے خلفائے راشدین کے تعامل کی روشنی میں کچھ اصول مستنبط کئے
جا سکتے ہیں۔ مثلاً قرآن مجید میں ہے۔

امرهم شوریٰ بینهم ۔ مسلمانوں کا معاملہ باہمی مشورہ سے طے ہوگا۔

اس سے معلوم ہوا کہ شخصی استبداد اور تحکم کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں جب خود
آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم وشاورهم فی الامر مشورہ کرنے اور دوسروں سے
استمزاج کا حکم ہے تو پھر کسی اور کا کیا ذکر؟
اب رہی یہ بات کہ استمزاج و استصواب آج کل کی جمہوریتوں کے قانون و دستور کے
مطابق مملکت کے ہر بالغ مرد سے کیا جائے جس کو Adult franchise کہا جاتا ہے
یا صرف اربابِ حل و عقد سے جن کی حیثیت آج کل کی آئینی اصطلاح میں نمائندگانِ اسمبلی یا
ممبرانِ پارلیمنٹ کی ہوتی ہے اس معاملہ میں قرآن نے پہلی صورت یعنی بالغوں کے حق رائے
دہندگی کو تسلیم نہیں کیا ہے اور دوسری صورت کا اثبات کیا ہے اور صاف کہا ہے۔

هَلْ يَسْتَوِی الَّذِیْنَ یَعْلَمُوْنَ	کیا وہ لوگ جو جانتے ہیں اور جو نہیں جانتے
وَالَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ	برابر ہیں۔

ایک اور موقع پر فرمایا گیا۔

فَاسْئَلُوْا اَھْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۔ اگر تم نہیں جانتے تو اہلِ علم سے پوچھو۔

اسلام حقانیت و صداقت کا مذہب ہے۔ ہر چیز کو اُس کی اصل ماہیت و نوعیت کی کسوٹی پر پرکھتا ہے اور عوام فریب الفاظ و اصطلاحات کا طلسم نہیں باندھتا۔ اس بنا پر وہ اس بات کا قائل نہیں کہ ایک جاہل کندۂ ناتراش اور شریر و فتنہ پرداز انسان کو بھی ووٹ دینے کا ایسا ہی حق ہے جیسا کہ ایک صاحبِ علم و فہم اور متقی و صالح کو ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اربابِ حل و عقد کا تعین کیوں کر کیا جائیگا؟ ہمارے زمانہ میں جو لوگ عوام سے جھوٹے سچے وعدے کر کے اور چند نمائشی کارنامے انجام دیکر ووٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور اس طرح اسمبلی۔ کونسل۔ یا میونسپل بورڈ کے ممبر منتخب ہو جاتے ہیں وہی قوم کے نمائندے اور اس کے اربابِ حل و عقد سمجھے جاتے ہیں لیکن اسلام اُن لوگوں کو اربابِ حل و عقد سمجھتا ہے جو قوم میں اپنے فہم و تدبر، عملِ صالح اور بلند کیرکٹر کی وجہ سے عوام کے مرجع اور اُن کے معتمد علیہ ہوں۔ انھوں نے اپنے لئے قوم سے کوئی ووٹ نہ مانگا ہو۔ اور ووٹ حاصل کرنیکے لئے اپنے کارناموں یا آئندہ کے منصوبوں کی کوئی طویل فہرست نہ شائع کی ہو لیکن اس کے باوجود ملتِ اسلامیہ نے اُن کی ذہنی اور عملی سربلندیوں سے متاثر ہو کر خود اُن کو اپنا امام یا لیڈر تسلیم کر لیا ہو پس قرآن مجید میں جن لوگوں سے مشورہ کرنے کا حکم ہے وہ یہی لوگ ہیں۔

ان اصولی اشارات کے علاوہ خاص خلیفہ کے انتخاب سے متعلق قرآن و حدیث میں کسی مخصوص نظام یا طریقہ کا حکم نہیں دیا گیا اسی بنا پر حضرت عمرؓ جن تین چیزوں کا ذکر کر کے فرمایا کرتے تھے کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کی حقیقت بتا جاتے تو مجھ کو دُنیا اور مافیہا سے زیادہ عزیز ہوتی۔ اُن میں سے ایک خلافت بھی ہے۔ اسی طرح ایک موقع پر جب لوگوں نے آپ سے آپکی جانشینی کے متعلق سوال کیا تو فرمایا کہ میں کسی کو نامزد کروں یا نہ کروں میرے

لئے دونوں راستے موجود ہیں کیونکہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو نامزد نہیں کیا لیکن ابوبکر نے مجھ کو نامزد کیا تھا۔ حضرت عمر کے اس قول سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس بارہ میں اُن کے ذہن میں کوئی قطعی حکم نہیں تھا۔ اور اس کو مسلمانوں اور اُن کے ارباب حل وعقد کی رائے پر ہی چھوڑ دیا گیا ہے کہ موقع اور محل کے مناسب جو طریقہ پسندیدہ ہو اختیار کرلیں۔ چنانچہ چاروں خلفا میں سے ہر ایک کا انتخاب ایک جداگانہ طریقہ پر ہوا۔ ہم ذیل میں اُس کی تفصیل درج کرتے ہیں۔

(۱) حضرت ابوبکر صدیق کا انتخاب ایک انتخابی مجلسِ مشاورت میں ہوا جس میں سب انصار اور اکابر مہاجرین موجود تھے۔ حضرت ابوبکر نے جب اپنی تقریر سے انصار کو مطمئن کر دیا اور اُن سے یہ تسلیم کرالیا کہ خلیفہ کوئی قریش میں ہی سے ہونا چاہئے تو پھر آپ نے حضرت عمر اور حضرت ابوعبیدہ بن الجراح کے نام پیش کئے، اتنے میں جھٹ حضرت عمر نے بیعت کے لئے حضرت ابوبکر کی طرف ہاتھ بڑھا دئے۔ حضرت عمر کا پیش قدمی کرنا تھا کہ انصار ومہاجرین ٹوٹ پڑے اور حضرت ابوبکر خلیفہ منتخب ہوگئے۔

حضرت ابوبکر کا یہ انتخاب اگرچہ انتخابِ عام تھا یا کم از کم کثرتِ آراء سے ہوا تھا لیکن یہ ظاہر ہے کہ ایک فوری کارروائی تھی۔ اس سے بعض لوگوں کو یہ خیال پیدا ہوگیا کہ جب کوئی شخص چاہے حضرت عمر کی طرح اچانک کسی کے ہاتھ پر بیعتِ خلافت کر سکتا ہے۔ چنانچہ حضرت عمر کے عہدِ خلافت میں کسی نے کہا کہ امیرالمومنین (عمر فاروق) کا انتقال ہوگیا تو میں فلاں شخص کے ہاتھ پر بیعت کرلوں گا۔ چونکہ بغیر کسی مشورہ کے محض شخصی پسند پر کسی کو خلیفہ مان لینا اسلام کی تعلیم کے خلاف تھا اس بنا پر جب حضرت عمر کو اس شخص کا یہ قول پہونچا تو آپ سخت غضب ناک ہوئے اور حضرت ابوبکر کی بیعت کو ایک استثنائی مثال قرار دیتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

فلا یغترن امرءٌ ان یقول انّما ۔۔۔ کوئی شخص دھوکہ میں پڑ کر یہ نہ کہے کہ ابوبکر

كانت بيعة ابي بكر فلتة — کی بیعت اچانک ہوئی تھی اور پھر بھی درست
وتمت الا وانها قد كانت — ہو گئی۔ خبردار ہاں وہ ایسی ہی اچانک ہوئی تھی
كذالك ولكن الله وقى شرها۔ — لیکن اللہ تعالیٰ نے اس جلدبازی کے شر سے محفوظ رکھا۔

اس کے بعد فاروق اعظم فرماتے ہیں کہ یہ بیعت اچانک اور دفعتہً سہی لیکن آخر بیعت تھی کس کے ہاتھ پر؟ صدیق اکبر کے ہاتھوں پر! جن سے زیادہ مستحق خلافت کوئی اور دوسرا نہیں ہو سکتا تھا۔ حضرت عمر کے اصل الفاظ یہ ہیں۔

وليس منكم من تقطع الاعناق — اور تم میں ابوبکر جیسا کوئی بھی ایسا نہیں تھا
اليه مثل ابي بكر — جس کے پاس دور دراز سے لوگ سفر کر کے آتے۔

حضرت ابوبکر کی بیعت کا یہ واقعہ جو ایک استثنائی حیثیت رکھتا تھا اگر حضرت ابوبکر کا واقعہ نہ ہوتا تو خود حضرت عمر کے نزدیک ایک عظیم شر اور فتنہ کا باعث ہو سکتا تھا۔ اسی بنا پر بطور اصول کے حضرت عمر نے بڑی تاکید کے ساتھ فرمایا کہ مسلمانوں کے باہمی مشورہ کے بغیر کسی کے ہاتھ پر بیعتِ خلافت کر لینا اس شخص کو خلیفہ نہیں بنا دیتا ہے۔

من بايع رجلاً عن غير مشورة — جس شخص نے مسلمانوں کے مشورہ کے بغیر کسی سے
من المسلمين فلا يبايع هو۔ [1] — بیعت کی تو اس سے وہ شخص خلیفہ نہیں بن گیا۔

پہلے دن حضرت ابوبکر کا انتخاب ایک خاص مجلس میں ہوا اور اگرچہ اچانک ہوا لیکن اُس وقت کی سب پارٹیوں کے نمائندوں کی موجودگی میں ہوا اور بلا مقابلہ ہوا اس کے بعد دوسرے روز مسجد میں بیعتِ عامہ ہوئی اور ایک لائق ذکر شخص بھی ایسا نہیں رہا جس نے بیعت نہ کی ہو یا کم از کم اس انتخاب کی مخالفت میں آواز بلند کی ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ خلیفہ کا انتخاب اور پھر بیعت کے ذریعہ تمام مسلمانوں کا اُس انتخاب پر اپنی رضامندی کا عملاً اظہار ضروری ہے۔

[1] صحیح بخاری جلد دوم ص ۱۰۰۹ باب رجم الحبلیٰ من الزنی اذا احصنت۔

(۲) خلیفۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلیفۂ دوم کا انتخاب اس طرح ہوا کہ اگرچہ حضرت ابوبکر کو اس کا یقین تھا کہ حضرت عمر سے بڑھ کر دوسرا کوئی شخص اُنکی جانشینی کیلئے موزوں نہیں ہو سکتا تاہم اس معاملہ میں انھوں نے اکابر صحابہ سے مشورہ کیا اور بحث و تمحیص کے بعد آخر حضرت عمر کے حق میں عہد نامۂ خلافت لکھوایا اور اپنے غلام کو دیا کہ مجمع عام میں جاکر سُنا دے۔ پھر خود بالاخانہ پر پہونچکر لوگوں سے جو نیچے جمع تھے پوچھا کہ میں عمر کو نامزد کرتا ہوں تم لوگ اس کو پسند کرتے ہو؟ سب نے سمعنا اطعنا کہا۔

(۳) خلیفۂ سوم حضرت عثمان کا انتخاب اس طرح ہوا کہ ایک زخم کاری کے بعد حضرت عمر کو اپنے جانبر نہ ہو سکنے کا یقین ہوگیا تو چھ ناموران قریش حضرت علی۔ عثمان۔ زبیر۔ طلحہ سعد بن ابی وقاص اور عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہم کی ایک کونسل بنادی اور وصیت کی کہ چھ آدمی اپنے میں سے کسی ایک کو خلیفہ منتخب کرلیں۔ فاروق اعظم کی وفات کے بعد کونسل کا جلسہ ہوا۔ دو روز تک بحث ہوتی رہی لیکن فیصلہ نہ ہوسکا۔ آخر تیسرے دن حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی تجویز کے مطابق تین حضرات نے اپنے نام واپس لے لئے اور اب خلافت بجائے چھ کے تین شخصوں میں دائر رہ گئی جن میں سے ایک خود عبدالرحمٰن بن عوف بھی تھے۔ بعد میں انھوں نے بھی اپنا نام واپس لے لیا۔ اب لے دے کے صرف دو رہ گئے ایک حضرت علی اور دوسرے حضرت عثمان ان دونوں نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کو اپنا حَکَم تسلیم کرلیا۔ اب عبدالرحمٰن بن عوف اور سب صحابہ مسجد میں جمع ہوئے۔ پہلے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے ایک مؤثر تقریر کی اور پھر حضرت عثمان کی طرف بیعت کے لئے ہاتھ بڑھا دیئے۔ ان کے بعد حضرت علی نے بیعت کی۔ آپ کا بیعت کرنا تھا کہ صحابہ ٹوٹ پڑے اور حضرت عثمان اتفاقِ آراء سے مسند آرائے خلافت ہو گئے۔

(۴) خلیفۂ چہارم حضرت علی کا انتخاب نہایت ہنگامی حالات میں ہوا۔ حضرت عثمان کے شہید ہوتے ہی فتنہ و فساد کے دروازے کھل چکے تھے۔ طوائف الملوکی نے اسلامی جمیعت، اتحاد

کا شیرازہ پراگندہ کر دیا تھا۔ مدینہ میں خاک اڑنے لگی تھی۔ صحابۂ کرام جو اس وقت حیات تھے منتشر تھے ان میں سے بہتیرے تو مدینہ سے باہر ادھر اُدھر کے علاقوں میں تھے۔ قاتلینِ حضرت عثمان کی بن آئی تھی۔ مدینہ پر چھائے ہوئے منڈلاتے پھرتے تھے۔ انہیں لوگوں نے حضرت علی کو خلیفہ بنانا چاہا تو حضرت علی نے پہلے پہل انکار کیا لیکن آخر جب ان کا اصرار شدید ہوا تو اسلامی جمعیت کو مزید انتشار و پراگندگی سے بچانے کی غرض سے ہامی بھر لی اور آپ کی خلافت کا اعلان ہو گیا اور عام مسلمانوں کے علاوہ جو اس وقت مدینہ میں موجود تھے حضرتِ طلحہ اور زبیر جن کی طرف سے اندیشہ ہو سکتا تھا۔ انھوں نے بھی بیعت کر لی لیکن پھر بھی بہت سے لوگوں نے بیعت نہیں کی اور مدینہ سے نکل کر شام کی طرف چلے گئے۔ چونکہ یہ انتخاب ہنگامی تھا اور حضرت علی نے خلافت کی ذمہ داری صرف ایک قومی اور اجتماعی ضرورت سے قبول کی تھی اس بنا پر اس انتخاب کو بطور ایک شرعی اصل کے پیش نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ جہاں تک پہلے تینوں خلفاء کے انتخاب کا تعلق ہے اس سے امورِ ذیل صاف طور پر سمجھ میں آتے ہیں۔

(الف) خلیفہ کا انتخاب مجمع عام میں ہوا۔

(ب) چند اربابِ رائے سے مشورہ کرنیکے بعد خلیفہ نے اپنی جانشینی کے لئے ایک شخص کو نامزد کیا۔ اور اُس کو استصوابِ رائے عامہ کی خاطر عام مسلمانوں کے سامنے پیش کیا۔

(ج) خلیفہ نے ایک کونسل مقرر کر دی کہ وہ خلیفہ کا انتخاب کریگی اور پھر اُس کونسل کے فیصلہ کو استصوابِ رائے عامہ کی غرض سے مسلمانوں کے عام مجمع میں پیش کیا جائے گا۔

(د) کسی خلیفہ نے اپنے بیٹے کا تو کیا ذکر! اپنے کسی رشتہ دار تک کو نامزد نہیں کیا۔ اس معاملہ میں احتیاط کا یہ عالم تھا کہ حضرت علی حضرت عمر کے دست و بازو اور غایت معتمد علیہ تھے لیکن چونکہ بعض روایات کے مطابق حضرت ام کلثوم بنت علی سے نکاح کر لینے کے بعد دونوں میں رشتہ مصاہرت بھی قائم ہو گیا تھا اس بنا پر حضرت عمر نے چھ آدمیوں کی جو کونسل بنائی اس میں حضرت

علی کا نام تو رکھا لیکن نامزد نہیں کیا حالانکہ اگر نامزدگی کی بات ہوتی تو حضرت علی سے زیادہ اور کون مستحق ہو سکتا تھا۔

(۵) آخری فیصلہ بہر حال جمہور کے ہاتھ میں ہے۔ جب تک بیعتِ عامہ نہیں ہو گی کوئی شخص خلیفہ نہیں ہو سکے گا۔

حضرت ابوبکر صدیق کا استحقاقِ خلافت

یوں تو جتنے بھی صحابۂ کرام تھے سب ہی فلکِ اسلام و ایمان کے مہر و ماہ تھے۔ اگرچہ ایک حکومت کو کامیابی کے ساتھ چلانے کے لئے اور وہ بھی ان حالات میں جو اُس وقت درپیش تھے۔ دل اور دماغ کے جن اعلیٰ کمالات و ملکات کی ضرورت ہے۔ تمام صحابہ ان میں برابر اور مساوی حیثیت و مرتبہ کے نہیں ہو سکتے تھے۔ لیکن جو حضرات خلافت کے بجا طور پر مستحق اور اہل تھے جیسے حضرت عمر۔ عثمان۔ علی۔ عبدالرحمٰن بن عوف اور زبیر و سعد رضی اللہ عنہم وہ بھی دو چار نہیں بڑی تعداد میں تھے۔ قرآن مجید نے جن لوگوں کی صلاحیتِ حکمرانی کی گواہی ان الفاظ میں دی تھی۔

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا	وہ لوگ جن کو اگر ہم زمین میں اقتدار دیدیں تو وہ
الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ	نماز قائم کریں۔ زکوٰۃ دیں۔ بھلائیوں کا حکم کریں
وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ (الحج)	اور بری باتوں سے روک ٹوک کریں۔

وہ ظاہر ہے اکا دکا نہیں۔ ایک پورا گروہ اور ایک جماعت تھے۔ اب سوال یہ ہے کہ جب صورتِ حال یہ تھی تو پھر آخر اس کی وجہ کیا تھی کہ ایک پیغمبر آخر الزماں کی براہِ راست خلافت و نیابتِ پیغمبری کے بعد جس سے بڑھ کر کوئی اور اعزاز نہیں ہو سکتا حضرت ابوبکر صدیق کے حصہ میں ہی آئی۔ یہ سب کچھ محض بخت و اتفاق کا نتیجہ نہیں ہو سکتا۔ ضروری ہے کہ اس کے اسباب و وجوہ ہوں۔ اس سلسلہ میں ہم کو امورِ ذیل پر غور کرنا چاہیے۔

(۱) صحابۂ کرام میں سب سے زیادہ کس کے متعلق قرآن مجید کی آیات نازل ہوئی ہیں اور ان آیات سے اس کی شخصیت پر کیا روشنی پڑتی ہے۔

(۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سب سے زیادہ کس کو رفاقت کا شرف حاصل رہا۔

(۳) سب سے زیادہ اداشناس و مزاج دانِ نبوت کون تھا۔

(۴) آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ اعتماد کس پر تھا۔

(۵) کیا آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قولاً یا عملاً اس کی خلافت کی طرف اشارہ کیا ہے؟

(۶) صحابۂ کرام میں اُس کو کیا مرتبہ و مقام حاصل تھا۔

(۷) اس نے اپنے کارناموں سے یہ حقیقت کہاں تک ثابت کی کہ بیشک وہی خلیفۂ رسول ہونے کا سب سے زیادہ مستحق تھا۔

اب ہم مذکورۂ بالا تنقیحات میں سے ہر ایک پر علی الترتیب کلام کرتے ہیں۔

حضرت ابوبکر صدیق کا ذکر قرآن مجید میں

یہ واقعہ ہے کہ تمام صحابۂ کرام میں سب سے زیادہ یہ شرف اور سعادت حضرت ابوبکر کو ہی حاصل ہے۔ کہ قرآن نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آپ کے خصوصی تعلق کو۔ آپؐ کے خاص خاص اعمال و اقوال کو جن سے اسلام کو بڑا فائدہ پہونچا اور آپؐ کے عہدِ خلافت کے بعض نہایت شان دار کارناموں کو پوری وضاحت و صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے اور اُن پر مدح کی ہے۔ اور صرف اسی قدر نہیں بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیساتھ حضرت ابوبکر کا قبل از بعثت جو دوستانہ تعلق تھا اُس کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں ہے۔

حَتّٰۤی اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَ بَلَغَ اَرْبَعِیْنَ سَنَةً (الاحقاف) یہاں تک جب جوانی کو پہونچا اور چالیس برس کا ہوا

حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ یہ آیت حضرت ابوبکر صدیق کی شان میں نازل ہوئی ہے اور اس کا واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیس سال کے اور حضرت ابوبکر اٹھارہ برس کے تھے۔ دونوں تجارت کے سلسلہ میں شام جارہے تھے۔ راستہ میں

ایک منزل پر قیام کیا۔ یہاں ایک بیری کا درخت تھا۔ حضورؐ اس درخت کے سایہ میں جاکر بیٹھ گئے اور ابو بکر وہاں ایک راہب رہتا تھا کچھ دین و مذہب کی باتیں پوچھنے کی غرض سے اُسکے پاس جا بیٹھے راہب نے ابو بکر سے حضور کی طرف اشارہ کرکے پوچھا کہ یہ نوجوان جو درخت کے نیچے بیٹھا ہے کون ہے؟ وہ بولے "محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب" راہب نے کہا "خدا کی قسم! یہ نبی ہوگا۔ کیونکہ عیسیٰ بن مریم کے بعد سوائے محمد رسول اللہؐ کے کوئی اور شخص اس درخت کے سایہ میں نہیں بیٹھ سکتا" راہب کی یہ بات ابو بکر کے دل میں ایسی بیٹھی کہ سفر ہو یا حضر کسی حالت میں بھی حضور کا ساتھ نہیں چھوڑتے تھے چنانچہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کا اعلان کیا تو سب سے پہلے ابو بکر نے ہی اُس کو قبول کیا اور اسلام لائے۔ اس وقت ابو بکر کی عمر اڑتیس سال یعنی آنحضرت سے دو برس کم تھی۔ جب ابو بکر چالیس برس کے ہوئے تو انھوں نے وہ دعا مانگی جو اس آیت میں مذکور ہے یعنی رب اوزعنی ان اشکر نعمتك الآیہ[1]

اسلام لانے کے بعد حضرت ابو بکر نے اپنی دولت اللہ کے راستہ میں اور اسلام کی مدد کے لئے جس فیاضی اور بے جگری سے خرچ کی ہے۔ قرآن اسکی داد اس طرح دیتا ہے۔

لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْ بَعْدُ (الحدید)	تم میں سے جن لوگوں نے فتح مکہ سے پہلے روپیہ خرچ کیا اور جہاد کیا تم میں سے کوئی اُن کے برابر نہیں ہو سکتا۔ ان لوگوں کا مرتبہ بہت اونچا ہے بہ نسبت اُن لوگوں کے جنھوں نے فتح کے بعد خرچ کیا ہے۔

محمد بن فضیل کلبی سے نقل کرتے ہیں کہ یہ آیت ابو بکر صدیق کی شان میں نازل ہوئی ہے اس لئے کہ وہی سب سے پہلے اسلام لائے اور انھوں نے ہی سب سے پہلے اللہ کے راستہ میں اپنی دولت خرچ کی[2] امام ابوالحسن الواحدی نے حضرت عبداللہ بن عمر سے ایک روایت نقل کی ہے اس سے بھی اُس کی تصدیق ہوتی ہے، وہ روایت یہ ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت

[1] اسباب النزول للواحدی ص ۲۸۲ مطبوعہ مصر۔ [2] ازالۃ الخفا ص ۸۴

صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حضرت ابو بکر ایک عبا پہنے ہوئے بیٹھے تھے جو سینہ پر سے اُدھڑی ہوئی تھی اتنے میں جبرئیل امین آ گئے۔ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یہ کیا بات ہے کہ ابو بکر کی عبا سینہ پر سے چاک ہو رہی ہے حضورؐ نے جواب دیا " اے جبرئیل! ابو بکر نے اپنی ساری دولت میرے اوپر فتح مکہ سے پہلے ہی خرچ کر دی " اب جبرئیل امین بولے " آپ اللہ کا سلام ابو بکر کو پہونچا دیجئے اور ان سے پوچھئے کہ آپ اپنے اس فقر پر اللہ سے راضی ہیں یا ناراض؟ حضورؐ نے حضرت ابو بکر سے یہ دریافت کیا تو وہ رونے لگے اور عرض کیا کہ کیا میں اپنے رب سے ناراض ہوں گا؟ نہیں بلکہ میں اپنے رب سے راضی ہوں۔ اپنے رب سے راضی ہوں " [1]

اس آیت میں تو صرف دولت خرچ کرنیکا ذکر ہے۔ ایک اور آیت میں انفاق کے ساتھ دوسری صفات کا بھی ذکر ہے۔ ارشاد ہے۔

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۝ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى (واللیل) | پس جس شخص نے دیا، پرہیزگاری برتی اور نیکیوں کی تصدیق کی ہم اُس کیلئے آسانیاں ہم پہونچائیں گے۔

الواحدی نے اس آیت کے ذیل میں متعدد روایات نقل کی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اُس کا سبب نزول یہ ہے کہ حضرت ابو بکر غلام خرید خرید کر آزاد کیا کرتے تھے۔ یہ غلام اکثر ضعیف و ناتواں ہوتے تھے۔ ایک دن اُن کے باپ ابو قحافہ نے کہا کہ بیٹا اگر تم کو غلام آزاد کرنے کا ایسا ہی شوق ہے تو پھر کڑیل نوجوان غلام خرید کر آزاد کرو تا کہ وہ کسی وقت تمہارے کام بھی آئیں " حضرت ابو بکر نے جواب دیا " ابا! میری نیت تو اُن غلاموں کے آزاد کرنے سے کچھ اور ہی ہے " [2]

حضرت ابو بکر نے بلال حبشی کو خرید کر آزاد کیا تو مشرکین مکہ نے کہنا شروع کیا کہ ابو بکر پر بلال کا کوئی احسان تھا۔ انھوں نے اس کا بدلہ چکایا ہے۔ قرآن نے اس کی بھی تردید کی

[1] اسباب النزول ص ۳۰۳ [2] اسباب النزول ص ۳۳۶

اور اعلان کیا۔

وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى ۝ اِلَّا ابْتِغَآءَ	اور ان (ابو بکر) پر کسی کا کوئی احسان نہیں تھا جس
وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ۝ وَلَسَوْفَ يَرْضٰى ۝	کا بدلہ چکایا گیا ہو بجز رب اعلیٰ کی رضا جوئی کے اور
(واللیل)	یہ عنقریب راضی ہو گا۔

حضرت ابو بکر راتوں کو بیدار رہ کر جو عبادتِ الٰہی کرتے تھے اس کا تذکرہ قرآن میں اس طرح کیا گیا ہے[1]

اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّيْلِ

(الزمر)

حضرت ابو بکر جب اسلام لائے اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی تصدیق کی تو عثمان طلحہ۔ زبیر۔ وغیرہم اُن کے پاس آئے اور پوچھا کہ کیا آپ ایمان لے آئے ہیں؟ حضرت ابو بکر نے جواب اثبات میں دیا تو یہ سب بھی مسلمان ہو گئے۔ قرآن نے اس واقعہ کو بھی بیان کیا ہے جس سے حضرت ابو بکر کی مدح کا پہلو نکلتا ہے۔ ارشاد ہے[2]

فَبَشِّرْ عِبَادِ الَّذِيْنَ	پس اے محمد آپ خوش خبری سنا دیجئے
يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ	اُن لوگوں کو جو قول سنتے ہیں اور اُس
اَحْسَنَهٗ (الزمر)	اچھے قول کا اتباع کرتے ہیں۔

ان متفرق واقعات و محامد کے علاوہ قرآن مجید میں حضرت ابو بکر کا سب سے اہم تذکرہ وہ ہے جو غارِ ثور میں رفاقت سے متعلق ہے۔ فرمایا گیا۔

ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ — "غارِ ثور میں دو جو تھے اُن میں کا دوسرا"

یہ آیت حضرت ابو بکر کی فضیلت مآبی کی اتنی بڑی اہم اور مستند دستاویز ہے کہ علماء نے کہا ہے کہ چونکہ حضرت ابو بکر کی معیت و صحبت نبوی قرآن مجید میں منصوص ہے اس

[1] اسباب النزول ص ۲۷۶ [2] ایضاً۔

بنا پر اس کا منکر کافر ہے یہ حضرت صدیق اکبر کی خصوصیت ہے کسی اور صحابی کو یہ شرف حاصل نہیں ہے پھر حضرت ابو بکر کی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیساتھ رفاقت فی الغار کے عنداللہ و عندالناس مقبول ہونے کی دلیل اس سے بڑھ کر کیا ہو گی کہ گہری دوستی کے لئے یارِ غار بطور استعارہ ہی بولا جانے لگا ہے"

پھر جس طرح قرآن مجید میں بعض مواقع پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تنبیہہ کی گئی ہے مثلاً ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن ام مکتوم جو نابینا تھے آپ کی خدمت میں آئے اور آپ نے اُن کی طرف زیادہ التفات نہیں فرمایا تو عَبَسَ وَتَوَلّٰٓی ○ اَنْ جَاۗءَهُ الْاَعْمٰى ○ کی آیات نازل ہوئیں، ٹھیک اسی طرح کا معاملہ حضرت ابو بکر صدیق کیساتھ بھی ہے۔ واقعہ افک میں حضرت ابو بکر نے مسطح بن اثاثہ کی مالی اعانت و امداد سے دست کشی اختیار کر لینے کا ارادہ کر لیا تھا تو قرآن میں ان لفظوں کے ساتھ تنبیہہ کی گئی۔

وَلَا يَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ	تم میں جو لوگ صاحبِ فضل و مقدرت ہیں وہ
وَالسَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوْٓا اُولِي الْقُرْبٰى	رشتہ داروں۔ مسکینوں۔ اور اللہ کے راستہ میں
وَالْمَسٰكِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ	ہجرت کرنیوالوں کی مدد نہ کرنیکی قسم نہ کھائیں
وَلْيَعْفُوْا۔ (النور ۷) پارہ ۱۸	اور ان کو چاہئے کہ معاف کر دیں۔

حضرت ابو بکر نے آیت سُن کر کہا "خدا کی قسم! میں چاہتا ہوں کہ خدا مجھ کو بخشدے اور عہد کیا کہ اب آئندہ برابر وہ مسطح کے کفیل رہیں گے۔ اگرچہ یہ تنبیہہ ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے ساتھ غیر معمولی قرب و اختصاص کی دلیل ہے۔ جس کو بے شبہ مختصاتِ حضرت ابو بکر میں شمار کرنا چاہئے۔

پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ حضرت ابو بکر کے عہدِ خلافت کا جو سب سے بڑا اور عظیم الشان کارنامہ ہے یعنی مرتدینِ عرب سے جنگ و قتال اس کا تذکرہ بھی قرآن میں کیا گیا ہے اور نہ صرف حضرت ابو بکر بلکہ وہ تمام صحابۂ کرام جنھوں نے اس قتال میں حصہ لیا انکو اللہ تعالیٰ

نے اپنی محبوبیت کا طغرائے امتیاز عطا فرمایا ہے۔ لیکن چونکہ اس اہم اور عظیم الشان کارنامہ کی ابتدا و انتہا اور اس کی قیادت و زعامت کا سہرا صدیقِ اکبر کے ہی سر ہے اس بنا پر محبوبیتِ الٰہی کے اس تمغۂ اعزاز میں حضرت ابو بکر کا حصّہ بھی سب سے زیادہ ہوگا۔

ارشادِ ربانی ہے :۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَنْ	اے ایمان والو تم میں سے اگر کوئی شخص اپنے
يَرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَسَوْفَ	دین سے پھر جائے تو عنقریب اللہ تعالیٰ اُن کے
يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ	بدلے میں ایسے لوگوں کو لائے گا جن سے اللہ محبت
أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ	کرتا ہے اور جو اللہ سے محبت کرتے ہیں، یہ لوگ
أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ ۔	مومنین پر ہلکے پھلکے ہیں۔ کافروں پر غالب اللہ
يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ	کے راستے میں جہاد کرتے ہیں اور کسی ملامت گر کی
وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ ۚ ذَٰلِكَ	ملامت سے نہیں ڈرتے۔ یہ اللہ کا فضل ہے
فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ ۚ	جس کو چاہتا ہے دیتا ہے اور اللہ بڑی وسعت
وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ۔ (پ۶ مائدہ ع ۸)	والا اور علم والا ہے۔

امام بیہقی نے حضرت حسن بصری سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت ابو بکر کی شان میں نازل ہوئی ہے جب عرب مرتد ہو گئے تو انھوں نے اور اُن کے رفقاء نے جہاد کیا اور آخر کار اُنکو اسلام کی طرف لوٹا دیا۔ یونس بن بُکیر قتادہ سے روایت کرتے ہیں کہ ہم آپس میں کہا کرتے تھے کہ یہ آیت ابو بکر کے بارہ میں نازل ہوئی ہے کیونکہ انھوں نے ہی مرتدینِ عرب سے قتال کیا تھا۔[1]

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رفاقت آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیساتھ سب سے زیادہ کسکو رفاقت و ہم رہی کا شرف حاصل ہوا ہے اور سب سے زیادہ آپکا شریک جلوت و خلوت کون ہے؟ اس سوال کا جواب بھی ظاہر ہے حضرت ابو بکرؓ اول من اسلم

[1] الصواعق المحرقہ ص ۹

ہیں پھر اسلام سے قبل بھی دونوں ساتھ اور بعض معاملات میں ایک دوسرے کے شریک و رفیق رہے ہیں اسلام قبول کرنے کے بعد تو معیت و رفاقت کا یہ عالم رہا کہ حضرت ابوبکر گویا ایک دن کیلئے بھی آپ سے جدا نہ ہوئے۔ قیام مکہ کے زمانہ میں اور لوگ حبشہ گئے لیکن صدیق اکبر نہ گئے۔ پھر ہجرت مدینہ کا وقت آیا تو بہت سے صحابہ جن میں حضرت عمر بھی شامل ہیں پہلے سے مدینہ پہونچ گئے لیکن حضرت ابوبکر نے ہجرت کی تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اور اس طرح رفیق سفر و حضر رہے۔ غزوات کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ جن غزوات میں حضور تشریف لے جاتے تھے حضرت ابوبکر بھی ساتھ ہوتے تھے۔ سرایا میں لوگ کہتے تھے کہ ابوبکر کو بھیجئے تو حضور فرماتے تھے کہ نہیں یہ میرے پاس رہیں گے اور مجھ کو ان کی ضرورت ہے۔ اس طویل ترین رفاقت کے باعث ظاہر ہے جو تربیت اور تعلیم حضرت ابوبکر کی ہو سکتی تھی کسی دوسرے کی نہیں ہو سکتی تھی۔

ادا شناسی و مزاج دانی نبوت اس قرب و اتصال۔ ہر وقت کی معیت و رفاقت اور پھر خود اپنی ذاتی استعداد و صلاحیت کے باعث جس درجہ کے ادا شناس و مزاج دان نبوت صدیق اکبر ہو سکتے تھے کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔ واقعات کا تتبع کیا جائے تو صاف نظر آئیگا کہ حضرت ابوبکر صدیق اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مزاج اور انداز طبیعت ایک ہی خمیر سے تیار ہوا تھا عادات و خصائل۔ اور امیال و عواطف کے اعتبار سے ایک دوسرے سے جتنے قریب حضور پُر نور اور صدیق اکبر تھے کوئی اور نہیں تھا۔ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ یہاں بحث صرف مزاج کی ہم رنگی سے ہے نہ کہ شریعت کے اصل احکام و مسائل سے۔ چنانچہ پہلے ایک روایت گزر چکی ہے جس میں ابن الدغنہ نے حضرت ابوبکر کے اوصاف و کمالات ٹھیک ٹھیک وہی بیان کئے ہیں جو حضرت خدیجہ نے سرورِ کونین کے بیان کئے تھے۔ اس کے علاوہ چند اور واقعات بھی ہیں جن سے اس پر مزید روشنی پڑے گی۔

عبداللہ بن ابی جو مشہور منافق تھا اُس کا انتقال ہوا تو اس کا بیٹا عبداللہ آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور درخواست کی کہ اپنی قمیص مرحمت فرمادیجیے تاکہ ابن اُبی کو اس میں کفنا دیا جائے۔ حضورؐ نے قمیص عطا فرمادی۔ اس کے بعد اس نے کہا کہ اب نماز بھی پڑھ دیجیے، رحمتِ عالم نے اس درخواست کو بھی شرفِ قبول عطا فرمایا لیکن آپ نماز کے ارادہ سے کھڑے ہو رہے تھے کہ حضرت عمرؓ نے آپ کا دامن پکڑ کر کھینچا اور عرض کیا یا رسول اللہ! آپ اس شخص کی نماز پڑھتے ہیں۔ حالانکہ آپ کو اللہ نے اس سے منع کیا ہے۔ ارشاد ہوا "اللہ نے" اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ " فرماکر مجھکو اختیار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ اگر آپ ستر مرتبہ بھی استغفار کریں گے تو میں نہیں بخشوں گا" تو میں اب ستر سے بھی زیادہ مرتبہ استغفار کردوں گا" حضرت عمرؓ نے کہا "وہ تو منافق تھا" لیکن آپ نہ ماننے اور نماز پڑھی۔ اس پر یہ آیت اتری :-

وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓی اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا	آپ کبھی ان میں سے کسی کی نماز نہ پڑھیں اور
وَلَا تَقُمْ عَلٰی قَبْرِهٖ ۔ [1]	اُس کی قبر پر کھڑے نہ ہوں۔

اس میں شک نہیں کہ حضرت عمرؓ کی رائے اور منشاء کے مطابق اس آیت کا نزول حضرت عمرؓ کی فضیلت و بزرگی کی دلیل ہے۔ لیکن آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جو کچھ کیا تھا غایتِ شفقت علی الخلق اور رحمۃ للعالمین کے جذبہ سے کیا تھا جو آپ کے مزاجِ گرامی مرتبت کا ایک خاص جوہر تھا اور چونکہ اس وصفِ خاص میں حضرت عمرؓ کو آپ کے ساتھ اس درجہ قرب و اختصاص نہیں تھا جتنا کہ حضرت ابوبکرؓ کو تھا اس بنا پر حضرت عمرؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فعل پر اچنبھا ہوا لیکن صدیقِ اکبرؓ کو کوئی حیرت نہیں ہوئی۔

اسی طرح کا ایک موقع صلح حدیبیہ کے واقعہ میں پیش آیا تھا۔ ابوجندلؓ جن کو کافروں نے بڑی بے رحمی سے مارا تھا جب انھوں نے صحابۂ کرام کے سامنے آکر اپنے زخم دکھائے اور کہا کہ کیا آپ لوگ اس حالت میں بھی مجھ کو مکہ واپس کردینا چاہتے ہیں تو پورا مجمع تڑپ اٹھا

---

[1] صحیح بخاری کتاب التفسیر ج۲ ص ۶۷۳

حضرت عمرؓ میں برداشت کہاں تھی؟ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر بولے "کیا آپ پیغمبر برحق نہیں ہیں۔ اور اس طرح کے اور سوال و جوابات کیے۔ آخر جب یہاں تسلی نہ ہوئی تو حضرت ابوبکرؓ کے پاس آئے اور وہی گفتگو کی۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا۔

ایھا الرجل انہ رسول اللہ	اے شخص! بےشبہ اللہ کے رسول ہیں اور
ولیس یعصی ربہ وھو ناصرہ	اپنے رب کی نافرمانی نہیں کرتے ہیں۔ خدا اُن
فاستمسك بغرزہ فواللہ	کی مدد کرنیوالا ہے۔ پس تم اُن کے دامن کو پکڑلو۔
انہ علی الحق	قسم اللہ کی وہ یقیناً حق پر ہیں۔

اب حضرت عمرؓ نے کہا "کیا آپ (آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم) ہم سے یہ نہیں کہا کرتے تھے کہ ہم جلد ہی بیت اللہ آئیں گے اور اُس کا طواف کریں گے؟ حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا" ہاں کیوں نہیں! لیکن حضور نے کیا یہ بھی فرما دیا ہے کہ تم اسی سال بیت اللہ پہونچو گے؟[۱]

اسی طرح تم پڑھ آئے ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو اس حادثۂ فاجعہ کی خبر سنتے ہی حضرت عمرؓ کا کیا حال ہوا تھا لیکن جب ابوبکرؓ نے (وما محمد الا رسول (الآیۃ) آیت پڑھی تو حضرت عمرؓ کی یکایک آنکھ کھل گئی اور ایسا معلوم ہوا کہ گویا اب تک انھوں نے یہ آیت سنی ہی نہ تھی۔

ان سب واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت کے سانچہ میں اس طرح ڈھل گئے تھے کہ فکر، ذہن اور مزاج و طبیعت تک میں یگانگت اور مکمل مماثلت پیدا ہو گئی تھی اور اس بنا پر اداشناسیِ نبوت میں کسی کو اُن کے ساتھ دعویِ ہمسری نہیں ہو سکتا تھا۔

---

[۱] صحیح بخاری کتاب الشروط ج۱ ص ۳۸۰

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ اعتماد کس پر تھا	یہی وجہ ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ اعتماد حضرت ابو بکر کی رائے پر تھا۔ ایک مرتبہ

حضرت ابوبکر اور حضرت عمر دونوں کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا۔

"تم دونوں اگر کسی مشورہ پر متفق ہو جاؤ تو میں اُس کی مخالفت نہیں کروں گا"

ایک دفعہ خاص حضرت ابوبکر کی نسبت ارشاد ہوا :۔

ان اللہ یکرہ فوق سمائہ — اللہ تعالیٰ آسمان پر اس بات کو ناپسند

ان یخطأ ابو بکر۔ [1] — کرتا ہے کہ ابو بکر خطا کریں۔

اسی اعتماد کا نتیجہ تھا کہ حضرت ابوبکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ محبوب تھے۔ عمرو بن العاص سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ آپ کو سب سے زیادہ محبوب کون ہے ؟ فرمایا "عائشہ" پھر دریافت کیا "مردوں میں؟" ارشاد ہوا "عائشہ کے باپ" [2]

ایک مرتبہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک عورت آئی۔ آپ نے فرمایا "پھر آنا" عورت بولی "اگر میں آؤں اور آپ کو نہ پاؤں تو کیا کروں" آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا۔

ان لم تجدینی فاتی ابا بکر [3] — اگر تو آئے اور مجھ کو نہ پائے تو ابو بکر کے پاس آ۔

ایک مرتبہ ارشاد فرمایا۔

لا یبقین فی المسجد باب الا سُدّ — مسجد میں جتنے بھی دروازے ہیں ان کو بند

الا باب ابی بکر۔ [4] — کر دیا جائے البتہ ہاں باب ابی بکر کھلا رہے۔

ایک دفعہ ارشاد ہوا۔

[1] اصابہ ج ۲ ص ۸۳۲ [2] صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۱۷ [3] صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۱۶ [4] صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۱۶

لَوْ كُنْتُ مُتَّخِذًا مِنْ اُمَّتِیْ خَلِیْلًا لَاتَّخَذْتُ اَبَابَكْرٍ وَّلٰكِنْ اَخِیْ وَصَاحِبِیْ[1]	اگر میں اپنی اُمت میں سے کسی کو اپنا خلیل بناتا تو ابو بکر کو بناتا۔ لیکن وہ میرا بھائی اور دوست ہے۔

غزوۂ بدر کے بیان میں گذر چکا ہے کہ میدانِ جنگ میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خیمہ میں آپکے ساتھ حضرت ابو بکر صدیق ہی تھے اور جب وہ عبدالرحمٰن سے جنگ کرنیکے لئے جانے لگے تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو روکا اور فرمایا تم ہیں خیمہ میں رہکر مجھکو زیادہ فائدہ پہونچا سکتے ہو۔ یعنی مشورہ وغیرہ کے سلسلہ میں۔

کیا آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قولاً وعملاً کسی کے استخلاف کی طرف اشارات کئے ہیں	اگرچہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو بھی صراحتہً اپنی جانشینی کیلئے نامزد نہیں فرمایا

لیکن اگر آپ کے قول وعمل سے یہ پتہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس باب میں آپ کا گوشۂ چشم خاطر کس کی جانب تھا تو بے شبہ وہ خوش قسمت ذات اور شخصیت حضرت ابو بکر صدیق کی ہی تھی۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دینی مناصب میں سب سے بڑا منصب امامتِ صلوٰۃ تھا جس کو امامتِ صغریٰ بھی کہتے ہیں۔ تم پڑھ آئے ہو کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ منصب مرض الوفات میں حضرت ابو بکر صدیق کو ہی تفویض فرمایا تھا اور وہ بھی کس اصرار کے ساتھ۔ حضرت عائشہ۔ حضرت حفصہ کے اشارہ پر حضرت ابو بکر صدیق کی رقتِ قلب کا عذر کرتی ہیں اور اپنے باپ کے بجائے حضرت عمر فاروق کا نام تجویز کرتی ہیں لیکن آپ ہیں کہ نہیں مانتے اور کوئی عذر نہیں سُنتے۔ حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ کو "صواحب یوسف" کہتے ہیں اور پھر اصرار کے ساتھ حضرت ابو بکر کی ہی امامت کرنیکا حکم دیتے ہیں۔ اور صرف اسی پر بس نہیں بلکہ جیسا کہ حضرت عائشہ کی روایت ہے۔ آپنے یہاں تک فرمایا کہ

لا ینبغی لقوم فیھم ابو بکر ان یؤمھم غیرہٗ[1]	جس قوم میں ابو بکر ہوں اُس کے لئے یہ مناسب نہیں کہ ابو بکر کے علاوہ کوئی اور شخص امامت کرے۔

[1] ترمذی ج۲ ص ۲۱۲ ابواب المناقب۔

صحابۂ کرام کیلئے صرف یہ ایک اشارہ ہی کافی تھا۔ چنانچہ حضرت علی اور حضرت عمر نے جہاں حضرت ابوبکر صدیق کے استحقاقِ خلافت پر تقریر کی یا اس کا تذکرہ کیا ہے۔ اُن کے "اول من اسلم" ہونے کیساتھ اس کا بھی ذکر کیا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو امامتِ صلوٰۃ کا حکم دیا تھا۔

امامتِ صلوٰۃ کے بعد ایک اہم دینی منصب امارتِ حج ہے اور تم پڑھ آئے ہو کہ اس منصب میں بھی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات ہی میں آپ کی نیابت وجانشینی کا شرف حضرت ابوبکر صدیق کو ہی حاصل ہوا تھا۔

علاوہ بریں متعدد روایات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارات قولاً بھی کئے ہیں ایک مرتبہ آپ نے فرمایا۔ "اگر تم ابوبکر کو امیر بناؤ گے تو ان کو امین پاؤ گے" [۱] کسی شخص نے حضرت عائشہ سے دریافت کیا کہ اگر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی کو اپنا جانشین نامزد کرتے تو کس کو کرتے؟ فرمایا "ابوبکر کو" [۲]

ایک مرتبہ مرض الوفات میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اللہ کا ایک بندہ ہے جس کو خدا نے اختیار دیا کہ دنیا یا وہ نعمتیں جو اللہ کے پاس ہیں اُن میں سے کسی ایک کو اختیار کرلے تو اس بندہ نے اللہ کی نعمتوں کو اختیار کرلیا۔ حضرت ابوبکر سمجھ گئے کہ اس بندہ سے مراد خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی ذات ہے۔ اس لئے بیساختہ رونے لگے اور عرض کیا "ہم سب کی جانیں اور اولاد آپ پر قربان ہوں" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اے ابوبکر ذرا ٹھہرو! اس کے بعد صحابہ سے خطاب کرکے فرمایا "یہ مسجد کے جتنے بھی دروازے ہیں سب بند کردو البتہ ہاں ابوبکر کے گھر کا دروازہ کھلا رہنے دو کیونکہ میں نہیں جانتا کہ میری صحبت میں اُن سے زیادہ کوئی افضل ہو" [۳]

---

[۱] ازالۃ الخفار ج ۲ ص ۱۴۱ [۲] صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۷۳ باب فضائل ابی بکر۔

[۳] طبری ج ۲ ص ۴۳۴

یہ روایت ابھی اوپر گزر چکی ہے کہ ایک عورت کے جواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا "اگر تم مجھ کو دنیا میں نہ پاؤ تو ابو بکر کے پاس جانا۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مرض الوفات میں ایک مرتبہ یہاں تک ارادہ کیا کہ صاف صاف حضرت ابو بکر کی خلافت کی وصیت لکھ دیں لیکن آپ نے اس ارادہ کو عملی جامہ اس لئے نہیں پہنایا کہ کہیں اس سے نامزدگی کی رسم جاری نہ ہو جائے اور جمہور اپنے حق انتخاب سے محروم ہو جائیں۔ صحیح مسلم میں حضرت عائشہ سے روایت ہے، فرماتی ہیں

قال لی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی مرضہ ادعی لی ابابکر اباک واخاک حتی اکتب کتاباً فانی اخاف ان یتمنی متمن ویقول قائل انا اولی، ویابی اللہ والمؤمنون الا ابابکر۔ [1]	مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیماری میں فرمایا کہ ذرا ابو بکر اپنے والد اور اپنے بھائی کو میرے پاس بلا دو۔ تو میں ایک تحریر لکھ دوں کیونکہ مجھ کو ڈر ہے کہ کوئی تمنا کرے اور کہنے والا کہے کہ میں زیادہ بہتر ہوں۔ حالانکہ اللہ اور مومنوں کے نزدیک ابو بکر کے سوا کوئی دوسرا نہیں۔

حضرت عبد اللہ بن عباس سے روایت ہے کہ جمعرات کے دن (یعنی وفات سے تین دن پہلے) آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی درد کی تکلیف شدید ہوگئی۔ فرمایا "میرے پاس آؤ۔ میں تمہارے لئے ایک ایسی تحریر لکھ دوں کہ پھر کبھی تم گمراہ نہ ہوا در جھگڑا نہ کرو" لوگوں کو تعجب ہوا کہ آج حضور کیسی بات کر رہے ہیں۔ انھوں نے دوبارہ حاضر ہو کر معلوم کرنا چاہا کہ اصل مطلب حضور کا کیا تھا؟ اب آپ نے فرمایا کہ اچھا! اب مجھ کو تم میری اسی حالت میں چھوڑ دو۔ اس کے بعد آپ نے تین باتوں کی وصیت فرمائی۔ ایک یہ کہ مشرکوں کو جزیرۃ العرب سے نکال دو۔ دوسری یہ کہ وفد سے جس طرح کا معاملہ میں کرتا تھا تم بھی وہی معاملہ کرو۔ رہی تیسری وصیت تو وہ آپ نے قصداً بیان نہیں کی یا راوی یعنی عبد اللہ بن عباس کا بیان

[1] جلد دوم ص ۲۷۳ باب من فضائل ابی بکر۔

ہے کہ میں ہی اُس کو بھول گیا ہوں"[۱]

حضرت عبداللہ بن عباس کی یہ روایت دُوسری جگہ ان لفظوں کے ساتھ ہے۔

"جب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو درد کی تکلیف شدید ہوئی تو ارشاد فرمایا "تم میرے پاس کتاب لاؤ۔ تاکہ میں ایک کتاب لکھدوں اور تم اس کے بعد گمراہ نہ ہو۔ عمرؓ نے کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درد کا غلبہ ہے اور ہم لوگوں کے پاس اللہ کی کتاب ہے، وہی ہمارے لئے کافی ہے۔ اس پر بڑا اختلاف اور شور و غل ہوا۔ حضورؐ نے فرمایا "اچھا تم یہاں سے ہٹو۔ تم کو میرے سامنے جھگڑا نہیں کرنا چاہیئے۔ حضرت عبداللہ بن عباس کو اس وقت حضور کی وصیّت کے قلم بند نہ ہونے کا بڑا افسوس ہوا۔ جب کبھی وہ اس روایت کو بیان کرتے تھے اس افسوس کا اظہار کرتے تھے"[۲]

اگرچہ ان روایتوں سے یہ ظاہر ہے کہ صحابہ کے اختلاف کے باعث کچھ لکھنے لکھانے کا معاملہ اس وقت رفت و گزشت ہو گیا۔ لیکن محدثین نے قیاس آرائیاں کی ہیں کہ آخر وہ چیز کیا تھی جو حضور قلم بند کرانا چاہتے تھے۔ بعض محدثین کا خیال ہے کہ وہ کتاب الاحکام کی کوئی چیز ہوگی۔ اور بعضوں کے نزدیک آپ خلافت کے بارہ میں وصیّت کرنا اور خلفا کے اسماءِ گرامی لکھانا چاہتے تھے[۳]

ہمارے نزدیک مذکورۂ بالا دوسرا خیال زیادہ قرینِ قیاس ہے اور اغلب یہ ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت حضرت ابوبکر صدیق کی خلافت کی ہی وصیّت فرمانا چاہتے تھے۔ چنانچہ صحیح مسلم کے حوالہ سے حضرت عائشہ کی جو روایت تم ابھی پڑھ آئے ہو اُس سے اِس رائے کی تائید ہوتی ہے، یہ روایت صحیح بخاری میں بھی ہے۔[۴]

---

[۱] صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۳۸ باب مرض النبی صلی اللہ علیہ وسلم ووفاتہ، [۲] باب کتابۃ العلم ج ۱ ص ۲۲
[۳] فتح الباری جلد اوّل ص ۱۸۶ [۴] جلد دوم ص ۸۴۶ کتاب المرضیٰ۔

لیکن چونکہ راوی کو الفاظ میں شک پیدا ہو گیا ہے اس لئے روایت کیساتھ ساتھ اپنا شک بھی ظاہر کرتا گیا ہے۔ بہرحال شروح کے الفاظ جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ کو خطاب کر کے ارشاد فرمائے یہ ہیں :

لقد ھممت او اردت ان ارسل الی ابی بکر وابنہ واعھد — میں نے پختہ ارادہ کیا تھا کہ ابوبکر اور اُن کے بیٹے کو بُلوا بھیجوں اور خلافت کی ذمہ داری ان کے سپرد کردوں۔

بہرحال صحیحین کی اس روایت کی روشنی میں قرین قیاس بھی ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم مرض الوفات میں حضرت ابوبکر کیلئے خلافت کی وصیت لکھانا چاہتے تھے لیکن صحابۂ کرام میں جو اس وقت موجود تھے اس پر اختلاف ہو گیا کہ ایسے وقت میں جبکہ آپکو درد کی شدید تکلیف تھی۔ یہاں تک کہ حضرت عائشہ کا بیان ہے کہ میں نے درد کی ایسی شدید تکلیف کسی شخص کو بھی نہیں دیکھی[۱]۔ آپ کو لکھنے لکھانے کی زحمت دی جائے یا نہیں۔ اس بنا پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارادہ ہی ترک کر دیا۔

حدیث قرطاس پر بحث | صحیح بخاری کی یہ روایت جو اوپر گزری حدیث قرطاس کہلاتی ہے۔ مولانا شبلی نے الفاروق میں اس پر بحث کر کے ثابت کرنا چاہا ہے کہ یہ روایت صحیح نہیں ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ مولانا کے دلائل نہایت کمزور ہیں اور ان سے ہرگز انکا دعویٰ ثابت نہیں ہوتا۔

مولانا کے دلائل حسب ذیل ہیں :-

(۱) آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کم و بیش ۱۳ دن تک بیمار رہے۔

(۲) کاغذ و قلم طلب کرنے کا واقعہ جمعرات کے دن کا ہے۔ جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم میں بتصریح مذکور ہے اور چونکہ آنحضرت صلعم نے دوشنبہ کے دن انتقال فرمایا اس لئے واقعہ کے بعد آں حضرت چار دن تک زندہ رہے۔

[۱] صحیح بخاری ج ۲ ص ۸۴۳

(۳) اس تمام مدتِ بیماری میں آنحضرتؐ کی نسبت اور کوئی واقعہ اختلالِ حواس کا کسی روایت میں کہیں مذکور نہیں ہے۔

(۴) اس واقعہ کے وقت کثرت سے صحابہ موجود تھے۔ لیکن یہ حدیث باوجود اس کے کہ بہت سے طریقوں سے مروی ہے بایں ہمہ بجز عبداللہ بن عباس کے اور کسی صحابی سے اس واقعہ کے متعلق ایک حرف بھی منقول نہیں۔

(۵) عبداللہ بن عباس کی عمر اس وقت صرف ۱۳ - ۱۴ برس کی تھی۔

(۶) سب سے بڑھ کر یہ کہ جس وقت کا یہ واقعہ ہے اس موقع پر عبداللہ بن عباس خود موجود نہ تھے اور یہ معلوم نہیں کہ یہ واقعہ انھوں نے کس سے سُنا۔

(۷) تمام روایتوں میں مذکور ہے کہ جب آں حضرتؐ نے کاغذ قلم مانگا تو لوگوں نے کہا کہ رسول اللہ بہکی ہوئی باتیں کر رہے ہیں۔ [۱]

اب ان دلائل کی حقیقت کیا ہے وہ سُنئے۔

(۱) نمبر ایک سے لیکر تین تک اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ مولانا نے "ھجر" کے معنی ہذیان کے مُراد لے رکھے ہیں اس سے قطعاً بحث نہیں کہ پیغمبر کو ہذیان ہو سکتا ہے یا نہیں یہاں ھجر کے معنی انوکھی سی بات کہنے کے ہیں اصل یہ ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیماری میں قلم کاغذ لانے کے متعلق اچانک جس انداز سے فرمایا صحابہ کو اس پر سخت حیرت و استعجاب دو وجہوں سے ہوا ایک یہ کہ اُن کو یہ خیال ہوا کہ کہیں خدا نخواستہ حضور ہم سے جُدا تو نہیں ہو رہے ہیں اور دوسری یہ کہ جب قرآن مجید اور سنتِ رسول اللہ دونوں اُن کے پاس ہیں تو پھر اب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اُن کے گمراہ ہونے کا کیا مطلب ہے۔ حضرت عمر ہوں یا کوئی اور جس کسی نے بھی ھجر کہا ہے اُس سے اسی درد آمیز حیرت و تعجب کا اظہار کیا ہے۔ چنانچہ ہم نے اوپر

[۱] الفاروق مطبوعہ فخر المطابع لکھنؤ حصۂ اول ص ۴۹ - ۵۰۔

حدیث کا جو ترجمہ لکھا ہے اُس میں ھجر کا ترجمہ "حضور کیسی باتیں کر رہے ہیں" کیا ہے

(۲) نمبر (۴) کی بھی کوئی اصلیت نہیں ہے۔ ایک واقعہ کو دیکھنے اور سُننے والے ہزاروں ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود واقعہ کی روایت، جو نمایاں شخصیت کے مالک ہوتے ہیں اُنھیں کے حوالہ سے کی جاتی ہے۔ پھر اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ چونکہ مولانا شبلی کے بقول اس وقت صحابہ کثرت سے موجود تھے اس بنا پر اگر عبداللہ بن عباس کی روایت خلاف واقعہ ہوتی تو ضرور دوسرے صحابہ اُس کی تردید کرتے۔ اُن کا خاموش رہنا اس کی دلیل ہے کہ وہ روایت کو صحیح مانتے تھے۔

(۳) حضرت عبداللہ بن عباس کی عمر ۱۳-۱۴ سال ضرور تھی لیکن وہ عاقل بالغ تھے۔ چنانچہ خود ان کا بیان ہے۔ "قبض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وانا ختین۔" اور حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ کوئی شخص ختین اسی وقت کہلاتا تھا جبکہ وہ بالغ ہو لیے[1]

(۴) مولانا کا یہ دعویٰ بالکل بے بنیاد ہے کہ عبداللہ بن عباس خود اس واقعہ کے وقت موجود نہیں تھے۔ اس کے ثبوت میں حاشیہ میں فتح الباری کے حوالہ سے صرف اتنا لکھتے ہیں کہ محدثین نے بدلائلِ قطعیہ ثابت کیا ہے کہ وہ (عبداللہ بن عباس) موجود نہ تھے۔ اس موقع پر مولانا کو عجیب مغالطہ پیش آیا ہے جس کو وہ "دلائل قطعیہ" فرماتے ہیں اُس کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ حدیث کا ایک ٹکڑا فخرج ابن عباس یقول ان الرزیۃ کل الرزیۃ بھی ہے اس سے ظاہر یہ ہوتا ہے کہ جب حضرت عبداللہ ابن عباس واقعہ مذکورہ کے بعد آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان سے نکلے تو اس وقت ان الرزیۃ کل الرزیۃ کہتے ہوئے نکلے اگر اس کو صحیح مان لیا جائے تو اشکال یہ وارد ہوتا ہے کہ عبید اللہ بن عبد اللہ جو کہ حضرت عبداللہ بن عباس سے اس روایت کے راوی ہیں وہ تو اس واقعہ کے وقت پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔

[1] الاصابہ جلد دوم ص ۳۲۲ مطبع مصطفیٰ محمد مصر

پھر انھوں نے کیسے دیکھا کہ عبداللہ بن عباس یہ کہتے ہوئے نکلے تھے. اس کے جواب میں حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اپنے ظاہر پر نہیں ہے بلکہ اصل یہ ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے عرصہ بعد جب عبداللہ بن عباس نے عبیداللہ سے یہ روایت بیان کی تو اس کے بعد عبداللہ بن عباس کے دل میں اس واقعہ کا صدمہ تازہ ہوگیا اور اس بنا پر وہ "ان الرزیۃ کل الرزیۃ" کہتے ہوئے چلے گئے [۱] بس بات اتنی تھی جس کو مولانا نے کیا سے کیا سمجھ لیا حافظ ابن حجر کے اس بیان سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ اصل واقعہ کے وقت خود عبداللہ بن عباس موجود ہی نہ تھے۔

اچھا! اگر بالفرض یہ ثابت بھی ہو جائے کہ حضرت عبداللہ بن عباس واقعہ کے وقت موجود نہ تھے تو اس سے روایت کی صحت پر کیا اثر پڑتا ہے؟ کیونکہ اس صورت میں روایت مرسل ہوگی اور باتفاقِ محدثین مراسیلِ صحابہ مقبول و معتبر ہیں۔

(۵) مولانا نے (۷) میں پھر وہی ہذیان والی بات دُہرائی ہے ہم بتا چکے ہیں کہ ہذیان کا یہاں کوئی ذکر مذکور ہی نہیں۔

مولانا اس روایت کو حضرت عمر کی شان کیخلاف بتاتے ہیں حالانکہ محدثین لکھتے ہیں کہ یہ حدیث حضرت عمر کی کتابِ فضائل کا ایک روشن باب ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آپ جو کچھ لکھوانا چاہتے تھے وہ منصب نبوت کی کوئی چیز نہیں تھی اس واقعہ کے بعد بھی آپ تین روز تک عالم ناسوت میں رہے۔ اگر منصبِ نبوت کی کوئی چیز ہوتی تو ضرور لکھاتے یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ کے بحکم آپ اس پر مامور تھے۔ حضرت عمر نے اس کو محسوس کر لیا تھا اس بنا پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غایتِ محبت و عشق اور کتاب اللہ و سنتِ رسول اللہ کی موجودگی میں اپنے اور دوسرے صحابہ پر یہ اعتماد کہ وہ راہ سے بے راہ نہیں ہوں گے ان وجوہ سے انھوں نے خیال کیا کہ حضور کو اس وقت درد کی شدید تکلیف ہے

[۱] فتح الباری ج ۱ ص ۱۸۷

اس حالت میں آپ کو لکھنے لکھانے کی کیوں تکلیف دی جائے۔

حدیثِ قرطاس کی یہ بحث ضمناً آگئی۔ بہر حال سطورِ بالا سے ثابت ہے کہ اگرچہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی جانشینی سے متعلق کسی خاص شخص کے نام کی تصریح نہیں کی لیکن آپ کا گوشۂ چشمِ التفات اور رجحانِ قلبی حضرت ابوبکر کی ہی طرف تھا۔

حضرت ابوبکر خود اس راز سے آگاہ تھے اسی وجہ سے اس منصبِ جلیل کا بارِ عظیم انگیز کرنیکے لئے آمادہ ہو گئے۔ ورنہ وہ جس طبیعت کے انسان تھے ہر گز اس کیلئے تیار نہیں ہو سکتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ایک قاصد محمد بن الزبیر کی معرفت حضرت حسن بصری سے سوال کیا کہ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر کو خلافت کیلئے نامزد کیا تھا؟ " حسن بصری یہ سوال سنتے ہی سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور فرمایا " خدا کی قسم آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر کو اپنا خلیفہ مقرر کردیا تھا۔ ورنہ وہ اس درجہ کے متقی اور اللہ کو جاننے والے تھے کہ اگر ان کو حکم نہ ہوتا تو وہ ہر گز مسلمانوں پر چھلانگ نہ لگاتے " (یعنی جھٹ خلیفہ نہ بن جاتے) [۱]

صحابۂ کرام میں حضرت ابوبکر کا مرتبہ و مقام

اس سلسلہ میں کچھ زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں تمام صحابۂ کرام حضرت ابوبکر کے مرتبہ و مقام سے اچھی طرح باخبر تھے اور اُسی کے مطابق آپ کا ادب و احترام کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمر کا بیان ہے کہ ہم آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں آپس میں ایک دوسرے کے مدارج و مراتب متعین کرتے تھے تو حضرت ابوبکر کو سب سے بہتر سمجھتے تھے۔[۲] ایک موقع پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات کے قریب آجانے کا اشارہ استعارہ کے پیرایہ میں کیا صحابہ میں سے کسی کا ذہن اُدھر منتقل نہیں ہوا۔ حضرت ابوبکر فوراً سمجھ گئے اور رونے لگے۔

---

[۱] الامامۃ والسیاسۃ ج ۱ ص ۲

[۲] صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۱۶ باب فضل ابی بکر بعد النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

صحابہ کو حیرت ہوئی کہ اس میں رونے کی کونسی بات تھی۔ آخر جب اُن کو بھی اصل حقیقت کا علم ہوا تو صاف لفظوں میں اعتراف کیا کہ وکان ابوبکر ھو اعلمنا [۱]

دربارِ نبوت کے شاعرِ خاص حضرت حسان بن ثابت کہتے ہیں :۔

وثانی اثنین فی الغار المنیف وقد طاف العدو به اذ صعد الجبلا

اور مبارک غار کے رفیق ہیں اور جب وہ پہاڑ (احد) پر چڑھے تو دشمن نے اُن کو گھیر لیا۔

وکان حب رسول اللہ قد علموا من البریۃ لم یعدل بہ رجلا

اور رسُول اللہ کے محبوب ہیں سب لوگ جانتے ہیں کہ پوری دنیا میں اُنکی برابر کوئی آدمی نہیں ہے،

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اشعار سُنے تو تبسم فرمایا جس سے دندانِ مبارک نظر آنے لگے اور ارشادِ مبارک ہوا "اے حسان! تم نے سچ کہا وہ (ابوبکر) ایسے ہی ہیں" [۲]

ہم نے حضرت ابوبکر کے براہِ راست خلیفۃ الرسول ہونے کے استحقاق پر بحث کرنیکے لئے جو سات معیار مقرر کئے تھے ان میں سے چھ کا ذکر ہو چکا اور اُن سے ثابت ہو گیا کہ اس معیار پر صدیق اکبر ہی پُورے اُترتے ہیں اور اس بنا پر کوئی شک نہیں کہ وہ ہی اس مرتبہ و مقام بلند کے مستحق تھے۔

اب رہ گئی یہ بات کہ حضرت ابوبکر کے کارنامہائے خلافت سے اس کی تصدیق کہاں تک ہوتی ہے کہ وہ ہی تمام صحابہ میں اس اعزاز کیساتھ اولین مستحق تھے ؟

اس کا جواب آئندہ صفحات میں ملے گا۔

---

[۱] صحیح بخاری ج ۱، ص ۵۱۶ باب فضل ابی بکر بعد النبی صلی اللہ علیہ وسلم ۔ [۲] ابن سعد تذکرہ ابی بکر۔

کارنامہائے خلافت

حضرت ابوبکر صدیق نے جس وقت عنانِ خلافت ہاتھ میں لی، یہ مسلمانوں کیلئے ایک نہایت ہی نازک اور بڑا صبر آزما وقت تھا۔ سب سے بڑا زخم جو اُن کے قلب و جگر پر لگا تھا آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حادثۂ وفات تھا جس نے دنیا اُنکی نگاہوں میں تیرہ و تار کردی تھی خود مدینہ میں منافقوں کا ایسا گروہ موجود تھا جو فتنہ انگیزی کیلئے موقع و بہانہ کی تلاش میں بیٹھا رہتا تھا۔ جھوٹے مدعیانِ نبوت۔ اور مرتدین عن الاسلام کے فتنہ نے خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں سر اٹھانا شروع کر دیا تھا۔ اب وہ اس ایک چنگاری کو ہوا دیکر جہنم بنا دینے کا خواب دیکھنے لگے تھے جن قبیلوں کو مدینہ کی سیادت کسی طرح گوارا نہیں ہوسکتی تھی وہ کل پرزے درست کرنیکی فکر کرنے لگے تھے۔ غرضکہ دقتوں اور دشواریوں کا ایک پہاڑ تھا جو خلیفۂ رسول اللہؐ کے آنکھوں کے سامنے کھڑا تھا حضرت عبداللہ بن مسعود کا بیان ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ہی ہم مسلمانوں کو ایسے حالات سے سابقہ پڑا کہ اگر اللہ تعالیٰ ابوبکر ہم کو عطا فرما کر ہم پر احسان نہ کرتا تو ہم ہلاک ہوجاتے[1] حضرت عائشہ فرماتی ہیں:۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی اور میرے باپ پر ایسے حوادث و مصائب ٹوٹ پڑے کہ اگر بڑے بڑے مضبوط پہاڑوں پر بھی

[1] فتوح البلدان بلاذری ص ۱۰۱۔

نازل ہوتے تو اُن کو ریزہ ریزہ کر دیتے۔ ایک طرف مدینہ میں نفاق گھسا ہوا تھا اور دوسری جانب عرب مرتد ہونے لگے تھے۔ [1]

ان سب اندرونی و بیرونی دشواریوں کے باوجود ایک اہم معاملہ یہ درپیش تھا کہ جیسا کہ گزر چکا ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات میں ہی اسامہ بن زید کی سرکردگی میں شام کی طرف ایک لشکر روانہ کیا تھا جو ابھی مقام جرف میں پہونچا تھا کہ حضورؐ کی شدید علالت کی خبر پہونچی اور وہ وہیں ٹھہر گیا یہاں تک کہ آپ کا وصال ہو گیا۔

صحابۂ کرام اور حضرت ابوبکر کی گفتگو

اب سوال یہ تھا کہ اس لشکر کو جس مہم پر بھیجا گیا تھا اُس پر اُسے جانے دیا جائے یا پہلے مُرتدین کی سرکوبی کی جائے۔ جو صورتِ حال پیدا ہو گئی تھی۔ صحابۂ کرام اُس سے گھبرائے ہوئے تھے انھوں نے کہا کہ لے دے کے اب یہی مسلمان ہیں جو آپ کے سامنے ہیں اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ عرب کا کیا حال ہے، وہ آپ سے ٹوٹتے جا رہے ہیں اس لئے مناسب نہیں ہے کہ آپ اس وقت مسلمانوں کو الگ الگ کریں [2]۔ لیکن وہ جو خلیفۂ رسول تھا وقت کے دریا میں اُن اُبھرنے والی امواجِ حوادث سے کہیں سراسیمہ ہو سکتا تھا۔ اس کے سامنے سب سے پہلا کام جو کرنیکا تھا اور ضروری تھا یہ ہی ہو سکتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی زندگی کے آخری لمحات میں جو مہم روانہ فرما گئے تھے وہ تکمیل کو پہونچے اور ادھوری نہ رہے۔ حضرت ابوبکر نے جواب دیا۔ "قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر مدینہ اس طرح خالی ہو جائے کہ میں ہی اکیلا رہ جاؤں اور درندے اور کتے مجھ کو بھنبھوڑ کھائیں میں اُس وقت بھی اسامہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مُطابق اس مہم پر روانہ کروں گا۔" [3]

[1] فتوح البلدان بلاذری ص ۱۰۲ [2] ابن جریر طبری ج ۲ ص ۴۶۱۔

[3] طبری ج ۲ ص ۴۶۱ و تاریخ ابن عساکر ج ۱ ص ۱۱۷

خلیفۂ رسول کا یہ قطعی فیصلہ معلوم ہو جانے کے بعد حضرت عمرؓ نے انصار کی نمائندگی کرتے ہوئے عرض کیا کہ اس لشکر میں سن رسیدہ اور تجربہ کار صحابہ شامل ہیں اور اسامہ نوجوان ہیں۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ امیر لشکر کسی ہمعمر آدمی کو بنا دیجئے۔ حضرت ابوبکرؓ یہ سنتے ہی غصہ میں قابو سے باہر ہو گئے اور فرمایا "اے خطاب کے بیٹے! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اسامہ کو امیر لشکر مقرر فرمایا اور اب تم کہتے ہو کہ میں اُن کو معزول کر دوں" حضرت عمرؓ یہ سنکر واپس گئے اور لوگوں کو بُرا بھلا کہا کہ اُن کی وجہ سے حضرت ابوبکرؓ سے سخت سُست سننا پڑا۔[1]

جیشِ اسامہ کی روانگی | بہرحال حضرت ابوبکرؓ نے اعلان عام کر دیا کہ جیشِ اسامہ میں جانے کے لئے جو لوگ نامزد کئے گئے تھے اُن میں سے کوئی بھی باقی نہ رہے۔ سب مقام جرف میں پہونچ جائیں اور خود وہاں پہنچکر لشکر کو روانگی کا حکم دیا۔ لشکر روانہ ہوا تو آپ پاپیادہ اس کی مشایعت کو چلے۔ حضرت اُسامہ جو گھوڑے پر سوار تھے بولے "یا تو آپ بھی سوار ہو جائیں ورنہ میں بھی پاپیادہ ہوا جاتا ہوں" فرمایا "تم کو خدا کی قسم جو اُترو۔ اور میں بھی ہرگز سوار نہیں ہوں گا۔ کیا ہوا اگر اللہ کی راہ میں کچھ دیر کیلئے میرے پاؤں غبار آلود ہو گئے۔ غازی کے ہر ہر قدم کے عوض سات سو نیکیاں لکھی جاتی ہیں" اس کے بعد حضرت اسامہ سے فرمایا "اگر تم نامناسب نہ سمجھو تو عمرؓ کو میرے پاس چھوڑ جاؤ مجھ کو اُن کے مشورہ کی ضرورت ہو گی" حضرت اسامہ اس پر بخوشی رضامند ہو گئے اب حضرت ابوبکرؓ نے لشکر کو روک کر نہایت قیمتی ہدایات دیں جن کا ذکر اپنے موقع پر آئیگا۔ اور لشکر روانہ ہو گیا۔[2]

مہم کی اہمیت | اس مہم کی اہمیت خاص طور پر اس لئے تھی کہ جیسا کہ غزوہ موتہ کے بیان میں گزر چکا ہے۔ عرب و شام کی سرحد کے ایک رئیس شرجیل بن عمرو نے

---

[1] طبری ج ۲ ص ۴۶۲۔ [2] ایضاً۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قاصد حارث بن عمیر کو قتل کر دیا تھا اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کا انتقام لینے کی غرض سے زید بن حارثہ کی سرکردگی میں ایک فوج بھیجی تھی۔ لیکن اس فوج کو شدید نقصان پہونچا۔ حضرت زید بن حارثہ اور اُن کے بعد یکے بعد دیگرے ان کے قائم مقام سب شہید ہوگئے اور فوج واپس ہوگئی۔ اسلامی لشکر کے اس حادثہ نے عرب و شام کی سرحدوں کے رؤوسائے قبائل کو جو عیسائی تھے اس قدر ہمت دلادی تھی کہ یہ لوگ اب مدینہ پر حملہ کرنے کا خواب دیکھنے لگے تھے اور خود مدینہ میں ان لوگوں کے حملہ کا اندیشہ اس قدر عام ہوگیا تھا کہ ایک مرتبہ (ایلار کے واقعہ میں) عتبان بن مالک نے حضرت عمر فاروق سے دفعتہ آکر کہا کہ "غضب ہوگیا"، تو حضرت عمر نے گھبرا کر پوچھا "خیر تو ہے"! کیا عیسائی آگئے" [۱]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک کے نام سے جو مہم لیکر گئے تھے۔ اہنی دشمن اسلام قبائل کی سرکوبی کرنے اور حضرت زید بن حارثہ وغیرہ کا انتقام لینے کی غرض سے گئے تھے لیکن حالات ایسے پیش آگئے کہ آپ تبوک سے ہی پلٹ آئے۔ بہرحال ان قبائل کا زور توڑنا ضروری تھا اور آپ یہ محسوس کرتے تھے کہ اس میں جتنی دیر ہوگی ان لوگوں کا حوصلہ بڑھیگا۔ اسی بنا پر آپ نے اپنی ناسازیِ طبع کے باوجود حضرت اسامہ کی سرکردگی میں یہ لشکر روانہ کر دیا تھا۔

حضرت ابوبکر جیشِ اسامہ کی اس اہمیت اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جو مقصد تھا اس سے پوری طرح باخبر تھے اسی وجہ سے آپ نے جب لشکر کو الوداع کہا تو اور باتوں کے ساتھ امیرِ لشکر کو اس کی بھی تاکید کی کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تم کو جیسا حکم کیا تھا ویسا ہی کرنا۔ اور ہاں دیکھو اس کی تعمیل میں ذرہ برابر کوئی کوتاہی نہ ہو" [۲]

---

[۱] صحیح بخاری واقعۂ ایلار [۲] طبری ج ۲ ص ۴۶۲ و ابن عساکر جلد ۱ ص ۱۲۲

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم کیا تھا؟ آپ نے فرمایا تھا۔

ان یوطی الخیل تخوم البلقاء والداروم من ارض فلسطین — فلسطین کی سرزمین میں بلقا اور داروم کے جو علاقے ہیں اسلامی لشکر اُن کو پامال کر کے آئے۔

ایک اور روایت میں الفاظ یہ ہیں:۔

وامرہ ان یوطی من آبل الزیت من مشارف الشام الارض بالاردن — اردن کی زمین جو شام کی سرحدوں میں آبل الزیت کے علاقہ میں ہے اسکو پامال کریں۔

چنانچہ اب لشکر جو تین ہزار مہاجرین وانصار پر مشتمل تھا جن میں سے ایک ہزار سوار فوج تھی روانہ ہوا (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے اُنیس[19] دن بعد) مدینہ کے شمال میں جہاں قبائل قضاعہ رہتے تھے وہاں پہونچا۔ یہاں سے روانہ ہو کر جب وادی القریٰ پہونچا تو حضرت اسامہؓ نے پہلے سے دو جاسوس روانہ کر دئے۔ یہ جاسوس حالات کی تحقیقات کر کے واپس ہوتے ہوئے اُبنیٰ تک جو وادی القریٰ سے دو دن کی مسافت پر ہے۔ پہونچے ہی تھے کہ اسامہ بھی مع فوج کے پہونچ گئے۔ جاسوسوں نے حالات امید افزا بیان کئے تو حضرت اسامہ نے فوراً حملہ کی تیاری کرنیکا حکم دیا اور اس وقت فوج کو خطاب کر کے فرمایا:۔

حضرت اسامہ کا فوج کو خطاب

"اے مجاہدینِ اسلام! حملہ کیلئے تیار ہو جاؤ۔ دشمن اگر بھاگ پڑے تو اُس کا پیچھا نہ کرنا۔ آپس میں متحد و متفق رہو۔ ہلکی آواز سے بولو۔ اللہ کو اپنے دلوں میں یاد کرو۔ اور تلواریں جب ایک مرتبہ نیام سے باہر نکال لو تو پھر جب تک تم اپنے دشمنوں کا جو تم پر ہتھیار اُٹھائے ہوئے ہوں سر قلم نہ کر دو۔ ان تلواروں کو نیام میں مت رکھو۔"

اس تقریر کے بعد حملہ شروع ہوا۔ دشمن مقاومت نہ کر سکا۔ اور مسلمانوں کی فتح کا اعلان ہو گیا۔ اس وقت حضرت اسامہ سبحہ نامی اسی گھوڑے پر سوار تھے جس پر اُنکے

والد حضرت زید بن حارثہ شہادت کے وقت سوار تھے چند مقامی لوگوں نے اُس شخص کی بھی نشان دہی کی جس نے حضرت زید کو قتل کیا تھا۔ امیر لشکر کے سامنے لایا گیا تو اُس کے حکم سے اُس شخص کی گردن اُڑا دی گئی اور اس طرح موتہ کا انتقام آج پُورا ہوا۔

مقام اُبنیٰ میں ایک دن قیام کر کے حضرت اسامہ نے مال غنیمت اہلِ لشکر میں شرعی طور پر تقسیم کر دیا۔ اور دُوسرے دن یہاں سے روانہ ہو کر وادی القریٰ ہوتے ہوئے بخیریت وعافیت مدینہ پہونچ گئے۔ اس پوری مہم میں ایک مسلمان کا بھی جانی نقصان نہیں ہوا۔ حضرت اسامہ نے وادی القریٰ پہونچکر مہم کی کامیابی اور اپنی واپسی کی اطلاع دربارِ خلافت کو کر دی۔ اس خبر سے مدینہ میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ جب لشکر مدینہ میں داخل ہوا ہے تو حضرت ابوبکر اور دُوسرے صحابہ کے علاوہ خواتین تک اس کے استقبال کے لئے موجود تھیں حضرت اسامہ مدینہ میں داخل ہوئے تو اس شان سے کہ اپنے باپ زید بن حارثہ کے گھوڑے پر سوار تھے اور اُن کے آگے حضرت بریدہ پرچم اٹھائے چل رہے تھے۔ یاد ہو گا کہ یہ وہی پرچم تھا جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات سے چند روز پہلے اُسامہ کو سپرد کیا تھا اور جس کے متعلق جیشِ اسامہ کی روانگی کے مخالفوں کو جواب دیتے ہوئے حضرت ابوبکر نے کہا تھا کہ جس پرچم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھولا تھا میں اسے کس طرح لپیٹ کر رکھ دوں۔

اس منظر نے سب کو بیقرار کر دیا لیکن کون بتا سکتا ہے کہ اس وقت اپنے محبوب آقا و مولا کی آخری خواہش کو اس طرح اپنے ہاتھوں تکمیل دیکھ کر خود صدیق اکبر کے قلب و جگر پر کیا کیفیت گزری تھی۔ خوشی میں حضرت ابوہریرہ کا یہ حال ہوا کہ تین مرتبہ اُن کی زبان سے نکل گیا کہ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ۔ اگر ابوبکر خلیفہ نہ ہوتے تو اللہ کی پُوجا نہ ہوتی۔ [۱]

[۱] جزئی طور پر یہ واقعہ تمام تاریخوں میں مذکور ہے لیکن ہم نے یہ تمام تفصیلات تاریخ ابن عساکر جلد اول ص ۱۲۳ - ۱۲۴ سے لی ہیں۔

مہم کا نتیجہ اور فائدہ سیاسی اعتبار سے اس مہم کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ قیصر روم پر جو اسوقت حمص میں تھا اس قدر اثر ہوا کہ اُس نے ملک کے بطارقہ (بشپ پادری) کو جمع کیا اور کہا "دیکھو یہ وہی لوگ ہیں جن سے میں تم کو خبردار کرتا تھا لیکن تم نہیں مانتے تھے تم ان عربوں کی ہمت وجرات دیکھتے ہو! ایک مہینہ کی مسافت پر آکر تم پر چھاپہ مارتے ہیں اور صحیح سلامت اُسی وقت واپس بھی چلے جاتے ہیں[1] اس کے علاوہ عرب وشام کی سرحدوں پر جو قبائل آباد تھے اور جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر سُن کر ہی علم بغاوت بلند کرنے پر آمادہ تھے اُن کو یقین ہوگیا کہ اگر مدینہ میں مسلمانوں کی جمعیت بڑی مضبوط نہ ہوتی تو ان حالات میں یہ لشکر ہرگز مدینہ سے اتنی دور دراز کی مسافت پر نہیں بھیجا جا سکتا تھا۔ اس خیال نے ان کے دلوں پر مسلمانوں کی قوت کی دھاک بٹھادی اور وہ مرعوب ہوگئے۔

انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کا مقالہ نگار ڈبلیو ڈبلیو منٹگمری لکھتا ہے کہ

"پیغمبر اسلام نے اس بات کو محسوس کر لیا تھا کہ جب تک شام کی طرف مہمیں روانہ نہیں کی جائیں گی عرب قبائل پُر امن نہیں رہ سکتے۔ ابوبکر اس کی سیاسی اہمیت سے واقف تھے۔ اسی وجہ سے باوجود شدید مخالفت اور سخت خطرات کے انھوں نے اسامہ کی زیر قیادت ایک بڑا لشکر شام روانہ کیا تھا"[2]

ایک بحث عام طور پر مؤرخین لکھتے ہیں کہ اس مہم کی تکمیل میں چالیس دن صرف ہوئے بلکہ ابن عساکر نے تو ۳۵ دن کی بھی ایک روایت نقل کی ہے لیکن تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ دونوں تاریخیں غلط ہیں اور اس کے وجوہ حسب ذیل ہیں :-

(۱) حضرت اسامہ نے جو کارروائی کی اُس کا دائرہ بلقا تک جو شام کے جنوب عرب میں واقع ہے وسیع تھا اور مدینہ سے یہاں تک کی مسافت کسی حالت میں چھ سو ساڑھے پانچسو میل سے کم نہیں ہے۔

---

[1] ابن عساکر ج ۱ ص ۱۲۴ [2] انسائیکلو پیڈیا آف اسلام جدید اڈیشن ج ۱ ص ۱۱۰

(۲) جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے۔ ہرقل نے اس مہم کی خبر سنکر بطارقہ سے کہا کہ دیکھو یہ لوگ (عرب) ایک مہینہ کی مسافت پر آکر چھاپہ مار گئے۔ ہرقل کے اس قول کے بموجب آنے جانے میں کم از کم دو ماہ لگنے چاہئیں۔

(۳) یہ ثابت ہے کہ حضرت ابو بکر نے یہ مہم ماہ ربیع الاوّل ۱۱ھ کے آخر میں روانہ کی تھی۔[1]

(۴) پھر یہ بھی ثابت ہے کہ طلیحہ کے اکسانے پر چند قبائل نے جن کا ذکر آگے آئے گا مدینہ کا جو محاصرہ کیا اور وہاں لُوٹ مار مچائی تھی۔ یہ واقعہ ماہِ جمادی الاخریٰ میں پیش آیا تھا۔ اور اس وقت تک حضرت اُسامہ یقیناً واپس نہیں آئے تھے۔ کیونکہ ان قبیلوں کا یہ حوصلہ ہُوا ہی اس لئے تھا کہ ان کے وفد نے مدینہ سے واپس ہو کر ان کو اطلاع دی تھی کہ مسلمانوں کی تعداد مدینہ میں کم اور اُن کی دفاعی طاقت کمزور ہے۔

اس کے علاوہ حافظ عماد الدین ابن کثیر نے تصریح بھی کی ہے کہ حضرت اسامہ اس واقعہ کے بعد آئے تھے

ثمّ قدام اسامة بن زید بعد ذالك بليالٍ۔[2] | اس واقعہ (اعراب) کے چند روز بعد اسامہ واپس آئے۔

ماہ جمادی الاخریٰ جو البدایۃ والنہایۃ میں مذکور ہے اُسی سے اگر شروع ماہ بھی مانا جائے تو ربیع الثانی اور جمادی الاوّل پورے دو مہینے پھر بھی ہو جاتے ہیں۔

ابن کثیر نے چالیس دن کی روایت نقل کر کے ایک قول ستر (۷۰) کا بھی نقل کیا ہے۔[3] ہمارے نزدیک یہی قول زیادہ صحیح اور قابلِ قبول ہے۔ اس کی تائید طبری کی اس عبارت سے بھی ہوتی ہے۔

(صدیق اکبر)

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۶ ص ۳۰۵ [2] البدایۃ والنہایۃ ج ۶ ص ۳۱۴
[3] البدایۃ والنہایۃ ج ۶ ص ۳۰۴۔

وکان فراغه فی اربعین	اور اسامہ کی فراغت چالیس دن میں
یوماً سوی مقامه و	ہوئی تھی اور یہ دن اُن کے قیام اور
منقلبه راجعاً۔ [1]	واپسی کے دنوں کے علاوہ ہیں۔

چنانچہ اسلامیات کے فاضل اور محقق ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے اس لشکر کی مدتِ واپسی ستر دن ہی لکھی ہے۔ [2]

[1] طبری ج ۲ ص ۲۶۳ [2] رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی زندگی ص ۲۷۹ مطبوعہ ادارہ اسلامیات لاہور۔

ارتداد و بغاوت اور اُسکے اسباب

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دنیا سے رخصت ہونا تھا کہ باستثنائے مکہ و مدینہ پورے عرب میں یکایک ارتداد و بغاوت کا طوفان اس زور شور سے اٹھا کہ اسلام کی عمارت کے در و دیوار ہل گئے اور صحابہ کرام اُس میں محصور ہو کر رہ گئے۔ ایک راوی کے بیان کے مطابق مسلمانوں کی اس وقت حالت اُس بکری جیسی تھی جو کہ موسم سرما کی بارش والی رات میں کھڑی ہو[1]؟

بعض یورپین مصنفین نے عرب قبائل کی اس شورش و بغاوت سے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ اسلام بزور شمشیر اور بجبر پھیلا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے باعث اسلام کی طاقت میں کچھ ضعف پیدا ہوا تھا کہ عرب نے عَلَمِ بغاوت بلند کر دیا اور حضرت ابوبکر نے پھر اُن کو تلوار کے زور سے اسلام میں داخل کر لیا[2] اس اعتراض سے قطع نظر تاریخ کے ایک طالب علم کو یہ خیال ضرور ہو سکتا ہے کہ آخر اسلام جو ایک دینِ حق اور مذہب فطرت ہے اس کا یہ نشہ کیسا تھا کہ چڑھا اور فوراً ہی اُتر گیا۔ اِس خیال کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمارے مورخ اس فتنہ کو عام طور پر فتنۂ ارتداد کے لفظوں سے تعبیر کرتے ہیں اور ہم نے بھی ان کی پیروی میں "ارتداد" کا ہی لفظ لکھا ہے۔ لیکن حق یہ ہے کہ یہ اصطلاحی معنی کے اعتبار سے ارتداد نہیں تھا۔

---

[1] طبری ج ۲ ص ۴۶۱   [2] تاریخ الاسلام السیاسی ص ۲۶۹

اور جو لوگ مسلمانوں کے خلاف معرکہ آرا ہوئے وہ زیادہ تر وہی لوگ تھے جنھوں نے اگرچہ اسلام کو رسمی طریقہ پر کسی لالچ یا دباؤ سے قبول کر لیا تھا مگر قرآن کے لفظوں میں اسلام اُن کے حلق سے نیچے نہیں اترا تھا۔ اسی بنا پر بعض مستشرقین تو ان لوگوں کو سرے سے مسلمان ہی نہیں مانتے اور ان کی بغاوت کو سیاسی بغاوت کہتے ہیں۔

مستشرقین کی رائے

پروفیسر فلپ ہٹی لکھتے ہیں:۔

"حقیقت یہ ہے کہ وسائلِ آمد و رفت کی کمی مبلّغین کی باقاعدہ تنظیم کا فقدان اور قلتِ وقت (آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ ۹ھ تک غزوات اور اپنی اندرونی تنظیم میں ہی مصروف رہے۔ مبلغین کو بیرونِ مدینہ بھیجنے کا وقت کم ملا) یہ اسباب تھے جن کی وجہ سے پیغمبر اسلام کی زندگی میں جزیرہ نمائے عرب کی ایک تہائی سے زیادہ آبادی مسلمان نہیں ہو سکی تھی۔ خود حجاز جو پیغمبر اسلام کی سرگرمیوں کا اصل میدان تھا اُس کا حال یہ تھا کہ آپ کی وفات سے ایک یا دو سال پہلے مکمل طور پر مسلمان ہوا تھا۔ جو وفد پیغمبر اسلام کی خدمت میں آتے تھے ظاہر ہے ان کو پورے عرب کا ترجمان نہیں کہا جا سکتا۔ اور کسی وفد کے مسلمان ہو جانے کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں تھی کہ ایک قبیلہ کے سرداروں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔"[1]

یورپین مصنفین میں سے مسٹر جے ولہاسن (J. WELLHAUSEN) اور پروفیسر کیتانی (Z. CAETANI) کی رائے یہ ہے کہ یہ جو کچھ ہوا سرتاسر سیاسی بغاوت تھی اور مذہب کے ساتھ اس کا کوئی لگاؤ نہیں تھا۔[2]

---

[1] ہسٹری آف دی عربس ص ۱۴۱ [2] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام جدید اڈیشن جلد اول ص ۱۱۰

وفاتِ نبوی کے وقت عرب قبائل میں دو گروہ

اصل یہ ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت راسخ العقیدہ مسلمانوں کے علاوہ جو حجاز اور طائف میں آباد تھے[۱]۔ عام عرب قبائل دو قسم کے تھے جن کے تفصیلی حالات ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

اعراب

ایک قسم تو اُن قبیلوں کی تھی جو مدینہ طیبہ کے قرب وجوار میں آباد تھے۔ مثلاً عبس ذبیان۔ بنو کنانہ۔ غطفان اور فزارہ۔ یہ وہ لوگ تھے جن تک اگرچہ اسلام کا پیغام پہونچا تھا لیکن چونکہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیرونِ حجاز میں اسلام کی دعوت و تبلیغ اور اس کے تمام فرائض وواجبات کی تعلیم کا باقاعدہ پروگرام وفات سے صرف ڈیڑھ دو برس پہلے ہی شروع کیا تھا اور اس مقصد کیلئے معلمین ومبلغین کا تقرر عمل میں آیا تھا اس بناپر مدینہ کے قرب وجوار میں رہنے والے قبائل نے اس پیغام کو سنا اور اسے قبول بھی کیا۔ لیکن چونکہ ان کو براہِ راست آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت و خدمت میں رہنے کا زیادہ موقع نہیں ملا اس لئے اسلام کی اصل روح سے وہ آشنا نہیں ہوسکے تھے اور اُن کا ایمان پختہ نہیں تھا۔

قرآن مجید میں ان لوگوں کو اعراب کہا گیا ہے اور جگہ جگہ ان کو متنبہ کیا گیا ہے کہ ان کا ایمان پختہ نہیں ہے۔ سورہ الحجرات میں ہے۔

---

[۱] مکہ۔ مدینہ اور طائف کے جو قبیلے اس وقت علاوہ قریش کے اسلام پر ثابت قدم رہے اُنکے نام یہ ہیں۔ مزنیہ۔ غفار۔ جھینہ۔ بلی۔ اشجع۔ اسلم اور خزاعۃ۔ طائف کا قبیلہ ثقیف بھی متردد ہوگیا تھا۔ لیکن وہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر کردہ عامل عثمان بن العاص تھے انھوں نے بڑی تدبیر سے کام لیا اور ان لوگوں سے کہا کہ اے اولاد ثقیف تم سب سے آخر میں مسلمان ہوئے ہو اسلئے اب سب سے پہلے مرتد نہ ہو۔ عثمان بن العاص کا یہ فقرہ کام کرگیا۔ اور یہ لوگ ارتداد سے باز آگئے۔

(الصدیق ابو بکر از محمد حسین ہیکل ص ۸۲ مطبوعہ مصر)

قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا ۖ
قُلْ لَمْ تُؤْمِنُوا وَلَٰكِنْ قُولُوا
أَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ
فِي قُلُوبِكُمْ ۖ وَإِنْ
تُطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ
لَا يَلِتْكُمْ مِنْ أَعْمَالِكُمْ
شَيْئًا ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ

اعراب کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں اے
محمد آپ کہہ دیجئے کہ تم ایمان نہیں لائے ہو لیکن
ہاں کہو کہ ہم نے اطاعت قبول کر لی ہے درانحالیکہ
ایمان تمہارے دلوں میں نہیں داخل ہوا اور اگر تم
اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو تو تمہارے
عملوں میں سے اللہ کچھ کم نہیں کرے گا۔ بے شبہ
اللہ غفور و رحیم ہے۔

ان اعراب میں اور راسخ العقیدہ مسلمانوں میں کیا فرق تھا؟ قرآن نے اسکو بھی بڑی وضاحت کیساتھ بیان کر دیا ہے تاکہ کسی شخص کو اعراب کے سمجھنے اور پہچاننے میں کوئی دقت نہ ہو۔ فوراً ہی ارشاد ہوا۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ
آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ
يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَ
أَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۚ أُولَٰئِكَ
هُمُ الصَّادِقُونَ ○

مومن تو صرف وہ ہی لوگ ہیں جو اللہ اور اس
کے رسول پر ایمان لے آئے ہیں پھر وہ شک بھی
نہیں کرتے اور اللہ کے راستے میں اپنے مال اور
جان کے ساتھ جدوجہد کرتے ہیں اور بس وہ
ہی لوگ سچے ہیں۔

یہ اعراب وہ ہی لوگ ہیں جو آگے چل کر مانعین زکوٰۃ بنے۔ اس چیز کو ذہن میں رکھو اور دیکھو کہ قرآن کس بلاغت سے اعراب اور مومنوں میں فرق بتاتے ہوئے خبردار کر رہا ہے کہ۔

(۱) ان اعراب نے اسلام کی ظاہری شوکت و سطوت اور اس کے سیاسی اقتدار و استیلا کو دیکھ کر اپنے آپ کو مسلمان کہنا شروع کر دیا ہے لیکن درحقیقت ایمان ابتک ان کے دلوں میں اترا نہیں ہے اور (۲) چونکہ یہ ابھی تک مومن نہیں ہوئے ہیں اس بنا پر ان کو ابتک شکوک و شبہات ہیں اور یہ اللہ کے راستہ میں جان و مال خرچ

کرنیکے لئے آمادہ نہیں ہیں۔

چنانچہ اعراب کی اس شتر گربگی کو ایک اور آیت میں صاف صاف بیان کر دیا گیا ہے

سَيَقُولُ لَكَ الْمُخَلَّفُونَ	جو اعراب بچھڑ گئے ہیں وہ آپ سے کہیں گے
مِنَ الْأَعْرَابِ شَغَلَتْنَا	کہ ہم کو ہمارے مال اور متعلقین نے مشغول کر لیا
أَمْوَالُنَا وَأَهْلُونَا فَاسْتَغْفِرْ لَنَا	اب آپ ہمارے لئے مغفرت طلب کیجئے یہ
يَقُولُونَ بِأَلْسِنَتِهِمْ مَا لَيْسَ فِي	لوگ اپنی زبانوں سے ایسی بات کہتے ہیں جو ان
قُلُوبِهِمْ قُلْ فَمَنْ يَمْلِكُ لَكُمْ مِنَ اللَّهِ	کے دل میں نہیں ہے۔ اے محمدؐ آپ ان سے
شَيْئًا إِنْ أَرَادَ بِكُمْ ضَرًّا أَوْ	کہہ دیجئے کہ اگر اللہ تم کو نقصان پہونچانے یا
أَرَادَ بِكُمْ نَفْعًا بَلْ كَانَ اللَّهُ	نفع تو اللہ کے اس ارادہ کو تمہارے لئے کون
بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا۔	روک سکتا ہے؟ بلکہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ تعالیٰ
(الفتح)	اُس سے باخبر ہے۔

پھر اسکو قرآن کے اعجاز کے علاوہ اور تم کیا کہہ سکتے ہو کہ اُس نے ان اعراب کی ایمانی کمزوریوں کی ہی پردہ دری نہیں کی ہے بلکہ اس بات کی بھی پیش گوئی کر دی کہ حضرت ابو بکر کے عہدِ خلافت میں یہ اعراب پکے مسلمان ہو جائیں گے اور پھر اُن کو فارس و روم جیسی طاقتور قوموں کے مقابلہ میں جنگ کرنیکے لئے بھیجا جائے گا چنانچہ ارشاد ہوتا ہے

قُلْ لِلْمُخَلَّفِينَ مِنَ الْأَعْرَابِ	آپ بچھڑنے والے اعراب سے کہہ دیجئے کہ تم
سَتُدْعَوْنَ إِلَىٰ قَوْمٍ أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ	سخت رعب وداب والی ایک قوم کیطرف
تُقَاتِلُونَهُمْ أَوْ يُسْلِمُونَ ج	بلائے جاؤ گے تم ان سے لڑو گے یا وہ مسلمان
فَإِنْ تُطِيعُوا يُؤْتِكُمُ اللَّهُ أَجْرًا	ہو جائیں گے۔ پس اگر تم اطاعت کرو گے تو
حَسَنًا ج وَإِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا	اللہ تعالیٰ تم کو اس کا اجر عطا فرمائے گا اور اگر
تَوَلَّيْتُمْ مِنْ قَبْلُ	تم نے ایسی ہی روگردانی کی جیسی کہ تم نے پہلے

(۱۰)

يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا (الفتح) — کی تھی تو اللہ تم کو سخت عذاب دے گا۔

ہم نے اوپر بتایا ہے کہ مدینہ کے قرب وجوار میں جو قبائل آباد تھے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو قرآن نے اعراب کہا ہے۔ چنانچہ خود قرآن میں ہے۔

مَا كَانَ لِأَهْلِ الْمَدِينَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ مِنَ الْأَعْرَابِ أَنْ يَتَخَلَّفُوا عَنْ رَسُولِ اللَّهِ (التوبہ) — اہل مدینہ اور وہ اعراب جو اُن کے اردگرد یعنی اطراف واکناف میں رہتے ہیں اُن کیلئے مناسب نہیں کہ وہ رسول اللہ سے پیچھے رہ جائیں۔

یہ وہی لوگ تھے جن کی خاطر خواہ تہذیب نفس اور تنظیم نہیں ہو سکی تھی اور اسلام کی پوری حقیقت ان کے ذہن نشین نہیں ہوئی تھی۔ اور اہل بداوت ہونیکی وجہ سے ان کا ذہن امر حق کو فوراً کما ینبغی قبول کرنے کی استعداد سے بے بہرہ تھا۔ اس بنا پر خود ان اعراب میں بھی دو قسم کے لوگ تھے ایک وہ جو دل وجان سے مومن ہو چکے تھے اور دوسرے وہ جو عصبیت جاہلیہ اور اسلام کے درمیان کش مکش سے دوچار تھے اور ابھی تک اپنے لئے کوئی قطعی راہ عمل متعین نہیں کر سکے تھے۔ قرآن نے اعراب کی ان دونوں قسموں کو بھی الگ الگ بیان کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

الْأَعْرَابُ أَشَدُّ كُفْرًا وَنِفَاقًا وَأَجْدَرُ أَلَّا يَعْلَمُوا حُدُودَ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ۝ وَمِنَ الْأَعْرَابِ مَنْ يَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا وَيَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَائِرَ ۚ عَلَيْهِمْ دَائِرَةُ السَّوْءِ ۗ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ (التوبة) — اعراب کفر اور نفاق میں بہت سخت ہیں اور اس لائق ہیں کہ اللہ نے اپنے رسول پر جو احکام اتارے ہیں اُن کے حدود کو نہ جانیں اور اللہ علیم وحکیم ہے اور اعراب میں بعض وہ ہیں جن کا حال یہ ہے کہ جو کچھ خرچ کرتے ہیں اس کو ایک ڈانڈ سمجھتے ہیں اور (اے مسلمانو) اس کا انتظار کرتے رہتے ہیں کہ تم کو چشم زخم پہونچے۔ یہ وبال انھی پر پڑیگا اور اللہ سننے اور جاننے والا ہے۔

ان کے مقابلہ میں دوسری قسم کے اعراب ہیں جن کا ذکر اس طرح کیا گیا۔

وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ ؕ اَلَاۤ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ ؕ سَيُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (التوبة)	اور اعراب میں بعض وہ ہیں جو اللہ اور یوم آخر پر ایمان لاتے ہیں اور جو کچھ خرچ کرتے ہیں اُس کو اللہ سے تقرب کا اور رسول کی دعاؤں کا ذریعہ سمجھتے ہیں ہاں بیشک وہ ان کیلئے تقرب الٰہی کا ذریعہ ہے۔ اللہ عنقریب اُن کو اپنی رحمت میں داخل کریگا، بیشک اللہ غفور رحیم ہے۔

غور کرو پہلی قسم کے اعراب کی خاص صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ جو کچھ خرچ کرتے ہیں اُس کو ڈانڈ سمجھتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ وہ طبعاً بخیل اور کنجوس تھے یا کم از کم انفاق فی سبیل اللہ کی اہمیت اُن کے ذہن نشین نہیں ہوئی تھی وہ اپنے آپ کو مسلمان کہتے بھی تھے تو اُن کے نزدیک اسلام صرف نماز اور روزہ کا نام ہوگا۔ اُن کا اصولِ زندگی "گر زر طلبی سخن درین است" تھا۔ [1]

اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی ہے کہ زکوٰۃ کا باقاعدہ حکم فتح مکہ کے بعد ۸ھ کے آخر میں نازل ہوا ہے اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ۹ھ کے شروع میں اس حکم کی تبلیغ و اشاعت اور زکوٰۃ کی وصولیابی کیلئے اپنے عُمّال و سفراء اطراف و جوانب میں

---

[1] اسی قسم کا ایک اعرابی تھا جو ایک مرتبہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور اسلام پر بیعت کی اس کے بعد اسے بخار آگیا۔ تو اب اس نے حضور سے کہا کہ "میری بیعت کو منسوخ کر دیجئے"۔ آپ نے ایسا کرنے سے انکار فرمایا۔ اعرابی پھر دوبارہ آیا اور وہی درخواست کی۔ آپ نے پھر انکار فرمایا۔ اب اعرابی اسی حالت میں مدینہ چھوڑ کر چلا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر فرمایا۔
"مدینہ ایک بھٹی کی مانند ہے جو کھرے کھوٹے کو الگ کر دیتی ہے"۔
(صحیح بخاری ج ۲ ص ۱۰۷۰ باب بیعۃ الاعراب)

روانہ کئے ہیں اس بنا پر ان خاص اعراب کا ذہن زکوٰۃ کے بارہ میں صاف نہیں تھا اس میں شک نہیں کہ ان میں شرارت پسند بھی تھے لیکن یہ بھی تسلیم کرنا چاہئے کہ ان میں اکثر و بیشتر ایسے بھی تھے جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد یہ سمجھ بیٹھے کہ زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم صرف آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی تک کیلئے تھا۔ یا اگر اب بھی ہے تو یہ ضروری نہیں کہ ہم اپنی زکوٰۃ مدینہ ہی بھیجیں۔ اپنے مالداروں سے زکوٰۃ وصول کر کے ہم خود اپنے فقرا پر بھی خرچ کر سکتے ہیں اپنی زکوٰۃ جمع کر کے مدینہ بھیجنے کو وہ لوگ ایک طرح کی زبردستی سمجھتے تھے چنانچہ ایک مرتبہ عمرو بن العاصؓ عمان سے واپس ہوتے ہوئے بنو عامر کے علاقوں سے گزر رہے تھے کہ درمیان میں قرۃ بن ھبیرۃ کے پاس قیام کیا۔ قرہ نے خوب خاطر مدارات اور تواضع کی، جب عمرو بن العاص رخصت ہونے لگے تو قرہ اُن کو تنہائی میں لے گیا اور بولا کہ اگر آپ لوگ (یعنی مدینہ والے) ہم سے مال لینا چھوڑ دیں تو ہم سب عرب آپ کے مطیع و فرماں بردار رہیں گے۔ ورنہ ہم اس تاوان کو قبول نہیں کر سکتے اور آپ کے ساتھ متفق نہیں ہوں گے۔ حضرت عمرو بن العاص قریش کے نامور ارباب سیاست میں سے تھے۔ قرۃ کی اس دھمکی کے جواب میں بولے "کیا تو کافر ہو گیا ہے اور تو ہم کو عرب کی دھمکی دیتا ہے میں تم لوگوں کو گھوڑوں سے پامال کر دوں گا" یہ کہا اور روانہ ہو گئے [۱]

ان لوگوں کے اس خیال کو تقویت اس سے بھی ہوئی ہو گی کہ جو قبائل عرب مسلمان ہوتے جاتے تھے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُن کی آزادی اور علی الخصوص مالی خود مختاری قائم رکھتے تھے۔ باذان یا بدھان (علی اختلاف الروایات) جو حکومتِ فارس کی طرف سے یمن کا گورنر تھا مسلمان ہوا تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کی سیادت کو جوں کا توں برقرار رکھا بحرین اور حضر موت کے امرا نے اسلام قبول کیا تو آپ نے اُن کیساتھ بھی یہی معاملہ کیا اور حکم دیا ان علاقوں کے مالداروں سے جو زکوٰۃ وصول کی جائے وہ انہیں کے فقیروں، غریبوں پر خرچ

[۱] طبری ج ۲ ص ۲۸۸

کی جائے [۱] ان وجوہ کی بنا پر جب تک آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس عالم ناسوت میں تشریف فرما رہے یہ لوگ مطیع اور فرماں بردار رہے لیکن آپ کی وفات کے بعد ہی انھوں نے محسوس کیا کہ اب مدینہ کی اسٹیٹ کو زکوٰۃ دینا گویا اس کا باج گزار ہونا ہے اور اپنی قبائلی عصبیت کی وجہ سے وہ اس ننگ کو برداشت کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہو سکتے تھے۔

قبائل عرب میں اعراب کا یہی وہ طبقہ ہے جن کو ہمارے مؤرخین مرتد لکھتے ہیں لیکن درحقیقت یہ مرتد نہیں تھے۔ بلکہ مسلمان تھے۔ البتہ مختلف اسباب کی بنا پر جن کا ذکر ابھی ہوا ان زکوٰۃ مدینہ اسٹیٹ کو نہیں دینا چاہتے تھے یہی وجہ ہے۔ جیسا کہ اپنے موقع پر ہم بیان کریں گے حضرت عمر اور دوسرے صحابۂ کرام ان لوگوں سے جہاد و قتال کرنے کے حق میں نہیں تھے۔

سرکش و باغی قبائل (۲) ان اعراب کے علاوہ دوسرے قبائل وہ تھے جو مدینہ سے دُور دراز اور کے جنوب میں یمن اور اس کے گرد و نواح میں اور شمال مشرق کی جانب عرب و شام کی سرحدوں پر آباد تھے مؤرخین اُن کو مرتد کہتے ہیں اور اُس کی وجہ یہ ایک عام غلط فہمی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے رخصت ہوتے ہوتے سارا عرب مسلمان ہو گیا تھا۔ چنانچہ طبری نے سدی کے واسطے سے روایت کی ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اعلانِ برأت کے بعد کفار عام طور سے مُسلمان ہو گئے تھے۔ اس بنا پر اب بغاوت و سرکشی کا طوفان اٹھا تو اس کو ارتداد کے سوا اور کیا کہیں؟ لیکن حق یہ ہے کہ یہ قبائل سرے سے اسلام کی لذت سے آشنا ہی نہیں ہوئے تھے۔ فتح مکہ کے بعد

---

[۱] حضرت ابو موسیٰ اشعری اور حضرت معاذ بن جبل کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اسلام کی دعوت اور اسکی تبلیغ و اشاعت کیلئے یمن بھیجا تو جہاں اور ہدایات کیں آپ نے معاذ بن جبل کو خطاب کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا کہ اخبرھم ان اللہ قد فرض علیکم صدقۃ توخذ من اغنیاء ھم فترد علی فقرائھم۔

(صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۲۳ باب بعث ابی موسیٰ و معاذ الی الیمن)

جب قریش بھی سب کے سب مسلمان ہو گئے اور اسلام کی ایک زبردست اسٹیٹ مدینہ میں قائم ہو گئی تو عرب کے ان قبائل نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس کثرت سے وفد بھیجنے شروع کئے کہ ۹ھ کا نام ہی عام الوفود ہو گیا لیکن ان وفود نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جس طرح آکر گفتگو کی ہے اُس سے صاف نظر آتا ہے کہ اگرچہ ہر قبیلہ کے دو چار سمجھدار آدمیوں نے اسلام کو صدق دل سے قبول کر لیا تھا لیکن قبائل کا عام انداز یہ تھا کہ گویا وہ ایک سیاسی طاقت کے سامنے سر خم کر رہے ہیں اور ایک فاتح سے اپنے معاملات طے کر کے اپنے قبیلہ کیلئے معاشی اور سیاسی مراعات حاصل کرنا چاہتے ہیں دین اور روحانیت کا ان کی گفتگو میں بہت کم شائبہ تھا۔ اس بنا پر اگرچہ ان قبائل نے اسلام کے سیاسی اقتدار کو تسلیم کر لیا لیکن یہ دل سے مسلمان نہیں ہوئے تھے اور اس انتظار میں بیٹھے تھے کہ کب ان کو موقع ملے اور یہ اسلام کے یا بالفاظ صحیح تر مدینہ کی ریاست کیخلاف علم بغاوت بلند کر دیں چنانچہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ہی ان کو موقع ملا اور وہ جھٹ اسلام کیخلاف صف آرا ہو گئے۔

ہم اپنے اس دعویٰ کو ثابت کرنیکے لئے ذیل میں اُن قبائل کے وفود کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیساتھ گفتگو کی مختصر روئیداد لکھتے ہیں تاکہ قارئین کو اندازہ ہو سکے کہ جن لوگوں کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہ طرزِ گفتگو ہو کیا اُن کو سچ مچ مسلمان کہا جا سکتا ہے؟ اور جب وہ مسلمان ہی نہیں تو پھر ارتداد کا کیا ذکر؟

بنو تمیم | اس شورش و بغاوت میں جن قبیلوں نے حصہ لیا اُن میں پیش پیش بنو تمیم اور بنو حنیفہ تھے۔ ۹ھ میں بنو تمیم کا ایک وفد بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو جنت کی بشارت کی پیش کش کی۔ لیکن یہ لوگ اسکی قدر دانی نہیں کر سکتے تھے۔ بولے "قد بشرتنا فاعطنا" آپ نے ہم کو خوش خبری دی ہے تو کچھ دیجئے بھی!

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس جواب سے بڑا صدمہ ہوا۔ یہاں تک کہ چہرہ کا رنگ

بدل گیا۔ اس کے بعد یمن کا ایک وفد آیا تو آپ نے اس کو خطاب کر کے فرمایا "بنو تمیم نے تو اس پیش کش کو قبول نہیں کیا۔ تم کر لو۔ ان لوگوں نے کہا "قبلنا یا رسول اللہ" [۱]

بنو حنیفہ اس قبیلہ کو شروع سے ہی اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیساتھ بیر تھا۔ چنانچہ ہجرت سے قبل ایک مرتبہ عکاظ کے میلہ کے موقع پر اور قبیلوں کے علاوہ۔ اس قبیلہ بنو حنیفہ کے لوگوں کے پاس بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے تو یہ لوگ نہایت بدتہذیبی اور تلخ کلامی سے پیش آئے تھے۔[۲] مکہ اور یمن کے درمیان ایک مقام یمامہ ہے، یہ قبیلہ یہیں کا رہنے والا تھا۔ مسیلمہ کذاب اس قبیلہ کا ایک فرد تھا جس نے بعد میں نبوت کا دعوٰی کیا اسی قبیلہ کا ایک وفد بھی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا مسیلمہ ساتھ تھا۔ اس نے کہا اگر "محمد" مجھ سے یہ وعدہ کرلیں کہ ان کے بعد میں سردار ہوں گا۔ تو میں انکی تابعداری قبول کر لوں گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں کھجور کی ایک شاخ تھی اسے لئے ہوئے مسیلمہ اور اس کے ساتھیوں کے پاس گئے اور فرمایا کہ اگر تو مجھ سے یہ شاخ بھی مانگے گا تو نہیں دوں گا۔"[۳]

اس قبیلہ کا ایک سردار ثمامہ بن اثال تھا۔ اگرچہ اس نے بھی ہجرت سے قبل مکہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیساتھ نہایت شوخ چشمی کا معاملہ کیا تھا[۴] اور پھر ۴ھ میں اسی کے علاقہ میں عامر بن الطفیل نے مسلمان مبلغوں اور مہمانوں کو دھوکہ سے قتل کر دیا تھا۔ لیکن ۹ھ میں یہ گرفتار ہو کر مدینہ آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکو معاف کر دیا اور یہ مسلمان ہو گیا۔ بنو حنیفہ کے کسی شخص نے مذہب بدل دینے پر طعنہ دیا۔ لیکن یہ آخر وقت تک اسلام پر قائم رہے اور نامور صحابی ہوئے۔[۵]

---

[۱] بخاری ج ۲ ص ۶۲۶ باب وفد بنی تمیم [۲] سیرت ابن ہشام [۳] صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۲۸ -
[۴] اصابہ تذکرہ ثمامہ [۵] بخاری ج ۲ ص ۶۲۸ اگرچہ طبری نے واقدی کے حوالہ سے ثمامہ بن اثال کا نام بھی مرتدین کی فہرست میں لکھا ہے۔ (دیکھو طبری ج ۲ ص ۲۳۲) لیکن ظاہر ہے ہم بخاری کے مقابلہ میں واقدی کے بیان کو صحیح تسلیم نہیں کر سکتے۔

مُضر | یمن کا مشہور قبیلہ ہے۔ یہ لوگ کفر میں اس قدر شدید تھے کہ جو لوگ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آنا چاہتے تھے ان کی راہ میں بھی رکاوٹیں ڈالتے تھے اسی سال قبیلۂ عبدالقیس کا ایک وفد خدمتِ گرامی میں آیا تو عرض کیا "ہم لوگ قبیلۂ ربیعہ سے تعلق رکھتے ہیں اور ہمارے آپ کے درمیان مُضَر کے کفار حائل ہیں"[1] ان لوگوں کے اس تشددِ طبع کی وجہ سے ہی ایک مرتبہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے حق میں بددعا بھی کی تھی[2]

دوس | یہ قبیلہ بھی یمن کا ہے۔ ۹ھ میں طفیل بن عمرو الدوسی خدمتِ سامی میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ قبیلۂ دوس کے لوگ آپکی اطاعت قبول نہیں کرتے اور سرکشی پر تلے ہوئے ہیں آپ اُن کے حق میں بددعا کر دیجئے۔ لیکن رحمتِ عالمؐ نے دعا کی تو یہ کہ" اے اللہ تو دوس کو ہدایت دے اور ان کو مسلمان بنا دے۔[3]

اہلِ نجران | نجران یمن کا مشہور شہر ہے جو مکہ سے سات دن کی مسافت پر ہے۔ عیسائیوں کا بڑا مرکز تھا اس شہر کے دو سردار عاقب اور سید بھی اِسی سال بارگاہِ رسالت میں حضورؐ سے مباہلہ کرنے آئے تھے۔ لیکن بعد میں اُن کی رائے بدل گئی اور آخر نہ اسلام لائے اور نہ مباہلہ کیا یوں ہی واپس لوٹ گئے۔[4]

اہلِ حضر موت | اس شورش و بغاوت میں اہلِ حضر موت نے بھی کافی حصہ لیا تھا اسلام سے قطع نظر۔ ان بدبختوں کو خود آقائے دوجہاں کی ذاتِ والا صفات کے ساتھ اس درجہ شدید دشمنی تھی کہ جب بنو عامر بن عوف کے ایک شخص کے ذریعہ یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خبرِ وفات پہونچی تو یہاں کی عورتوں نے جن میں شریف و وضیع دونوں قسم کی عورتیں تھیں باقاعدہ جشنِ مسرت منایا۔ انھوں نے ہاتھوں پر مہندی لگائی اور دف بجائے۔ یہ عورتیں پہلے سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موت کی دعائیں مانگتی تھیں۔ ابو جعفر محمد بن حبیب المتوفی

---

[1] بخاری ج ۲ ص ۶۲۷۔ [2] العقد الفرید ج ۲ ص ۲۶۰ جدید ایڈیشن۔ [3] بخاری ج ۲ ص ۶۳۰۔ [4] بخاری ج ۲ ص ۶۲۹۔

۲۴۵ھ نے ان عورتوں کی تعداد تیس کے لگ بھگ بتائی ہے اور ان میں سے خاص خاص عورتوں کے نام اور اُن کے نسب بھی لکھے ہیں۔ موصوف کے بیان کے مطابق یہ عورتیں حضر موت کے مختلف علاقوں مثلاً تریم۔ مشطہ۔ البخیر اور تنعہ وغیرہ میں پھیلی ہوئی تھیں یعنی وہ ان علاقوں کی نمائندگی کر رہی تھیں[۱] پس جب عورتوں کی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دشمنی کا یہ عالم تھا تو اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ان کا جن قبیلوں سے تعلق تھا وہاں کی عام فضا کیا ہوگی؟

بنو عامر پھر معاملہ صرف یہیں تک محدود نہیں تھا بلکہ بعض قبیلوں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دھوکہ سے قتل تک کر دینے کی سازش کی تھی۔ چنانچہ سنہ ۱۰ھ میں عامر بن الطفیل اربد بن قیس۔ اور جبار بن سلمی کی سرکردگی میں بنو عامر کا ایک وفد خدمت اقدس میں حاضر ہوا تو اسی ناپاک منصوبہ کو لیکر آیا تھا۔ عامر بن الطفیل اور اربد دونوں میں یہ قرارداد ہوئی تھی کہ عامر بن الطفیل حضور کو باتوں میں لگا کر اپنے ساتھ مشغول کریگا اور ادھر اربد موقع پاکر آپؐ پر تلوار کا وار کر دیگا۔ لیکن یہاں پہونچکر اربد پر ایسی دہشت طاری ہوئی کہ وہ عامر کے اشارہ کرنیکے باوجود ہاتھ بھی نہیں اٹھا سکا۔ اور آخر دونوں واپس چلے گئے۔[۲]

یہی عامر بن الطفیل ہے کہ جب اسکو بعض لوگوں نے اسلام کی دعوت دی تو اس نے بپھر کر جواب دیا تھا "میں نے تو قسم کھالی ہے کہ میں اسوقت تک چین نہیں لوں گا جبتک سارا عرب میرا مطیع نہیں ہوجائیگا۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ میں قریش کے ایک نوجوان شخص کی پیروی کروں"[۳]

یہ وفد بنو عامر جب واپس لوٹ رہا تھا۔ تو عامر بن الطفیل کو ایک مقام پر طاعون ہوا اور قبیلۂ بنو سلول کی ایک عورت کے گھر میں مرگیا۔ اربد اپنے قبیلہ میں واپس پہونچا تو لوگوں نے حالات پوچھے۔ اس شخص نے نہایت حقارت آمیز الفاظ میں آنحضرت صلی اللہ

[۱] کتاب المحبر ص ۱۸۴-۱۸۵۔ مطبوعۂ دائرۃ المعارف حیدر آباد دکن۔ [۲] ابن جریر طبری ج ۲ ص ۲۹۸ [۳] ایضاً۔

علیہ وسلم کا تذکرہ کیا اور بولا "کچھ نہیں۔ یہ شخص (آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم) کسی شی کی عبادت کی ہم کو دعوت دیتا ہے۔ اگر یہ یہاں میرے پاس ہو تو میں اسکو اپنے تیروں کا نشانہ بنادوں [۱] قدرت نے اس بدزبانی اور گستاخی کا انتقام اس سے اس طرح لیا کہ اس واقعہ کے ایک یا دو دن بعد وہ اپنا اونٹ لئے اسے فروخت کرنے جارہا تھا کہ درمیان راہ میں اچانک اس پر اور اس کے اونٹ پر بجلی گری اور دونوں وہیں جل کر بھسم ہو گئے۔ [۲]

یہ جو کچھ تم نے پڑھا جنوبی عرب کا حال تھا۔ شمال مشرق میں عرب و شام کی سرحد پر غسان۔ قضاعہ وغیرہ جو قبائل آباد تھے ان کی فتنہ انگیزی اور شورش پسندی کی کیفیت تم غزوۂ موتہ کے ذکر میں پڑھ آئے ہو۔ انہیں کی سرزنش اور تادیب کیلئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اسامہ کی زیر سرکردگی ایک لشکر روانہ کیا تھا لیکن ابھی یہ مقام جرف سے آگے بھی نہیں بڑھا تھا کہ خود حضور دنیا سے رخصت ہو گئے۔ یعنی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک یہ قبائل بھی بحیثیت مجموعی اپنی اسی جاہلیت پر قائم رہے۔

سطور بالا میں ہم نے قبائل کی ایک عام کیفیت و حالت پر روشنی ڈالی ہے جس سے اندازہ ہوگا کہ ان قبائل کو من حیث المجموع کیونکر مسلمان کہا جاسکتا ہے اور جب یہ مسلمان ہی نہیں تو پھر یہ کہنا کہ خلافت صدیقی میں یہ مرتد ہو گئے تھے۔ کیونکر درست ہو سکتا ہے۔

اب ہم بعض خاص اشخاص کی نسبت گفتگو کریں گے جن کے متعلق اولاً غزوات نبوی تک میں شریک ہونا اور پھر باغیوں کی قیادت کرنا ثابت ہے تو اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ بھی مرتد نہیں تھے؟

عیینۃ بن حصن الفزاری	حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ یہ شخص فتح مکہ سے پہلے مسلمان ہوگیا تھا

اور فتح مکہ کے علاوہ غزوۂ حنین و محاصرۂ طائف میں شریک ہوا تھا۔ پھر آں حضرت

---

[۱] طبری ج ۲ ص ۳۹۹ [۲] ایضاً۔

صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکو بنو العنبر پر جو بنی تمیم کی ایک شاخ ہے چھاپا مارنے کے لئے بھی بھیجا تھا لیکن ابوبکر کے عہد میں مرتد ہو گیا۔[۱]

حافظ ابن حجر نے اس کو مسلمان ماننے کے بعد مرتد کہا ہے لیکن تحقیق سے ثابت ہوتا ہے یہ شخص آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک مسلمان ہی نہیں ہوا تھا۔

اصل یہ ہے کہ عام مسلمانوں کے علاوہ کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو "مولفۃ القلوب" کہلاتے تھے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کو مال غنیمت میں سے حصہ دلاتے تھے اور اُن کے ساتھ دوسری رعایتیں بھی کرتے تھے۔ اور یہ سب کچھ تالیفِ قلب کی غرض سے ہوتا تھا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ یہ شخص یا تو خود سچا اور پکا مسلمان ہو جائے اور یا اگر وہ اپنے قبیلہ کا کوئی با اثر آدمی ہے تو مسلمان اُس کے شر سے محفوظ رہیں۔ مولفۃ القلوب کی بس صرف یہی حیثیت تھی۔

اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ مولفۃ القلب سچ مچ مُسلمان بھی ہو۔ یہ لوگ غزوات تک میں شریک ہوتے تھے لیکن صرف مالی منفعت اور غنیمت میں حصہ دار ہونے کیلئے اسلام یا جذبۂ اقامتِ دین سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا۔ اُن کیساتھ رہنے سے بہر حال مسلمانوں کی تعداد زیادہ نظر آتی تھی اور پھر مالِ غنیمت میں اپنا حصہ حلال کرنے کی غرض سے یہ لوگ کچھ نہ کچھ کرتے بھی ہوں گے اس بنا پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم انکو اپنے ساتھ لگائے رکھتے تھے اور کوئی شبہ نہیں کہ سیاسی اعتبار سے تدبُّر و دُور اندیشی کا مقتضا بھی یہی تھا۔[۲]

---

[۱] الاصابہ تذکرہ عیینۃ بن حصن ج ۳ ص ۵۵ [۲] طبری کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم۔ ابوسفیان بن حرب۔ اُن کے بیٹے امیر معاویہ اور حکیم بن حزام کو بحیثیتِ مولفۃ القلوب کچھ زیادہ حصہ دیا کرتے تھے۔ یہ حضرات مسلمان تھے اور اسلام پر قائم رہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مولفۃ القلوب مسلمان بھی ہوتے تھے اور تالیفِ قلب کا فائدہ صرف سیاسی نہیں دینی بھی ہو سکتا تھا۔ ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ محض غزوات میں شرکت کی بنا پر کسی شخص کے اسلام کا حکم نہیں لگایا جا سکتا اس کے لئے اس کی زندگی کے عام حالات دیکھنے ہوں گے کیونکہ ممکن ہے وہ مولفۃ القلوب میں سے ہو اور تالیفِ قلب نے بھی اس کو نہ بدلا ہو یا منافق ہو۔

عُیینۃ بن حصن اپنی قوم کا سردار تھا[1] اور مُولفۃ القلوب میں سے تھا۔[2]
غزوۂ حُنین کے موقعہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جن مولفۃ القلوب کو بہت کچھ دیا تھا۔ طبری نے اُن کی فہرست دی ہے اور اس فہرست میں عُیینۃ کا نام بھی ہے۔
عبداللہ بن ابی بکر کا بیان ہے کہ یہ سب لوگ اشراف میں سے تھے اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کو سو اُونٹ فی کس کے حساب سے دئے تھے لیکن اس کے باوجود عیینۃ کا کیا حال تھا اور اگر وہ مسلمان تھا تو اُس کا اسلام کس قسم کا تھا اس کا اندازہ واقعات ذیل سے ہوگا!
کسی شخص نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا "یا رسول للہ! آپ نے عیینۃ اور اقرع بن حابس کو سو سو اُونٹ دئے ہیں لیکن جعیل بن سراقہ کو چھوڑ دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اما والذی نفسی بیدہ لجعیل بن سراقۃ الضمری خیرٌ من طلاع الارض کلھم مثل عیینۃ بن حصن والاقرع بن حابس ولکنی تالفتھما لیسلما ووکلت جعیل بن سراقۃ الی اسلامہ[3]	جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اسکی قسم! اس میں شک نہیں کہ جعیل۔ عیینۃ اور اقرع جیسے تمام دنیا بھر کے چھاپہ ماروں سے زیادہ بہتر ہے۔ لیکن میں ان دونوں (عیینۃ اور اقرع) کی دل جوئی کرتا ہوں تاکہ یہ مسلمان ہو جائیں۔ اور رہا جعیل تو اُس کو میں نے اس کے اسلام کے حوالہ کر دیا ہے۔

[1] چنانچہ حافظ ابن حجر نے اس کا ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ یہ خدمتِ گرامی میں حاضر ہوا اس وقت حضرت عائشہ آپ کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں۔ عیینۃ نے حضرت عائشہ کیطرف اشارہ کرکے پوچھا "یہ کون عورت ہے" آپ نے جواب دیا "عائشہ" اب عیینۃ بولا "آپ میری بیوی ام البنین کو قبول کر لیجئے تا جو عائشہ سے زیادہ بہتر ہیں"۔ حضرت عائشہ کو یہ سنکر غصہ آگیا تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "یہ شخص احمق ہے مگر اپنی قوم کا سردار (مطاع) ہے۔ [2] الاصابہ جلد ۳ ص ۵۵ [3] طبری جلد ۲ ص ۳۵۹

غور کرو! آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا "لیسلما" فرمانا صاف بتاتا ہے کہ اس وقت تک یہ دونوں آپ کے نزدیک مسلمان نہیں تھے۔ اسی طرح ایک مرتبہ مالِ غنیمت کی تقسیم کے سلسلہ میں چند انصاریوں کی نسبت آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا کہ یہ لوگ اس بات کے شاکی ہیں کہ آپ مولفۃ القلوب کو تو کافی دے رہے ہیں لیکن انصار کو نظر انداز کر رہے ہیں تو آپ نے فوراً تمام انصار کو جمع کیا اور ایک نہایت موثر خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

تالفت بھا قوما لیسلموا ووکلتکم الی الاسلام۔[1]

میں ان عطیات کے ذریعہ ایک گروہ کی دل جوئی کرتا ہوں تاکہ یہ لوگ مسلمان ہو جائیں اور تمکو اے انصار اسلام کے حوالہ کر دیا ہے۔

لیکن عینیہ کی فطرت احسان ناشناس تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس غیر معمولی داد و دہش کے باوجود وہ آپ کے صرف انہیں احکام کی تعمیل کرتا تھا جو اُس کے ذاتی مفاد سے نہیں ٹکراتے تھے۔ غزوہ حُنین میں اگرچہ اوس کو سو اونٹ مل چکے تھے۔ لیکن اس کے باوجود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فریق مخالف کی ایک بڑھیا کو جو گرفتار ہو کر آئی تھی۔ باندی بنانے سے منع کیا تھا۔ عینیہ نہ مانا اور زرِ فدیہ کے لالچ میں اسے بھی اپنے قبضہ میں کر لیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے باوجود اسے واپس کر دینے سے انکار کر دیا۔[2]

علاوہ بریں اُس نے جاہلیت کے عادات و رسوم کو بھی ترک نہیں کیا تھا اور اس بناء پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیساتھ کبھی بڑی بے ادبی اور گستاخی سے پیش آتا تھا۔ طبری نے ۹ھ کے واقعات میں عبداللہ بن ابی بکر کی روایت سے نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ بنو تمیم کا وفد آیا۔ عینیہ بن حصن الفزاری اور اقرع بن حابس یہ دونوں بھی ساتھ تھے۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم زنانخانہ میں تشریف رکھتے تھے، ان لوگوں نے بڑی

[1] طبری جلد ۲ ص ۳۵۷ - [2] طبری جلد ۳ ص ۳۵۷

بے ادبی سے چیخ کر حضورؐ کو آواز دی اور باہر آنے کیلئے کہا۔ آپ باہر تشریف لائے تو ان لوگوں نے کہا "ہم آپ سے حسب و نسب میں مفاخرت کرنیکی غرض سے آئے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے ان کا چیلنج قبول کیا اور ان کے خطیب کے مقابلہ میں اپنے خطیب ثابت بن قیس اور ان کے شاعر زبرقان بن بدر کے بالمقابل اپنے شاعر حسان بن ثابت کو حکم دیا کہ اُن کے ہفوات کا جواب دیں طبری نے اس واقعہ کی پوری تفصیل لکھی ہے اور جانبین کے خطبے اور اشعار نقل کئے ہیں اُن سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ بعض غزوات میں شریک ہونیکے باوجود عیینۃ اور اُس کے دوسرے ساتھی۔ اقرع بن حابس۔ عطارد بن حاجب بدستور عہدِ جاہلیت کے رسوم و افکار پر قائم تھے اور اسلام کی کسی تعلیم کا ان لوگوں کی زندگی پر کوئی اثر نہیں تھا۔[1]

اسی کا یہ اثر تھا کہ جب طلیحہ نے نبوّت کا دعویٰ کیا تو عیینۃ جھٹ اس کا دستِ راست بن گیا اور اب وہ کہا کرتا تھا "خدا کی قسم دو حلیفوں میں سے کسی ایک نبی کا ہم اتباع کریں یہ ہمارے لئے زیادہ محبوب ہے بہ نسبت اس کے کہ ایک قریشی نبی کی پیروی کریں۔[2]

عیینۃ کا اقرار کہ وہ مسلمان نہیں تھا

بہرحال اس لحاظ سے ہمکو عیینۃ کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ اُسنے اپنے اسلام قبل از ارتداد" کے بارے میں ہمکو کسی مغالطہ میں نہیں چھوڑا جبتے گرفتار کر کے مدینہ لایا گیا ہے تو دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ اُس کے دونوں ہاتھ اس کی گردن سے بندھے ہوئے تھے۔ مدینہ کے لڑکے کھجور کی ایک شاخ سے اسکو ہنکاتے پھرتے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ "او دشمن خدا! تجھ کو آخر یہ کیا سوجھی تھی کہ ایمان لانے کے بعد کافر ہو گیا" عیینۃ اُس کے جواب میں کہتا تھا "قسم خدا کی میں تو کبھی ایمان لایا ہی نہیں تھا۔[3]

---

[1] طبری ج ۲ ص ۳۷۸ [2] طبری ج ۲ ص ۴۸۷ [3] طبری ج ۲ ص ۴۸۹ محاصرۂ طائف کے موقع پر عیینہ بھی اسلامی لشکر کیساتھ تھا۔ یہاں کسی شخص نے عیینہ کو مشرکین کی تعریف کرتے سنا تو اس سے کہا "عیینہ خدا تجھ کو غارت کرے تو آیا ہے محمد رسول اللہ کی مدد کرنے لیکن تعریف کر رہا ہے مشرکوں کی" عیینۃ نے جواب دیا۔ "خدا کی قسم میں تو تم مسلمانوں کے ساتھ ثقیف سے جنگ کرنے آیا ہی نہیں ہوں۔ بلکہ میری غرض تو صرف یہ ہی کہ محمد نے اگر طائف فتح کر لیا تو مجھ کو ثقیف کی ایک لڑکی ملیگی جس سے میں لطف اندوز ہوں گا اور اس سے میری اولاد ہوگی۔ (طبری ج ۲ ص ۳۵۵)

اس سلسلہ میں ایک خاص اہم بات یہ ہے کہ حضرت ابوبکر کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے اس کا خون معاف کردیا اور درگزر فرمایا[1] اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ عینیہ حضرت ابوبکر کی رائے میں مرتد نہیں بلکہ باغی تھا۔

دوسرے لوگ | عینیہ پر اس قسم کے دوسرے لوگوں کو بھی قیاس کیا جاسکتا ہے عباس بن مرداس السلمیؓ اور اقرع بن حابس یہ بھی مولفۃ القلوب میں سے تھے اور اس حیثیت سے غزوات تک میں شریک ہوتے تھے لیکن عالم یہ تھا کہ غزوہ حنین میں عباس بن مرداس کو دوسرے مولفۃ القلوب سے حصہ کم ملا تھا تو یہ شخص بگڑ گیا اور چند اشعار پڑھے جن میں یہ دو شعر حافظ ابن حجر نے نقل کئے ہیں۔

اتجعل نھبی ونھب العبید بین عیینۃ والاقرع

وماکان حصن ولا حابس یفوقان مرداس فی مجمع

ترجمہ۔ اے محمد! کیا آپ میرا اور میرے گھوڑے عبید کا لوٹا ہوا مال عینیہ اور اقرع کے درمیان تقسیم کرتے ہیں حالانکہ حصن اور حابس یہ دونوں بھی کسی مجمع میں مرداس پر فائق نہیں ہوسکتے۔[2]

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سُنا تو آپ کو بڑا صدمہ ہوا اور حکم دیا کہ "اس کی زبان کاٹ لو" صحابۂ کرام نے اس کی تعمیل اس طرح کی کہ اس کو کچھ اور دیکر اس کی زبان بند کردی۔[3]

اقرع بن حابس کا حال تم ابھی پڑھ ہی چکے ہو کہ سنہ ۹ھ میں بنو تمیم کا جو وفد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیساتھ مفاخرت کرنے آیا تھا اُس وفد کا ایک رکن یہ بھی تھا۔ پھر انصار کے شکوہ کرنے پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جن دو مولفۃ القلوب کو زیادہ حصہ دینے کی وجہ بتلاتے ہوئے فرمایا تھا "لیسلما" ان میں سے ایک یہ اقرع بھی تھا۔ اس کے علاوہ عہدِ صدیقی میں ایک مرتبہ عینیہ اور اقرع خلیفہ رسول کے پاس آئے اور کہا کہ آنحضرت

[1] طبری ج ۲ ص ۴۸۹ [2] الاصابہ ج ۲ ص ۲۶۳ [3] طبری ج ۲ ص ۳۵۹

صلی اللہ علیہ وسلم مولفۃ القلوب کی حیثیت سے ہم پر داد و دہش کرتے تھے۔ آپ بھی ایسا کیجیے اور اس کے بعد ایک زمین کا مطالبہ کیا۔ حضرت ابوبکر جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم بقدم چلتے تھے انھوں نے ان کی درخواست منظور کرلی۔ لیکن جب پروانہ خلافت کی تصدیق کے لئے یہ دونوں حضرت عمر فاروق کی خدمت میں پہونچے تو انھوں نے شدید مخالفت کی اور فرمایا " اسلام جب کمزور تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تم لوگوں کی تالیفِ قلب کرتے تھے۔ لیکن اب اسلام مضبوط اور قوی ہوگیا ہے اور ہم کو تم لوگوں کی پروا نہیں ہے۔ تم اسلام کو نقصان پہونچانے کیلئے اپنی جیسی جو کوشش بھی کرسکتے ہو کر گزرو[۱]

غور کرو! ارتداد سے تائب ہونے کے بعد بھی ان لوگوں کی حیثیت حضرت عمر کے نزدیک کیا تھی؟ مذکورۂ بالا اقتباس کے آخری فقرہ سے صاف ظاہر ہے۔

قبیلۂ بنو سلیم کا ایاس بن عبداللہ بن عبدیالیل جو الفجارۃ کے لقب سے مشہور ہے مرتدین کے ایک گروہ کا سرغنہ تھا[۲] لیکن ارتداد سے تائب ہونیکے بعد بھی اس کے اسلام کا کیا حال تھا؟ اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ اس نے حضرت ابوبکر کی خدمت میں آکر عرض کیا کہ میں مسلمان ہوں اور جو لوگ مرتد ہوگئے ہیں اُن سے جنگ کرنا چاہتا ہوں۔ حضرت ابوبکر نے اُس کو ہتھیار اور ساز و سامان سے لیس کردیا لیکن یہ بدبخت ان ہتھیاروں سے خود مسلمانوں پر ہاتھ صاف کرنے لگا۔ حضرت ابوبکر کو اطلاع ہوئی تو گرفتاری کے احکام جاری کئے۔ جب گرفتار ہوکر آیا تو حضرت ابوبکر نے شدید غداری اور بے وفائی کی وجہ سے اس کو بڑی سخت سزا دی اور آگ میں ڈلوا کر زندہ جلادیا۔[۳]

بہر حال اس بحث سے تم کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ جن لوگوں کو مرتد کہا جاتا ہے اُن کے اسلام قبل از ارتداد کی کیا حقیقت تھی؟ حد یہ ہے کہ مسیلمہ اور طلیحہ جنھوں نے نبوت کا

---

[۱] الاصابہ ج ۳ ص ۵۹۔ اسی واقعہ کو طبری نے بھی لکھا ہے۔ (جلد ۲ ص ۵۰۰) لیکن الفاظ کچھ بدلے ہوئے ہیں۔ [۲] البدایۃ والنھایہ ج ۶ ص ۳۱۲ - حافظ عماد الدین ابن کثیر نے اس کا نام انس لکھا ہے لیکن صحیح ایاس ہے۔ طبری وغیرہ ایاس ہی لکھتے ہیں۔ [۳] طبری ج ۲ ص ۴۹۳

دعویٰ کیا تھا اُن تک کی نسبت مورخین لکھتے ہیں کہ انھوں نے شروع میں اسلام قبول کر لیا تھا؟ لیکن اگر اسلام یہی ہے تو کفر کس چیز کا نام ہے؟ اصل بات یہ ہی ہے کہ اوّل تو یہ ارتداد تھا ہی نہیں اور اگر تھا بھی تو بجائے دینی اور مذہبی ارتداد کے سیاسی ارتداد تھا۔ یعنی اُن لوگوں نے مصلحتِ وقت کے پیشِ نظر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف سیاسی اطاعت قبول کی تھی۔ اور وہ بھی محض منافقانہ طور پر۔ چنانچہ اسکے بعد بھی ریشہ دوانیوں میں لگے رہے اور جب فضا سازگار ہوتی نظر آئی تو کھلم کھلا علمِ بغاوت بلند کر دیا۔

وجوہ واسباب

یہ سب کچھ پڑھ لینے کے بعد قدرتی طور پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس صورتِ حال کے اسباب کیا تھے؟ اور وہ کیا وجوہ تھے جن کے باعث یہ لوگ دینِ حق کو اب تک قبول نہیں کر سکے تھے؟

اصل یہ ہے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے تیرہ سال تو مکہ مکرمہ میں بسر ہو گئے تھے۔ یہاں اگرچہ حج کے موقع پر عرب کے مختلف قبائل کے لوگ آتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُن کو اپنا پیغام پہونچاتے تھے لیکن اوّل تو یہ پیغام ظاہر ہے کہ چند آدمیوں تک ہی پہنچا تھا اور پھر جو لوگ اس کو سنتے تھے وہ بھی مختلف طبیعت اور مختلف استعداد کے تھے۔ اُن میں کچھ صدق دل سے اُسکو قبول کر لیتے تھے، اور سچے مسلمان ہو جاتے تھے اور کچھ ایسے تھے جو تھوڑا بہت اثر قبول کرتے تھے لیکن قبیلہ میں پہونچنے کے بعد وہ اثر زائل ہو جاتا تھا اور کچھ ایسے بھی تھے جنکے دل سرے سے پسیجتے ہی نہیں تھے اس کے علاوہ چونکہ قریش کی سخت ترین عداوت کے باعث خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپکے جاں نثاروں کو سخت ترین مشکلات اور دشواریوں کا مقابلہ کرنا پڑ رہا تھا اس لئے تبلیغِ اسلام کا ایک ہمہ گیر نظام قائم نہیں ہو سکتا تھا۔

پھر جب آپ مدینہ ہجرت کر گئے تو مدنی زندگی کے آٹھ سال غزوات و سرایا میں صرف ہو گئے اور اسکا اثر اگرچہ یہ ضرور ہوا کہ حجاز کی بڑی آبادی مسلمان ہو گئی لیکن یہاں بھی منافقین کا ایک مستقل گروہ موجود تھا۔ پھر یہود و نصاریٰ بھی تھے جو یقیناً اسلام کے اس عروج پر خوش نہیں ہو سکتے تھے۔ یہ تو خود حجاز کا عالم تھا۔ رہ گئے وہ قبائل جو مدینہ سے دور دراز کے فاصلوں پر آباد تھے تو اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آخر عہدِ نبوت میں ان میں تبلیغِ اسلام کے لئے مبلغین اسلام کے وفود روانہ کئے لیکن چند در چند وجوہ کی بنا پر یہ سب قبائل اس قدر جلد اسلام کی دعوت کو لبیک کہنے کیلئے آمادہ نہیں ہو سکے۔ اور وہ وجوہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) عرب عاربہ اور متعربہ یعنی جنوبی عرب اور شمالی عرب کے قبائل میں دیرینہ عداوتیں تھیں۔ یہاں تک کہ شمالی عرب کے لوگ خدا کو اللہ کہتے تھے تو جنوبی عرب کے قبائل رحمٰن کہتے تھے۔ مسیلمہ نے جب نبوت کا دعویٰ کیا ہے تو بعض اُس کے ساتھی صاف کہتے تھے کہ "ہم جانتے ہیں کہ مسیلمہ جھوٹا ہے اور محمدؐ سچے ہیں لیکن بایں ہمہ کذاب ربیعۃ احب الینا من صادق مضر" قبیلۂ ربیعہ کا جھوٹا مضر کے سچے سے ہم کو زیادہ محبوب ہے۔

(۲) یہود۔ نصاریٰ۔ مجوس۔ اور منافقین۔ یہ لوگ اسلام کے دشمن اور موقع کے منتظر تھے ہی۔ اب انھوں نے قبائلِ عرب میں بے چینی دیکھی تو انہیں شہ دیکر اور آمادہ بہ فساد کر دیا چنانچہ سجاح بنت الحارث جس نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا اُس کے ساتھیوں میں ایک بڑی تعداد بنو تغلب کے عیسائیوں کی تھی۔[1]

اسی طرح بحرین میں حطم کی زیرِ قیادت مجوسیوں نے بغاوت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔

(۳) پھر سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ رومیوں اور ایرانیوں میں مدت سے چپقلش چلی آ رہی تھی اور عرب کے خانہ بدوش قبائل ان دونوں حکومتوں کے علاقوں پر آئے دن چھاپے مارتے تھے اس بنا پر دونوں نے اپنی اپنی سرحدوں پر ان عربوں کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کر دی

[1] محاضرات تاریخ الامم الاسلامیہ جلد اول ص ۱۷۷

تھیں جن کو آج کل کی اصطلاح میں درمیانی مملکتیں (BAFFER STATER) کہا جاتا ہے۔ ایرانیوں نے حیرہ (حال کوفہ) میں ایک عربی ریاست اور رومیوں نے اسی طرح کی ایک عربی ریاست دمشق میں قائم کی۔ ایرانیوں اور رومیوں میں جب جنگ ہوتی تھی تو حیرہ اور دمشق کے عرب اپنی اپنی حامی مملکتوں کا ساتھ دیتے اور اس طرح خود اپنی ہی برادری کے لوگوں کیخلاف صف آرا ہوتے تھے۔ ایرانی اور رُومی حکومتوں کی داد و دہش اور عرب نوازی کا اثر صرف سیاسی ہی نہیں بلکہ مذہبی بھی تھا۔ چنانچہ قبیلۂ غسّان جو سدِ مآرب کے ٹوٹنے کے باعث شام کی سرحد پر آکر آباد ہوگیا تھا اُس نے عیسائی مذہب ہی قبول کرلیا تھا۔ اسی طرح بحرین میں باغیوں نے جب حضرت ابوبکر صدیق کے خلاف عَلَم بغاوت بلند کیا تو ایران کی ساسانی حکومت نے ان کی پُوری پُشت پناہی کی اور کمک بھیجکر اُن کی مدد کی۔[1]

ابن عبدربہ نے " وفود العرب علیٰ کسریٰ " کے زیرِ عنوان بڑی تفصیل سے بتایا ہے کہ عرب کے وفود کس طرح شاہِ ایران کے دربار میں جاتے تھے اور وہاں سے بڑے بڑے عطیات و صلات حاصل کرکے آتے تھے۔[2] اسی طرح قیصرِ روم کی طرف سے ان عربوں کو بڑی بڑی رقمیں سالانہ عطیہ کے طور پر ملتی تھیں۔

ان حکومتوں کا عربوں پر اثر کس قدر عمیق تھا اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ قیامِ مکہ کے زمانہ حج کے موقع پر ایک مرتبہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر کے ساتھ قبیلۂ بنو ذہل بن شیبان کے پاس تشریف لیگئے اور " قل تعالوا اتل ما حرم ربکم علیکم ان لا تشرکوا بہ الآیۃ "۔ چند آیتیں پڑھ کر اُن کو اسلام کی دعوت دی تو قبیلہ کے سردار مفروق۔ مثنیٰ اور ہانی بن ربیعہ ان آیتوں سے بڑے متاثر ہوئے لیکن ساتھ ہی بولے کہ اوّل تو مدتوں کا خاندانی دین اچانک ترک کردینا زود اعتقادی ہے اور پھر ہم لوگ کسریٰ کے زیرِ اثر ہیں اور ہم دونوں میں باہمی معاہدہ ہوچکا ہے کہ کسی اور کے اثر میں نہ جائینگے۔[3]

---

[1] فتوح اعثم الکوفی۔ [2] دیکھو العقد الفرید جلد اوّل۔ [3] روض الانف بحوالہ قاسم بن ثابت۔

اسلام کا جب غلغلہ بلند ہوا اور پیہم فتوحات کے باعث اُس کے قدم حجاز میں مضبوطی کے ساتھ جم گئے اور مدینہ میں ایک نہایت با اقتدار اسلام کی پہلی ریاست قائم ہو گئی تو اب ایران اور روم دونوں کی مملکتوں کو اپنی فکر ہوئی اور انھوں نے ان عرب قبائل کو جو اُن کے احسان مند اور دست نگر تھے۔ اسلام کے خلاف بھڑکانا شروع کیا اور آخر کار انہیں بغاوت پر آمادہ کر دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ موتہ کا اہتمام انہیں لوگوں کی سرکوبی کے لئے کیا تھا۔ لیکن ابھی اس مہم کا اصل مقصد حاصل نہیں ہوا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہی وفات ہو گئی۔ اور اسلام کے خلاف ریشہ دوانیوں کا جو مواد اندر ہی اندر پک رہا تھا بغاوت کے کوہِ آتش فشاں کی شکل میں اچانک پھٹ پڑا۔

مدّعیانِ نبوّت

ظاہر ہے اتنی بڑی اور وسیع تحریکِ بغاوت بغیر کسی لیڈر کے نہیں ہو سکتی تھی۔ چنانچہ یمن میں الاسود العنسی اس تحریک کا قائد تھا اور یمامہ میں بنو حنیفہ میں مسیلمہ۔ قبیلہ اسد اور غطفان میں طلیحہ اور قبیلۂ بنو تمیم میں سجاح اس تحریک کی قیادت کر رہے تھے، دراصل یہ تحریک ایک خالص سیاسی قسم کی تھی اور مذہب سے اسکا کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ لیکن چونکہ یہ لوگ جانتے تھے کہ اس تحریک کو مذہبی رنگ دئے بغیر کامیاب نہیں بنایا جا سکتا اور پھر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال ان کے سامنے تھی اس بنا پر ان لوگوں نے مذہب کا نام دیکر یہ تحریک شروع کی اور خود اپنے لئے نبوّت کا دعویٰ کیا۔

اب ہم ان مدعیانِ نبوّت کا حال الگ الگ لکھتے ہیں۔

الاسود العنسی مؤرخین لکھتے ہیں کہ اسلام میں سب سے پہلا شخص جو مرتد ہوا۔ وہ الاسود العنسی ہے[1] اس کا نام عبہلۃ بن کعب تھا۔ قبیلہ مذحج کی شاخ عَنَس سے تعلق

[1] کامل ابن اثیر جلد دوم ص ۲۵۵ مطبوعۂ لیدن۔

رکھتا تھا۔ کہانت اور شعبدہ بازی میں اس کو بڑی دسترس تھی اُسکا ایک گدھا تھا جسکو اُسنے سکھا پڑھا رکھا تھا۔ گدھے سے کہتا کہ کیا تو اپنے رب کے سامنے سجدہ نہیں کریگا اور اُس کے بعد وہ گدھے سے گھٹنوں کے بل بیٹھنے کو کہتا اور گدھا فوراً اُس کی تعمیل کرتا تھا اسکی وجہ سے اسکا لقب ذوالحمار پڑ گیا تھا۔ یہ بلاذری کا بیان ہے[1] لیکن زیادہ صحیح یہ ہے کہ یہ لفظ ذوالحمار نہیں بلکہ ذوالخمار ہے۔ خمار دوپٹہ یا اوڑھنی کو کہتے ہیں۔ چونکہ یہ ہر وقت عمامہ باندھے رہتا اور چادر اوڑھے رہتا تھا اس لئے اس کو ذوالخمار کہتے تھے۔[2]

العنسی کے ارتداد کے وقت یمن کی حالت

یمن سیاسی اعتبار سے شاہِ ایران کے ماتحت تھا اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اور سلاطین و امراء کیساتھ شاہِ ایران کو بھی دعوتِ اسلام کا خط لکھا ہے تو اُس وقت باذان یا بدھان علیٰ اختلاف الرّوا حکومتِ ایران کی طرف سے یمن کا گورنر تھا۔ کسریٰ (شاہِ ایران) نامۂ نبویؐ دیکھ کر چراغ پا ہوا اور اس نے باذان کو لکھا کہ حجاز کے اس شخص (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) کا سر اُس کے پاس بھیجدے لیکن باذان کا قلب اسلامی تعلیمات سے متاثر ہو چکا تھا اس لئے کسریٰ کے حکم کی تعمیل کرنیکے بجائے اُس نے کہا یہ کہ جب اسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اسلام کی دعوت پہونچی تو اُس نے فوراً اس کو لبیک کہا اور اسلام قبول کر لیا۔ اس سے پہلے اسلام کی دعوت یمن میں پھیل ہی چکی تھی اور بہت سے لوگ یہاں مسلمان ہو چکے تھے۔

اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے باذان کو اپنی طرف سے پورے یمن کا گورنر مقرر فرمایا۔ لیکن کچھ دنوں بعد جب باذان کا انتقال ہو گیا تو آپ نے یمن کی عمل داری کو مختلف عمال میں تقسیم کر دیا۔ چنانچہ عمرو بن حزم کو نجران کا۔ خالد بن سعید بن العاص کو نجران و زبید کے درمیانی علاقہ کا۔ عامر بن شہر کو ہمدان کا۔ شہر بن باذان کو صنعاء کا۔ عک اور اشعریین کا طاہر بن ابی ہالہ کو۔ مارب کا ابو موسیٰ اور جند پر یعلی بن امیہ کو عامل مقرر فرما دیا ان

---

[1] فتوح البلدان ص ۱۱۱ [2] تاریخ الکامل ابن اثیر جلد دوم صفحہ ۲۵۴

عمال کے علاوہ آپ نے چند معلمین بھی بھیجے تھے جو مختلف قبیلوں میں رہکر انکو اسلامی احکام و مسائل کی تعلیم دیتے تھے۔ معاذ بن جبلؓ اُن کے صدر تھے جن کیلئے کوئی علاقہ مخصوص نہیں تھا اور وہ قبیلہ قبیلہ تعلیم و تبلیغ کا کام انجام دیتے تھے۔ ان کے علاوہ حضر موت کے علاقوں پر زیاد بن لبید، سکاسک اور سکون پر عکاشہ بن ثور اور بنو معاویۃ بن کندہ پر عبداللہ یا مہاجر عامل مقرر کئے گئے تھے۔ لیکن مہاجر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی علالت کے باعث روانہ نہ ہو سکے تھے۔ آخر جب آپ کا وصال ہو گیا تو حضرت ابو بکرؓ نے انکو روانہ کیا۔

اسود عنسی کا دعویٰ نبوت اور خروج

حجۃ الوداع سے تشریف لانیکے بعد آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مزاج گرامی کچھ ناساز ہو گیا تھا اسود عنسی کو اس کی اطلاع ہوئی تو اس کا حوصلہ بڑھا اور اس نے خود نبوت کا دعویٰ کر دیا۔ جیسا کہ گزر چکا ہے۔ یہ شعبدہ باز تو تھا ہی۔ قبیلۂ مدحج اس کا ہم نوا ہو گیا۔ اسود نے سب سے پہلے نجران پر حملہ کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیطرف سے اس جگہ جو عامل اور مبلغ مقرر تھے۔ یعنی عمرو بن حزم اور خالد بن سعید انکو یہاں سے نکال دیا اب وہ صنعاء کیطرف بڑھا۔ ادھر سے باذان کا بیٹا شہر مقابلہ کے لئے نکلا لیکن شہر بن باذان نے جام شہادت نوش کیا (یہ واقعہ اسود عنسی کے خروج کے پچیس دن کے بعد پیش آیا) شہر صنعاء کی حیثیت چونکہ مرکزی تھی اس لئے اسکے سقوط کیساتھ ہی مسلمان عمال میں اضطراب پیدا ہو گیا اور وہ فضا کو ناسازگار پاکر منتشر ہو گئے۔ بقول مورخ ابن اثیر کے اسود عنسی کی شہرت آگ کی طرح پھیل گئی اور چند روز میں ہی یہ یمن کی سب سے بڑی طاقت بن گیا۔ شہر بن باذان کی شہادت کے بعد اس نے اُس کی بیوہ سے نکاح بھی کر لیا تھا جس کا نام آزاد تھا، قدرت نے اسی بیوی کے ہاتھوں اسکی ہلاکت مقدر کی تھی۔

اسود عنسی کا خاتمہ

اس کا واقعہ یہ ہوا کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان حالات کا علم ہوا تو آپ نے یہاں جو لوگ اپنے اسلام پر ثابت قدم تھے انکو پیغام بھیجا کہ وہ صاف طور پر کھلم کھلا یا چالاکی کیساتھ جس طرح بھی ممکن ہو اسود عنسی کا مقابلہ کریں [1] ادھر ایران

[1] یہاں تک کی تفصیلات کامل ابن اثیر ج ۲ ص ۲۵۵-۲۵۶ سے ماخوذ ہیں۔

کے شاہی خاندان کے افراد اور اعیان و امرا جو یمن میں آباد تھے اسود عنسی نے ان کے ساتھ انتہائی تحقیر و تذلیل کا معاملہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس لئے یہ لوگ یوں بھی اس شخص سے نالاں اور پریشان تھے۔ اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم پہنچا جسکو دبر بن یحنس الازدی لیکر گئے تھے اور ادھر آپنے قیس بن ھبیرۃ بن مکشوح کو بھی تھوڑی سی جمعیت کیساتھ اسود سے جنگ کرنیکے لئے روانہ کر دیا تھا تو ان لوگوں نے ایرانی امرار فیروز اور داذوید اور شہر بن باذان کی بیوہ آزاد جو اب اسود کی بیوی تھی ان سب کے ساتھ مل کر اسود کو دھوکہ سے قتل کر دینے کا ایک منصوبہ تیار کر لیا۔ چنانچہ آزاد کی رہنمائی میں ایک شب یہ سب لوگ اسود عنسی کے مکان میں ایک پوشیدہ راستہ سے داخل ہو کر چھپ کر بیٹھ گئے اور آخر صبح کے وقت جبکہ اسود نشہ کی حالت میں پڑا سو رہا تھا فیروز نے آگے بڑھ کر اس زور کا وار کیا کہ وہ شدید زخمی ہو گیا اور مذبوح بیل کی طرح دہاڑیں مارنے لگا۔ اسود کے مکان کے پہرہ دار جو ادھر اُدھر تھے یہ چیخ سنکر دوڑ پڑے اور پوچھا کہ یہ کیا ہوا تو آزاد نے مذاق میں کہا کہ "تمہارے پیغمبر پر وحی نازل ہوئی ہے۔ اتنے میں داذوید اور قیس اور چند اور مسلمان جو چھپے بیٹھے تھے آ گئے اور قیس نے اسود کی گردن اُس کے تن سے جدا کر دی۔ اسکے بعد شہر کی چہار دیواری پر کھڑے ہو کر اعلان کیا کہ محمد رسول اللہؐ خدا کے سچے پیغمبر ہیں اور اسود عنسی جھوٹا اور کاذب تھا۔ اسود کے قتل ہوتے ہی اُس کے ساتھیوں کے پاؤں اُکھڑ گئے جو بھاگ سکتے تھے بھاگ گئے۔ جنھوں نے کچھ مقاومت کی ان کا کام تمام کر دیا گیا۔[1]

یہ واقعہ اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے پانچ روز پہلے پیش آیا تھا اور آپؐ نے اپنی زبانِ وحی ترجمان سے اس کا اظہار بھی فرمادیا تھا۔ لیکن اس کی اطلاع مدینہ میں آپ کی وفات کے دس دن بعد پہونچی[2] چونکہ خلافتِ صدیقی کے عہد کی یہ پہلی خوشخبری

---

[1] ابن اثیر و فتوح البلدان بلاذری ص ۱۱۲ - ۱۱۳ - [2] بلاذری ص ۱۱۳

تھی اسلئے حضرت ابوبکر صدیق کو قدرتی طور پر اس کی بڑی مسرت ہوئی۔[۱]

اسود عنسی کے قتل کے بارہ میں مورخین میں بڑا اختلاف ہے کہ وفاتِ نبوی سے پہلے ہوا ہے یا بعد میں لیکن سطورِ بالا میں ہم نے جو کچھ لکھا ہے اُس سے دونوں کے بیانات میں تطبیق پیدا ہو جاتی ہے۔

طلیحۃ الاسدی طلیحہ کے باپ کا نام خویلہ تھا اور قبیلۂ بنی اسد کیساتھ تعلق رکھنے کی وجہ سے اسدی کہلاتا تھا اس نے بھی نبوت کا دعویٰ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں کیا تھا۔ آپکو اطلاع ہوئی تو آپ نے ضرار بن الازور کو بنو اسد کا عامل بنا کر بھیجا اور حکم دیا کہ طلیحہ اور اس کے ساتھیوں کیساتھ جو لوگ مرتد ہو گئے ہیں اُن کی سرزنش کیجائے ضرار مسلمانوں کیساتھ مقامِ واردات میں مقیم تھے اور یہاں مسلمانوں کی تعداد روز بروز بڑھ رہی تھی۔ ان کے برخلاف طلیحہ اپنے آدمیوں کیساتھ سمیرا میں فروکش تھا لیکن اسکے ساتھیوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ آخر ضرار کے کسی ساتھی نے طلیحہ کو پکڑ کر اس پر تلوار ماری۔ لیکن اتفاق سے یہ بچکر بھاگ نکلا۔ اب اسکو پروپیگنڈہ کا اچھا موقع مل گیا کہ تلوار اس پر اثر ہی نہیں کرتی ہے۔ ضعیف الاعتقاد لوگوں کا ایک وسیع حلقہ اسکے گرد جمع ہو گیا۔ اتنے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی، طلیحہ دعویٰ کرتا تھا کہ اس کے پاس جبریل آتے ہیں اور مسجع عبارتیں گھڑ گھڑ کر بہ طور وحی سُناتا تھا۔ اور کہتا تھا کہ نماز میں رکوع و سجود کی ضرورت نہیں ہے اللہ تعالیٰ یہ پسند نہیں کرتا کہ تمہاری کمر جھکے اور تمہاری پیشانیاں گرد آلود ہوں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کو بھی پروپیگنڈہ کا ذریعہ بنایا گیا۔[۲] چنانچہ عیینۃ بن حصن الفزاری جو طلیحہ کا دستِ راست تھا جہاں عصبیت کے نام پر لوگوں کو ابھارتا تھا۔ یہ بھی کہتا تھا کہ دیکھو محمد کا انتقال ہو گیا لیکن ہمارا پیغمبر زندہ ہے۔[۳] بہرحال اسد۔ غطفان اور طے کے قبائل میں اسکو بڑا انفوذ واثر حاصل ہو گیا۔ طلیحہ نے ان سب لوگوں کو دو حصوں میں تقسیم

[۱] ابن اثیر جلد دوم ص ۲۵۸ [۲] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۶۱ [۳] طبری ج ۲ ص ۴۸۷

کر کے ایک کو مقام ابرق میں ٹھہرا دیا اور دوسرے فریق کو مقام ذوالقصہ کی طرف بھیجا جو مدینہ طیبہ سے نجد کے راستہ پر قریب ہی واقع ہے۔

سجاح بنت الحارث | اس وقت نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرنے کی ہوا کچھ ایسی چل رہی تھی کہ مرد تو مرد عورتیں بھی اس میدان میں قسمت آزمائی کیلئے اتر پڑیں۔ چنانچہ سجاح نے جو بنو تغلب سے تعلق رکھتی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد نبوت کا دعویٰ کیا۔ بنو تغلب اور بنو تمیم میں کچھ لوگ اس کے پیرو ہو گئے۔ انکے علاوہ قبیلہ ہذیل جو عیسائی تھا وہ بھی اس کا حامی ہو گیا اور مسیحیت کو ترک کر دیا۔ مالک بن نویرہ جو مرتد ہو گیا تھا اسکا دستِ راست تھا۔ لیکن سجاح اور مسیلمہ جس کا ذکر ابھی آتا ہے۔ دونوں میں ازدواجی تعلق ہو گیا[1] اور اس طرح اسکی نبوت مسیلمہ کی نبوت میں مدغم ہو گئی۔

مسیلمۃ الکذاب | مسیلمہ کے باپ کا نام حبیب تھا اور کنیت ابوثمامہ یا ابوثمالہ تھی[2] بنو حنیفہ سے تعلق رکھتا تھا۔ بنو حنیفہ کا جو وفد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ۹ھ میں آیا تھا اُس کا ایک رکن یہ بھی تھا اور اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا تھا کہ اگر اپنے بعد مجھ کو اپنا قائم مقام بنانے کا آپ وعدہ کریں تو میں آپ سے بعیت کر لوں گا۔ لیکن آپؐ نے کھجور کی ایک شاخ جو آپکے پاس تھی اس کی طرف اشارہ کر کے صاف جواب دے دیا کہ اگر تو مجھ سے کھجور کی یہ شاخ بھی مانگے گا تو میں نہیں دوں گا[3] اسی قبیلہ کے ایک اور شخص ہوذۃ بن علی نے بھی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح کی بات لکھی تھی لیکن آپ نے اسکو بھی یہی جواب دیا اور ساتھ ہی دعا فرمائی کہ اے اللہ! تو مجھ کو اسکے شر سے بچا چنانچہ

---

[1] اس تعلق کی ابتدا کیوں کر ہوئی اور یہ کس نوعیت کا تعلق تھا۔ ابن جریر نے اس کی تفصیل جو کہ نہایت فحش ہے جلد دوم ص ۴۹۷ پر لکھی ہے۔ [2] فتوح البلدان ص ۹۷ بلاذری نے حلیہ یہ لکھا ہے کہ پست قامت زرد رو اور چپٹی ناک والا تھا۔ بلاذری کے بیان کے مطابق حبیب مسیلمہ کے باپ کا نہیں دادا کا نام تھا اور باپ کا نام کبیر تھا لیکن طبری وغیرہ مسیلمہ بن حبیب لکھتے ہیں۔ [3] صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۲۸

چند روز کے بعد ہی یہ مرگیا۔ (بلاذری ص ۹۴)

مسیلمہ وفد بنوحنیفہ کے ساتھ اپنے قبیلہ میں واپس پہنچا تو نبوت کا دعویٰ کر دیا اور اس کے ساتھیوں نے یہ خبر اڑا دی کہ محمد رسول اللہ نے مسیلمہ کو اپنا شریک کار تسلیم کر لیا ہے، بنو حنیفہ اور جو لوگ ان کے حلیف تھے وہ سب مسیلمہ کے ساتھی ہو گئے۔ اب مسیلمہ کو جرارت یہاں تک ہو گئی کہ اُس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک خط لکھا جس کا سرنامہ یہ عبارت تھی:۔

"من مسیلمة رسول الله الی محمد رسول الله" اور اس کے بعد لکھا تھا۔

آدھی زمین میری ہے اور آدھی زمین قریش کیلئے ہے لیکن قریش انصاف نہیں کریں گے"۔

یہ خط عمرو بن الجارود الحنفی نے مسیلمہ کیطرف سے لکھا تھا۔ اس کا جواب نبی صادق مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم نے ابی بن کعب سے جو لکھوایا اس کے شروع میں یہ الفاظ تھے " محمد النبی الی مسیلمة الکذاب" اور پھر لکھا تھا کہ زمین اللہ کی ہے وہ جسکو چاہتا ہے اُس کا وارث بناتا ہے"۔

مسیلمہ کے ساتھیوں میں کثرت سے ایسے لوگ تھے جو مسیلمہ کو جھوٹا سمجھتے تھے اور اسکی بداخلاقی وبدعملی کے باعث اسکو ناپسند کرتے تھے۔ لیکن صرف قبائلی عصبیت کے باعث اس کے ساتھ لگے ہوئے تھے۔ چنانچہ خود مسیلمہ کا موذن جس کا نام حجیر تھا وہ جب اذان دیتا تھا تو برملا کہتا تھا" اشهد ان مسیلمة یزعم انه رسول الله" یعنی میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ مسیلمہ یہ سمجھتا ہے کہ وہ اللہ کا رسول ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ مسیلمہ بھی یہ سُن کر کہتا تھا" افصح حجیر[1]" اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ مسیلمہ خود بھی اپنے متعلق کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں تھا لیکن صرف اپنا کام نکالنے کے لئے چہرہ پر نبوت کا نقاب ڈال لیا تھا۔

یوں تو مدعیان نبوت کے سلسلہ میں اور بھی دو تین نام ملتے ہیں لیکن اُنکو فروغ نہیں ہوا۔ اور وہ جلد ہی گمنامی کی موت مر گئے۔ ارتداد و بغاوت کا عرب میں یک بیک جو طوفان اُمڈا تھا اُس کی رہبری اور قیادت بھی مذکورہ بالا چار شخص تین مرد اور ایک عورت کر رہے تھے۔ ان کے

[1] فتوح البلدان بلاذری ص ۹۷

علاوہ عیینہ بن حصن الفزاری اور مالک بن نویرہ وغیرہ ہر قسم کے لوگ انہیں میں سے کسی نہ کسی کے اعوان وانصار تھے۔ ان چار میں سے ایک شخص یعنی اسود عنسی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہی حیات میں یا آپ کی وفات کے فوراً بعد (علیٰ اختلاف الروایات) مارا گیا تھا اور اُس کے ساتھیوں میں سے جو چند آدمی زندہ وسلامت بچ رہے تھے انہوں نے مسلمانوں کی اطاعت قبول کرلی تھی[1] اب فتنہ کے سرغَل وسرغنہ طلیحہ۔ سجاح اور مسیلمہ باقی رہ گئے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق نے اُن کا خاتمہ کس طرح کیا اور اس طوفان پر کیونکر قابو پایا۔ آئندہ باب میں اُس کی تفصیل پڑھو۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے جنگی اقدامات

پہلے گذر چکا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے جب حضرت اسامہؓ کی سرکردگی میں لشکر حدود شام کیطرف روانہ کرنیکا ارادہ کیا ہے تو انصار اور کبار مہاجرین کی رائے عرب کی عام بغاوت وفتنہ انگیزی کے باعث اس کیخلاف تھی۔ ان حضرات کو اندیشہ تھا کہ مدینہ کو اسلامی فوج سے خالی دیکھ کر باغی مدینہ پر حملہ کردیں گے اور پھر اُن سے عہدہ برا ہونا مشکل ہو جائیگا لیکن خلیفۂ رسول نے اس مشورہ کو محض اس لئے قبول نہیں کیا تھا کہ آپ کے نزدیک سب سے مقدم اور ضروری آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ادھورے چھوڑے ہوئے کام کو پورا کر دینا تھا چنانچہ آپنے ایسا ہی کیا۔

مانعین زکوٰۃ اعراب کا وفد

قبائل عبس وذبیان۔ بنو کنانہ۔ غطفان اور فزارہ جو حوالی مدینہ میں آباد تھے یہ لوگ وہ تھے جو اس کا اقرار کرتے تھے کہ ہم نماز پڑھیں گے لیکن زکوٰۃ

---

[1] فیروز دیلمی جنھوں نے اسود عنسی کو قتل کیا تھا اور جسپر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے متعلق یہ الفاظ فرمائے تھے "قتلہٗ رجل مبارک من اہل بیت مبارکین (ایران وعرب کی طرف اشارہ ہے) اُن کا بیان ہے کہ اسود کے قتل کے بعد صنعاء میں ہمارا وہی اقتدار قائم ہو گیا جو پہلے تھا اور معاذ بن جبل ہم کو نماز پڑھاتے تھے

(البدایۃ والنہایۃ ج ۶ ص ۳۱۰)

نہیں دیں گے۔ ان میں بھی دو قسم کے لوگ تھے بعض تو وہ تھے جو بربنائے بخل سرے سے ادائے زکوٰۃ کے ہی منکر تھے اور بعض کہتے تھے کہ ہم زکوٰۃ نکالیں گے لیکن اسکو مدینہ نہیں بھیجیں گے، ان لوگوں کا استدلال یہ تھا کہ قرآن مجید میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا گیا ہے۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ

اے پیغمبر آپ لوگوں سے صدقہ لیجئے جو ان کو پاک صاف کردے اور ان کیلئے سلام و رحمت طلب کیجئے۔ آپکی صلوٰۃ ان کیلئے تسکین کا باعث ہے

یہ کہتے تھے کہ اب حضورؐ کی وفات کے بعد کوئی ایسا نہیں ہے جسکی صلوٰۃ ہمارے لئے سکن ہو اس لئے اب ہم کسی کو زکوٰۃ نہیں دیں گے۔ اس کے علاوہ ان کا ایک استدلال یہ بھی تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زکوٰۃ کے بارہ میں ارشاد ہے۔

تُؤْخَذُ مِنْ اَغْنِيَائِهِمْ وَتُرَدُّ اِلٰى فُقَرَائِهِمْ

زکوٰۃ ہر جگہ کے مالداروں سے لی جائے اور انہیں لوگوں کے فقیروں پر تقسیم کردی جائے۔

اس بنا پر یہ لوگ کہتے تھے کہ ہم زکوٰۃ نکالیں گے تو اس کو مدینہ نہیں بھیجیں گے۔ بلکہ خود اپنے قبیلہ کے فقراء پر ہی تقسیم کردیں گے۔ اب ان لوگوں نے سلسلہ جنبانی اس طرح کی کہ پہلے اپنے وفد گفتگو کیلئے مدینہ بھیجنے شروع کئے۔

ان وفود نے پہلے مدینہ کے دوسرے ذمہ دار حضرات سے گفتگو کی اور ان سے درخواست کی کہ وہ اس معاملہ میں حضرت ابوبکرؓ سے ان کی سفارش کردیں۔

صحابۂ کرام اور حضرت ابوبکرؓ میں گفتگو

اس وقت عرب کی جو عام حالت تھی کچھ اس کا احساس اور پھر ان وفود کا استدلال بھی کچھ دل لگتا سا تھا۔ صحابۂ کرام ان لوگوں کی گفتگو سے متاثر ہو گئے اور انھوں نے صدیق اکبرؓ سے کہا کہ ان اعراب کو جو زکوٰۃ ادا کرنا نہیں چاہتے اسی حالت میں چھوڑ دیا جائے اور ان سے مزید کوئی تعرض نہ کیا جائے۔ صحابۂ کرام کا خیال تھا کہ ان اعراب کا ایمان ابھی نیا نیا ہے مکمل طور پر جب دلنشیں اور راسخ ہو جائیگا تو پھر یہ لوگ خود زکوٰۃ دینگے۔[1]

---

[1] البدایہ والنہایۃ ج ۶ ص ۳۱۱ - علامہ ابن حزم نے اسی بنا پر ان لوگوں کی نسبت لکھا ہے (باقی حاشیہ ص۲۰۳ پر)

لیکن حضرت ابوبکرنے یہ مشورہ قبول کرنیسے صاف انکار کردیا اور فرمایاکہ "خدا کی قسم اگر یہ لوگ اونٹ کی ایک رسی[1] سے بھی جس کو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ادا کرتے تھے انکار کریں گے تو میں اس پر اُن سے جنگ کروں گا۔ اس کے بعد فرمایا "زکوۃ مال کا حق (یعنی عبادت) ہے۔ جو لوگ نماز اور زکوۃ میں تفریق کریں گے میں اُن سے قتال کروں گا۔

حضرت عمر جو اپنی رائے کے اظہار میں زیادہ جری اور بیباک تھے انہوں نے کہا "آپ ان لوگوں سے قتال کس بنیاد پر کریں گے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تو فرمایا ہے "مجھ کو حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے اُس وقت تک قتال کروں جب تک کہ وہ لا الہ الا اللہ وان محمداً رسول اللہ نہ کہیں۔ لیکن جب وہ یہ کلمہ پڑھ لیں گے تو ان کی جانیں اور ان کے مال محفوظ ہو جائیں گے مگر ہاں جب ان پر کسی کا کوئی حق ہو لیکن حضرت ابوبکر کا استدلال یہ تھا کہ نماز اور زکوٰۃ میں باعتبار فرضیت کوئی فرق نہیں ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں اکثر مقامات پر نماز اور زکوۃ دونوں کا ذکر ایک ساتھ ہی ہے اس کے علاوہ قرآن میں ہے۔

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَآتَوُا الزَّکَاۃَ فَخَلُّوْا سَبِیْلَھُمْ	پس اگر یہ لوگ توبہ کرلیں اور نماز پڑھیں اور زکوۃ ادا کریں تو تم ان سے کچھ نہ کہو۔

پھر یہ معلوم ہے کہ بنو ثقیف کا ایک وفد جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں طائف سے حاضر ہوا تھا اور اس نے کہا تھا کہ ہم اسلام قبول کرنیکے لئے تیار ہیں لیکن نماز سے ہمکو مستثنیٰ کر دیجئے تو آپ نے بڑی سختی کیساتھ ان کی یہ درخواست رد کردی تھی اور فرمایا تھا "بھلا وہ دین ہی کیا ہے جس میں نماز نہ ہو" انه لا خیر فی دین لا صلوٰۃ فیه" پس جس طرح دین نماز کے

(بقیہ حاشیہ ص ۱۷۲) "وطائفة بقیت علی الاسلام ایضاً الا انهم قالوا "نقیم الصلوٰۃ ونشرائع الاسلام الا انا لا نؤدی الزکوٰۃ الی ابی بکر رضی اللہ عنه ولا نعطی طاعتنا لاحد بعد رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم (الملل والنحل ج ۲ ص ۲۲)

[1] بعض روایتوں میں عقال کا لفظ ہے جس کے معنی رسی کے ہیں اور بعض میں عناق کا لفظ ہے اسکے معنی ایک برس کے بچہ

بغیر کچھ نہیں ہے۔ زکوٰۃ کے بغیر بھی وہ دین باقی نہیں رہتا ہے۔

حضرت ابوبکر کا فیصلہ چونکہ بالکل حق تھا اور حقیقت یہ ہے کہ اسی ایک فیصلہ نے دین کی اصل عظمت اور اُس کی اصلیت کو قائم رکھ لیا۔ اس بنا پر حضرت عمر بھی قائل ہو گئے۔ خود فرماتے ہیں۔

فما ھو الا ان رأیت اللہ قد	تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی میں نے دیکھ لیا کہ اللہ
شرح صدر ابی بکر۔	نے ابوبکر کا سینہ کھول دیا تھا۔

وفود کی ناکام واپسی اور مدینہ کی حفاظت کے انتظامات

بارگاہِ خلافت سے مایوس ہو کر یہ ارکانِ وفد اپنے اپنے قبیلوں کی طرف واپس ہوئے یہاں مدینہ میں دیکھ ہی گئے تھے کہ صحابہ کرام کی ایک بڑی تعداد حضرت اُسامہ کے ساتھ جا چکی تھی اور یہاں تھوڑے سے صحابہ رہ گئے تھے۔ ان لوگوں نے اپنے قبیلوں کو آمادہ کیا کہ موقع سے فائدہ اٹھا کر مدینہ پر حملہ کر دیا جائے ادھر یہ لوگ یہ منصوبہ باندھ رہے تھے اور اُدھر حضرت ابوبکر نے وقت کی نزاکت کو محسوس کر کے مدینہ کی حفاظت و نگرانی کا بندوبست شروع کر دیا۔ آپ نے پہلا کام یہ کیا کہ کبارِ صحابہ یعنی حضرت علی۔ عبدالرحمٰن بن عوف۔ زبیر بن عوام۔ عبداللہ بن مسعود۔ اور طلحہ بن عبداللہ رضی اللہ عنہم کی سرکردگی میں مدینہ کے مختلف راستوں پر حفاظتی دستے متعین کر دئے اور جو اہلِ مدینہ تھے ان پر مسجد میں حاضر ہونا لازمی کر دیا۔ تاکہ اگر کوئی ہنگامی صورت اچانک پیدا ہو جائے تو ان کو فوراً اطلاع ہو سکے اور سب کو خبردار کر دیا کہ "اے مسلمانو! یہ وفد تمہاری قلتِ تعداد کو دیکھ کر گیا ہے۔ اس لئے تم نہیں جانتے کہ یہ صبح کو حملہ کر دیں گے۔ یا شب میں، یہ لوگ مسافت کے اعتبار سے تو آخر تم سے قریب ہیں ہی۔ یہ لوگ ہم سے معاملہ طے کر لے اور بہت کچھ توقعات لیکر آئے تھے لیکن ہم نے ان کے مطالبہ کو ٹھکرا دیا ہے اس لئے تم تیار ہو جاؤ اور ہوشیار رہو۔[1]

مدینہ پر شبخون

حضرت ابوبکر کا جو اندیشہ تھا وہ آخر صحیح ثابت ہوا۔ وفد کو ناکام گئے ابھی

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۶ ص ۳۱۱ - ۳۱۳

تین دن ہی ہوئے تھے کہ ان قبیلوں نے جو طلیحہ اسدی کے زیرِ اثر تھے اپنے آپکو دو حصّوں میں برابر تقسیم کیا۔ ایک حصّہ مقام ذوحسیٰ میں چھوڑا جو مدینہ کے قریب نجد کے راستہ پر واقع ہے اور اس کا مقصد یہ تھا کہ یہ کمک کا کام دے۔ رہا دُوسرا حصّہ تو اس نے مدینہ پر غارتگری کے ارادہ سے چڑھائی کردی۔ مدینہ کی حفاظت پر جو دستہ متعین تھا اس نے حضرت ابوبکرؓ کو اطلاع پہونچائی۔ آپ نے حکم دیا کہ تم اپنی جگہوں پر رہو اور اِدھر سے آپ خود مسلمانوں کو اونٹوں پر لیکر روانہ ہوئے۔ باغی مقابلہ کی تاب نہ لاکر بھاگ پڑے مسلمانوں نے ان کا پیچھا کیا۔ باغی مقام ذوحسیٰ پہونچے تو جو لوگ یہاں پہلے سے موجود تھے وہ بھی اب ان کے ساتھ مل گئے مسلمان اونٹوں پر اُن کا تعاقب کرتے ہوئے آ ہی رہے تھے کہ ذوحسیٰ والوں نے کیا حرکت کی؟ چمڑہ کے تھیلے جو اُن کیساتھ تھے ان میں پھونک بھری، غبارہ کی شکل بناکر اُن میں رسّیاں باندھیں اور ان کو اونٹوں کیطرف پھینک مارا۔ مسلمانوں کے یہ اونٹ جنگ کی فریب کاریوں کے عادی نہ تھے۔ اس لئے بھاگ پڑے اور سیدھے مدینہ میں آکر ٹھہرے۔[1]

مدینہ پر حملہ کی تیاریاں قبیلۂ عبس و ذبیان۔ بنو مرہ اور بنو کنانہ وغیرہم جو انکے حلیف تھے سمجھے کہ مسلمان پسپا ہوکر بھاگ گئے ہیں اس لئے اب ان کا حوصلہ بڑھا اور انھوں نے مدینہ پر باقاعدہ حملہ کے ارادہ سے ذوالقصہ (یہ مقام بھی مدینہ سے قریب نجد کے راستہ پر ہے) والوں کو بھی پیغام بھیجا کہ ان کے ساتھ شریک ہوجائیں۔ طلیحہ کا بھائی (حافظ عمادالدین ابن کثیر نے بیٹا لکھا ہے)[1] حبال ان کی قیادت کر رہا تھا۔ اُدھر یہ لوگ مدینہ پر حملہ کا خواب دیکھ رہے تھے اور اِدھر حضرت ابوبکرؓ نے مدینہ واپس پہونچکر ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا آتے ہی جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہوگئے۔ باقاعدہ فوج کی ترتیب کی۔ فوج کے دائیں بازو پر نعمان بن مقرن کو، بائیں بازو پر عبداللہ بن مقرن کو مقرر کیا اور پچھلا حصّہ ان کے بھائی سوید کے سپرد کیا۔ ابھی ایک پہر شب باقی تھی کہ روانہ ہوگئے۔ صبح کی پَو پھٹی بھی نہیں تھی کہ

---

[1] کامل ابن اثیر ج ۲ ص ۲۶۱ و طبری ج ۳ ص ۲۴۸ کہ ۲۴۸ - والبدایۃ والنہایۃ ج ۶ ص ۳۱۳ و فتوح البلدان ص ۱۰۱

دشمن پر جا پہونچے یہ لوگ بے خبر آرام سے سو رہے تھے۔ مسلمانوں نے تلوار چلانی شروع کردی یہ لوگ بدحواس ہوکر جو بھاگے تو ذوالقصہ میں دم لیا۔ خلیفۂ رسول نے ذوالقصہ تک ان کا تعاقب کیا۔ لیکن اب ان لوگوں میں مقابلہ کی طاقت نہیں تھی اس لئے حضرت نعمان بن مقرن کو ان کے دستہ کیساتھ ذوالقصہ میں چھوڑ کر خود مدینہ واپس تشریف لے آئے۔ یہاں مسلمانوں کی اس کامیابی سے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد پہلی مرتبہ حاصل ہوئی تھی مسرّت کی لہر دوڑ گئی۔ پھر اس پر مزید یہ ہوا کہ مختلف قبائل کے جو سردار مسلمان تھے وہ اپنی اپنی زکوٰۃ لے کر مدینہ پہونچ گئے اس سے جہاں مالی اعتبار سے تقویت ہوئی اور مسلمانوں کو امداد پہنچی یہ بھی ثابت ہوگیا کہ باغیوں اور مرتدوں کی کثرت کے باوجود متعدد بیرونی قبائل کے رؤسا پکے اور سچے مسلمان تھے اس احساس نے خوشی دوچند کردی۔

جو حضرات مدینہ کا پہرہ دے رہے تھے ان میں سے ایک ایک صاحبِ زکوٰۃ رئیس کو لیکر مدینہ میں آتا تھا تو مسلمان ان کو دیکھ کر کہتے "ہذا نذیر"[1] حضرت ابوبکر فوراً فرماتے کہ نہیں بلکہ وہ بشیر ہیں۔ اور اسلام کے حامی ہیں۔ سُست نہیں ہیں۔ اصل الفاظ یہ ہیں "بل ھو بشیر۔ وھو حام ولیس بوانٍ" لوگ اس کے جواب میں حضرت ابوبکر سے کہتے۔ طالما بشرت بالخیرِ "آپ تو ہمیشہ ہی خیر کی بشارت دیتے رہے ہیں۔

عبس و ذبیان کی غداری

حضرت ابوبکر کی ذوالقصہ سے واپسی کے بعد قبیلۂ عبس و ذبیان کا اور کوئی بس نہ چلا تو یہاں تھوڑے بہت جو مسلمان تھے ان کو دھوکہ سے قتل کر ڈالا، صدیق اکبر کو اس کی اطلاع ہوئی تو قسم کھائی کہ جب تک وہ ان قبیلوں سے مسلمانوں کے خونِ ناحق کا بدلہ نہیں لے لیں گے چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ اسی اثناء میں حضرت اسامہ اپنی مہم

[1] طبری ج ۲ ص ۴۷۸ چونکہ یہ حضرات مدینہ کے پہرہ دار تھے اس لئے ان کا آنا بظاہر اس بات کی علامت تھی کہ مدینہ کو کوئی خطرہ پیش آگیا ہے اور یہ اس کی اطلاع لیکر آئے ہیں مسلمان فرطِ مسرت سے مذاق میں انکو ھذا نذیرٌ اسی مناسبت سے کہتے تھے۔ جو حضرات صدقات لیکر آئے تھے تاریخوں میں ان سب کے نام بھی محفوظ ہیں۔

سے فارغ ہوکر مدینہ واپس آگئے تھے اب حضرت ابوبکر کو اور زیادہ اطمینان ہوا۔ آپ نے حضرت اسامہ کو مدینہ میں اپنا قائم مقام مقرر کیا اور فرمایا ارمجوا و استریحو اتم لوگ اب آرام کرو۔

ذوالقصہ کو روانگی

اس انتظام سے فارغ ہوکر آپ نے بنفسِ نفیس ایک فوج لیکر ذوالقصہ کی روانگی کا ارادہ کیا تاکہ غدار قبیلوں کو اُن کی غداری کی سزا دیکر مسلمانوں کا انتقام لیں۔ صحابۂ کرام نے ہر چند منت وسماجت کی اور کہا اے خلیفۂ رسول! ہم آپکو قسم دیتے ہیں۔ آپ نہ جائیے۔ اگر خدانخواستہ آپ کو چشم زخم پہونچا تو ہم لوگوں کا کوئی نظام باقی نہیں رہے گا اور آپ کا یہاں رہنا دشمن کے لیے سخت مرعوب کن ہوگا آپ اپنے بجائے کسی دُوسرے کو بھیجد یجئے وہ اگر کام آگئے تو آپ انکی جگہ کسی دوسرے کو مقرر کرسکتے ہیں[1] لیکن حضرت ابوبکر نہ مانے

حضرت عائشہ فرماتی ہیں " جب میرے باپ سواری پر بیٹھے اور تلوار میان سے باہر نکالے ذوالقصہ کیلئے روانہ ہونے لگے تو حضرت علی بن ابی طالب اُن کی سواری کی باگ روک کر کھڑے ہوگئے اور بولے " اے رسول اللہ کے خلیفہ! آپ کہاں جارہے ہیں؟ میں آپ سے وہی کہوں گا جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ اُحد کے موقع پر آپ سے کہا تھا یعنی یہ کہ آپ اپنی تلوار میان میں کیجئے اور اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر درد مند نہ کیجیے "[2]

مانعینِ زکوٰۃ کی مکمل سرکوبی

لیکن حضرت ابوبکر نے ان سب کے جواب میں فرمایا " اللہ کی قسم میں میں ایسا نہیں کروں گا اور میں اپنے نفس کیساتھ تمہاری غم خواری قبول نہیں کرسکتا۔" چنانچہ آپ اپنا لشکر لیکر ذی حسی اور ذوالقصہ کیطرف روانہ ہوگئے۔ مقام ابرق میں اہل ربذہ پر حملہ کیا۔ حارث اور عوف یہاں کے لیڈر تھے اُن کو شکست دی۔ بنو عبس اور بنو بکر خوف زدہ ہوکر بھاگے۔ حضرت ابوبکر ابرق میں چند روز قیام فرمانیکے بعد آگے بڑھے اور بنو ذبیان کو مغلوب کیا اور اُن کے علاقوں پر قبضہ کرلیا اور آخر اس طرح عبس و ذبیان نے جن مسلمانوں کو شہید

---

[1] طبری ج ۲ ص ۴۷۹۔ [2] البدایۃ والنہایۃ ج ۶ ص ۳۱۵ لیکن اس کے بعد حافظ صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت ابوبکر نے حضرت علی کی درخواست قبول کرلی اور وہ خود واپس ہوگئے اور لشکر روانہ کردیا حالانکہ طبری وغیرہ میں ہے کہ آپ نے یہ مشورہ منظور نہیں فرمایا اور بہ نفسِ نفیس تشریف لے گئے۔

کیا تھا ان کا انتقام لیکر فتح وکامرانی کا پرچم اڑاتے ہوئے مدینہ واپس آ گئے۔[1]
بنو ذبیان۔ عبس۔ غطفان۔ بنو بکر اور انکے علاوہ دوسرے قبیلے جو مدینہ کے قرب وجوار میں آباد تھے اور جو اعراب مدینہ کہلاتے تھے حضرت ابو بکر کی اُنکے ساتھ یہ آخری کامیاب جنگ تھی، اُن کو چاہیے تھا کہ اب وہ حضرت ابو بکر کی اطاعت قبول کر لیتے اور زکوٰۃ کی فرضیت کے بھی قائل ہو کر مسلمان اور پکے مومن بن جاتے۔ لیکن ان پیہم شکستوں نے اُن کو بوکھلا دیا تھا۔ اور آخر نتیجہ یہ ہوا کہ اب تک اسلام کی جو مصنوعی نقاب انہوں نے اپنے چہرہ پر ڈال رکھی تھی اسے بھی نوچ کر پھینک دیا اور کھلم کھلا باغی اور کافر تھے انکی صفوں میں جا کر مل گئے۔ اس لئے حروبِ ارتداد کا اب ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔

[1] طبری ج ۲ ص ۴۷۹

مدعیانِ نبوّت اور مرتدین سے عام جنگ

اس وقت تک حضرت اُسامہ اور اُنکے رفقاء کچھ دنوں آرام کرنیکے بعد تازہ دم ہو چکے تھے اس لئے اب موقع تھا کہ مدعیانِ نبوّت کے برخلاف نہایت شدید اور ہمہ گیر مہم کا آغاز کیا جائے اور اس کی ضرورت اس لئے بھی تھی کہ بنو عبس و ذبیان اور بنو بکر وغیرہم ذیقعدہ میں شکستِ فاش کھانے کے باوجود راہِ راست پر آنیکے بجائے طلیحہ کے زیرِ دامن پناہ گیر ہو گئے تھے وہاں طے۔ غطفان اور سُلیم دوسرے قبیلے پہلے سے تھے ہی اس لئے اب طلیحہ کی طاقت دو چند ہو گئی تھی اور وہ اس وقت اسلام کے لئے بڑا خطرہ بنا ہوا تھا۔ یہ حال تو مدینہ کے مشرق اور شمال مشرق کا تھا۔ اس کے علاوہ جنوب میں جو آگ لگی ہوئی تھی اس کا مختصراً ذکر آ ہی چکا ہے۔

اسلامی فوج کے گیارہ دستے

ان سب امُور کے پیشِ نظر حضرت ابوبکر ذوالقصہ میں دوبارہ تشریف لائے اور یہاں پُوری اسلامی فوج کو گیارہ حصّوں میں تقسیم کیا اور ہر حصّہ کا الگ الگ ایک سردار جو صاحبِ عَلَم ہوتا تھا مقرر فرمایا اس کی تفصیل حسبِ ذیل نقشہ سے معلوم ہو گی۔

(نقشہ صفحہ آئندہ نمبر ۱۸۰ پر ملاحظہ فرمایئے)

نمبر	سردار فوج کا نام	مقام جنگ	اُن قبیلوں یا اشخاص کے نام جن سے جنگ کرنیکے لئے ان سرداران فوج کا تقرر ہوا تھا۔
۱	حضرت خالد بن الولید سیف اللہ	بزاخۃ اور بطاح	طلیحہ اور مالک بن نویرہ
۲	" عکرمۃ ابن ابی جہل	یمامہ	مسیلمۂ کذاب اور بنو حنیفہ
۳	" مہاجر ابن ابی امیہ	یمن و حضرموت	پیروانِ اسود عنسی اور قیس بن العاص
۴	" عمرو بن العاص	عرب شام کی سرحد	قضاعۃ۔ ودیعۃ اور حارث۔
۵	" خالد بن سعید بن العاص	الحمقتان (حدود شام میں)	یہاں جو قبائل آباد تھے بڑے سرکش تھے
۶	" علاء بن الحضرمی	بحرین	الحطم بن ضبیعۃ
۷	" سوید بن المقرن	یمن کا نشیبی علاقہ	
۸	" عرفجۃ بن ہرثمہ	مہرہ	
۹	" حذیفۃ بن محصن	عمان	لقیط بن مالک الازدی
۱۰	" طریفۃ بن حاجز السلمی [1]	عرب کا شمالی حصہ	بنو سلیم و ہوازن
۱۱	" شرحبیل بن حسنہ	یمامہ (حضرت عکرمہ کے ساتھ)	مسیلمہ و بنو حنیفہ [2]

وقت اور سیاست کا تقاضہ تھا کہ حضرت ابوبکر خود مدینہ میں قیام فرمائیں۔ چنانچہ آپ فوج کے کمانڈر انچیف کی حیثیت سے دار الخلافت میں مقیم رہے اور یہیں سے فوج کی نقل و حرکت کی نگرانی اور اس کیلئے احکام و ہدایات جاری کرتے رہے۔

اتمام حجت کے لئے حضرت ابوبکر نے فوج کو روانہ کرتے وقت ایک اعلانِ عام لکھوا کر ہر ہر دستۂ فوج کو الگ الگ دیا تاکہ جنگ کرنے سے پہلے باغیوں اور دشمنوں کو سنا دیا جائے۔ اسکو

[1] طبری نے (ج ۲ ص ۴۸۰) ان کا نام طریفہ لکھا ہے لیکن ابن اثیر اور دوسری تاریخوں میں معن بن حاجز ہے، دیکھو کامل ابن اثیر ج ۲ ص ۲۶۳۔ [2] طبری و ابن اثیر۔

سنکر اگر یہ لوگ راہِ راست پر آجائیں اور اسلام کی اطاعت قبول کرلیں تو اُن سے درگزر کیا جائے ورنہ پھر جنگ فیصلہ کریگی۔ چونکہ حضرت ابوبکرؓ کی یہ تحریر نہایت اہم ہے جس سے آپکی سیاسی بصیرت۔ عزم و ہمت پر روشنی پڑتی ہے اور ساتھ ہی مختصراً اسلام کی اصل روح اس میں سمودی گئی ہے اس لئے ہم ذیل میں طوالت کے باوجود اس کا پورا ترجمہ نقل کرتے ہیں۔

خلیفۂ رسول کا اعلانِ عام

"ابوبکر خلیفۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیطرف سے اُن تمام عام و خاص لوگوں کے نام جن کے پاس میری یہ تحریر پہونچے اور جو اسلام پر قائم ہوں یا اُس سے رُوگرداں ہو گئے ہوں۔ سلام اُن پر جنھوں نے ہدایت کی پیروی کی اور ایک مرتبہ اسکو قبول کرنیکے بعد اس سے گمراہی اور اندھے پن کی طرف نہیں لوٹے۔ میں تم سب لوگوں کے سامنے اُس اللہ کی حمد کرتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ یکتا ہے۔ اُس کا کوئی شریک نہیں اور محمد اس کے بندہ اور رسول ہیں' ہم اُن تمام چیزوں کا اقرار کرتے ہیں جو آپ لیکر آئے اور جو شخص اس کا منکر ہے ہم اس کی تکفیر کرتے ہیں اور ہم اُس سے جہاد کریں گے۔

اما بعد: اللہ تعالیٰ نے محمد کو اپنی طرف سے حق کیساتھ اپنی مخلوق کیطرف بشیر و نذیر اور حق کا داعی اور چراغِ فروزاں بناکر بھیجا۔ تاکہ جو لوگ زندہ ہیں آپؐ ان کو ڈرائیں اور کافروں پر اللہ کی حجت تمام کردیں۔ اللہ نے جس کو توفیق دی اُس نے یہ امرِ حق بخوشی قبول کرلیا اور جس نے اُس سے پشت پھیری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے حکم سے اس پر ایسی ضرب لگائی کہ وہ بھی طوعاً یا کرہاً اسلام کے حلقہ میں داخل ہوگیا۔ اس کے بعد اللہ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اس دُنیا سے اٹھا لیا۔ آپؐ اللہ کے امر کو نافذ کر چکے تھے اور آپ پر جو کچھ فرض تھا اسکو پورا کر چکے تھے۔ اللہ اس بات[۱] (وفاتِ نبویؐ) کو اپنی کتاب کے ذریعہ محمد رسول اللہ

[۱] حضرت ابوبکرؓ نے اس موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا ذکر زیادہ قوت کیساتھ اس لئے کیا کہ (باقی ص۱۸۲ پر)

اور تمام اہلِ اسلام کو صاف طور بیان کر چکا تھا۔ چنانچہ اُس نے کہا

اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ — بے شبہ آپ بھی مرنیوالے ہیں اور دوسرے بھی مرنیوالے ہیں۔

اور اس نے کہا۔

وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ اَفَاِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ۔ — اور آپ سے پہلے ہم نے کسی انسان کو بھی دوامی زندگی نہیں بخشی تو کیا جب آپ مر جائیں گے تو یہ لوگ ہمیشہ رہیں گے۔

ان آیتوں میں تو خطاب خاص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تھا۔ ان کے علاوہ عام مومنوں کو خطاب کر کے فرمایا گیا۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْــًٔا وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ۔ — اور محمد نہیں ہیں مگر ایک رسول، ان سے پہلے بھی رسول گذر چکے ہیں تو اگر یہ مر جائیں یا قتل کر دئے جائیں تو کیا تم روگردانی اختیار کر لوگے اور جو روگردانی اختیار کرلے گا تو وہ اللہ کو ہرگز کوئی نقصان نہیں پہونچا سکتا ہے۔ اور اللہ شکر کرنیوالوں کو جزا دے گا۔

پس جو شخص محمد کی پوجا کرتا تھا تو اسے معلوم ہونا چاہئے کہ محمد مر گئے۔ لیکن ہاں جو شخص صرف اللہ کو پوجتا ہے جس کا کوئی شریک نہیں ہے تو اللہ اُس کی نگرانی کرنیوالا ہے۔ وہ ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے وہ قیوم ہے اور اسکو کبھی موت نہیں آئیگی۔ اُس کو نہ غنودگی آتی ہے اور نہ نیند۔ وہ اپنے امر کی حفاظت کرنیوالا ہے۔ اپنے دشمن سے بدلہ

(بقیہ ص ۱۸۱) عیینہ بن حصن وغیرہ جیسے مفسد قبائل میں یہی کہہ کہہ کے پروپیگنڈہ کر رہے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وفات ہو گئی اور طلیحہ اب تک زندہ ہے اور زندہ رہے گا اس سے معلوم ہوا کہ اصل پیغمبر طلیحہ ہی ہے غور کرو حضرت ابوبکر کے یہ ارشادات منصب نبوت اور مقام رسالت سے متعلق اسلام کے اصل نقطۂ نظر کی کتنی اعلیٰ قسم کی توضیح ہے جس کے باعث اسلام دوسرے مذاہب سے بالکل ممیز ہو جاتا ہے۔

لینے والا ہے اور وہ اُس کو اس دشمنی کی سزا دیگا۔ اور میں تم لوگوں کو وصیت کرتا ہوں کہ اللہ سے ڈرو اُس سے اور جو چیز تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم لائے ہیں اُس سے اپنا حصہ لو۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ کا اتباع کرو۔ اللہ کے دین کی رسی کو مضبوطی سے پکڑو کیونکہ جس شخص کو اللہ ہدایت نہیں دیتا وہ گمراہ ہے اور جس کو اللہ معاف نہیں کرتا وہ مصائب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ جس شخص کی مدد اللہ نہیں کرتا وہ رسوا ہوتا ہے جس کو اللہ نے ہدایت دی وہ راہِ راست پر آیا۔ اور جسکو اللہ نے گمراہ کر دیا وہ گم کردہ راہ ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَالْمُهْتَدِ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا۔ اور پھر اُس کا دنیا میں کوئی عمل قبول نہیں کیا جاتا۔ جو اسکو اللہ سے قریب کر دے اور آخرت میں نہ کوئی فدیہ قبول کیا جاتا ہے اور نہ اُس کے برابر کی کوئی چیز۔

تم میں سے جو لوگ اسلام کا اقرار کرنے اور اس پر عمل کرنے کے بعد اپنے دین سے پھر گئے ہیں مجھ کو ان کی اطلاع پہونچی ہے۔ ان لوگوں نے ایسا اس لئے کیا ہے کہ وہ اللہ کے متعلق غلط فہمی میں ہیں۔ اس کے امر سے جاہل ہیں اور انھوں نے شیطان کی آواز پر لبیک کہا ہے۔

ایسیں انصار و مہاجرین اور تابعین باحسان کے لشکر کا فلاں فلاں کو سردار بنا کر تمہارے پاس بھیجتا ہوں۔ میں نے ان کو حکم کیا ہے کہ وہ اس وقت تک کسی سے نہ قتال کریں اور نہ قتل کریں جب تک کہ اللہ کیطرف اسکو دعوت نہ دیدیں۔ اس دعوت کو جو شخص لبیک کہے گا۔ اقرار کریگا۔ اپنی شرارت اور فتنہ انگیزی سے باز آجائیگا اور نیک عمل کریگا یہ میرا نمائندہ اُس کو قبول کریگا اور اُس کی مدد کریگا لیکن اُس کے برخلاف جو شخص انکار کریگا تو میں نے حکم دیا ہے کہ اُس سے قتال کیا جائے۔ پھر جب یہ دشمن ہاتھ لگ جائیں تو اُن کو آگ میں جلائے۔ ان کو قتل کر کر کے ختم کر دے اور انکی

عورتوں اور اولاد کو گرفتار کرلے۔ اور اب سوائے اسلام کے اُن سے کوئی چیز قبول نہیں کی جائیگی۔ پس جو لوگ ان میرے نمائندوں کا اتباع کریں گے تو وہ اُن کے لیئے بہتر ہوگا اور جو ان کی پرواہ نہیں کریگا وہ اللہ کو ذرا عاجز نہیں کرسکتا۔
میں نے اپنے نامہ بردوں کو حکم دیا ہے کہ میری یہ تحریر تم لوگوں کے ہر مجمع میں پڑھ کر سنائی جائے"۔ [1]

عہدنامہ لشکر روانہ ہوئے تو اُن کے آگے آگے یہ نامہ بر چل رہے تھے جو اس تحریر کو لئے ہوئے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق کا یہ اعلان تو مرتدین کے نام تھا جن سے قتال کرنیکے لئے یہ لشکر روانہ ہو رہے تھے اس کے علاوہ خاص امراء فوج کے نام آپنے ایک عہدنامہ الگ تحریر فرمایا تھا جس میں اُن کے فرائض و واجبات بتائے گئے تھے اور جنگ کے سلسلہ میں انکو خاص خاص ہدایات اور احکام دئے گئے تھے۔ اس میں بھی یہ بات بالکل صاف صاف کہدی گئی تھی کہ ان مرتدین سے اسلام کے سوا کوئی اور دوسری چیز مقبول نہیں ہوگی اور خود مسلمانوں کے ساتھ نرمی و ملاطفت کا برتاؤ کرنیکی تاکید کی تھی۔ [2]

جنگِ بُزاخہ

عبس اور ذبیان کی شکست کے وقت طلیحہ سمیرا۔ ایک مقام میں مقیم تھا اب وہ بزاخہ میں آگیا تھا اور اِدھر اُدھر کے قبیلوں کو اپنے ساتھ ملا کر ایک بڑی جنگ کی تیاری کر رہا تھا۔ حضرت خالد بن الولید اسی کے مقابلہ پر مامور کیئے گئے تھے۔

حضرت خالد کو ہدایات جب حضرت خالد اپنی مہم پر روانہ ہونے لگے تو حضرت ابوبکر صدیق نے انکو چند ہدایات دیں جن سے خلیفہ رسول کی فوجی بصیرت پر روشنی پڑتی ہے۔ آپنے فرمایا۔

[1] طبری ج ۲ ص ۲۸۱-۲۸۲۔ [2] طبری ج ۲۔ ص ۲۸۲

"تم پیش قدمی اس طرح کرنا کہ قبیلۂ بنوطے سے آغاز کرو۔[1] پھر بزاخہ کا رُخ کرنا۔ اور جب یہاں سے فارغ ہو جاؤ تو پھر بطاح کی طرف پیش قدمی کرنا۔ اور ساتھ ہی حکم دیا کہ جب تم ایک مہم سے فارغ ہو جاؤ تو بس اسی جگہ اس وقت تک رہنا جب تک کہ میرا حکم نہ پہنچ جائے۔ ساتھ ہی حضرت ابوبکرؓ نے بطور ایک تدبیر کے دشمن کو مرعوب کرنے کی غرض سے خود اپنے متعلق یہ مشہور کر دیا کہ میں ایک فوج لیکر خیبر جا رہا ہوں اور وہاں خالدؓ کی فوج کے ساتھ ملکر اس کی مدد کروں گا۔

بنوطے مسلمان ہوتے ہیں

قبیلہ بنوطے کا مقام اجا تھا۔ خلیفۂ رسولؐ کی ہدایت کے مطابق حضرت خالدؓ نے پہلے اس کا رُخ کیا۔ حضرت عدیؓ بن حاتم جو اس قبیلہ کے معزز شخص تھے اور اپنے اسلام پر قائم تھے وہ حضرت ابوبکرؓ کے حکم سے بنوطے کے پاس آئے اور کہا کہ دیکھو خالدؓ ایک لشکر جرار لیکر تم لوگوں کیطرف روانہ ہو چکے ہیں۔ اور ادھر خود ابوبکرؓ بھی ایک لشکر کیساتھ خیبر جا رہے ہیں۔ اس لئے تم لوگوں کیلئے بہتر یہی ہے کہ اسلام قبول کرو اور طلیحہ کا ساتھ چھوڑ دو ورنہ اسلامی فوج تم کو تباہ و برباد کر دیگی۔ ان لوگوں نے پہلے تو حضرت عدیؓ کی بات کا مذاق اُڑایا اور حضرت ابوبکرؓ کیلئے بطور استخفاف و تمسخر ابوالفصیل کا لفظ استعمال کیا۔ لیکن جب حضرت عدیؓ نے پھر دوبارہ قوت کیساتھ کہا کہ تم کس خوابِ خرگوش میں ہو۔ جو فوج تمہاری طرف بڑھ کر آ رہی ہے اس کا قائد کسی بچھڑے کا باپ (ابوالفصیل) نہیں بلکہ فحل اکبر (ایک بڑا سانڈ) ہے اب تم جانو اور تمہارا کام۔ اب یہ لوگ نرم ہوئے اور انھوں نے کہا کہ اچھا! آپ جا کر ذرا اس لشکر کو ہم سے دُور رکھئے ہمارے وہ بھائی بند جو طلیحہ کے پاس بزاخہ چلے گئے ہیں۔ ہم ان کو حسن تدبیر سے واپس بُلالیں۔ ورنہ طلیحہ اُن سب کو قتل کر دیگا۔ عدیؓ نے یہ بات مان لی۔ حضرت خالدؓ اس وقت مقام سنح میں فروکش تھے۔ عدیؓ یہاں آئے اور کہا "آپ ذرا تین دن کا توقف کیجئے

---

[1] صدیق اکبرؓ کو معلوم تھا کہ اگرچہ اس وقت بنوطے بھی طلیحہ کیساتھ ملے ہوئے ہیں لیکن وہ ایسے زیادہ سرکش نہیں ہیں معمولی گفتگو اور کسی قدر تخویف و تہدید سے رام ہو جائیں گے، اسی بنا پر آپ نے بنوطے کے متعلق یہ مشورہ دیا۔

اس درمیان میں پانچسو بڑے بڑے جنگ جو سپاہی آپ سے آکر مل جائیں گے جن سے آپکو بڑی تقویت ہوگی۔ حضرت خالد نے یہ درخواست منظور کرلی۔ آخر حضرت عدی نے جو کہا تھا وہی ہوا بزاخہ سے قبیلۂ بنو طے کے لوگ جو وہاں چلے گئے تھے جب واپس آگئے تو حضرت عدی طے کو لیکر حضرت خالد کی خدمت میں آئے اور انھوں نے اسلام کی اطاعت قبول کی لیے

ابن کثیر کا بیان ہے کہ اس طرح حضرت خالد کی فوج میں ایک ہزار شہسواروں کا اضافہ ہو گیا

| بنو جدیلہ مسلمان ہوتے ہیں | اب حضرت خالد مقام النسر کیطرف بڑھے جو بنو جدیلہ کی قیام گاہ |

تھا۔ حضرت عدی نے پھر مداخلت کی اور فرمایا کہ قبیلہ طے ایک پرندہ کی طرح ہے اور جدیلہ اس پرندہ کا ایک پر ہے۔ اس پرندہ کا ایک پر یعنی طے تو درست ہو گیا۔ اب مجھ کو ذرا موقع دیجئے کہ میں دوسرے پر (جدیلہ) کو بھی درست کر دوں۔ حضرت خالد نے یہ درخواست بھی منظور کرلی۔ عدی ان لوگوں کے پاس آئے اور ان سے بھی وہی بات کہی جو طے سے کہی تھی اس کے بعد ان کو اسلام کی دعوت دی۔ ان لوگوں نے دعوت فوراً قبول کرلی اور حضرت عدی کے ہاتھ پر مسلمان ہو گئے۔ اب بنو جدیلہ کے مسلمان ہو جانے سے حضرت خالد کی فوج میں مزید ایک ہزار سواروں کا اضافہ ہو گیا۲

حضرت عدی بن حاتم کا یہ کارنامہ اتنا شاندار اور مبارک ہے کہ مورخین لکھتے ہیں عدی بہترین شخص تھے اُن سب لوگوں میں جو طے میں پیدا ہوئے تھے۔"

ایسی حالت میں جبکہ تمام عرب میں اسلام کی مخالفت کی آگ لگی ہوئی تھی۔ اچانک بلا کسی جنگ و جدال کے محض ایک شخص کی تبلیغ و فہمائش پر دو قبیلوں کا مسلمان ہو جانا اور ان کے دو ہزار سپاہیوں کا اسلامی فوج میں آشریک ہونا جہاں اسلام کا ایک معجزہ ہے۔ حضرت ابو بکر

---

۱ تین دن کی مہلت کا ذکر طبری نے کیا ہے ج ۲ ص ۴۸۳ لیکن کامل ابن اثیر (ج ۲ ص ۲۶۳) میں دنوں کی کوئی تحدید نہیں ہے اور غالباً صحیح بھی یہی ہے۔ کیونکہ بظاہر تین دن میں ان تمام حالات کا انصرام مشکل تھا۔

۲ طبری ج ۲ ص ۴۸۳ و ابن اثیر ج ۲ ص ۲۶۳۔

صدیق کے حسنِ تدبر و سیاست کا بھی بڑا ثبوت ہے۔

اب حضرت خالد اپنی اصل منزل مقصود یعنی بزاخہ کیطرف روانہ ہوئے۔ تقدمۃ الجیش کے طور پر حضرت عکاشہ بن محصن اور ثابت بن اقرم الانصاری کو پہلے سے روانہ کردیا تھا راستہ میں کہیں ان دونوں کو طلیحہ کا بھائی حبال مل گیا۔ انھوں نے اسکو قتل کردیا۔ طلیحہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو وہ اپنے بھائی سلمہ کو لیکر نکلا اور طلیحہ نے حضرت عکاشہ کو اور حضرت ثابت کو سلمہ نے قتل کردیا اور اس کے بعد یہ دونوں واپس لوٹ گئے۔ اب حضرت خالد اپنے لشکر کیساتھ اس مقام پر پہونچے تو حضرت عکاشہ اور حضرت ثابت کو مقتول دیکھ کر آپ کو اور مسلمانوں کو سخت رنج ہوا۔ بہرحال اب بزاخہ کا میدان جنگ سامنے تھا۔ طلیحہ کیساتھ اس وقت عیینۃ بن حصن الفزاری اپنے قبیلہ کے سات سو بہادروں کیساتھ تھا۔ انکے علاوہ قبیلۂ قیس اور بنو اسد بھی اس کے جاں نثاروں میں تھے۔ چونکہ بنو اسد اور بنو طے دونوں آپس میں ایک دوسرے کے حلیف تھے اس لئے طے کے جو سپاہی حضرت خالد کی فوج میں شامل تھے انھوں نے کہا کہ ہم قبیلۂ قیس سے ہی جنگ کریں گے حضرت عدی بن حاتم اس پر کہاں چپ رہ سکتے تھے۔ فوراً بولے! خدا کی قسم! میرے خاندان کا زیادہ سے زیادہ عزیز و قریب بھی اس دین کو ترک کریگا تو میں اس سے بھی قتال کروں گا۔ بھلا یہ کیا بات ہوئی کہ چونکہ بنو اسد اور بنو طے آپس میں ایک دوسرے کے حلیف ہیں اس لئے بنو طے بنو اسد سے جنگ نہیں کریں گے! حضرت خالد نے فرمایا۔ "یہ قیس بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ اگر بنو طے انہیں سے لڑنا چاہتے ہیں تو ان کو ایسا کرنے دو اور ان کی مخالفت نہ کرو"

طلیحہ سے جنگ اب اسلامی فوج اس طرح بڑھی کہ بہادران طے قیس کے بالمقابل صف آرا تھے اور باقی مجاہدین دوسرے قبیلوں کے سامنے صفیں جمائے کھڑے تھے۔ جنگ شروع ہوئی تو نہایت گھمسان کا رن پڑا عیینۃ کو اپنے بہادروں پر بڑا ناز تھا لیکن اسلامی فوج نے اسکو بدحواس کردیا طلیحہ ایک چادر میں لپٹا ہوا بالوں کے ایک خیمہ میں مقیم تھا عیینۃ کو اپنی فوج کے پاؤں اکھڑتے

نظر آئے تو گھبرا گھبرا کے طلیحہ کے خیمہ میں پہنچکر پوچھتا تھا کہ کوئی وحی آئی؟ لیکن طلیحہ ہر مرتبہ جواب نفی میں دیتا تھا۔ آخر جب تیسری بار عیینۃ آیا اور یہی سوال کیا تو طلیحہ نے کہا ہاں، وحی آئی ہے اور وہ یہ ہے "ان لك رحا کرحاہ وحدیثا لا تنساہ" عیینۃ غصہ کے مارے بے قابو ہوگیا اور بولا "اللہ جانتا ہے کہ تجھ کو ایسا واقعہ پیش آئیگا کہ تو اس کو نہیں بھولے گا۔ طلیحہ سے یہ کہہ کر اس نے بنو فزارہ سے کہا کہ لوگو، یہ شخص جھوٹا ہے۔ اس لئے اب تم جنگ سے ہٹ جاؤ طلیحہ کی سب سے بڑی طاقت یہی بنو فزارہ تھے اس لئے میدانِ جنگ سے ان کا الگ ہونا تھا کہ طلیحہ کی فوج کو شکست ہوگئی۔ طلیحہ نے اپنے لئے ایک گھوڑا اور اپنی بیوی نوار کیلئے ایک سواری کا انتظام پہلے سے کر رکھا تھا۔ میاں بیوی دونوں اپنی اپنی سواری پہ بیٹھ میدانِ جنگ سے بھاگ نکلے۔ طلیحہ نے بھاگتے بھاگتے کہا کہ اے بنو فزارہ تم میں سے جو شخص بھی اس وقت اپنی بیوی کے ساتھ بھاگ سکتا ہو اسے چاہئے کہ اپنی جان لیکر بھاگ جائے۔

طلیحہ کی شکست اور اس کا مسلمان ہونا

طلیحہ یہاں سے فرار ہوکر سیدھا شام پہونچا۔ کچھ دنوں بعد جب اسکو معلوم ہوا کہ قبیلۂ اسد و غطفان دونوں مسلمان ہوگئے ہیں تو بنو کلب میں آکر خود بھی مسلمان ہوگیا۔ ایک مرتبہ عمرہ کے ارادہ سے مکہ جاتے ہوئے مدینہ کے قرب وجوار سے گزر رہا تھا کہ کسی شخص نے حضرت ابوبکر کو اطلاع دی آپ نے فرمایا۔ "اب میں کیا کروں وہ مسلمان ہوگیا ہے۔ حضرت ابوبکر کی وفات تک وہ بنو کلب ہی میں رہا۔ جب حضرت عمر فاروق سے بیعتِ خلافت کرنیکی غرض سے وہ خلیفۂ دوم کے سامنے آیا تو حضرت عمر نے پوچھا "کیا تو وہی ہے جس نے عکاشہ اور ثابت کو قتل کیا تھا؟ واللہ میں تجھ کو کبھی پسند نہیں کر سکتا۔ طلیحہ نے جواب دیا امیر المومنین! اسلام تو پرانی چیزوں کو ہدم کر دیتا ہے۔ اب ان باتوں کا کیا ذکر۔ اس کے علاوہ آپ کو ایسے دو شخصوں کی کیا فکر ہے جن کو اللہ نے میرے ذریعہ عزت بخشی (یعنی شہادت پائی) اور ان دونوں کے ہاتھوں نے مجھکو ذلیل نہیں کیا۔ یہ سنکر حضرت عمرؓ نے طلیحہ کو بیعت کر لیا[1]

[1] الکامل لابن اثیر ج ۲ ص ۲۶۴ و طبری ج ۲ ص ۴۸۹

جزیرہ نمائے عرب کے شمال مشرق کے جو مرتد قبائل تھے حضرت خالد کی انکے ساتھ یہ آخری جنگ تھی۔ یہ شکست خوردہ قبائل بنو اسد اور قیس اور بنو فزارہ اپنے متعلقین کو میدانِ جنگ میں نہیں لائے تھے اور خود انھوں نے شکست کے بعد فوراً اسلام قبول کر لیا اس لئے اُن میں سے کسی کو غلام باندی نہیں بنایا گیا اور حضرت خالد نے اُن کو امن دیدیا۔[1]

بنو عامر کا اسلام بنو عامر نہ اِدھر تھے اور نہ اُدھر۔ متردد تھے اور یہ دیکھ رہے تھے کہ جنگ میں کس کا پلہ بھاری رہتا ہے۔ اب حضرت خالد کو فتح ہوئی اور بنو طے۔ جدیلہ۔ اسد۔ قیس اور غطفان یہ سب قبائل مسلمان ہو گئے تو اب اُن میں سرکشی اور بغاوت کی جرأت نہیں رہی۔ حضرت خالد کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اقرار کیا کہ ہم اسلام قبول کرتے ہیں۔ اور اب نماز بھی پڑھیں گے اور زکوٰۃ بھی ادا کریں گے۔ حضرت خالد نے ان سے بیعت لی اور انکو امن دیا۔

ظالموں کو سخت سزائیں مذکورہ بالا جو قبائل مسلمان ہو گئے تھے ان کے خاص خاص خبیث الفطرت سرداروں اور امیروں نے اُن مسلمانوں پر اپنے ارتداد کے زمانہ میں بہت شدید مظالم کئے تھے جو ان میں گھر کر رہ گئے تھے اسلئے ان مسلمانوں کا انتقام لینا ضروری تھا۔ چنانچہ حضرت خالد نے ان تمام قبائل کو مجبور کیا کہ وہ اپنے اس قسم کے لوگوں کو پیش کریں۔ یہ لوگ آئے تو اُن میں سے چند ایک کو تو آپ نے گرفتار کر کے مدینہ بھیجدیا۔ انھیں میں عیینۃ بن حصن الفزاری قرۃ بن ھبیرۃ۔ الفجاءۃ السلمی اور علقمۃ بن علاثۃ تھے ان کے علاوہ باقی تمام مجرموں کو خود بہت سخت اور عبرتناک سزائیں دیں۔ بعد میں حضرت ابوبکر کو اطلاع ہوئی تو آپ نے بھی حضرت خالد کو تقویٰ اور پرہیزگاری اور لوگوں کیساتھ احسان کا معاملہ کرنے کی تاکید فرمائی اور جن لوگوں نے مسلمانوں کو قتل کیا تھا اُن سے انتقام لینے کی بھی توثیق فرمائی۔[2]

ام زمل کی فتنہ انگیزی اور اُسکا استیصال اس مہم سے فارغ ہونیکے بعد بھی حضرت خالد بزاخہ میں ایک مہینہ مقیم رہے۔ کیونکہ اب بھی کچھ ایسے شریر اور سرکش لوگ باقی تھے جو

---

[1] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۶۵ [2] طبری ج ۲ ص ۱۹۱

شکست کھا جانے اور قبائل کے مسلمان ہوجانیکے باوجود فتنہ انگیزی پر تُلے ہوئے تھے چنانچہ اسی قماش کے کچھ لوگ ام زمل نامی ایک عورت کے پاس جمع ہوگئے۔ ام زمل، ام قرفہ کی بیٹی تھی۔ بنو فزارہ کی طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن حارثہؓ کی سرکردگی میں جو سریہ بھیجا تھا اُس کے ہاتھوں ام قرفہ گرفتار ہوئی تھی اور چونکہ اس نے مسلمانوں کے ساتھ انتہائی عداوت اور دشمنی کا مظاہرہ کیا تھا اس لئے قتل کردی گئی تھی ام زمل کے دل میں وہی غبار بھرا ہوا تھا حالانکہ خود اس کے ساتھ معاملہ یہ کیا گیا تھا کہ جب یہ گرفتار ہوکر آئی تو حضرت عائشہؓ کے حصہ میں پڑی لیکن حضرت عائشہؓ نے چند روز کے بعد اس کو آزاد کردیا اور یہ اپنے قبیلہ میں واپس چلی گئی۔ حضرت عائشہؓ کے اس احسان کے باوجود یہ اپنی ماں کے خون کو فراموش نہیں کرسکی تھی۔ اب غطفان۔ طے۔ سلیم۔ اور ہوازن کے بچے کھچے باغی اور سرکش لوگ جو ابتک مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ ام زمل کے اردگرد جمع ہوئے تو عورت کی بات! اس نے ان سب لوگوں کو پھر لڑنے پر آمادہ کردیا اور ساتھیوں کے اس گروہ کے ساتھ خود ایک اونٹ پر بیٹھ کر جو اسکی ماں کا تھا بڑے کروفر اور شان وشوکت کے ساتھ نکلی۔ حضرت خالد کو ان واقعات کا علم ہوا تو خود اسکے مقابلہ کو بڑھے۔ مسلمان مجاہدین نے ام زمل کے اونٹ کا محاصرہ کرلیا۔ پہلے اونٹ کی کونچیں قطع کیں اور پھر ام زمل کو قتل کردیا۔ ابن کثیر کا بیان ہے کہ اس اونٹ کے اردگرد ایک سو باغی شہسوار کام آئے اور اس فتح کا مژدہ فوراً حضرت ابوبکرؓ کو پہونچا دیا گیا۔[1]

حضرت خالد نے اس کے علاوہ بھی دو تین شورشوں کا جو بزاخہ کے قرب وجوار میں برپا ہورہی تھیں خاتمہ کیا اور آخر یہاں کے ایک ماہ قیام کی مدت میں شمال مشرق کے محاذ کا مطلع بالکل صاف ہوگیا۔

قیدیوں کیساتھ حُسنِ سلوک اس جنگ میں جو بڑے بڑے سردار پکڑے گئے تھے۔ حضرت خالد نے ان کو مدینہ بھیجدیا تھا حضرت ابوبکر نے ان کیساتھ جس ملاطفت اور نرمی کا معاملہ کیا

[1] ابن اثیر ج ۲ ص ۳۶۶ -

اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ یہ سب آگ طلیحہ کی ہی لگائی ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود جب
اس نے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا تو حضرت ابوبکر نے اس سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ پھر طلیحہ
کی جو کچھ بھی طاقت تھی عیینہ کے دم سے تھی۔ لیکن اس نے جب اسلام کے قبول کر لینے کا اعلان
کیا تو اس کی بھی جان بخشی کر دی گئی اور قید سے رہا کر دیا گیا۔ قرۃ بن ھبیرۃ جو بنو عامر کا
سردار تھا۔ مدینہ میں قیدی بنا کر لایا گیا۔ لیکن اس نے کہا کہ میں کبھی بھی مرتد نہیں ہوا۔ البتہ میری
قوم زکوٰۃ کو تاوان سمجھتی تھی اس لئے اُس سے اپنا استثنار چاہتی تھی۔ حضرت ابوبکر نے پوچھا
تیرے اس ایمان کا کوئی گواہ ہے؟ قرہ نے حضرت عمرو بن العاص کو گواہی میں پیش کیا۔ جو
عمان میں جیفر کے پاس سے مدینہ جاتے ہوئے بنو عامر کے قبیلہ میں ایک شب کے لئے قرۃ بن
ھبیرۃ کے مہمان رہے تھے اور اس وقت قرۃ میں اور حضرت عمرو بن العاص میں زکوٰۃ کے
مسئلہ پر گفتگو ہوئی تھی۔ اب اس وقت عمرو بن العاص نے گواہی میں وہی گفتگو نقل کر دی اور
اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ قرۃ واقعی مرتد نہیں ہوا تھا تو حضرت ابوبکر نے اسکو بھی رہا کر دیا۔ البتہ
جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے صرف ایک الفجاءۃ السلمی ہے جس کو اس کی حد درجہ غداری اور سفاکی
کی وجہ سے حضرت ابوبکر نے بڑی سختی اور بے رحمی کے ساتھ قتل کرایا ہے۔

سجاح اور مالک بن نویرہ

بنو تمیم کی اہمیت قبیلۂ بنو تمیم کے مکانات جنوب کی جانب بنو عامر سے ذرا فاصلہ پر اور
مدینہ کے مشرق میں واقع تھے جو خلیج فارس تک چلے گئے تھے۔ شمال مشرق کی جانب
یمں دریائے فرات کے دہانہ سے ملے ہوئے تھے۔ عہد جاہلیت میں اور اس کے بعد آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں بھی یہ قبیلہ بڑا معزز سمجھا جاتا تھا اور شجاعت و سخاوت کا اوصاف
میں ممتاز تھا اس قبیلہ میں نامور شعراء۔ بہادر اور فیاض طبع لوگ پیدا ہوئے اس قبیلہ کی
شاخیں بنو حنظلہ۔ دارم۔ بنو مالک۔ بنو یربوع وہ ہیں جن کے کارناموں سے عربی ادب و تاریخ

کی کتابیں بھری ہوئی ہیں۔

چونکہ یہ قبائل خلیج فارس اور فرات کے دہانہ سے قریب تھے اس بناپر ارض عراق اور جزیرہ نمائے عرب دونوں کیساتھ ان کے تعلقات تھے اور ادھر ایران میں بھی ان کی آمدورفت تھی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں سے اکثر لوگ نصرانیت کے زیر اثر آگئے۔ یہ سب اسباب تھے جن کے باعث عرب میں جب بغاوت وارتداد کا طوفان اٹھا تو بنوتمیم نے بھی اس میں نمایاں حصہ لیا

مالک بن نویرہ کی بغاوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جب وفات ہوئی تو اس وقت آپ کے چند عمال بنوتمیم میں موجود تھے جو زکوٰۃ وصول کرنے کی غرض سے بھیجے گئے تھے [۱]

انہیں میں مالک بن نویرہ تھا جو قبیلۂ بنویربوع کا سردار تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر وفات ملنے پر ان عاملوں میں اختلاف ہوا کہ جو زکوٰۃ اور صدقات ان لوگوں نے جمع کرلئے تھے اُن کا کیا کریں؟ اُن کو حضرت ابوبکر کے پاس بھیجیں یا وہیں لوگوں میں تقسیم کردیں۔ مالک بن نویرہ اس گروہ میں شامل تھا جو زکوٰۃ کو مدینہ بھیجنے کا مخالف تھا اس طرح اب وہ اسلام سے منحرف ہوکر اس کے مخالفوں کی صف میں شریک ہوگیا اور مسلمانوں کا کھلم کھلا دشمن بن گیا۔

سجاح کی آمد یہ عُمّال آپس میں اختلاف کر ہی رہے تھے کہ اتنے میں سجاح بنت الحارث الجزیرہ سے جو عراق میں ہے اس شان سے یہاں پہونچ گئی کہ اُس کے قبیلۂ بنوتغلب کے لوگ اس کو گھیرے ہوئے تھے اور وہ ایک عظیم لشکر کی قیادت کررہی تھی جس میں قبیلہ ربیعہ۔ نمر۔ ایاد اور شیبان کے آزمودہ کار لوگ شریک تھے۔ سجاح بنوتمیم کی شاخ بنویربوع سے تعلق رکھتی تھی اور عراق کے بنوتغلب سے جنھوں نے مسیحیت کو اختیار کرلیا تھا۔ اس کے ننھالی تعلقات تھے اس بناپر ابتداءً یہ خود بھی مسیحی تھی اور اسلام کیساتھ جو دشمنی یہود اور نصاریٰ کو تھی۔ سجاح بھی

---

[۱] طبری نے ان تمام عُمّال کے نام اور جن جن قبیلوں پر یہ مقرر کئے گئے تھے ان کے نام ذکر کئے ہیں۔ یہ عمال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد تین حصّوں میں بٹ گئے تھے۔ ایک وہ جو اسلام کے سچّے اور پکّے حامی تھے اور انھوں نے اپنی جمع کردہ زکوٰۃ مدینہ بھیجی جیسے صفوان بن صفوان۔ دوسرے وہ جو متردد تھے جیسے زبرقان بن بدر۔ تیسرے وہ جو کھلم کھلا مخالف ہوگئے۔ مثلاً مالک بن نویرہ (ج ۲ ص ۴۹۵)

اسلام کیساتھ وہی عداوت رکھتی تھی۔ یہ کاہنہ بھی اور اس کی قابلیت۔ ذہانت اور ہوشیاری کی دلیل بھی کیا کم ہے کہ اس زمانہ میں عورت ہو کر عرب کے نامور قبیلوں کی قیادت کر رہی تھی۔

اسلام کیساتھ دشمنی کے باعث یہ موقع کی تلاش میں تو تھی ہی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر وفات سنتے ہی ایک لشکر لے مدینہ پر حملہ کے ارادہ سے چل پڑی۔ بعض مورخین کا خیال ہے اور غالباً صحیح ہے کہ سجاح کا یہ اقدام حکومت ایران اور عراق میں اس کے جو عمال تھے ان کے بھڑکانے اور جوش دلانے کا نتیجہ تھا۔ ورنہ خود اُس کو اپنے بل بوتہ پر مدینہ پر حملہ کی جرأت نہیں ہو سکتی تھی۔

سجاح کی قبائل سے جنگ سجاح شمال عراق سے اُتر کر جب جزیرہ نمائے عرب میں داخل ہوئی تو طبعی طور پر اس کو سب سے پہلے خود اپنے قبیلہ بنو تمیم کے پاس آنا چاہیے تھا یہاں پہونچی تو دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عمال صدقات میں پھوٹ پڑی ہوئی ہے۔ اب اسے موقع اچھا مل گیا۔ اُس نے مالک بن نویرہ کو جلد ہی اپنا ہم نوا بنالیا۔ لیکن مالک بن نویرہ نے سجاح کو مشورہ دیا کہ وہ ابھی مدینہ پر حملہ کا ارادہ نہ کرے بلکہ بنو تمیم کے جو بعض قبیلے اب تک اس کی (سجاح کی) پیغمبری کا اقرار نہیں کر سکے ہیں اور اس کے مخالف ہیں۔ پہلے اُن سے جنگ کی جائے۔ سجاح نے اس مشورہ کو فوراً قبول کر لیا۔ اس کے اصل قوت بازو دو ہی شخص تھے۔ ایک مالک بن نویرہ اور دُوسرا وکیع جو بنو تمیم کی ایک شاخ بنو حنظلہ کا سردار تھا۔ ان دونوں کے مشورہ سے اب سجاح نے بنو تمیم کی مختلف شاخوں پر حملہ شروع کر دیئے جن میں قتل وقتال ہوا۔ دونوں طرف کے آدمی گرفتار ہوئے اور غلام بنائے گئے لیکن آخر میں صلح ہو گئی اور قیدیوں کا تبادلہ کر لیا گیا۔

یمامہ پر حملہ کا ارادہ یہاں سے فارغ ہو کر سجاح کے دل میں پھر مدینہ پر حملہ کرنیکا ولولہ اٹھا۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ مالک بن نویرہ اور وکیع دونوں اپنے اپنے قبیلوں کو زبان دے چکے تھے کہ سجاح مدینہ جانے کے لیے اُن قبیلوں سے نہیں گزرے گی بلہ

لہ [illegible] اکو دراصل مدینہ یا حضرت ابوبکر کے ساتھ ہمدردی نہیں تھی بلکہ اصل یہ ہے کہ (باقی صفحہ ۱۹۴ پر)

اس لیئے جب اہلِ جزیرہ کے سردارانِ فوج نے اس سے آکر کہا کہ اب ہم کیا کریں۔ مالک اور وکیع تو ہماری کوئی مدد نہیں کریں گے اور ہم اُن کے علاقوں میں گزر بھی نہیں سکتے ہیں تو اس نے "پیغمبرانہ" شان میں جواب دیا کہ "یمامہ کا رُخ کرو۔ ان لوگوں نے کہا "یمامہ کا معاملہ تو بڑا مشکل ہے۔ وہاں مسیلمہ کی طاقت بڑی مضبوط ہے، لیکن سجاح بولی "کوئی پرواہ کی بات نہیں ہے۔ یمامہ پر حملہ لازمی طور پر کرنا ہے"[1]

مسیلمہ اور سجاح کا نکاح

اب ادھر مُسیلمہ کو خبر ہوئی تو سخت پریشان ہوا۔ اسکو اس بات کا اندیشہ تھا کہ اگر وہ سجاح سے جنگ کرنے میں مشغول ہو گیا تو مسلمانوں کا لشکر جو ثمامہ بن آثال یا شرحبیل بن حسنہ کی سرکردگی میں چلا آرہا تھا اُسکو غلبہ حاصل ہو جائیگا یا جو قبائل اُسکے اطراف و اکناف میں آباد تھے ان کو سر اٹھانے کا موقع مل جائیگا۔ اس بنا پر اس نے یہ چال چلی کہ اُس نے سجاح کے پاس ایک ہدیہ بھیجا اور اپنی جان کی امان طلب کر کے اُس سے ملنے کی درخواست کی۔ سجاح نے درخواست منظور کر لی تو مسیلمہ بنو حنیفہ کے چالیس آدمیوں کو ہمراہ لیکر سجاح کے جائے قیام پر پہونچا۔ یہاں دونوں میں خلوت میں گفتگو ہوئی۔ دونوں ہی کاہن تھے اور پیغمبری کا دعویٰ کرتے تھے۔ دونوں پر وحی نازل ہوتی تھی لیکن مسیلمہ بہرحال مرد تھا آخر وہ اس فتنہ کی پری کو شیشے میں اتار لینے میں کامیاب ہو گیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں میاں بیوی بن گئے[2]

(بقیہ صفحہ ۱۹۳) چونکہ سجاح کے ساتھ الجزیرہ اور عراق کے لوگ تھے اس لئے ان قبیلوں کو اس بات کا اندیشہ تھا کہ اگر سجاح ان لوگوں کو لے کر ان قبائل میں سے گزرے گی تو اس سے ان کی آزادی اور خود مختاری خطرہ میں پڑ جائیگی۔

[1] سجاح نے اس وقت پیغمبرانہ انداز میں گویا کہ ابھی اس پر وحی نازل ہوئی ہے جو الفاظ کہے وہ یہ تھے۔

علیکم بالیمامة ودفوا دفیف الحمامه ۔ فانھا غزوة صرامة لا یلحقکم بعدھا ملامة

[2] طبری وغیرہ نے اس موقع کے جو واردات اور مسیلمہ و سجاح کی جو باہمی گفتگو لکھی ہے۔ اگرچہ عربی ادب و تاریخ کے ایک محقق کو اس کا اعتبار کرنا بہت مشکل ہے۔ نہایت فحش اور گندی ہے۔

نکاح کے بعد مسیلمہ سجاح کو اپنی جائے قیام پر لے آیا۔ سجاح تین دن یہاں رہی پھر اپنی قوم میں واپس چلی گئی۔ مسیلمہ اور سجاح کے درمیان جو معاملات طے ہوئے تھے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ یمامہ کی پیداوار سے جو کچھ آمدنی ہوگی اس کا نصف حصہ سجاح کو دیا جائیگا۔ سجاح ان معاملات کے انصرام و تعمیل کی غرض سے اپنے کارکن ھذیل۔ عقۃ اور زیاد کو یہاں چھوڑ کر الجزیرہ واپس لوٹ گئی۔ جہاں تک خلافت صدیقی کا تعلق ہے سجاح کے ڈرامہ کا یہ آخری سین ہے۔ کیونکہ پھر وہ عراق سے باہر نہیں نکلی۔ مورخین لکھتے ہیں کہ امیر معاویہ کے عہد حکومت میں مسلمان ہو گئی تھی [1]

بطاح میں حضرت خالد کا نزول

سجاح کے جزیرہ لوٹ جانے کے بعد بنو تمیم کے بعض امرا مثلاً وکیع اور سماعہ اپنی حرکت پر نادم ہوئے اور جب حضرت خالد حضرت ابوبکر کے حکم کے مطابق بزاخہ کی مہم سے فارغ ہونیکے بعد بطاح پہونچے تو وکیع بن مالک سماعہ اور زبرقان اپنی اپنی زکوٰۃ لیکر حضرت خالد کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انھوں نے اپنے اسلام کا اعلان کیا ان کے برخلاف مالک بن نویرہ اب تک متردد تھا لیکن چونکہ اس کو حضرت خالد کے مقابلہ کی جرأت نہیں تھی اس بنا پر اس نے اپنے تمام ساتھیوں اور قبیلہ والوں کو منتشر کر کے انکے گھروں کو واپس کر دیا۔ حضرت خالد یہاں پہونچے تو مطلع صاف تھا۔ آپ نے مسلمانوں کی چند ٹولیاں (سریات) ادھر ادھر روانہ کیں اور تاکید کی کہ تم اسلام پیش کرو اور اذان دو جو لوگ اس دعوت کو قبول کرلیں اور اذان دیں نماز پڑھیں اور زکوٰۃ ادا کرنے کا بھی عہد کریں اُن سے کچھ نہ کہو۔ لیکن جو ایسا نہ کریں اُن کو سزا دی جائے۔

مالک بن نُویرہ کا قتل | ایک ٹولی واپس ہوئی تو اپنے ساتھ مالک بن نویرہ اور چند اور

[1] طبری ج ۲ ص ۵۰۰۔

لوگوں کو گرفتار کرتی لائی۔ یہ لوگ جو گرفتار کر کے لائے گئے تھے ان میں ابو قتادہ بھی تھے انہوں نے شہادت دی کہ قیدیوں نے اذان دی تھی اور نماز پڑھی تھی لیکن بعض اور ارکان سریہ نے اسکی مخالفت کی۔ حضرت خالد نے اس اختلاف کے باعث قیدیوں کے متعلق اُس وقت فیصلہ کرنا ملتوی کر دیا اور ان کو کسی جگہ محبوس کرنیکا حکم دیا۔ لیکن رات ہی رات میں مالک بن نویرہ اور اس کے ساتھی قتل کر دئے گئے اور حضرت خالد بن الولید نے مالک بن نویرہ کی بیوی ام تمیم سے نکاح کر لیا۔ ابو قتادہ انصاری کو اس پر سخت برہمی ہوئی اور وہیں حضرت خالد سے تیز کلامی کی لیکن انھوں نے اس پر ہی بس نہیں کی بلکہ مدینہ پہونچکر انھوں نے اور مالک بن نویرہ کے بھائی متمم بن نویرہ نے اولاً حضرت ابوبکر اور پھر حضرت عمر سے خالد بن الولید کی شکایت کی اور پورا واقعہ کہہ سنایا۔ حضرت ابوبکر کو سُن کر صدمہ تو ہوا لیکن مصلحتِ وقت کے پیش نظر چُپ ہو گئے۔ فاروق اعظم کو شدید غصہ تھا ان کی رائے ہوئی کہ خالد کو فوراً معزول کر دیا جائے۔ اور چونکہ ایک مسلمان کو عمداً قتل کر کے اُسی کی بیوی سے عدتِ وفات کے انقضا سے قبل انھوں نے شادی کی ہے۔ اس لئے انہیں رجم کر دیا جائے۔ حضرت عمر کا اس پر جب اصرار زیادہ بڑھا تو حضرت ابوبکر نے آخر حضرت خالد کو مدینہ طلب کیا اور اُن سے گفتگو کے بعد آپ کو جب یقین ہو گیا کہ اگر مالک بن نویرہ کا قتل بحالتِ اسلام ہوا بھی ہے تو بہر حال وہ قتل عمد نہیں۔ قتل خطا ہے تو آپ نے حضرت خالد کیطرف سے مالک کا خون بہا ادا کیا اور چونکہ مقامِ جنگ (بطاح) سے حضرت خالد کی غیر حاضری کے باعث حالات زیادہ بگڑ گئے تھے اس بنا پر فوراً اُن کو واپس روانہ کر دیا۔

مالک بن نُوَیرہ کے واقعہ قتل پر ایک نظر

ارتداد سے تائب ہونیکے باوجود مالک بن نویرہ کا قتل اور پھر اس کے بعد ہی فوراً اُس کی بیوی سے نکاح ان دونوں چیزوں نے جہاں خالد کی سیرت سے متعلق ایک پیچیدہ بحث پیدا کر دی ہے اس سے بظاہر حضرت ابوبکر پر بھی مداہنت اور جرم سے چشم پوشی کا اعتراض وارد ہوتا ہے

اس لئے ہم اس پر ذرا تفصیل سے بحث کرتے ہیں۔

واقعہ کی مختلف صورتیں | سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ واقعہ کی اصل صورت کیا تھی؟

(۱) اس سلسلہ میں ایک روایت جو طبری نے نقل کی ہے یہ ہے کہ مالک بن نویرہ اور اس کے ساتھیوں کے اسلام سے متعلق جب ارکانِ سریہ میں اختلاف ہوگیا تو حضرت خالد بن الولید نے خیال کیا کہ دوسرے دن فیصلہ کریں گے اور قیدیوں کے بارے میں حکم دیا کہ اُن کو بند کرکے رکھا جائے۔ اتفاق سے اُس رات سردی بہت زیادہ تھی اس لئے حضرت خالد کو قیدیوں کا خیال آیا تو آپ نے محافظین کو حکم دیا "ادفئوا اسراکم" عام لغت کے مطابق اس فقرہ سے حضرت خالد کی مراد یہ تھی کہ اپنے قیدیوں کو کپھا ڑھا دو تاکہ سردی سے اُن کی حفاظت ہوجائے۔ لیکن جو لوگ پہرہ دے رہے تھے وہ ادفار کے اس معنی سے بے خبر تھے اس لئے انھوں نے بنو کنانہ کے لغت کے مطابق ادفار کے معنی قتل کے سمجھے اور اس بنا پر سب قیدیوں کو قتل کردیا۔ اب چیخ پکار کا شور بلند ہوا تو حضرتِ خالد نے پوچھا "یہ کیا ہے؟" اور جب معلوم ہوا کہ قیدی قتل کردئے گئے ہیں تو انھیں افسوس تو ہوا۔ لیکن فرمایا "جو چیز مقدر ہوتی ہے وہ ہوکر رہتی ہے"۔[۱]

(۲) طبری کی ہی ایک اور روایت یہ ہے کہ حضرت خالد نے یہ معلوم کرنے کی غرض سے کہ کونسی شہادت سچی ہے۔ مالک بن نویرہ کے اسلام کی یا اس کے اصرار علی الارتداد کی خود مالک بن نویرہ کو بلایا اور گفت گو شروع کردی۔ اثنائے گفتگو میں ایک مرتبہ مالک نے کہا۔ "میرا خیال تو یہ ہی ہے کہ تمہارے ساتھی (صاحبکم) یہ یہ کہا کرتے تھے" "تمہارے ساتھی" کے لفظ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیطرف اشارہ تھا۔ حضرت خالد نے کہا "کیا تو ان کو (آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو) اپنا صاحب نہیں سمجھتا" یہ کہا اور اُس کی اور اس کے ساتھیوں کی گردنیں اڑادیں [۲]

---

[۱] طبری ج ۲ ص ۵۰۲ [۲] طبری جلد ۲ ص ۵۰۳۔

(۳) تیسری روایت ابن خلکان کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ حضرت خالد اور مالک بن نویرہ میں خوب گفتگو ہوئی۔ اس کے سلسلہ میں مالک نے کہا "میں نماز پڑھتا ہوں لیکن زکوٰۃ نہیں دیتا" حضرت خالد نے کہا "کیا تجھ کو معلوم نہیں ہے کہ نماز اور زکوٰۃ دونوں ہی فرض ہیں اور ایک بغیر دوسرے کے مقبول نہیں ہے۔[1] اس پر مالک بن نویرہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا " قد کان صاحبک یقول ذالک" آپ کے صاحب تو چنیں و چناں کہتے تھے۔ حضرت خالد کو یقین ہوگیا کہ یہ شخص ابھی تک مسلمان نہیں ہوا ہے۔ چنانچہ انھوں نے کہا " او ما تراہ لک صاحبا " کیا تو انکو (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو) اپنا صاحب نہیں سمجھتا اس کے بعد فرمایا " میں تیری گردن اڑا دوں گا۔ اس پر دونوں میں مزید سخت کلامی ہوئی۔ مالک بن نویرہ " صاحبک" کا لفظ بار بار دہرائے جاتا تھا۔ آخر حضرت خالد نے حکم دیا اور مالک بن نویرہ قتل کر دیا گیا[2]

(۴) چوتھی روایت یعقوبی کی ہے اور وہ یہ ہے کہ حضرت ابوبکر نے حضرت خالد کو لکھا کہ مالک بن نویرہ کا رخ کریں۔ چنانچہ وہ وہاں پہنچے۔ مالک بن نویرہ حضرت خالد کے بلانے پر آیا تو اس کی بیوی بھی ساتھ تھی۔ خالد پر اسکی بیوی کا کچھ اثر ہوا اور انہوں نے کہا۔

واللہ لانلت مافی مثابتک	جو تیرا ٹھکانہ ہے تو اس وقت تک اسکو نہیں پائے گا
حتی اقتلک	جب تک میں تجھ کو قتل نہیں کر دوں گا۔

اس کے بعد مالک بن نویرہ سے مناظرہ کیا[3] اور اس کی گردن اڑا دی اور پھر اسکی بیوی سے نکاح کیا[4]

---

[1] کسی کو غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے۔ مراد یہ ہے کہ نماز ہو یا زکوٰۃ دونوں ہی فرض ہیں اور جب تک کوئی شخص ان دونوں کی فرضیت کا قائل نہ ہو اس کی کوئی ایک عبادت خواہ وہ فقط نماز ہو یا فقط زکوٰۃ مقبول نہیں ہوگی۔

[2] ابن خلکان ج ۵ ص ۶۶ مطبوعہ مصر جدید اڈیشن۔ [3] اصل کتاب میں فنظر مالکا چھپا ہوا ہے لیکن ہمارے نزدیک یہ تصحیف ہے اصل لفظ فناظر ہوگا۔ اس کی تائید طبری وغیرہ کی روایات سے بھی ہوتی ہے۔

[4] تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۱۲۸

(۵) پانچویں روایت یاقوت حموی کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ حضرت خالد کا دستہ جو ضرار بن الازور کی سرکردگی میں تھا اس کا مقابلہ مالک بن نویرہ کے دستہ سے ہوا۔ دونوں میں جنگ ہوئی اور ضرار نے مالک کو قتل کر دیا [1]

اگرچہ کتاب الاغانی لابی الفرج الاصفہانی اور بعض دوسری ادبی کتابوں میں یہ واقعہ ایک افسانۂ حسن و عشق بنا کر لکھا گیا ہے اور اس میں کافی رنگ آمیزی کی گئی ہے لیکن وہ سرتاسر بیہودہ اور لغو ہے تاریخی حیثیت سے واقعہ کی جو صورت بھی ہو مذکورۂ بالا چار صورتوں میں ہی محدود ہے۔

واقعہ کی اصل صورت اب ہمیں یہ بتانا چاہیے کہ قرائن اور قیاس کی روشنی میں واقعہ کی اصل صورت کیا ہونی چاہیے۔

جہاں تک پہلی صورت کا تعلق ہے وہ کچھ زیادہ قابلِ اعتبار نظر نہیں آتی۔ وجہ یہ کہ ادفأ کے عام معنی ڈھانکنے چھپانے اور گرمی پہونچانا ہی ہیں قرآن و حدیث میں یہ لفظ اسی معنی میں آیا ہے قتل کرنے کے معنی میں اس لفظ کا استعمال یا قتل سے اس کا کنایہ ہونا دور کا احتمال ہے اس بنا پر جب قیدیوں کو محافظین کو اس لفظ کی حقیقی مراد میں شبہ ہوا تھا تو انکو حضرت خالد سے پوچھنا چاہیے تھا۔ محض ایک دور کا احتمال و ابہام پر قتل کر دینا اور وہ بھی کسی معمولی شخص کو نہیں بلکہ مالک بن نویرہ ایسے اہم شخص کو اور پھر وہ بھی ایک جماعت کیساتھ کسی طرح قیاس میں نہیں آتا۔ اور اچھا! اگر ان لوگوں سے یہ حرکت عجلت میں ہو بھی گئی تھی تو حضرت خالد کو اُن سے بازپرس کرنی چاہیے تھی صرف یہ کہدینا کہ "جو کچھ ہوتا ہے اللہ کے حکم سے ہوتا ہے" کافی نہیں ہے۔ اگر واقعہ کی دراصل صورت یہ ہی تھی تو حضرت خالد صاف طور پر معذور تھے۔ پھر حضرت عمرؓ کا اس قدر غضب ناک ہونا اور حضرت ابوبکرؓ کا اس کے جواب میں "فَاَوَّلَ فَاَخطَأَ" خالد نے تاویل کی اور ان سے خطا ہو گئی" فرمانا کوئی معنی ہی نہیں رکھتا۔ اور اگر ان سب باتوں کی بھی کوئی توجیہ کر لی جائے تو حضرت خالد نے مالک کی بیوی سے جو فوراً نکاح کیا ہے درانحالیکہ وہ مسلمان تھا اس کی کیا توجیہ ہوگی۔

---

[1] معجم البلدان ج ۱ ص ۶۶۱ مطبوعۂ لیپزگ۔

اب رہیں باقی تین صورتیں تو وہ تقریباً ایک ہی متن کی مختلف شرحیں معلوم ہوتی ہیں لیکن ۲ اور ۴ اتنی واضح اور صاف نہیں ہیں جتنی کہ ع ۳ یعنی ابن خلکان کی روایت ہے۔ اس بنا پر ہمارے نزدیک اسی کو اصل سمجھنا چاہیے۔

مالک بن نویرہ کا مختصر حال | واقعہ کی اس صورت کے متعیّن ہو جانیکے بعد اب یہ سنو کہ مالک بن نویرہ کے حالات کیا ہیں؟

مالک بن نویرہ بنوتمیم کی شاخ بنویربوع کا سردار تھا۔ کنیت ابوحنظلہ تھی۔ عرب کے مشہور شعرا اور شہسواروں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ یہ مسلمان کب ہوا؟ اس کی صحیح تاریخ کا متعین کرنا مشکل ہے۔ غالباً ۸ھ یا ۹ھ ہجری میں ہوا ہوگا جبکہ بنوتمیم کا ایک وفد خدمت نبویؐ میں حاضر ہوا تھا۔ بہرحال اتنا معلوم ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکو اپنی قوم کے صدقات کے جمع کرنے پر عامل مقرر فرمایا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر پہنچی تو اس نے زکوٰۃ روک لی اور اسکو مدینہ بھیجنے کے بجائے اپنی قوم میں تقسیم کردیا اور اُس نے یہ شعر پڑھے۔

نقلت خذوا اموالکم غیر خائف	ولا ناظر فیما یجیئ من الغد
فان قام بالدین المخوف قائمٌ	اطعنا وقلنا الدین دین محمدٍ[۱]

اب اس وقت سے لیکر قتل ہونے تک مالک بن نویرہ نے جو کارنامے انجام دیئے ہیں جیساکہ طبری کے حوالہ سے ہم پہلے لکھ چکے ہیں وہ یہ ہیں۔

(۱) مالک بن نویرہ نے صرف یہ ہی نہیں کیا کہ اس نے زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کردیا ہو بلکہ جب سجاح عراق سے چلکر مدینہ پر حملہ کے ارادہ سے یہاں پہونچی تو مالک بن نویرہ نے اُس سے ساز باز کرلی اور اس جھوٹی مدعیۂ نبوت کا وہ دست راست بن گیا۔

(۲) سجاح کو آمادہ کیا کہ بنوتمیم کی بعض شاخیں جو اب تک اپنے اسلام پر قائم تھیں اُن پر

[۱] الاصابہ ج ۳ ص ۳۳۶ اصل کتاب میں المحوق چھپا ہوا ہے مگر یہ صحیح نہیں ہے۔

وہ حملہ کرے۔ چنانچہ سجاح نے ایسا کیا اور مالک بن نویرہ نے اس معاملہ میں اُس کی ہر قسم کی مدد کی۔

(۳) سجاح کے عراق چلے جانے کے بعد زبرقان، وکیع بن مالک اور سماعہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر وفات سنکر متردد یا مخالف ہو گئے تھے ان کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ چنانچہ حضرت خالد بزاخہ سے مقام بطاح میں پہونچے تو ان لوگوں نے حضرت خالد کا استقبال کیا اور اپنے جمع کئے ہوئے صدقات اُن کے حوالہ کر دئے لیکن مالک بن نویرہ کو اب بھی ہوش نہیں آیا اور وہ اپنے لوگوں کو لیکر اپنے قبیلہ میں چلا گیا[۱]

(۴) حضرت خالد نے جو جماعت (سریہ) ان لوگوں کے تعاقب میں روانہ کی تھی اس سے تاکیداً کہا تھا کہ اگر یہ لوگ نماز کیساتھ ساتھ زکوٰۃ کے ادا کرنیکے لئے بھی حامی بھرلیں تو پھر ان سے کوئی تعرض نہ کیا جائے[۲]

حضرت خالد کے اس صاف و صریح حکم کے باوجود اس سریہ کا مالک بن نویرہ کو گرفتار کرکے لانا خود اس بات کی دلیل ہے کہ مالک بن نویرہ نے اس جماعت کے سامنے ادائے زکوٰۃ کی حامی نہیں بھری تھی۔

(۵) مالک بن نویرہ کے واقعۂ قتل سے متعلق طبری اور ابن خلکان کے حوالہ سے جو دو روایتیں اوپر گزر چکی ہیں اُن میں صاف تصریح ہے کہ حضرت خالد اور مالک بن نویرہ میں جو گفتگو ہوئی ہے اُس میں مالک بن نویرہ نے ادائے زکوٰۃ کا اقرار نہیں کیا اور وہ اپنے انکار پر برابر مصر رہا۔ اس کے علاوہ اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے صاحبکم کی ترکیب استعمال کی۔

---

[۱] ابن اثیر کے الفاظ یہ ہیں۔ وعرف وکیع وسماعۃ قبح ما اتیا فراجعا رجوعاً حسناً ولم یتجبرا واخرجا الصدقات فاستقبلا بہا خالداً وسار خالد یرید البطاح وبہا مالک بن نویرہ قد تردد علیہ امرہٗ التاریخ الکامل ج ۲ ص ۲۷۲

[۲] طبری ج ۲ ص ۵۰۲

اب غور کرو مالک بن نویرہ کے اس تجزیۂ حالات سے کیا کسی درجہ میں بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ اپنے ارتداد سے تائب ہو کر پھر مسلمان ہو گیا تھا؟

مالک بن نویرہ کے اسلام کی شہادت

یہ حالات تو خود مالک بن نویرہ کے تھے۔ اب ہم کو اُس شہادت پر بھی ایک نظر ڈالنی چاہیے جو اُس کے اسلام سے متعلق تاریخ سے فراہم ہو سکتی ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ اگرچہ مالک بن نویرہ کو گرفتار کر کے لانے والی جماعت میں دو چار نہیں بلکہ کافی تعداد میں مسلمان ہوں گے لیکن اس کے باوجود مالک بن نویرہ کے اسلام کی شہادت صرف دو شخصوں سے ہی منقول ہے ایک متمم بن نویرہ جو خود مالک بن نویرہ کے حقیقی بھائی تھے اور اُن کو اپنے اس بھائی سے کس درجہ محبت تھی وہ ان کے اُن مراثی سے ظاہر ہے جو خنسا کے مراثی کی طرح عرب کی تاریخِ مرثیہ گوئی میں شاہکار کی حیثیت رکھتے ہیں اور دوسرے شخص ابو قتادہ انصاری ہیں اس میں شبہ نہیں کہ مؤخر الذکر ایک جلیل القدر صحابی اور انصاری ہیں اس بنا پر ہم ان کی طرف جھوٹ اور دروغ گوئی کی نسبت نہیں کر سکتے۔ لیکن اس سلسلہ میں بہرحال مندرجہ ذیل دو باتوں کو ذہن میں رکھنا چاہیے۔

(۱) حضرت ابو قتادہ نے جو شہادت مالک بن نویرہ اور اس کے ساتھیوں کے اسلام کی دی ہے اس میں ادائے زکوٰۃ کے اقرار کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ بلکہ صرف اس قدر ہے کہ انھم اقاموا الصلوٰۃ۔ ان لوگوں نے نماز پڑھی تھی [1]

(۲) حافظ ابن حجر نے اقامت صلوٰۃ کے علاوہ اذان کا بھی ذکر کیا ہے لیکن زکوٰۃ کا وہاں بھی نام نہیں ہے [2]

حضرت خالد جب بزاخہ کی مہم سے فارغ ہو کر بطاح کے قصد سے روانہ ہونے لگے ہیں تو انصار نے ساتھ جانے سے انکار کیا اور کہا کہ اس بارہ میں خلیفہ کا ہمارے پاس کوئی حکم نہیں ہے۔ ہر چند حضرت خالد نے سمجھایا کہ میرے پاس حکم موجود ہے اور میں امیر بھی

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۶ ص ۳۲۲ [2] الاصابہ ج ۳ ص ۳۳۷

ہوں لیکن یہ نہ مانے۔ آخر جب خالد ان کو پیچھے چھوڑ کر کافی دُور نکل گئے تو انکو خیال ہوا کہ اگر اسلامی لشکر کو کامیابی ہوئی تو ہم اُس میں حصّہ دار بننے سے محروم رہیں گے اور اگر ناکامی ہوئی اور مسلمانوں کو نقصان پہونچا تو لوگ ہمیں کو برا بھلا کہیں گے۔ اب اُن کو ندامت محسوس ہوئی اور وہ حضرت خالد کے لشکر میں جاکر شریک ہوئے۔[۱]

اگرچہ اس واقعہ کو نقل کرنے سے ہمارا مقصد یہ ثابت کرنا نہیں ہے کہ چونکہ حضرت ابوقتادہ بھی انصاری تھے اس بنا پر اُن کو پہلے سے ہی حضرت خالد کیساتھ اختلاف تھا اور وہ یہاں (مقام بطاح) میں آنے کیلئے تیار نہیں تھے۔ تاہم اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ اس قسم کے جزئی واقعات کو قانونِ شہادت کی رو سے کسی واقعہ کی اصل نوعیت کے متعین کرنے میں بڑا دخل ہوتا ہے۔ واقعۂ زیرِ بحث میں اگرچہ حضرت ابوبکر نے حضرت خالد کا عذر قبول فرمالیا اور پھر دوبارہ مسیلمہ سے جنگ کرنے کی غرض سے اُن کو اس عہدہ پر واپس کردیا لیکن حضرت ابوقتادہ کے دل میں حضرت خالد کیطرف سے جو تکدر پیدا ہوگیا تھا وہ پھر بھی نہ نکلا اور انھوں نے قسم کھالی کہ اب وہ آئندہ کبھی خالد کے جھنڈے کے نیچے نہیں چلیں گے یعنی ان کی سرداری میں کسی جنگ میں شریک نہیں ہوں گے۔[۲]

اب نفسیات کے کسی طالب علم سے دریافت کرو حضرت ابوقتادہ کا یہ رویہ کس چیز کی غمازی کر رہا ہے۔

اوپر ہم نے جو کچھ لکھا ہے اُس سے یہ بات بالکل صاف ہوجاتی ہے کہ اگر واقعی مالک بن نویرہ قتل سے پہلے ارتداد سے تائب ہو کر سچّا اور پکّا مسلمان بن بھی گیا تھا تو بے شبہ آخرت میں اس کو اس کا اجر ملے گا اور یہ معاملہ تو اس کے اور خدا کے درمیان ہے۔ لیکن جہانتک واقعات کی ترتیب اور ان کی تحقیق و تنقید کا تعلق ہے تو کوئی شبہ نہیں کہ حضرتِ خالد پر ایک مسلمان کے قتل عمد کا کوئی الزام عائد نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ حضرت خالد کی رائے اور یقین میں

[۱] کامل ابن اثیر ج ۲ ص ۲۷۲ [۲] تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۱۴۸۔

اپنے ارتداد پر بدستور قائم تھا اور مسلمان نہیں ہوا تھا چنانچہ حضرت ابوبکر سے حضرت خالد نے کہا تھا کہ مالک جب اثنائے گفتگو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرتا تھا تو آپ کیلئے صاحبکم کی ترکیب استعمال کرتا تھا[1] حضرت ابوبکر نے خالد کے اس عذر کو قبول فرمالیا تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ حضرت ابوبکر نے بھی مالک بن نویرہ کے عدم اسلام وقیام علی الارتداد کو تسلیم کرلیا تھا۔ ورنہ جیسا کہ حضرت ابوبکر کے الفاظ تاول فاخطاء سے متبادر ہوتا ہے۔ اگر واقعہ یہی ہے کہ حضرت خالد کو غلط فہمی ہوئی تھی اور اس بناپر انھوں نے ایک مسلمان کو قائم علی الارتداد سمجھ لیا تھا تو اگرچہ حضرت خالد ایک مسلمان کے قتل عمد سے بری ہوجاتے ہیں بہرحال ان کا مالک کی بیوی سے اس کی عدت وفات کے انقضاسے قبل نکاح کرلینا تو کسی طرح بھی جائز اور درست نہیں ہوسکتا۔ اور اس بناپر ضروری تھا کہ اول تو حضرت خالد اس عورت سے خود قطع تعلق کرلیتے اور اگر خود نہ کرتے تو کم ازکم حضرت ابوبکر کو حکم کرنا چاہئے تھا کہ وہ تعلق منقطع کردیں کیونکہ سرے سے نکاح ہی فاسد تھا۔

حافظ ابن حجر نے زبیر بن بکار کی روایت سے نقل کیا ہے کہ حضرت ابوبکر نے خالد بن الولید کو حکم کیا تھا کہ وہ مالک کی بیوی سے مفارقت اختیار کرلیں[2] ممکن ہے یہ روایت صحیح ہو اور حضرت ابوبکر نے واقعی حضرت خالد سے ایسا کہا ہو۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ حضرت خالد نے ام تمیم سے تعلق منقطع نہیں کیا چنانچہ حضرت خالد کی بنوحنیفہ کے ساتھ جو جنگ ہوئی ہے اس موقع پر ام تمیم حضرت خالد کے ساتھ موجود تھی اور حضرت خالد نے ایک خیمہ میں اس کی حفاظت پر مجاعہ کو مقرر کر رکھا تھا[3] اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ شرعاً حضرت خالد کا نکاح ام تمیم کیساتھ درست تھا۔ اسی بناپر نہ حضرت خالد نے اس سے از خود مفارقت اختیار کی اور نہ انھوں نے اس بارہ میں حضرت ابوبکر کے حکم یا مشورہ کی پرواکی۔ اگر یہ تسلیم

[1] الاصابہ ج ۳ ص ۳۳۷ [2] الاصابۃ ج ۳ ص ۳۳۷ [3] کامل ابن اثیر ج ۲ ص ۲۷۶ اس جنگ کا مفصل تذکرہ آگے آئیگا۔

کرلیا جائے کہ واقعی حضرت ابوبکر نے اس بارہ میں حکم دیا تھا۔

ایک اشکال اور اس کا جواب

اس موقع پر بعض مورخین کو اشکال یہ پیش آیا ہے کہ اچھا! ہم نے مانا کہ مالک بن نویرہ نے ارتداد سے توبہ نہیں کی تھی لیکن وجہ کیا ہے کہ جنگ بزاخہ کے موقع پر اپنے اپنے قبیلہ کے بڑے بڑے سردار قرۃ بن ھبیرہ۔ الفجاءۃ السلمی ابو شجرہ اور عیینۃ بن حصن الفزاری جیسے لوگ گرفتار ہوئے تو حضرت خالد نے ان کو سیدھا مدینہ بھیجدیا تھا اور خود اون کی نسبت کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ پھر مالک بن نویرہ کے بارے میں بھی ایسا کیوں نہیں کیا جب کہ وہ مرتبہ اور حیثیت میں ان لوگوں سے کسی طرح کم اور جرم کے اعتبار سے کسی طرح بڑھا ہوا نہیں تھا[1]

اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ درحقیقت حضرت ابوبکر اس قسم کے معاملات میں اپنے اعیان لشکر اور امرائے فوج پر پورا اعتماد کرتے اور انہیں کو وسیع اختیارات دیتے تھے۔ چنانچہ قعقاع بن عمرو کو ایک جماعت کے ساتھ علقمہ بن علاثہ کو اس کے ارتداد و بغاوت کی سزا دینے کے لئے روانہ کیا تو آپ نے فرمایا "علقمہ تمہارے ہاتھ پڑ جائے تو تمہیں اختیار ہے اس کو میرے پاس بھیجو یا تم خود قتل کر دو۔ اس کے بعد آپ نے یہ نہایت ہی حکیمانہ جملہ ارشاد فرمایا

واعلموا ان شفاء النفس الخوض	اور یاد رکھو کہ نفس کی شفا کسی کام کو خوب اچھی طرح
فاصنع ما عندك[2]	کرنے میں ہے۔ اس لئے جو تم کو مناسب معلوم ہو کرنا۔

اس عام پالیسی کے ماتحت اسی طرح کے اختیارات حضرت ابوبکر نے حضرت خالد بن الولید کو بھی دیئے تھے کہ جس مجرم کے حق میں وہ جو چاہیں اپنی صوابدید کے مطابق فیصلہ کریں حضرت خالد کے نام ایک مکتوبِ گرامی میں ارشاد فرماتے ہیں۔

لیزدك ما انعم الله به علیك	اللہ نے تم کو جو نعمتیں خیر کی دے رکھی ہیں اون میں
خیرا واتق الله فی امرك فان الله	اور اضافہ ہو تم اپنے معاملات میں اللہ سے برابر

[1] الصدیق ابوبکر از محمد حسین ہیکل مصر ص ۱۵۶ [2] طبری ج ۲ ص ۴۹۰۔

مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَالَّذِيْنَ هُمْ مُحْسِنُوْنَ جد في امر الله ولا تنين ولا تظفرن باحد قتل المسلمين الا قتلته ونكلت به غيره ومن احببت ممن حاد الله او ضاده ممن ترى ان في ذالك صلاحاً فاقتله [1]

ڈرتے رہو۔ کیوں کہ اللہ اُن لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جو متقی ہوتے ہیں اور نیک ہوتے ہیں تم اللہ کے معاملات میں پوری سعی کرو سستی نہ دکھاؤ۔ اور جن لوگوں نے مسلمانوں کو قتل کیا ہے ان میں سے اگر کوئی تمہارے ہاتھ لگ جائے تو اس کو قتل کردو اور اس طرح دوسروں کو سبق دو۔ اور ان کے علاوہ جن لوگوں نے اللہ سے انحراف یا بغاوت کی ہے اگر تمہاری رائے میں ان کو قتل کردینا مناسب ہو تو قتل کر دو۔

بلکہ جہاں تک مالک بن نویرہ کا تعلق ہے ایک روایت یہ بھی ہے کہ خود حضرت ابوبکر نے حضرت خالد سے قسم لی تھی کہ اگر مالک بن نویرہ ہاتھ پڑ جائے تو اسکو بلا تامل قتل کر دیں، اصل الفاظ یہ ہیں۔ وعزم عليه ليقتلن مالكاً ان اخذه [2]

مذکورہ بالا تقریر سے یہ بات صاف طور پر معلوم ہو جاتی ہے کہ مالک بن نویرہ قتل کے وقت مرتد تھا اُس نے اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ حضرت خالد نے اسی وجہ سے اُن اختیارات کے ماتحت جو حضرت ابوبکر نے ان کو دیئے تھے مالک کو قتل کیا اور وہ اس میں حق بجانب تھے۔ مالک کے بھائی متمم بن نویرہ کا قصہ ہے کہ ایک مرتبہ وہ حضرت عمرؓ کے پاس آیا اور اس نے بھائی کا جو مرثیہ لکھا تھا وہ سنایا تو فاروق اعظم پر اُس کا بڑا اثر ہوا اور فرمایا کہ اگر میں بھی شاعر ہوتا تو اپنے بھائی زید کا مرثیہ کہتا۔ متمم بن نویرہ بولا اے امیر المومنین دونوں برابر نہیں ہیں۔ اگر میرا بھائی بھی اسی طرح قتل ہوتا جیسا کہ آپکا بھائی ہوا ہے تو میں کبھی اپنے بھائی کا مرثیہ کہتا ہی نہیں، حضرت عمرؓ نے یہ سنکر فرمایا "جیسی تعزیت آج متمم بن نویرہ

[1] طبری ج ۲ ص ۴۹۱ [2] ابو ریاش احمد بن ابی ہاشم القیسی نے خاص حضرت خالد اور مالک بن نویرہ کے واقعہ پر ایک مستقل رسالہ لکھا تھا۔ شیخ عبد القادر بن عمر البغدادی نے اپنی مشہور کتاب خزانۃ الادب علی شواھد شرح الکافیہ میں اس رسالہ کا ایک اقتباس نقل کیا ہے۔ یہ جملہ اسی اقتباس میں ہے۔ دیکھو خزانۃ الادب جلد ا ص ۲۳۷ مطبعہ میریہ بولاق۔

نے میری کی ہے ایسی آج تک کسی نے کی ہی نہیں۔

علامہ ابن شاکر المتوفی ۷۶۴ھ اس واقعہ سے استدلال کرتے ہیں کہ مالک بن نویرہ خود اُس کے بھائی متمم کے نزدیک بھی مرتد قتل ہوا تھا اور حضرت عمر سے اُس نے جو کچھ کہا اُس کا مطلب یہ تھا کہ میں تو اپنے بھائی کو اس لئے روتا ہوں کہ وہ اسلام پر نہیں مارا گیا۔ اس کا انجام خراب ہوا لیکن آپ کے بھائی زید تو اسلام کیطرف سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے ہیں۔ حق کی راہ میں مارے گئے ہیں۔ اُن کے مراتب اور مدارج تو اللہ کے ہاں بہت بلند ہیں۔ تو پھر اُن کے ماتم کی کیا ضرورت ہے[1]

ام تمیم سے نکاح اس واقعہ میں حضرت خالد نے صرف ایک مالک بن نویرہ کو ہی تو قتل نہیں کیا تھا بلکہ اس کے جتنے ساتھی تھے وہ بھی قتل کر دئے گئے تھے۔ لیکن اس کے باوجود حضرت خالد کے خلاف جو شورش ہوئی اس کی بُنیاد مالک بن نویرہ ہی کا قتل تھا۔ اس سلسلہ میں کسی اور مقتول کا نام نہیں لیا جاتا۔ اس کی وجہ درحقیقت ایک تو یہ ہے کہ حضرت خالد نے مالک بن نویرہ کی بیوی ام تمیم بنت منہال سے اُسی روز نکاح کر لیا اور اس کی وجہ سے لوگوں کو موقع مل گیا کہ وہ اس نکاح کو قتلِ مالک کا سبب قرار دیں[2] اور دُوسری وجہ خود متمم بن نویرہ تھا جس نے اپنے مرثیوں سے آگ لگا دی تھی اور جو اُس وقت مدینہ کے بچہ بچہ کی زبان پر تھے۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ نے بھی اپنے بھائی عبدالرحمٰن بن ابی بکر کی شہادت پر وہی شعر بہ طور مرثیہ پڑھے ہیں اور صحیح بخاری میں درج ہیں۔

جہاں تک دوسری وجہ کا تعلق ہے تو ظاہر ہے یہ شعر کی کرشمہ سازیاں ہیں جن سے تاریخ ادب کے صفحات بھرے ہوئے ہیں۔ حضرت خالد پر اس کی ذمہ داری کیونکر عائد ہو سکتی ہے۔

رہی پہلی وجہ تو ہمارے خیال میں اصل صورت یہ پیش آئی ہے کہ حضرت خالد نے پہلے ام تمیم کو باندی بنایا ہوگا۔ اور یہ ثابت ہی ہے کہ گرفتار شدہ لوگ "سبایا" بنائے گئے تھے جنکو

---

[1] فوات الوفیات ج ۲ ص ۲۹۶ مطبوعہ مکتبۃ النہضۃ المصریہ۔ [2] چنانچہ اغانی وغیرہ میں (باقی ص ۲۰۸ پر)

بعد میں متمم بن نویرہ کی درخواست پر حضرت ابوبکر کے حکم سے آزاد کر دیا گیا تھا ——— لیکن ام تمیم نے فوراً ہی اسلام قبول کر لیا ہوگا تو اب حضرت خالد نے اُس سے نکاح کر لیا۔ معترضین کہتے ہیں کہ حضرت خالد اس کو دیکھ کر عاشق ہو گئے تھے اس لئے نکاح کیا۔ ممکن ہے یہ صحیح ہو لیکن جب نکاح شرعاً درست تھا اور مالک بر بنائے ارتداد قتل ہوا تھا تو اس میں شرع یا اخلاق کسی اعتبار سے کیا قباحت ہے۔ یہ تو اُس وقت ہے جب کہ معترضین کی بات کو صحیح مان لیا جائے۔ ورنہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ام تمیم چونکہ ایک عالی مرتبت اور معزز شخص کی بیوی تھی اور اب وہ بیوہ ہو گئی تھی اس لئے حضرت خالد نے اُس کی تسلی اور دلدہی کیلئے اُس سے نکاح کیا تھا۔ رہا قتل کے بعد فوراً نکاح کرنا! تو ہمارے خیال میں راوی کو اس میں شبہ ہوا ہے۔ کیونکہ طبری کے الفاظ یہ ہیں۔

وتزوج خالدٌ ام تمیم ابنۃ المنھال — خالد نے ام تمیم سے نکاح کیا اور پھر اسکو چھوڑ دیا

وترکھا لینقضی طھرُھا (ج ۲ ص ۵۰۲) — تاکہ اس کی مدتِ طہر پوری ہو جائے۔

غالباً مالک کے قتل کے بعد حضرت خالد ام تمیم کو بطور سبی اپنے خیمہ میں لے گئے ہوں گے اور پھر اس کے مسلمان ہو جانے پر کچھ دنوں کے بعد اس سے نکاح کیا ہوگا۔ اسی کو راوی نے اس طرح بیان کر دیا۔

یاد رکھنا چاہئے کہ یہ صرف ہمارا قیاس نہیں ہے بلکہ اس کی ایک اصل بھی موجود ہے۔

ابو زید وثیمہ بن الوشا ر المتوفی ۲۳۷ھ تیسری صدی کے ایک بلند پایہ مورخ ہیں۔ انھوں نے حضرت ابوبکر کے عہد میں فتنۂ ارتداد کا جو طوفان اٹھا تھا خاص اسی موضوع پر ایک مستقل کتاب "کتاب الردۃ" کے نام سے لکھی تھی۔ یہ کتاب اب ناپید ہے لیکن یہ کس پایہ کی کتاب

بقیہ ص ۲۰۷) لکھ ہی دیا کہ حضرت خالد تو اس عورت سے زمانۂ جاہلیت سے محبت کرتے تھے۔ حالانکہ جو شخص عرب کے اخلاق سے واقف ہے وہ جانتا ہے کہ محض بیوی حاصل کرنے کے لئے اسکے شوہر کو قتل کرنا انکے ہاں صد درجہ بزدلانہ اور غیر شریفانہ فعل سمجھا جاتا تھا تو پھر عرب بھی خالد بن ولید ایسا بہادر شخص اس بزدلی کا کیونکر مرتکب ہو سکتا تھا۔

تھی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ حافظ ابنِ حجر نے اصابہ میں جگہ جگہ اس کے حوالے دیئے ہیں اور اس کے اقتباسات نقل کئے ہیں۔ چنانچہ اصابہ کے انہیں اقتباسات کو ایک جرمن فاضل نے یک جا مرتب کر کے کتاب الردہ کے نام سے شائع کر دیا ہے۔ ابوزید وثیمہ کا تذکرہ وفیات الاعیان اور فوات الوفیات دونوں میں ہے اس کے علاوہ محمد بن عمر الواقدی نے بھی اسی موضوع پر اور اسی نام سے ایک کتاب لکھی تھی جسکا ایک نسخہ ابتدائی اور انکے مطابق اصلاح کرنی غرور سکا ہے پٹنہ میں موجود ہے۔ ابن شاکر نے متمم بن نویرہ کے تذکرہ میں وثیمہ اور واقدی ان دونوں کی مذکورۂ بالا کتابوں کے حوالہ سے حضرت خالد اور مالک بن نویرہ کا جو واقعہ نقل کیا ہے اُس میں حضرت خالد اور ام تمیم کے نکاح کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

قیل انہ اشتراھا من الفئ وتزوج بھا وقیل انھا اعتدت بثلاث حیض ثم خطبھا الی نفسہ فاجابتہ [۱]	کہا جاتا ہے کہ خالد نے ام تمیم کو مالِ غنیمت میں سے خریدا تھا اور پھر اس کیساتھ نکاح کر لیا تھا اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ام تمیم نے تین حیض کی عدت گزاری تھی اور اسکے بعد خالد نے اس کو اپنا پیغامِ نکاح دیا اور ام تمیم نے اس کو قبول کر لیا۔

کوئی کہہ سکتا ہے کہ اچھا جب بات یہی تھی تو پھر حضرت عمر نے حضرت خالد کے رجم کر دینے کا مطالبہ کیوں کیا۔ تو اس کے جواب میں ہم ایک روایت پیش کرتے ہیں جس سے یہ مسئلہ بالکل واضح ہو جائیگا۔ حافظ ابنِ حجر نے ضرار بن الازور الاسدی کے تذکرہ میں الاصابہ میں ایک روایت نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر فاروق کے عہدِ خلافت میں حضرت خالد نے ضرار بن الازور کے ماتحت بنو اسد کی طرف ایک دستہ (سریہ) روانہ کیا۔ اس دستہ نے بنو اسد پر چھاپہ مارا اور ایک عورت گرفتار کر لی۔ ضرار جو دستہ کے امیر تھے دہ مسلمانوں سے اجازت لیکر عورت کو اپنے تصرف میں لے آئے لیکن بعد میں ان کو ندامت ہوئی اور انھوں نے حضرت خالد سے درخواست کی

[۱] دیکھو فوات الوفیات ج ۲ صفحہ از ۶۲۵ تا صفحہ ۶۲۸

کہ وہ اس واقعہ کی اطلاع حضرت عمر کو کردیں اور اس کیلئے بارگاہِ خلافت سے باقاعدہ منظوری لے لیں۔ حضرت خالد کے نزدیک چونکہ اس کی ضرورت نہیں تھی اسلئے انھوں نے ضرار سے کہا کہ اسکی ضرورت نہیں ہے لیکن وہ نہ مانے۔ آخر حضرت خالد نے فاروقِ اعظم کو اس کی اطلاع دی تو آپ کو سخت غصہ آیا اور فوراً حضرت خالد کو حکم بھیجا کہ ضرار کو سنگسار کردیا جائے۔ اتفاق یہ ہوا کہ حکم پہونچنے سے پہلے ہی ضرار کا انتقال ہوگیا۔ اب حضرت خالد کو یہ حکم ملا تو انھوں نے فرمایا "اللہ ضرار کو رسوا کرنا نہیں چاہتا تھا"

اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ حضرت عمر اذنِ خلیفہ کے بغیر مال غنیمت میں تصرف کو ناجائز اور حرام سمجھتے تھے اور اسی بنا پر انھوں نے ام تمیم کیساتھ تسرّی کو حرام سمجھ کر حضرتِ خالد کو مستحق رجم قرار دیا۔ لیکن اس کے برخلاف حضرت خالد مسلمانوں کی باہمی رضامندی کے بعد مال غنیمت میں تصرف کو جائز قرار دیتے تھے۔ پھر یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت خالد نے درپردہ حضرت ابوبکر سے اس طرح کے تصرفات کیلئے اجازت لے رکھی ہو اور اسی بنا پر حضرت ابوبکر نے حضرت خالد کے خلاف اس معاملہ میں کوئی تادیبی کارروائی نہیں کی۔

چند ضمنی مباحث | تم پڑھ آئے ہو کہ جب ابوقتادہ انصاری نے مدینہ آکر حضرت خالد کی شکایت صدیق اکبر سے کی تو آپ سنکر غضب ناک ہوگئے اور ان کی شکایت پر کوئی اعتنا نہیں کیا۔ آخر ابوقتادہ حضرت عمر کے پاس آئے اور پورا واقعہ کہہ سنایا۔ حضرت عمر فاروق سخت برہم ہوئے اور اسی وقت حضرت ابوبکر کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا کہ "خالد کی تلوار میں فساد ہے" آپ انکو فوراً معزول کردیجئے اور میدان جنگ سے واپس بلالیجئے۔ اس کے علاوہ حضرت خالد کی شان میں کچھ اور بھی سخت الفاظ استعمال کئے۔ حضرت ابوبکر نے ان کو ٹوکا اور فرمایا کہ جس تلوار کو اللہ نے اپنے دشمنوں پر بے نیام کردیا ہے میں اُس کو نیام کے اندر واپس نہیں کرسکتا (اشارہ تھا حضرت خالد کے سیف اللہ ہونے کی طرف) لیکن حضرت عمر کا اصرار زیادہ بڑھا تو حضرت خالد کو مدینہ طلب کیا۔ خالد مدینہ پہونچکر مسجد نبوی میں سے گزر رہے تھے کہ وہاں فاروقِ اعظم

نے ان کو دیکھ کر سخت سست کہا لیکن انھوں نے پروا نہیں کی۔ وہ سیدھے صدیق اکبر کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ گفتگو ہوئی اور اس کے بعد حضرت ابوبکر نے متمم بن نویرہ کو اس کے بھائی کا خون بہا بیت المال سے ادا کیا اور خالد بن ولید کو بطاح واپس کر دیا۔ یہ پڑھنے کے بعد قدرتی طور پر حسب ذیل سوالات پیدا ہوتے ہیں۔

(۱) اگر حضرت خالد خلیفۂ رسول کی رائے میں بے گناہ تھے تو انھوں نے خون بہا کیوں ادا کیا؟

(۲) حضرت ابوبکر اور حضرت عمر میں اس قدر شدید اختلاف کی وجہ کیا ہے۔

اب ہم ہر ایک سوال کا جواب الگ الگ بالترتیب لکھتے ہیں۔

حضرت ابوبکر کا دیت ادا کرنا

اگرچہ حضرت خالد سے گفتگو کے بعد اور دوسرے ذرائع سے بھی واقعہ کی اصل نوعیت حضرت ابوبکر پر روشن ہو گئی تھی لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حضرت خالد نے عجلت پسندی اور بے احتیاطی سے کام لیا تھا اگر وہ مالک بن نویرہ کو قتل کرنے کی بجائے مدینہ بھیج دیتے تو جب وہ دیکھتا کہ سب ہی ناموران وزعمائے قبائل مسلمان ہوئے جا رہے ہیں تو ممکن ہے وہ بھی مسلمان ہو جاتا۔ اس کے علاوہ ام تمیم سے نکاح کیسا ہی جائز سہی۔ بے احتیاطی کا عمل ضرور تھا۔ ان دونوں باتوں کی وجہ سے اول تو خود حضرت ابوبکر کو ناگواری تھی ہی[1] پھر متمم بن نویرہ کی تالیفِ قلب اور حضرت عمر فاروق کی تسکین خاطر بھی ضروری تھی ان مصالح کے پیشِ نظر آپ نے متمم کو دیت بیت المال سے ادا کی۔ آپ کا یہ عمل محض بر بنائے مصلحت و سیاست تھا۔ اس لئے نہیں تھا کہ آپکی رائے میں بھی حضرت خالد ایک مسلمان کے قتلِ خطا کے مرتکب ہوئے تھے۔ چنانچہ جیسا آگے آئیگا۔ عراق کی

---

[1] حافظ ابن حجر نے زبیر بن بکار کی روایت سے نقل کیا ہے کہ جب خالد کے پاس اموال غنیمت آتے تھے تو وہ انکو ارباب غنائم میں تقسیم کر دیتے تھے اور ان کا حساب حضرت ابوبکر تک نہیں پہونچاتے تھے وہ بعض اوقات ایسے اقدامات بھی کر جاتے تھے جن کو حضرت ابوبکر اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ مالک بن نویرہ کا قتل اور اس کی بیوہ کے ساتھ نکاح حضرت ابوبکر نے ان دونوں باتوں کو مکروہ سمجھا۔ الاصابہ ج ۱ ص ۴۱۴ تذکرۂ خالد بن الولید۔

فتوحات کے سلسلہ میں مصیخ نامی ایک مقام پر حضرت خالد نے عبد العزیٰ جس کا نام بعد میں عبد اللہ ہوگیا تھا اور لبید بن جریر ان دونوں کو جو دشمن کے کیمپ میں تھے قتل کر دیا تھا لیکن بعد میں پتہ چلا کہ یہ دونوں مسلمان تھے اور اس بارہ میں ان کے پاس حضرت ابو بکر کی ایک تحریر بھی تھی حضرت ابو بکر کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے ان کی دیت ادا کی لیکن ساتھ ہی حضرت خالد کی طرف سے معذرت کرتے ہوئے فرمایا کہ یوں ادا کرنیکو تو میں نے ادا کر دی ہے لیکن دراصل یہ دیت مجھ پر واجب نہیں تھی کیونکہ یہ دونوں مقتول اہل حرب کے ہاں مقیم اور اُن کے مہمان تھے (طبری ج ۲ ص ۵۸۱)

اور حقیقت یہ ہے کہ اور معاملات کی طرح اس ایک معاملہ میں بھی خلیفۂ رسول نے بعینہ وہی کیا جو اسی قسم کے ایک واقعہ میں (جبکہ حضرت خالد کے ہاتھوں بنو جذیمہ کے لوگوں کا قتل عمل میں آیا تھا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا۔ آپ نے اس واقعہ کو سنکر ایک طرف تو دونوں ہاتھ اٹھا کر دو مرتبہ فرمایا۔

اللھم انی ابرءُ الیک مما صنع خالد[1]	اے اللہ جو کچھ خالد نے کیا ہے میں تیری جناب میں اس سے برأت کا اظہار کرتا ہوں۔

اور دوسری جانب حضرت علی کو مقتولین بنی جذیمہ میں سے ہر ایک کی نصف دیت (خون بہا) ادا کی۔ حضرتنا الاستاذ مولانا سید محمد انور شاہ الکشمیریؒ فرماتے ہیں کہ میری رائے میں یہ خون بہا محض مصالحت کی غرض سے ادا کیا گیا تھا۔ کیوں کہ مقتولین کے ورثہ نے کوئی مطالبہ نہیں کیا تھا لیکن رحمتِ عالمؐ نے پسند نہیں کیا کہ اُن کا خون رائگاں جائے۔[2] لیکن بایں ہمہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد کو معزول نہیں کیا۔ اور اس واقعہ کے بعد بھی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں وہ برابر فوجی امارت کے عہدہ پر سرفراز رہے۔

شیخین کا اختلاف اب صرف ایک بات باقی رہتی ہے اور وہ یہ کہ آخر حضرت ابو بکر اور حضرت

---

[1] صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۲۲ باب بعث النبی صلی اللہ علیہ وسلم خالد بن الولید الی بنی جذیمۃ۔

[2] فیض الباری علی صحیح البخاری ج ۴ ص ۱۱۷

عمرؓ میں اس درجہ شدید اختلاف کی وجہ کیا تھی ؟

ایک وہ شخص جس کی نظر عہدِ نبوت اور اس کے بعد کی تاریخ پر ہے جانتا ہے کہ خلیفہ اول و دوم کا یہ اختلاف پہلی مرتبہ نہیں تھا عہدِ نبوت میں بھی دونوں میں متعدد بار مختلف معاملات و مسائل میں اختلاف ہوا۔ اور اُس کے بعد جیش اسامہؓ کی روانگی کے وقت اور مانعین زکوٰۃ سے جہاد کرنے کے بارے میں بھی اختلاف ہوا تھا لیکن جب کبھی اختلاف ہوا فاروقِ اعظم کو آخر میں اقرار کرنا پڑا کہ حضرت ابوبکرؓ کی جو رائے تھی وہی صواب تھی۔ چنانچہ اس موقعہ پر بھی ایسا ہی ہوا۔ حضرت عمرؓ نے بعد میں فرمایا :-

رحم اللہ ابا بکرٍ ھو کان اعلم منی بالرجال	اللہ تعالیٰ ابوبکرؓ پر رحم فرمائے وہ مجھ سے زیادہ مردم شناس واقع ہوئے تھے۔

حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں ایک مرتبہ متمم بن نویرہ نے حاضر ہو کر حضرت خالدؓ سے قصاص کا مطالبہ کیا تو آپ نے فرمایا :-

لا ارد شیئاً صنعہ ابوبکرٍ[1]	ابوبکرؓ جو کر گئے ہیں میں اسکو رد نہیں کروں گا۔

اصل یہ ہے کہ حضرت عمرؓ جن کی شان میں فرمایا گیا تھا " اشدھم فی امر اللہ عمر انھوں نے ابو قتادہ انصاری سے مالک بن نویرہ کا واقعہ سنا تو چونکر بنو جذیمہ کیساتھ بھی اس قسم کا واقعہ پیش آچکا تھا اس بنا پر ان کو سخت غصہ آیا۔ کیونکہ بحکم حسنات الابرار سیأت المقربین وہ ایک صحابی سے اس طرح کے فعل کا صدور اور وہ بھی مکرر بہت مستبعد جانتے تھے، اس کے برخلاف حضرت ابوبکرؓ کا معاملہ یہ تھا کہ ہر بات میں اسوۂ رسولؐ کا اتباع ان کی فطرت اور طبیعت بن گئی تھی۔ وہ انسانی فطرت کی کمزوریوں سے بھی اچھی طرح واقف تھے اور دوسری طرف سیاست اور فوجی تدابیر کا جو مقتضا تھا اُس سے بھی پورے طور پر آگاہ تھے۔ حضرت ابوبکرؓ کی رائے میں اگر حضرت خالدؓ سے کسی غلطی کا ارتکاب ہوا بھی تھا تو بہر حال وہ اتنی بڑی غلطی ہرگز نہیں

---

[1] خزانۃ الادب ج ۱ ص ۲۳۸

تھی جس کی پاداش میں حضرت خالد ایسے مدبر سپہ سالار اور بہادر جرنل کی قیادت سے لشکر کو محروم کر کے اسلامی محاذِ جنگ کو خطرہ میں ڈالتے۔ بارگاہِ خلافت کی طلب پر حضرت خالد کا مدینہ چلا آنا اور خلیفۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رُوبرو معذرت خواہ ہونا بھی حضرت خالد کے جرمِ فروگزاشت کی تلافی کیلئے کافی تھا۔ آج کی مہذب دُنیا میں کیا ہوتا ہے؟ کسی ذمہ دار شخصیت سے بڑے سے بڑا جرم سرزد ہو جاتا ہے لیکن صرف ایک لفظ "افسوس" (REGRET) کہدینا ہی اسکی مکافات کر دیتا ہے۔ حضرت عمر فاروق کے مزاج میں اوّلاً تو شدت تھی ہی پھر اس وقت تک حکومت کی براہِ راست ذمہ داری کا بوجھ بھی اُن کے کاندھوں پر نہیں پڑا تھا لیکن جیسا کہ حضرت ابوبکر نے وفات کے وقت اپنی جانشینی کیلئے فاروق اعظم کے نام کی سفارش کرتے ہوئے پیشگوئی کی تھی۔ جب خود حضرت عمر کو حکومت و خلافت کے بارِ گراں کا متحمل ہونا پڑا تو ان کے تشدد میں خود بخود اعتدال کا رنگ پیدا ہو گیا۔

مسیلمہ اور اہلِ یمامہ سے جنگ

یاد ہوگا کہ حضرت ابو بکر صدیق نے باغی و مرتد قبائل سے جنگ کرنیکی غرض سے جو گیارہ لشکر مختلف اطراف میں روانہ کیے تھے ان میں سے ایک لشکر جو مسیلمہ کیطرف روانہ کیا گیا تھا عکرمہ بن ابی جہل کی سرکردگی میں تھا لیکن بعد میں محسوس ہوا کہ یہ لشکر ناکافی ہوگا تو آپ نے شرجبیل بن حسنہ کے ماتحت ایک لشکر اور بھیجا۔ حضرت عکرمہ نے یمامہ پہونچتے ہی شرجبیل کا انتظار کئے بغیر حملہ کردیا لیکن اس کو پسپا ہونا پڑا۔ ادھر شرجبیل کو اسکی اطلاع ہوئی تو وہیں راستہ میں ٹھہر گئے۔ عکرمہ نے حضرت ابو بکر کو اصل واقعہ کی خبر کی تو آپ کو بڑا ملال ہوا اور عکرمہ کو لکھا کہ اب آئندہ تم میری شکل نہ دیکھنا اور میں تمہاری شکل نہ دیکھوں گا۔ ساتھ ہی حکم بھیجا کہ وہ حذیفہ اور عرفجہ کے پاس پہنچکر عمان اور مہرہ کے لوگوں کیساتھ جنگ کریں اور یہاں سے فارغ ہو کر یمن اور حضر موت کا رُخ کریں۔ اب رہے شرجبیل تو اُنکو حکم بھیجا کہ وہ جہاں ہیں وہیں رہیں یہاں تک کہ خالدؓ پہنچ جائیں۔

حضرت خالد کی نامزدگی غالباً حضرت ابو بکر صدیق کو مسیلمہ کی طاقت کا شروع میں صحیح اندازہ نہیں تھا اور اسی وجہ سے حضرت خالد کو ابتداءً اس محاذ پر نہیں بھیجا گیا تھا۔ لیکن جب عکرمہ کو شکست ہوئی اور ساتھ ہی معلوم ہوا کہ مسیلمہ کے ساتھ چالیس ہزار عرب کے منتخب نبرد آزما ہیں تو اب آپ کو موقع کی نزاکت اور اہمیت کا صحیح اندازہ ہوا۔ اب ظاہر

ہے اتنے بڑے معرکہ کو سر کرنیکے لئے سیف اللہ کے سوا اور کس کے نام قرعہ فال نکل سکتا تھا چنانچہ حضرت خالد دربارِ خلافت کی طلبی پر بطاح سے مدینہ آئے اور یہاں مالک بن نویرہ کے واقعہ کی جو صورتِ حال پیدا ہوگئی تھی جب حضرت خالد کا بیان سُننے کے بعد حضرت ابوبکر کو اُس کے متعلق اطمینان ہوگیا تو اب حضرت ابوبکر نے معرکۂ یمامہ کو سر کرنیکی پوری ذمہ داری حضرت خالد کے سپرد کی۔

نامورانِ مہاجرین وانصار کی شرکت

غزوۂ بدر کے بعد یمامہ کا معرکہ سب سے بڑا معرکہ تھا جبکہ اسلام کی زندگی اور موت کا قطعی فیصلہ ہونیوالا تھا۔ اسی بناپر حضرت ابوبکر نے صرف حضرت خالد کے بھیجنے پر اکتفا نہیں کی۔ بلکہ نامورانِ مہاجرین وانصار جو بدر و حنین کے معرکے سر کرچکے تھے اور جن میں بڑے بڑے حفاظ و قرّا تھے ان کو بھی اس جنگ کیلئے نامزد کیا گیا مہاجرین کے دستہ کے سردار حضرت ابوحذیفہ اور حضرت عمر فاروق کے بھائی زید بن خطاب تھے اور انصار کا دستہ ثابت بن قیس بن شماس کی ماتحتی اور نگرانی میں تھا[1]

غرضکہ اس شان وشوکت اور اہتمام کیساتھ حضرت خالد مسیلمہ سے جنگ کرنیکے لئے یمامہ روانہ ہوئے تو پہلے بطاح آئے یہاں جو لشکر پہلے سے موجود تھا اسکو ساتھ لیا اور یمامہ روانہ ہوگئے۔ حضرت ابوبکر نے اس خیال سے کہ کوئی پیچھے سے حملہ نہ کردے۔ حضرت خالد کی عقب میں سلیط کی سرکردگی میں ایک اور دستہ روانہ کیا۔

مجاعہ کی گرفتاری

حضرتِ خالد یمامہ سے ابھی ایک شب کی مسافت پر تھے کہ ان کو ایک دستہ ملا جس کا سردار مجاعہ بن مرارہ تھا جو بنو حنیفہ کے معززترین لوگوں میں شمار ہوتا تھا یہ دستہ بنو تمیم اور بنو عامر پر شبخون مار کر آرہا تھا۔ حضرت خالد کے حکم سے اس دستہ کے سب

---

[1] صحابہ بدریین کو حضرت ابوبکر اس قدر عزیز رکھتے اور ان کو اس درجہ بابرکت سمجھتے تھے کہ آپ ان کا کسی جنگ میں جانا پسند نہیں کرتے تھے (طبری ج ۲ ص ۵۰۵) یمامہ کے معرکہ کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ حضرت ابوبکر کو اپنے ذاتی رجحان کے برخلاف اس موقع پر بدری صحابہ کو بھی بھیجنا پڑا۔

آدمی قتل کر دیئے گئے اور مجاعہ گرفتار کر لیا گیا۔ اب لشکر آگے بڑھا اور یمامہ کے ایک مقام عقربا، پہونچا جہاں مسیلمہ اپنا لشکرِ کثیر لئے بڑا تھا جس کی تعداد عام مورخین کے بیان کے مطابق چالیس ہزار اور بعض روایات میں ساٹھ ہزار بیان کی جاتی ہے۔[1]

لشکر کی ترتیب دوسرے دن صبح کو حضرتِ خالد نے اپنے لشکر کو اس طرح ترتیب دی کہ دائیں بازو (میمنہ) کے کمانڈر حضرت زید بن خطاب تھے اور بائیں بازو (میسرہ) کی قیادت حضرت اسامہ بن زید کے سپرد تھی۔ اور خود ایک دستہ لئے ہوئے وسطِ لشکر میں تھے ادھر مسیلمہ نے اپنے لشکر کی صف بندی کی اور دونوں لشکر ایک فیصلہ کن جنگ کے لئے ایک دوسرے کے رُوبرو کھڑے ہوگئے۔

جنگ کا آغاز اب مسیلمہ کیطرف سے شرحبیل بن مسیلمہ نے بنو حنیفہ کو للکار کر کہا اے لوگو! آج کا دن غیرت کا دن ہے۔ اگر تم لوگ شکست کھا گئے تو تمہاری عورتوں کو لونڈی باندیاں بنا لیا جائے گا۔ اور بغیر نکاح کے اُن کیساتھ تمتع کیا جائیگا۔ اس لئے تم اپنے حسب و شرف کی طرف سے مدافعت کرو اور اپنی عورتوں کو بچاؤ۔ ادھر مجاہدینِ اسلام کے ولولہ و جوش کا یہ عالم تھا کہ:- "جوہرِ شمشیر سے باہر تھا دَم شمشیر کا"

مجاہدین کا جوش و خروش مہاجرین کا عَلَم حضرت سالم مولی حُذیفہ کے ہاتھ میں تھا۔ کسی نے کہا کہ آپ اگر قتل ہو گئے تو ایک حاملِ قرآن جاتا رہے گا۔ انھوں نے کہا "اگر میں اس بات کا اندیشہ کر دوں تو مجھ سے بُرا حاملِ قرآن کون ہوگا۔ نہار رجال ایک شخص تھا جس نے مشہور کر دیا تھا کہ محمد رسُول اللہ نے اپنی نبوّت میں سے نصف کا شریک مسیلمہ کو کر لیا ہے اور اس طرح مسیلمہ کا دست راست تھا۔ اس نے صف سے باہر نکل کر پکارا کہ ہل من مبارز کیا مجھ سے کوئی مقابلہ کرنیوالا ہے۔ اُس کے جواب میں اسلامی لشکر کیطرف سے حضرت عمر فاروق کے بھائی زید بن خطاب آگے بڑھے اور انھوں نے اس زور کا وار کیا کہ نہار رجال ڈھیر تھا۔ اب

---

[1] طبری ج ۲ ص ۵۰۵ -

دونوں لشکر گت پت ہوگئے اور بڑے زور کا رن پڑا۔ مسیلمہ کا ایک ایک آدمی اس پر پروانہ وار اپنی جان قربان کرنے پر تلا ہوا تھا۔ کیونکہ اس کو یقین تھا کہ اگر اس جنگ میں شکست ہوگئی تو حجاز کی سیادت جنوبی عرب پر ہمیشہ کیلئے قائم ہو جائیگی۔ اور شدید قبائلی عصبیت کے باعث یہ چیز انکی موت کے مرادف تھی مسلمانوں کو ایسی ہولناک اور سخت جنگ لڑنیکا پہلا اتفاق تھا۔ اسلئے اول اول مسلمان پسپا ہوگئے۔ یہ رنگ دیکھ کر مسیلمہ کی فوج کا حوصلہ یہاں تک بڑھا کہ اُسنے حضرت خالد کے خیمہ پر حملہ کردیا۔ یہاں حضرت خالد کی نئی بیوی ام تمیم تھیں حملہ آوروں نے چاہا کہ انھیں قتل کردیں لیکن مجاعہ جسکو حضرت خالد ام تمیم کی نگرانی میں رکھ گئے تھے اس نے روکا اور کہا کہ میں اس عورت کا پڑوسی ہوں۔ ان لوگوں نے اب ام تمیم سے تو کوئی تعرض نہیں کیا لیکن خیمہ کی دھجیاں اڑادیں۔

مسلمانوں کا دوسرا حملہ اب مسلمانوں نے اپنے آپکو سنبھالا اور ایک دوسرے کو پکار پکار کر ثابت قدمی اور استقلال کی دعوت دینے لگا ثابت بن قیس نے کہا "آہ! اے مسلمانو! آخر تم کو کیا ہوگیا ہے۔ اے اللہ! ان مسلمانوں نے جو پسپائی دکھائی ہے میں اُس سے بری ہوں۔ زید بن خطاب بولے "خدا کی قسم! اب میں اُس وقت تک زبان نہیں کھولوں گا جب تک کہ ہم لوگ دشمنوں کو شکست نہیں دے دیں گے یا میں خود قتل نہیں کردیا جاؤں گا۔ ابوحذیفہ نے للکار کر کہا" اے اہلِ قرآن! تم اپنے افعال سے قرآن کو زینت دو۔ یہ مجاہدینِ اسلام اپنی اپنی جگہ پر شیر کی طرح ہنکار رہے تھے کہ اتنے میں حضرت خالد نے پلٹ کر اس زور کا حملہ کیا کہ دشمن پیچھے ہٹنے پر مجبور ہوگیا۔ لیکن کچھ فاصلہ پر پہونچکر جوابی حملہ کیا اور جنگ تیز ہوگئی۔ مہاجرین۔ انصار۔ اہلِ قری اور اہلِ بادیہ ان سب کے دستے ایک دوسرے کیساتھ ملے ہوئے دادِ شجاعت دے رہے تھے۔ حضرت خالد نے حکم دیا کہ ہر دستۂ فوج الگ الگ ہوجائے۔ اب حضرت خالد نے جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ مہاجرین۔ انصار اور اہلِ قری کو بہ نسبت اہلِ بادیہ کے زیادہ نقصان پہونچا تھا۔ اور مشہور صحابہ حضرت زید بن خطاب۔ حضرت سالم اور اُن کے آقا حضرت ابوحذیفہ اس معرکہ میں کام آچکے تھے۔ حضرت خالد

نے دشمن کی جمعیت پر نگاہ ڈالی تو دیکھا کہ مسیلمہ اپنی جگہ پر جما ہوا کھڑا ہے اور اسکے حمائیتوں نے چاروں طرف سے اس کو اپنے حلقہ میں لے رکھا ہے اب حضرت خالد نے محسوس کیا کہ جب تک مسیلمہ کے دستۂ خاص پر حملہ کر کے اسے شکست نہیں دی جائیگی دشمن کی جمعیت منتشر نہ ہو گی۔ چنانچہ انھوں نے یک بیک وا محمداہ کا نعرہ لگایا اور مسیلمہ کے دستہ پر حملہ کر دیا۔ اب عالم یہ تھا کہ دشمن کی فوج کا ایک ایک بہادر سر بکف ہو کر آگے بڑھتا تھا اور اس کی لاش خاک و خون میں تڑپ کر رہ جاتی تھی۔ مسیلمہ نے یہ دیکھ کر چاہا کہ خود مقابلہ کیلئے آگے بڑھے۔ لیکن شدتِ خوف و اضطراب سے ایک قدم آگے بڑھاتا تھا اور پھر اُسے پیچھے ہٹا لیتا تھا۔ اتنے میں حضرت خالد نے اپنے دستہ کے مجاہدوں کیساتھ اچانک اس زور کا حملہ کیا کہ اب مسیلمہ کیلئے راہِ فرار اختیار کرنیکے سوا کوئی چارۂ کار نہیں رہا۔ مسیلمہ کے جاں نثاروں نے ہر چند اس سے کہا کہ "تو ہم سے جس فتح و ظفر کا وعدہ کرتا تھا وہ کہاں ہے؟ لیکن اب اس کیلئے ٹھہرنا ناممکن تھا۔ خود بھاگتا جاتا تھا اور لوگوں سے کہہ رہا تھا۔" اپنے حسب و نسب کی طرف سے مدافعت کرو۔ لیکن ظاہر ہے اب اسکی ان باتوں کا اثر ہی کیا ہو سکتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی فوج کے پاؤں اُکھڑ گئے اور وہ بھی میدانِ جنگ چھوڑ کر بھاگ پڑی۔ ذرا فاصلہ پر ایک باغ تھا جس کی چہار دیواری محفوظ تھی۔ محکم بن الطفیل نے چیخ کر کہا۔ اے بنو حنیفہ باغ! باغ! یعنی اس میں چل کر پناہ لو۔ یہ باغ درحقیقت مسیلمہ کا قلعہ تھا اور چونکہ مسیلمہ اپنے آپکو رحمٰن الیمامۃ کہتا تھا اس لئے باغ کا نام حدیقۃ الرحمٰن تھا۔ یہ سب لوگ اس میں پہنچکر قلعہ بند ہو گئے۔

مسیلمہ کا قتل

اسلامی لشکر نے اس قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ اندر جانیکا راستہ نہیں تھا اسلئے حضرت براء بن مالک نے مسلمانوں سے درخواست کی کہ وہ ان کو اُوپر اٹھا کر باغ (قلعہ) کے اندر ڈال دیں۔ مجاہدین نے کہا " ہم ایسا نہیں کریں گے" لیکن براء بن مالک نے اصرار کیا۔ تو مسلمانوں نے مجبوراً اُن کو باغ کی دیوار پر پہونچا دیا اور اندر کیطرف کود کر تن تنہا لڑتے بھڑتے

گھسے چلے گئے۔ یہاں تک کہ دروازہ کھول دیا۔ بس اب کیا تھا؟ مسلمان باغ کے اندر گھس آئے اور پھر شدید جنگ شروع ہوگئی۔ دونوں طرف سے کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ لیکن بنوحنیفہ کے مقتولین کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اس معرکہ میں مسیلمہ بھی جبیر بن مطعم کے غلام وحشی کے ہاتھوں مارا گیا۔ اب بنوحنیفہ کیلئے جمنا ناممکن تھا۔ پسپا ہوکر بھاگ پڑے۔

حضرت خالد کو یہ خوشخبری پہونچی تو مجاعہ کو لیکر بنوحنیفہ کے مقتولین کو دیکھنا شروع کیا۔ ایک طرف محکم کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ یہ شخص خوبصورت اور وجیہ تھا۔ حضرت خالد نے پوچھا "کیا تمہارا سردار (مسیلمہ) یہی ہے؟" مجاعہ نے جواب دیا "نہیں! بخدا یہ اس سے زیادہ بہتر اور شریف ہے۔ یہ محکم الیمامہ ہے۔ محکم کو حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر نے ایک تیر مار کر اُس وقت ہلاک کیا تھا جبکہ ابھی باغ کے احاطہ سے باہر پیچھے سے اپنے ساتھیوں کی حفاظت کر رہا تھا۔

اب حضرت خالد قلعہ کے اندر داخل ہوئے یہاں ایک لاش کی طرف اشارہ کرکے مجاعہ نے بتایا کہ یہ مسیلمہ ہے اس دن سے اس باغ کا نام ہی "حدیقۃ الموت" یعنی موت کا باغ پڑ گیا۔ اور اسی نام سے وہ تاریخوں میں مشہور ہے۔ طبری کا بیان ہے کہ باغ سے باہر اور اندر دس ہزار آدمی مسیلمہ کے اور بارہ سو مسلمان مجاہدین قتل ہوئے۔[1]

باقی قلعوں پر قبضہ اس مہم سے فارغ ہونیکے بعد عبداللہ بن عمرؓ اور عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ نے حضرت خالد کو مشورہ دیا کہ باقی دوسرے قلعوں پر بھی جہاں مسیلمہ کے ساتھی ابھی تک محفوظ ہیں حملہ کیا جائے۔

اِدھر مجاعہ نے جس پر حضرت خالدؓ اعتماد کرنے لگے تھے آکر کہا کہ مسیلمہ کیساتھ جو لوگ آئے تھے جلد باز قسم کے تھے ورنہ ایک بہت بڑی تعداد تو ابھی تک قلعوں میں بند ہے۔ مجاعہ کا مقصد اس کہنے سے صرف یہ تھا کہ حضرت خالدؓ بنوحنیفہ کے بچے کھچے لوگوں کیساتھ مصالحت کرلیں اور ان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ مراعات برتیں۔ چنانچہ مجاعہ نے ایک طرف تو حضرت

[1] یہ پوری تفصیل طبری ج ۲ از صفحہ ۵۰۴ تا صفحہ ۵۱۹ و ابن اثیر ج ۲ از صفحہ ۲۷۲ تا صفحہ ۲۸۰ سے ماخوذ ہے۔

خالد سے یہ کہا اور دوسری جانب اپنی قوم کی عورتوں سے کہا "تم سب ہتھیار پہن لو اور قلعوں کی مونڈیروں پر کھڑی ہو جاؤ۔ عورتوں نے فوراً اس پر عمل کیا اب حضرت خالد نے یہاں پہنچکر نظر اٹھائی تو دیکھا کہ قلعوں پر زرہ پوش اور ہتھیار بند سپاہیوں کی صفیں کھڑی ہیں ادھر چونکہ مسیلمہ کے ساتھ مسلمان مجاہدین کو بڑی شدید جنگ لڑنی پڑی تھی اس لئے وہ تھکے ماندے اور گھر واپس جانے کیلئے بیقرار تھے۔ ان وجوہ کی بنا پر مجاعہ نے جو ترکیب چلی تھی وہ کامیاب ہوئی اور حضرت خالد نے معمولی سی شرطوں پر صلح کرلی۔ بعد میں جب مجاعہ کی فریب کاری کا بھید کھلا تو حضرت خالد کو بڑا غصہ آیا۔ لیکن مجاعہ نے صاف کہا "یہ لوگ (بنو حنیفہ) میرے ہم قوم ہیں۔ اس لئے میرے لئے ناممکن تھا کہ میں ان کی مدد نہ کرتا۔"

صلح ہو جانیکے بعد حضرت خالد نے ان سب بقیۃ السیف پر اسلام پیش کیا۔ جسکو انھوں نے فوراً قبول کرلیا۔ اور حضرت خالد نے ازروئے صلح جو کچھ اُن سے وصول کیا تھا وہ سب ان کو واپس کر دیا[1]

جنگ یمامہ کی تاریخ یہ جنگ یمامہ کب ہوئی؟ اس میں اختلاف ہے۔ کوئی ۱۱ھ بتاتا ہے۔ اور کوئی ۱۲ھ حافظ عماد الدین ابن کثیر نے دونوں میں تطبیق اس طرح دی کہ اس کا آغاز تو ہوا ۱۱ھ میں لیکن ختم ہوئی ۱۲ھ میں واللہ اعلم[2]

حدیقۃ الموت کا جائے وقوع عام طور پر محدثین اور مورخین کے ہاں مشہور ہے اور جیسا کہ ہم نے بھی لکھا ہے۔ کہ مسیلمہ کیساتھ یہ جنگ یمامہ میں لڑی گئی تھی اور حدیقۃ الموت جس میں مسیلمہ قتل ہوا تھا اس کی نسبت بھی تسلیم کیا جاتا ہے کہ وہ یمامہ کی حدود میں یا اس کے قریب ہی تھا۔ لیکن مشہور مستشرق ڈاکٹر اسپرنگر[3] جس نے ابو اسماعیل الازدی کی کتاب "فتوح الشام" کو ۱۸۵۴ء میں اڈٹ کیا تھا اُس نے ایک اور مستشرق کپٹن لیس (LEES) کو ۷ر فروری ۱۸۶۵ء کو ایک

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۶ ص ۳۲۵ [2] البدایۃ والنہایۃ ج ۶ ص ۳۲۶ - [3] ڈاکٹر اسپرنگر اور سر ولیم لنسان لیس یہ دونوں کلکتہ مدرسہ کے جو مسلمانوں میں عام طور پر مدرسہ عالیہ کلکتہ کے نام سے مشہور ہے پرنسپل تھے۔ اول الذکر ۱۸۵۰ء میں اور موخر الذکر ۱۸۵۷ء میں)

خط لکھا تھا جو ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کی کارروائیوں (P roceed inqs) کی رپورٹ بابت ۱۸۶۵ء میں از صفحہ ۱۰۳ تا صفحہ ۱۰۷ چھپا ہوا ہے۔ اس میں ڈاکٹر موصوف نے یہ ثابت کیا ہے کہ مسیلمہ کا باغ یمامہ میں نہیں۔ بلکہ مقام ہجر میں ہے۔

جنگ کا اثر | مرتد اور باغی قبائل سے جتنی لڑائیاں لڑی گئی ہیں ان میں یمامہ کی جنگ سب سے بڑی اور سخت ترین تھی۔ مسیلمہ کے ساتھ جو لشکر تھا اس کی تعداد اکثر نے چالیس ہزار اور بعضوں نے ساٹھ ہزار لکھی ہے اور یہ سب کے سب مسیلمہ پر پروانہ وار فدا تھے جس کے متعدد اسباب و وجوہ کا ذکر پہلے آچکا ہے۔

موقع کی اس نزاکت کے باعث وہ اکابر مہاجرین و انصار جن کو حضرت ابوبکر مدینہ سے باہر بھیجنا پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کو بھی محاذِ جنگ پر بھیجا گیا اور اگرچہ اس معرکہ میں مسلمانوں کو شدید نقصان پہونچا۔ اکابر صحابہ اور بڑے بڑے حفاظ و قراء[1] جام شہادت نوش کر گئے۔ لیکن چونکہ اسلام کے سب سے بڑے حریف پر یہ آخری اور فیصلہ کن فتح تھی جس نے جزیرۃ العرب میں ہمیشہ کیلئے اسلام کے قدم جما دئے اور اُس کو کسی مخالفت کا اندیشہ نہیں رہا۔ اس لئے اسلامی فوج فتح و ظفر کا پرچم اُڑاتی ہوئی جب مدینہ میں داخل ہوئی ہے تو مدینہ کا گوشہ گوشہ مرحبا اور آفریں کے نعروں اور حمد و صلوٰۃ کے نغموں سے گونج اٹھا۔ جو صحابۂ کرام اس جنگ میں شہید ہو گئے تھے۔ اُن کا غم ہونا ایک طبعی بات تھی۔ لیکن نصرتِ خداوندی پر ترانہ ہائے حمد کی آوازوں میں نوحۂ و ماتم کی یہ صدائیں دب دب کر رہ گئیں۔

اس فتح و کامرانی پر حضرت ابوبکر سے زیادہ خوش ہونیکا حق اور کسے ہو سکتا تھا۔ لیکن آپکو بارہ سو صحابہ کے شہید ہو جانیکا رنج و ملال بھی کم نہیں تھا چنانچہ آپ کو اطلاع ہوئی کہ حضرت خالد نے جنگ کے بعد مجاعہ کی بیٹی سے نکاح کر لیا ہے تو انتہائی حلیم و بردبار ہونیکے باوجود حضرت خالد کو ایک سخت غضب آلود خط لکھا کہ" اے ام خالد کے بیٹے! معلوم ہوتا ہی تمہارے

---

[1] ابن اثیر اور بلاذری نے اجلۂ صحابہ کے ناموں کی فہرست دی ہے۔

دل میں درد نہیں ہے۔ تم اُس وقت عورتوں سے نکاح کرتے ہو جبکہ تمہارے گھر کے صحن میں بارہ سو[2] مسلمانوں کا خون ابھی تک خشک نہیں ہوا ہے" [1]

بحرین

حضرت خالد جس وقت یمامہ کی جنگ میں مصروف تھے دوسرے مسلمان قائدین فوج جن کا ذکر پہلے آچکا ہے حضرت ابوبکر صدیق کے احکام کے مطابق عرب کے مختلف حصوں میں باغیوں کے ساتھ مصروفِ پیکار تھے۔ اُنہیں میں سے ایک ریگستانی صوبہ بحرین کا تھا جو مدینہ سے بہت دُور شمال مشرق میں خلیج فارس کے کنارہ پر واقع تھا۔ یہ علاقہ حکومتِ ایران کے ماتحت تھا اور اس میں متعدد عرب قبائل بنو عبدالقیس، بکر بن وائل اور تمیم آباد تھے جن کا سردار ایران کی طرف سے مقرر کیا جاتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں یہ سردار منذر بن ساوی تھا جس کے نام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لکھے ہوئے تو خطوط ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے اپنی قابلِ قدر کتاب "الوثائق السیاسیہ" میں نقل کئے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر منذر اور بحرین کے صدر مقام ہجر کا گورنر (مرزبان) یہ دونوں مسلمان ہو گئے تھے اور ان کے ساتھ جتنے عرب قبائل یہاں آباد تھے۔ انھوں نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا۔ یہ واقعہ ۸ھ کا ہے۔[2] بعض مورخین اس کو نو ہجری کے واقعات میں شمار کرتے ہیں لیکن اصح اوّل ہی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے چند روز بعد ہی منذر بن ساوی کا بھی انتقال ہو گیا تو حطم ایک سردار کیساتھ بنو عبدالقیس اور بنو بکر مرتد ہو گئے۔ لیکن جارود بشر بن عمرو العبدی جنھوں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فیضِ صحبت حاصل کیا تھا اُن کی کوششوں سے بنو عبدالقیس تو جلدی اسلام کیطرف لوٹ آئے۔[3] لیکن بنو بکر کو اپنے ارتداد پر اصرار رہا اور ان لوگوں نے نعمان بن منذر بن ماء السماء (صاحب الخورنق والسدیر) کے بیٹے کو جس کا نام بھی منذر تھا

[1] طبری ج ۲ ص ۵۱۹ [2] فتوح البلدان بلاذری ص ۸۵ [3] طبری ج ۲ ص ۵۱۹

اپنا سردار منتخب کرلیا۔ الحطم بن ضبیعہ، بنو بکر اور دوسرے عجمی لوگ جو بحرین میں آباد تھے اور جو سرے سے مسلمان ہی نہیں ہوئے تھے اُن کو ساتھ ملا کر مقام جوآثا میں حضرت جارود کیخلاف محرکہ آرا ہوا۔ ان لوگوں نے مسلمانوں کا محاصرہ کرکے سامانِ رسد تک سے اُن کو محروم کردیا لیکن مسلمان فقر و فاقہ اور ان تمام سختیوں کے باوجود اسلام کے دامن کو پکڑے رہے۔

یہی حالات گزر رہے تھے کہ حضرت ابوبکرؓ نے علاء بن الحضرمی کو بحرین کے محاذ پر روانہ کیا۔ علاء بحرین اُس وقت پہونچے ہیں جب کہ حضرت خالد مسیلمہ کی جنگ سے فارغ ہو چکے ہیں۔ اس بنا پر بنو حنیفہ کے بچے کھچے لوگ جو اب مسلمان ہو گئے تھے وہ بھی حضرت علاء کے ہم رکاب ہو گئے۔ ان کے علاوہ ثمامہ بن آثال اور قیس بن عاصم المنقری بھی اپنے اپنے لوگوں کیساتھ اس لشکر میں شریک ہو گئے۔ حضرت علاء اپنے لشکر کو لئے ہوئے صحرائے دھنا میں سے گذر رہے تھے کہ شام ہوگئی تو انھوں نے ایک مقام پر پڑاؤ ڈالا تاکہ رات کے وقت جنگل میں کہیں راستہ نہ بھول جائیں۔ جب یہ لشکر پڑاؤ ڈالے پڑا تھا اتفاق ایسا ہوا کہ اُونٹ جن پر سامانِ خورد و نوش لدا ہوا تھا بدک کر بھاگ پڑے اور یہاں کھانے پینے کی کوئی چیز باقی نہیں رہی۔ مسلمان سخت پریشان ہوئے۔ یہاں تک کہ انہیں اپنی موت کا یقین ہوگیا اور ایک دوسرے کو وصیت کرنے لگا۔ حضرت علاء بن الحضرمی نے اُن کی ہمت بندھائی اور کہا کہ اے لوگو! کیا تم سب مسلمان نہیں ہو۔ کیا تم اللہ کے انصار اور اُس کی راہ میں جہاد کرنیوالے نہیں ہو؟ تم یقین رکھو کہ اللہ تم جیسے لوگوں کو کبھی رسوا اور ذلیل نہیں کریگا۔ چنانچہ اسلامی فوج جب نمازِ فجر سے فارغ ہوئی تو اُن کو دور سے سراب چمکتا نظر آیا۔ فوج کے پیش رو دستہ نے پاس جاکر دیکھا تو وہ پانی تھا بہت خوش ہوئے سب نے پانی پیا۔ غسل کیا اور اپنے اپنے مشکیزوں میں بھر لیا۔ اس کے بعد آفتاب ذرا بلند ہوا تھا کہ اچانک اُونٹ بھی ادھر اُدھر بھاگتے ہوئے واپس آگئے۔ مسلمانوں کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اب یہ لشکر تازہ دم ہو کر روانہ ہوا اور بحرین پہونچا۔ یہاں جارود مقامی مسلمانوں کی جمعیت کیساتھ حطم بن ضبیعہ کے بالمقابل صف آرا تھے۔ حضرت علاء بن الحضرمی نے جارود کو

پیغام بھیجا کہ تم اپنی جگہ پر ڈٹے رہو۔ لیکن حطم کا لشکر تعداد میں بہت زیادہ تھا اور ساز و سامان بھی اس کے پاس بافراط تھا۔ اس لئے حضرت علاء اور حطم دونوں ایک دوسرے کے مقابلہ میں خندقیں کھود کر پڑ گئے۔ دن کے وقت یہ دونوں فوجیں خندقوں سے باہر آ کر جنگ کرتی تھیں اور پھر خندقوں میں واپس چلی جاتی تھیں ایک ماہ تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ فتح و شکست کسی فریق کو نہیں ہوتی تھی۔ آخر ایک رات دشمن کے لشکر میں اچانک شور و غل اور مار دھاڑ کی آواز بلند ہوئی۔ حضرت علاء نے عبداللہ بن حذف کو خبر لانے کے لئے بھیجا۔ انھوں نے آکر بتایا کہ فریق مخالف کے سپاہی شراب میں بدمست ہیں اور خوش فعلیاں کر رہے ہیں۔ حضرت علاء یہ سنتے ہی اپنی فوج کو لیکر ان لوگوں پر جا پڑے اور تلوار چلانی شروع کر دی، یہ لوگ سخت بدحواس ہو کر رہ گئے۔ ان میں کچھ قتل ہو گئے۔ کچھ گرفتار ہوئے۔ کچھ ادھر ادھر جہاں جگہ نظر آئی چھپ گئے اور باقی جو تھے وہ بھاگ پڑے۔ اسی ہنگامہ میں حطم مارا گیا۔

جو لوگ اس دارو گیر سے بچ نکلے تھے وہ کشتیوں میں سوار ہو کر جزیرہ دارین[1] پہونچے۔ حضرت علاء نے ان لوگوں کا تعاقب کرنا چاہا لیکن مشکل یہ تھی کہ مسلمانوں کے پاس کشتیاں نہیں تھیں کہ وہ سمندر پار کر سکتے۔ آخر حضرت علاء نے مسلمانوں کو جمع کر کے کہا کہ کچھ خوف نہ کرو۔ جس خدا نے تمہاری مدد خشکی (صحرائے دھنا) میں کی ہے وہ بحر میں بھی تمہاری مدد کریگا اسکے بعد سب مسلمانوں نے ملکر جناب باری تعالیٰ میں عجز و الحاح کیساتھ دعا کی۔ دعا سے فارغ ہوئے تو مسلمانوں میں اس قدر جوش و خروش تھا کہ گھوڑا۔ اونٹ۔ گدھا اور خچر غرض کہ جس کے پاس جو سواری تھی اس نے بے جھجک سمندر میں ڈال دی۔ بقول اقبال

بحر ظلمات میں دوڑا دئے گھوڑے ہم نے

اس شان سے مسلمانوں نے سمندر پار کیا اور جزیرہ دارین کے ساحل پر پہونچے۔ یہاں چونکہ مفرورین کے لئے اب کہیں بھاگ نکلنے کی گنجائش نہیں تھی اس لئے وہ بڑی بے جگری

[1] دارین خلیج فارس کے جزیروں میں سے ایک جزیرہ تھا جو بحرین کے سامنے ہی تھا۔ یہاں کی آبادی زیادہ تر عیسائی تھی۔

سے لڑے لیکن فتح مسلمانوں کو ہی ہوئی۔ اور یہ سب لوگ لقمۂ اجل بن گئے۔ طبری کی روایت ہے کہ اس جنگ میں مالِ غنیمت اس کثرت سے ہاتھ آیا کہ ایک ایک سوار کو چھ چھ ہزار اور پاپیادہ کو دو دو ہزار ملے۔ حضرت علاء، اسی دن بحرین کیلئے واپس روانہ ہو گئے اور بحرین پہنچکر حضرت ابوبکر کو مژدۂ فتح کا خط لکھا اور جو حالات گذرے تھے سب از اول تا آخر لکھے۔ اب یہاں مرتدین اور باغیوں کی طاقت مکمل طور پر ٹوٹ چکی تھی جو بچ رہے تھے سب مسلمان ہو گئے۔ کسی نے خبر اُڑا دی کہ بنو شیبان حملہ کی تیاریاں کر رہے ہیں لیکن یہ محض افواہ تھی۔ حضرت علاء نے تحقیق کی تو اس کی کوئی اصلیت نہ تھی [1]

جنگِ بحرین کی اہمیت | اگرچہ اس جنگ کا نمبر جنگِ یمامہ کے بعد ہے۔ لیکن بعض خاص اعتبار سے یہ جنگ یمامہ سے بھی زیادہ اہم تھی۔ یمامہ میں صرف ایک قوم اور ایک گروہ سے واسطہ تھا۔ لیکن بحرین چونکہ خلیج فارس پر واقع تھا۔ ایران کی حکومت کے ماتحت تھا اور یہاں ہندوستان اور ایران کے تاجر آباد تھے جنھوں نے فرات کے دہانہ سے عدن تک اپنی آبادیاں قائم کر رکھی تھیں اس بنا پر اسلام کی یہ جنگ صرف کسی ایک قوم سے نہیں تھی، بلکہ بین الاقوامی تھی۔ اور پھر چونکہ ان لوگوں میں عیسائی بھی تھے اور یہودی بھی۔ آتش پرست بھی تھے اور بُت پرست بھی اس لئے اس جنگ کو بین المذاہبی جنگ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس جنگ میں مسلمانوں کو جو شاندار فتح ہوئی اور اثرات ونتائج کے علاوہ اس کا اثر یہ بھی ہوا کہ جزیرہ نمائے عرب کے شمال مشرق میں ایرانی حکومت نے اسلام کیخلاف ریشہ دوانیوں کا جو جال پھیلا رکھا تھا اس کا تار و پود بکھر گیا اور مسلمانوں کیلئے عراق کی فتح کا راستہ کھل گیا جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

عمان و مہرہ

عمان بحرین سے قریب ہی بحرِ ہند کے ساحل پر واقع ہے۔ یہاں زیادہ آبادی قبیلہ اُزد کی

---

[1] یہ پوری تفصیل ملخصاً طبری ج ۲ از صفحہ ۵۱۹ تا صفحہ ۵۲۸ سے ماخوذ ہے۔

تھی لیکن دوسری قومیں بھی ان کیساتھ رہتی تھیں۔ ۸ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوزید انصاری کو جو قبیلۂ خزرج سے تعلق رکھتے تھے تبلیغ اسلام کیلئے بھیجا جیفر اور عبید جو یہاں کے امیر تھے ان کے نام عمرو بن العاص کے ذریعہ ایک مکتوب والا ارسال فرمایا۔ جیفر او عبید دونوں نے اسلام کی دعوت کو لبیک کہا اور پھر اُن کی دعوت پر باقی عرب بھی مسلمان ہوگئے۔[1]

لیکن جب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو ازد سب مرتد ہو گئے۔ لقیط بن مالک ذوالتاج جس نے اُس زمانہ کی عام ہوا کے مطابق نبوّت کا دعوی کیا تھا۔ اور ان مرتدین کا قائد تھا اس نے عمان پر قبضہ کرلیا اور جیفر اور عبید[2] کو مجبوراً پہاڑوں میں پناہ لینی پڑی حضرت ابوبکر کو ان حالات کا علم ہوا تو آپ نے حذیفہ بن محصن اور عرفجہ بن ہرثمہ کو عمان کے محاذ پر روانہ کیا اور ان کے عقب میں عکرمہ بن ابی جہل کو بھیجا جو یمامہ کی جنگ میں شکست کھا چکے تھے۔ حذیفہ اور عرفجہ ابھی عمان پہونچے بھی نہیں تھے کہ عکرمہ اُن سے آملے۔ عمان کے قریب پہونچ کر ان حضرات نے جیفر اور عبید کو اپنی آمد کی خبر کی اور یہ بھی اسلامی فوج سے آکر مل گئے۔ اب اسلامی فوج نے عمان کے دارالسلطنت مقام صحار میں پڑاؤ ڈالا اور ادھر لقیط بن مالک اپنی فوج لئے مقام دبا میں پڑا تھا۔ آخر مسلمانوں نے پیش قدمی کرکے لقیط پر حملہ کیا بڑا سخت قسم کا معرکہ ہوا۔ جنگ کے پہلے دَور میں دشمن کا پلہ بھاری نظر آتا تھا اور اس کی وجہ سے مسلمانوں میں اضطراب و تشویش کی لہر دوڑ گئی کہ اسی اثناء میں خریت بن راشد۔ بنو ناجیہ کا لشکر اور سیحان بن صوحان بنو عبدالقیس کی ایک بڑی جمعیت لئے ہوئے پہونچ گئے۔ اچانک اس غیبی امداد کو دیکھ کر مسلمانوں کے دل بڑے مضبوط ہو گئے اور انھوں نے پینترا بدل کر اس زور کا حملہ کیا کہ دشمن کے پاؤں اکھڑ گئے۔ ابن اثیر کا بیان ہے کہ اس معرکہ میں دشمن کی فوج کے دس ہزار آدمی قتل ہوئے اور بہت بڑی تعداد میں مال غنیمت ہاتھ آیا۔ اس کا پانچواں حصہ حضرت عرفجہ کے ہاتھ مدینہ روانہ کر دیا گیا۔ اور حضرت حذیفہ یہاں کے انتظام اور دروبست کی غرض سے

[1] فتوح البلدان بلاذری ص ۸۳ ۔ [2] ابن اثیر نے عبید کا نام عیاذ لکھا ہے ج ۲ ص ۲۸۵

عمان ہی میں قیام پذیر رہے۔[1]

اب رہے عکرمہ بن ابی جہل تو وہ ایک لشکرِ کثیر کے ساتھ مہرہ چلے گئے۔ یہاں مہرہ میں دو گروہ تھے جو آپس میں ایک دوسرے کے رقیب و حریف تھے۔ ایک گروہ کا سردار ایک شخص سخریت نامی تھا اور دوسرے گروہ کا امیر مُصبح نام کا ایک شخص تھا جو بنو محارب سے تعلق رکھتا تھا۔ ان دونوں میں مصبح کا گروہ نسبتہً زیادہ طاقتور اور با اقتدار تھا۔ اب حضرت عکرمہ نے سیاسی چال یہ چلی کہ جو گروہ کمزور تھا اُس کو اپنا ہم نوا بنانے کی کوشش کی۔ چنانچہ اس مقصد کیلئے سخریت سے گفت و شنید کی۔ سخریت نے بڑی خوشی سے عکرمہ کی دعوت پر لبیک کہا اور مسلمان ہوگیا۔ اب عکرمہ نے مصبح کو دعوتِ اسلام دی لیکن وہ اپنی طاقت پر نازاں تھا اسلئے یہ دعوت قبول نہیں کی، عکرمہ نے اعلان جنگ کر دیا۔ شدید قتال کے بعد مُصبح شکست کھا گیا اور قتل کر دیا گیا جو لوگ اسلام کی شمشیرِ خارا شگاف سے بچ رہے تھے مسلمان ہو گئے۔[2]

یمن

پہلے گزر چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات ہی میں اسود عنسی نے یمن میں نبوت کا دعویٰ کرکے فتنہ و فساد کی آگ بھڑکائی تھی اور چند روز کے بعد ہی اس کا صفایا کر دیا گیا تھا۔ اسود عنسی کے قتل ہو جانے کے بعد یمن میں سخت قسم کی طوائف الملوکی اور لاقانونیت پیدا ہوگئی یہاں تک کہ مسلمانوں کو اپنی جان اور عزت کا محفوظ رکھنا دشوار ہوگیا۔ اسود عنسی کی فوج کے سردار تھے کہ صنعا اور عدن کے درمیان گھوڑے دوڑاتے پھرتے تھے اور جو جی میں آتا تھا کرتے تھے۔ اسود عنسی کے ساتھیوں کے علاوہ عرب کا مشہور بہادر اور شہسوار عمرو بن معدیکرب اور قیس بن عبدیغوث یہ دونوں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خبرِ وفات سنتے ہی مرتد ہو گئے تھے اس بنا پر پورے یمن میں فتنہ و فساد کی آگ بھڑک اٹھی تھی اور مدینہ اور یمن کا درمیانی راستہ تک خطرناک ہو گیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے

---

[1] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۸۵ [2] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۸۶۔

جو عمّال اور امرا یہاں مقرر تھے انھوں نے حضرت ابوبکرؓ کو اصل صورتِ حال سے مطلع کیا۔ فیروز دیلمی جس نے اسود عنسی کو قتل کیا تھا ابنا سے تعلق رکھتا تھا جو اگرچہ ایرانی النسل تھے لیکن مدت سے یمن میں آباد ہو گئے تھے اور یہاں اچھا خاصہ اقتدار رکھتے تھے اس بنا پر یہ تمام باغی اور فتنہ پرداز ابنا کے خاص طور پر دشمن تھے اور اُن کو یمن سے جلاوطن کرنیکا ارادہ کئے ہوئے تھے۔

حضرت ابوبکرؓ کو ان حالات کا علم ہوا تو آپ نے فیروز دیلمی کو یمن میں اپنا نائب مقرر فرمایا اور عمر ذی مران۔ سعید ذی ذود۔ ذوالکلاع الحمیری اور حوشب ذی ظلیم وغیرہم جو یمن کے با اقتدار لوگ تھے اور اسلام پر قائم تھے ان سبکو حکم بھیجا کہ وہ فیروز کی اطاعت کریں اور اُن کیساتھ پُورا تعاون کریں۔ فیروز دیلمی نے بنو عقیل بن ربیعہ اور بنو عک وغیرہما قبائل جو اسلام پر قائم تھے ان کو اپنے ساتھ لیکر صنعاء سے باہر قیس بن عبد یغوث بن مکشوح کا سخت مقابلہ کیا اور ابنا جنکو وہ جلاوطن کرنے پر تلا ہوا تھا اُنہیں قیس کے پنجۂ ظلم سے نجات دی۔ یہ سب کچھ ہو ہی رہا تھا کہ اتنے میں حضرت ابوبکرؓ کی ہدایت اور حکم کے مطابق ایک طرف ادھر شمال سے مہاجر بن ابی امیہ اور انکے بعد ہی عکرمہ بن ابی جہل عمان و مہرہ کی مہم سے فارغ ہو کر یہاں پہونچ گئے۔ اب مسلمانوں کی طاقت اس قدر زیادہ اور مضبوط تھی کہ ان کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ چنانچہ معمولی سی جھڑپوں کے بعد ہی قیس شکست کھا گیا اور گرفتار ہو گیا۔ ادھر عمرو بن معدیکرب کا حوصلہ ٹوٹ گیا تھا۔ اُس نے خود اپنے آپکو مسلمانوں کے حوالہ کر دیا۔ مہاجر بن ابی امیہ نے ان دونوں کو مدینہ روانہ کیا جہاں حضرت ابوبکرؓ کیساتھ معمولی سی گفتگو اور ان کی فہمائش کے بعد دونوں پھر مسلمان ہو گئے اور عراق و شام کی مہمات میں شریک ہوئے۔ اب مہاجر صنعاء میں آکر مقیم ہو گئے اور عکرمہ نے جنوبی یمن میں قیام کیا اور اس طرح پورا یمن فتنہ و فساد سے پاک صاف ہو کر پھر گہوارۂ امن بن گیا۔[1]

مہم یمن کی اہمیت اس مہم کی سب سے اہم اور بڑی خصوصیت یہ ہے کہ فیروز الدیلمی۔ داذویہ اور دوسرے ابنا یہ سب اگرچہ یمن میں آبسے تھے لیکن ایرانی النسل تھے۔ اس بنا پر اگرچہ قیس بن مکشوح مسلمان تھا اور اسود عنسی کے قتل کے مشورہ میں بھی شریک تھا لیکن ان سب باتوں کے

[1] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۸۷ و ۲۸۸

باوجود حضرت ابوبکر صدیق نے جب فیروز کو اپنا نائب مقرر کیا تو اس کی عربی عصبیت کی رگِ غیرت و حمیت بھڑک اٹھی اور یہ مرتد ہو گیا اس کے بعد اس نے ایک جمعیت اپنے ارد گرد فراہم کر کے ان ایرانی النسل متوطنینِ یمن سے یمن کو پاک و صاف کر دینے کا ایک منصوبہ باندھا۔ لیکن حضرت ابوبکر نے اس کا یہ منصوبہ ناکام بنا دیا اس طرح گویا تاریخ اسلام میں یہ سب سے پہلا واقعہ ہے جبکہ عربی عصبیت کے سر پر عملاً ایک ضرب کاری لگا کر اسلامی اخوت و مساوات کی مثال قائم کی گئی اُس کا اثر جہاں عربوں پر یہ ہوا کہ ان کی آنکھ کھل گئی غیر عربی قوموں پر یہ ہوا کہ ان کیلئے اسلام میں زیادہ کشش پیدا ہو گئی۔ قیس بن مکشوح کو حضرت ابوبکر صدیق نے ایک ایرانی النسل مسلمان ادذویہ کے قصاص میں چاہا کہ اسے قتل کر دیں لیکن چونکہ قیس نے یہ قتل خفیہ طور پر کیا تھا اور اس کے ثبوت کیلئے کوئی شہادت نہیں مل سکی اس لئے یہ قتل نہیں کیا جا سکا اور پھر ارتداد سے توبہ کر لینے پر معاف کر دیا گیا [۱]

کندہ و حضرموت

کندہ اور حضرموت بھی یمن سے قریب ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیطرف سے ان دونوں جگہوں کے گورنر (عامل) زیاد بن لبید الانصاری تھے جن کا کام صدقات کے جمع کرنیکے علاوہ اسلامی احکام و مسائل کی تعلیم و تبلیغ بھی تھا۔ جب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد عرب کے دوسرے قبائل مرتد ہوئے تو اہلِ کندہ و حضرموت بھی اس گمراہی سے محفوظ نہیں رہے اشعث بن قیس کندہ کا نہایت معزز اور نامور شخص تھا۔ ۱۰ھ میں کندہ کے اسّی [۲] آدمیوں کیساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس شان سے حاضر ہوا تھا کہ یہ اور اس کے سب ساتھی ریشمین لباس پہنے ہوئے تھے اشعث نے اسلام قبول کیا لیکن اب کندہ اور حضرموت میں جو ارتداد پیدا ہوا اُس کی قیادت بھی اسی کے ہاتھ میں تھی۔ زیاد بن لبید الانصاری نے مقابلہ کیا لیکن جم نہ سکے

[۱] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۸۸ [۲] حافظ ابن حجر نے بروایت ابن سعد تعداد ستر بتائی ہے الاصابہ ج ۱ ص ۶۶

اتنے میں مہاجر بن امیہ اور عکرمہ دونوں یمن سے یہاں پہونچ ہی گئے۔ حضرت مہاجر نے عکرمہ کو تو وہیں چھوڑا اور خود ایک لشکر لیکر زیاد بن لبید سے ملے اور پھر دونوں نے پیش قدمی کرکے محجر الزبرقان نامی ایک مقام پر اشعث بن قیس کو چیلنج کیا۔ دونوں فوجوں میں سخت معرکہ آرائی ہوئی۔ اشعث جم نہیں سکا۔ اُس نے اپنے ساتھیوں کیساتھ بھاگ کر قلعۂ النجیر میں پناہ لی اور قلعہ بند ہو کر بیٹھ گیا۔ اسلامی فوج قلعہ کا محاصرہ کرکے پڑ گئی۔ جب محاصرہ طویل ہوا اور سامان رسد وغیرہ کا پہونچنا بھی مسدود ہو گیا تو آخر جان کی بازی لگا کر یہ سب باہر نکل آئے اور بڑی بہادری کیساتھ لڑے لیکن اس درمیان میں حضرت عکرمہ بھی اپنی فوج لیکر آ گئے تھے اس لئے اشعث بن قیس نے ان کو درمیان میں ڈالکر حضرت مہاجر سے پناہ طلب کی۔ یہ پناہ نو آدمیوں کیلئے طلب کی گئی تھی۔ لیکن اشعث کچھ ایسا بدحواس تھا کہ جب اُس نے اُن نو آدمیوں کے ناموں کی فہرست پیش کی تو اُس میں خود اپنا نام لکھنا بھول گیا۔ اس بنا پر قلعہ کے اُن نو آدمیوں کو جن کے نام درج فہرست تھے امن دیدیا گیا اور اشعث گرفتار کرکے مدینہ بھیجدیا گیا یہاں حضرت ابو بکر اور اشعث میں طویل گفتگو ہوئی جس میں اشعث نے دوبارہ مسلمان ہونے اور اسلام پر ثابت قدم رہنے کا اقرار واعتراف کیا اور حضرت ابو بکر صدیق نے معاف کر دیا۔ اشعث بن قیس جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر مسلمان ہوئے تو انھوں نے حضرت ابو بکر صدیق کی بہن ام فروہ سے نکاح کرنے کی درخواست کی تھی لیکن اُس وقت نکاح نہیں ہو سکا تھا۔ اب ارتداد سے تائب ہونے کے بعد انھوں نے پھر اپنی اس خواہش کا اعادہ کیا تو حضرت ابو بکر نے یہ درخواست منظور فرما لی اور بہن کا نکاح ان سے کر دیا۔ اس کے بعد ان کا قیام مع متعلقین کے مدینہ میں ہی رہا اور عراق وشام کی مہمات میں کارہائے نمایاں انجام دیئے[1] کندہ وحضرموت کی یہ جنگ حروب ارتداد وبغاوت کے سلسلہ کی آخری کڑی ہے جس پر اُنکا خاتمہ ہو گیا اور پورا عرب اسلام کے علم کے نیچے آ گیا۔ ان جنگوں میں بہت سے لوگ باندی غلام بھی بنائے گئے تھے لیکن حضرت عمر فاروق نے

[1] الاصابہ ج ۱ ص ۶۶ -

فدیہ لے لیکر اُن سبکو آزاد کردیا اور فرمایا "یہ بات عرب کیلئے بہت بُری ہے کہ اُن میں سے کوئی کسی کا مملوک ہو" عہدِ اسلام میں جو لوگ باندی غلام بنائے گئے تھے حضرت عمرؓ نے صرف انہیں کے ساتھ نہیں بلکہ عہدِ جاہلیت کے باندی غلاموں کو بھی آزاد کردیا[1]

حروبِ ارتداد و بغاوت پر ایک نظر

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے مسند آرائے خلافت ہوتے ہی پورے عرب میں ارتداد و بغاوت کا طوفان جب زور شور سے اٹھا تھا تو تمہیں یاد ہو گا اُس وقت مدینہ کی حالت کیا تھی؟

حضرت عائشہؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی زبانی تم سُن آئے ہو کہ مدینہ میں جو مسلمان تھے اُن کی حالت اس بکری کے مانند تھی جو سخت سرد رات میں بارش میں بھیگی کھڑی ہو۔

اسلام دشمنی اور دینِ محمدی کی مخالفت کی ایک ہمہ گیر آگ تھی جس کے شعلے شمال میں حدود شام اور الجزیرہ تک جنوب میں بحرِ سند کے کناروں تک مشرق میں عراق عرب اور خلیج فارس تک اور مغرب میں بحرِ احمر کے سواحل اور تنگنائے باب المندب تک پھیلے ہوئے تھے۔ لیکن دنیا نے دیکھا کہ ایک سال سے بھی کم مدت میں مجاہدینِ اسلام نے کس طرح تعداد، سازوسامان اور اسلحہ ہر اعتبار سے اقلیت میں ہونیکے باوجود شر و فساد کی ان تمام طاقتوں کو فنا کرکے دینِ قیم کی فتح و ظفر کا پرچم لہرایا اور پورے جزیرۃ العرب کو اسلام کے جھنڈے کے نیچے لاکھڑا کردیا۔ یہ واقعہ تاریخ عالم کا ایک نہایت ہی اہم واقعہ ہے کہ اسی سے انسانی تہذیب و معاشرت۔ کلچر اور فکر و نظر میں وہ عظیم الشان انقلاب پیدا ہوا جس کا داعی اسلام تھا ورنہ اگر خدانخواستہ اسلام خود اپنے وطن میں گھُٹ کر رہ جاتا تو باہر کی دنیا پر اُس کا کیا اثر ہو سکتا تھا۔ اس انقلاب کا ہیرو اور لیڈر کون ہے؟ وہی ابوبکر صدیقؓ جن کی رقتِ قلب کا یہ عالم تھا کہ حضورِ پُر نور کی جگہ نماز کی امامت کو کھڑے ہوئے تو آنسوؤں کی لڑی بندھ گئی لیکن آج یہی وہ رقیق القلب انسان ہے، جو خون کی روشنائی سے اسلام کی عظمت و حقانیت کی

---

[1] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۹۲

دستاویز مرتب کر رہا ہے، شدت و رقت۔ قہر و مہر اور رحم و تشدد کا یہ لطیف امتزاج ایک انسانِ کامل جس کی سیاست سرتاپا سیاست محمدی ہو اُس کے سوا اور کس میں ہو سکتا تھا۔ رضی اللہ عنہ

اس فتنہ کا استیصال جس تیزی اور قوت کیساتھ ہوا ہے اس پر مستشرقین کو سخت حیرت ہے۔ چنانچہ کیتانی کا خیال ہے کہ ان تمام جنگوں سے فراغت ایک سال میں نہیں بلکہ دو سال میں ہوئی ہوگی [1] لیکن درحقیقت یہ صرف خیال ہی خیال ہے۔ تمام مورخین لکھتے ہیں کہ ۱۲ھ کے آغاز میں حضرت ابوبکر نے شام و عراق کی مہم شروع کر دی تھی اور یہ ناممکن تھا کہ اندرون عرب استحکام و استقلال حاصل کئے بغیر وہ کسی اور طرف توجہ کرتے۔

اصل یہ ہے کہ حروبِ ارتداد کا ایک طویل سلسلہ۔ وسیع و عریض محاذِ جنگ۔ اور عرب قبائل کا تمرد و سرکشی ان سب چیزوں کی وجہ سے کیتانی [2] اور اُسکے ہم خیال مستشرقین کی سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ اس محاذِ جنگ کا قطعی فیصلہ ایک برس کی قلیل مدت میں کیوں کر ہو گیا ہوگا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ فتوحات عراق و شام کا سلسلہ بھی تو، جیسا آگے چل کر معلوم ہوگا۔ کافی دراز و وسیع ہے اور پھر یہاں تو مقابلہ رومی اور ایرانی اُس وقت کی دو عظیم الشان سلطنتوں سے تھا۔ پس اگر حروبِ ارتداد کی انجام دہی میں دو برس لگے تو اس حساب سے عراق و شام کی فتوحات میں بھی کم از کم دو ہی برس لگنے چاہئیں حالانکہ حضرت ابوبکر کی مدتِ خلافت ہی کل سوا دو برس ہے اور جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں یہ بالکل بعید از قیاس بات ہے کہ حروبِ ارتداد کیساتھ ساتھ فتوحاتِ عراق و شام کی مہم بھی جاری ہو۔

اس سلسلہ میں یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ پروفیسر فلپ ہٹی کی رائے میں ان تمام اندرونی لڑائیوں کا خاتمہ صرف چھ مہینہ کی قلیل مدت میں ہی ہو گیا تھا [3]

---

[1] انسائیکلو پیڈیا آف اسلام ج ۱ ص ۱۱۰ جدید ایڈیشن۔ [2] ایک مشہور اطالوی مستشرق جس کی کتاب ANNALS OF ISLAM اطالوی زبان میں ہے۔ [3] دیکھو ہسٹری آف دی عربس ایڈیشن ۱۹۲۹ء ص ۱۴۱

فتوحات

تیسری صدی عیسوی میں عرب کے شمال میں بازنطینی سلطنت قائم تھی جو شام پر قابض تھی اور اُس کے مشرقی سرحد پر جو عراق سے ملتی تھی ایرانی حکومت کا پرچم لہرا رہا تھا۔ صحرائے شام ان دونوں کے درمیان حدِ فاصل تھا۔ دونوں حکومتیں آپس میں ایک دوسرے کی رقیب تھیں اور ان میں آئے دن جنگ رہتی تھی۔ عراق اور شام ان دونوں ملکوں کی سرحدیں چونکہ عرب سے ملتی تھیں اس لئے عرب کے خانہ بدوش اور بدو قبائل ان ملکوں میں گھس کر لوٹ مار مچاتے رہتے تھے جس کے باعث دونوں سلطنتوں کا ناک میں دم تھا اس بنا پر ان دونوں نے عقل مندی یہ کی کہ بفر اسٹیٹ (BUFFER STATE) کے طور پر عربوں کو اپنے اپنے ملک کی سرحدوں پر آباد کر کے ان کی اپنی باقاعدہ ریاستیں قائم کر دیں تاکہ اس طرح وہ عربوں کی لوٹ مار سے محفوظ رہیں اور ساتھ ہی جب ایرانی اور بازنطینی حکومتوں میں جنگ ہو تو ہر ایک کی دست پروردہ عرب حکومت اس کی مدد کر سکے۔ ساسانی حکومت کے ماتحت جو عرب حکومت قائم ہوئی وہ حکومتِ حیرہ یا لخمی حکومت کہلاتی ہے اور شام کی سرحد پر قیصر روم کے زیر سایہ جو عرب حکومت بنی اس کا نام حکومت غسانیہ ہے۔

حکومتِ حیرہ کا پہلا بادشاہ مالک بن فہم ازدی تھا۔ اس کے انتقال کے بعد اُس کا بیٹا جذیمۃ الابرش تخت نشین ہوا۔ یہ بڑے جاہ وجلال کا بادشاہ تھا۔ عربی تاریخ وادب میں اس سے

متعلق بہت سی کہاوتیں اور روایتیں مشہور ہیں۔ جذیمہ زبار نامی ایک عورت کے ہاتھ سے مارا گیا تو اس کا بھانجہ عمرو بن عدی اُس کا قائم مقام ہوا۔ اس نے زبار سے اپنے ماموں کا انتقام لیا اور حیرہ کو جو کوفہ سے متصل ہے اپنا دار السلطنت بنایا اور عراق کا بادشاہ کہلایا لیکن اسی زمانہ میں ایران میں اردشیر بن بابک نے ایک وسیع سلطنت قائم کی اور عمرو بن عدی کو اپنا باج گذار بنا لیا۔ یہ صورتِ حال اس خاندان کے آخری بادشاہ منذر کے زمانہ تک قائم رہی جس کا خاتمہ سنہ ۶۳۲ء میں ہوا۔

شاپور بن اردشیر نے حجاز اور یمن کو بھی باج گزار بنا لیا اور امرا القیس کندی کو ان دونوں کا گورنر مقرر کیا۔

لیکن چونکہ اول تو محکوم رہنا عرب کی فطرت کے خلاف تھا اور پھر ساسانی حکومت کا ان عربوں کیساتھ معاملہ بھی تحقیر و تذلیل کا تھا اس لئے عربوں کو جب کبھی موقع ملتا تھا ساسانی حکومت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیتے تھے۔ چنانچہ سابور ذی الاکتاف جب ایران کے تخت پر بیٹھا تو تمام عرب میں بغاوت کے شعلے بھڑک اُٹھے اور عراق کے متعدد صوبوں پر قبضہ کر لیا گیا سابور اسوقت کم سن تھا بڑے ہو کر اُس نے عربوں سے اس طرح انتقام لیا کہ مقام ہجر میں پہنچکر سخت خوں ریزی کی اور جو عرب گرفتار ہو کر آتے تھے اُن کے شانے اکھڑوا دیتا تھا اسی سے اس کا لقب ذو الاکتاف ہو گیا۔[1]

ایران میں مزدک کے زیرِ اثر بے حیائی اور بے شرمی عام ہو گئی تھی۔ انہیں مزدکی اثرات کا نتیجہ تھا کہ خسرو پرویز نے حیرہ کے بادشاہ نعمان سوم ابو قابوس سے اُس کے خاندان کی حسین عورتوں کا مطالبہ کیا اور جب نعمان نے اس حکم کی تعمیل سے انکار کیا تو اُسکو مدائن بلا کر قید میں ڈلوا دیا جہاں طاعون سے اُس کا انتقال ہو گیا۔ نعمان نے اپنے بیش قیمت اسلحہ بنو بکر کے ایک شخص ہانی بن مسعود کے پاس بطور امانت رکھ دیئے تھے۔ نعمان کی گرفتاری کے بعد خسرو پرویز نے حیرہ کا فرمانروا

[1] الاخبار الطوال ص ۴۹

بنو طے کے ایک شخص ایاس بن قبیصہ کو بنا دیا۔ خسرو پرویز کے حکم سے ایاس نے ہانی بن نعمان کی اس امانت کا مطالبہ کیا۔ لیکن جب ہانی نے امانت میں خیانت کرنے سے انکار کر دیا تو کسریٰ کو سخت غصہ آیا اور اس نے ذی قار نامی ایک مقام پر بنو بکر کا خاتمہ کر دینے کی غرض سے ایک لشکرِ جرار بھیجا۔ بنو بکر اپنی ضد پر قائم تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بڑے زور کا معرکہ ہوا اور ایرانیوں کو شکستِ فاش ہوئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان دنوں مدینہ میں تشریف رکھتے تھے آپ کو ایرانیوں کی شکست کا علم ہوا تو فرمایا۔

الیومَ انتصف العرب من العجم [۱] — آج عرب نے عجم سے اپنا بدلہ لے لیا۔

تاریخ عرب میں "یوم ذی قار" کی بڑی اہمیت ہے۔ شعراء نے بڑے فخر اور جوش کے ساتھ قصیدے لکھے ہیں۔

سنہ ۶ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں اوروں کو دعوتِ اسلام کے خطوط لکھے تھے ایک خط شاہ ایران کے نام بھی بھیجا تھا لیکن شاہِ ایران نے اس نامۂ مبارک کیساتھ بڑی بے ادبی اور گستاخی کا معاملہ کیا۔ اسے پڑھے بغیر ہی چاک کر دیا اور نامہ بر کو دربار سے نکلوا دیا۔ اس کے علاوہ یمن کے گورنر بازان کو حکم بھیجا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو گرفتار کر کے ایران کے پایۂ تخت مدائن روانہ کر دے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ہوئی تو فرمایا۔

هلك كسرىٰ ولا — کسریٰ ہلاک ہو گیا اور اب اُس کے بعد

كسرىٰ بعدهٗ — کوئی کسریٰ نہیں ہو گا۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ شیرویہ نے اپنے باپ خسرو پرویز کو قتل کر دیا۔ یہ معجزہ دیکھ کر بازان خود مسلمان ہو گیا۔ [۲]

اس کے علاوہ تم پڑھ آئے ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے فوراً بعد ہی ایرانی حکومت کے اشارہ پر سجاح مدینہ پر حملہ کے ارادہ سے ایک لشکرِ جرار کیساتھ آئی تھی۔

---

[۱] تاریخ ابن خلدون ج ۲ ص ۲۶۸ [۲] اس واقعہ کا ذکر پہلے بھی آ چکا ہے۔

ان سب واقعات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عرب اور ایران کے تعلقات بہت پرانے تھے اور ایرانی ہمیشہ عربوں کو دبا کر رکھنے کی کوشش کرتے رہے تھے اور دنیا کی عام شہنشاہیتوں کی طرح اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے خود عربوں کے ہی ایک قبیلہ مثلاً بنو عبدالقیس کو دوسرے قبیلہ مثلاً بنو بکر کیخلاف استعمال کرتے تھے جس کا اثر یہ تھا کہ عربوں میں قومی وحدت قائم نہیں ہو سکتی تھی۔

ایرانی حکومت کو اسلام سے جو خاص پرخاش تھی اس کی وجہ بھی یہی تھی یہ لوگ سمجھتے تھے کہ اسلام سے وابستہ ہو کر عرب ایک منظم اور مضبوط طاقت بن رہے ہیں اور یہ طاقت اُن کی شہنشاہیت کے لئے ایک کھلا چیلنج تھی۔ اس بنا پر جزیرہ نمائے عرب کی مشرقی سرحد اُس وقت تک محفوظ ہی نہیں ہو سکتی تھی جب تک کہ عراق کے عربوں کو ایران کی شہنشاہیت کے جوئے سے آزاد نہ کرا لیا جاتا اور ظاہر ہے یہ مقصد ایران کیساتھ جنگ کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا تھا چنانچہ سر ولیم میور لکھتا ہے۔

"سرحد پر جو مسلمان رہتے تھے۔ عراق اور شام کے لوگ جب اُن سے متصادم ہوئے تو قیصر روم اور کسریٰ ایران دونوں نے اپنے اپنے علاقوں کے لوگوں کی مدد کی اس بنا پر جنگ کا دائرہ وسیع ہو گیا اور اسلام کو مشرق اور مغرب کی "طاقتور حکومتوں سے مجبوراً مقابلہ کرنا پڑا۔"[1]

ایک طرف ایران کے ساتھ عرب کے یہ تعلقات تھے اور دوسری جانب شام کیساتھ تعلقات کی نوعیت یہ تھی کہ شروع میں بنو قضاعہ کے چند قبیلے وہاں جا بسے تھے وہاں رومیوں کی حکومت تھی۔ انھوں نے انہیں لوگوں میں سے ایک سردار کو ان کا حاکم مقرر کر دیا اور غرض وہ یہی تھی کہ ایک طرف وہ خانہ بدوش عرب قبائل کی لوٹ مار سے محفوظ رہیں اور دوسری جانب ایران اور

---

[1] The Khilafat, Its Rise, Decline And Fall - page 46.

روم کے درمیان ایک بفر اسٹیٹ کا کام دیں ان سرداروں کو ملوک کہا جاتا تھا۔ سدِ مآرب کے ٹوٹنے سے قبل غسانی قبیلہ یمن سے ہجرت کرکے یہاں پہونچا اور آباد ہو گیا۔ غسانیوں[1] نے کچھ دنوں بعد اس درجہ طاقت وقوت حاصل کر لی کہ یہ بنو قضاعہ پر غالب آ گئے اور اب رومیوں نے ان کو ہی ملوک تسلیم کر لیا۔ ان کی مدتِ حکومت کے بارہ میں اختلاف ہے۔ زیادہ صحیح وہ ہے جو ابو الفدا نے لکھا ہے۔ یعنی چار سو برس۔ کیونکہ غسانی دوسری یا تیسری صدی عیسوی میں شام پہونچے ہیں۔ اس خاندان کا آخری بادشاہ جبلہ بن الایہم تھا۔ جو حضرت عمرؓ کے زمانہ میں پہلے مسلمان ہوا اور پھر مرتد ہو کر قسطنطنیہ بھاگ گیا۔ جرجی زیدان کے ناول فتاۃ غسان میں اسی جبلہ کا تذکرہ ہے۔

عراق میں ملوکِ حیرہ کا جو حال تھا وہی ان غساسنہ کا تھا۔ کہنے کو خود مختار اور صاحبِ حکومت تھے لیکن درحقیقت رومیوں کی باج گزاری کا حلقہ ان کے کانوں میں پڑا ہوا تھا اور رومی حکومت ان کے ساتھ سخت تحقیر و تذلیل کا معاملہ کرتی تھی جس کا اعتراف سر ولیم میور جیسے مصنف تک نے کیا ہے۔ چنانچہ لکھتا ہے۔

"شام کے لوگ بازنطینی حکومت کے ماتحت طرح طرح کی مصیبتیں برداشت کرتے تھے اختلافِ مذہب کی بنا پر ان کو سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔ بھاری بھاری ٹیکس اُن سے وصول کیے جاتے تھے' ان وجوہ کی بنا پر جب مسلمان عربوں نے شام پر حملہ کیا تو یہ شامی عرب صرف تماشائی کی حیثیت سے دیکھتے رہے کیوں کہ انکو عرب حملہ آوروں سے جو زیادہ نرم برتاؤ کرتے تھے اور جن میں زیادہ رواداری اور رحمدلی تھی۔ بہت کچھ توقعات تھیں"[2]

[1] یہ یاد رکھنا چاہیے کہ بنو غسان عمرو بن عامر المزیقیہ کی اولاد میں تھے۔ عمرو بن عامر کے ایک بیٹے کا نام جفنہ تھا۔ اس کی نسبت سے یہ لوگ آل جفنہ کہلاتے ہیں۔ غسان دراصل ایک چشمہ کا نام تھا جس پر یہ لوگ ایک عرصہ تک مقیم رہے تھے اس تقریب سے اُن کا نام آل غسان یا بنو غسان پڑ گیا۔

[2] The Caliphate its Rise, Decline And Fall. P:65

مشہور جرمن مصنّف وان کریمر (Von Kramer) نے اسی حقیقت کو اور زیادہ صاف لفظوں میں کہا ہے :-

"جو عرب عرصۂ دراز سے شام اور عراق میں آباد تھے چونکہ یہ عرب مسلمانوں کے ہم نسل ہم قوم اور ہم زبان تھے اس لئے انھوں نے حملہ آور عربوں کی مدد صرف چھپے چوری نہیں بلکہ علی الاعلان کی۔ ان عراقی اور شامی عربوں نے صرف جاسوسی کی خدمات انجام نہیں دیں بلکہ بسا اوقات میدانِ جنگ میں بھی اُن کا ساتھ دیا" [۱]

جب اسلام کا غلغلہ بلند ہوا اور اس کے ذریعہ عربوں میں قومی تنظیم پیدا ہوئی اور انھوں نے عظیم سیاسی طاقت حاصل کرلی تو حکومتِ ایران کی طرح بیزنطینی حکومت کو بھی شدید خطرہ لاحق ہوا اور اس خطرہ سے محفوظ رہنے کے لئے اس نے اُنہیں عربوں کو استعمال کیا جو حدودِ شام میں آباد تھے۔ چنانچہ ۶ھ میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت اسلام کا خط قیصرِ روم ہرقل کے پاس حضرت دحیہ کلبی کے ہاتھ بھیجا اور وہ واپس آتے ہوئے مقام جذام میں پہونچے تو انہیں شامی عربوں نے حضرت دحیہ پر حملہ کیا اور اُن کا تمام مال واسباب لوٹ لیا۔ اسی طرح جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بصریٰ کے حاکم کو ایک خط لکھا اور حارث بن عمیر اسکو لیکر گئے تو شرجیل بن عمرو جو شام کے سرحدی علاقہ کا ایک عرب رئیس حکمراں اور قیصر کے ماتحت تھا اُس نے حضرت حارث کو قتل کردیا۔ اس کا انتقام لینے کے لئے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین ہزار فوج شام روانہ کی اور غزوۂ موتہ کا واقعہ پیش آیا۔ حضرت زید بن حارثہ جعفر طیار اور عبداللہ بن رواحہ جو اکابر صحابہ میں سے تھے اسی غزوہ میں شہید ہوئے تھے۔

اس سے رومیوں کا حوصلہ بڑھا اور وہ مدینہ پر حملہ کی تیاریاں کرنے لگے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ خبریں پہونچیں تو آپ بہ نفسِ نفیس ایک لشکر جرار لیکر مقام تبوک کیطرف

[۱] The orient Under The Caliphs: Translaton By Prof Khuda BaKsh p: 92,

بڑھے اور اگرچہ اُس وقت جنگ نہیں ہوئی لیکن مسلمانوں کی روز افزوں طاقت رومیوں کو چین سے نہیں بیٹھنے دیتی تھی اور وہ برابر کوئی نہ کوئی شوشہ چھوڑتے ہی رہتے تھے۔

تم پڑھ آئے ہو کہ وفات سے چند روز پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اُسامہ کے ماتحت جو لشکر بھیجا تھا وہ اسی حفظ ماتقدم کیلئے بھیجا تھا اس لشکر کی اہمیت اس قدر زیادہ تھی کہ حضرت ابوبکر صدیق نے عنان خلافت ہاتھ میں لیتے ہی ہزار مشکلوں کے باوجود پہلا کام یہی کیا کہ اس لشکر کو حدودِ شام کی طرف روانہ کیا۔ ولیم میور کہتا ہے کہ حضرت ابوبکر کا یہ عمل انتہائی سیاسی دانش مندی پر مبنی تھا۔ کیونکہ اُس نے اسلام کے اندرونی اور بیرونی دشمنوں کے دل پر اسلام کی سیاسی طاقت و قوت کی دھاک بٹھادی۔[1]

اوپر ہم نے جو کچھ لکھا ہے اُس سے واضح ہوا ہو گا کہ مسلمان درحقیقت اُس وقت ایران اور روم دو طاقتور دشمنوں کے درمیان گھرے ہوئے تھے جو اسلام کیلئے مستقل خطرہ ہونے کے علاوہ خود عربی قومیت کے اتحاد کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھے۔ اس بنا پر جب تک ان دونوں حکومتوں کی سرکوبی نہ کی جاتی نہ اسلام کو پھیلنے اور بڑھنے کا موقع مل سکتا تھا۔ نہ عربی قومیت مستحکم اور مضبوط ہو سکتی تھی اور نہ عراق اور شام کے عرب قبائل کو ان دونوں حکومتوں کی غلامی اور اُن کے حقارت آمیز برتاؤ سے نجات مل سکتی تھی۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کا مقالہ نگار لکھتا ہے، "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جس پیمانہ پر لشکر شام کی طرف روانہ کیا اُس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے یہ بات محسوس کرلی تھی کہ عرب قبائل میں امن اپنی سرحدوں کو وسیع کئے بغیر قائم ہی نہیں کیا جا سکتا تھا"[2]

اِن بیانات سے اُن یورپین مصنفین کی بھی تردید ہوتی ہے جو عراق و شام پر اسلامی لشکر کی پیش قدمی کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ چونکہ عرب طبعاً جنگ جو تھے اور حروبِ ارتداد سے فارغ ہونے کے بعد اندیشہ تھا کہ پھر کہیں اور کسی طرف سے بغاوت کا شعلہ نہ بھڑک اٹھے اس لئے

---

[1] The Caliphate p: 42 – [2] جدید ایڈیشن ج ۱ ص ۱۱۰

حضرت ابوبکر نے انکو مشغول رکھنے کیلئے انکا رُخ ان ملکوں کی طرف پھیر دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر یہ اقدام صرف اسی غرض سے تھا تو اس میں کوئی جان نہ تھی اور اس صورت میں مسلمان ہرگز اس لائق نہیں ہو سکتے تھے کہ وہ دنیا کی دو عظیم الشان طاقتوں سے بیک وقت ٹکرا سکتے ——

انصاف پسند یورپین مصنفین نے خود اعتراف کیا ہے کہ مسلمانوں کی یہ فتوحات کسی دُنیوی لالچ اور طمع کا نتیجہ نہیں۔ بلکہ اُس اسپرٹ، بے خوفی اور بے جگری اور اُس ڈسپلن کا نتیجہ تھیں جو اسلام نے اُن کے اندر پیدا کر دیا تھا۔ وان کریمر لکھتا ہے۔

"ہم کو سخت حیرت ہوتی ہے کہ مدینہ سے جو معمولی سی فوجیں روانہ کی جاتی تھیں۔ انھوں نے کس طرح بازنطینی اور ایرانی ہمسایہ شہنشاہیتوں کے مقابلہ میں عجیب و غریب کامیابیاں حاصل کیں، لیکن ہم کو یہ فراموش نہ کرنا چاہئے کہ اسلام نے پہلے زمانہ کے غیر منظم لوگوں میں ایک غیر مشروط اور مطلق اطاعت کا جذبہ پیدا کر دیا تھا صرف یہی ایک جذبہ تھا جس نے عرب مسلمانوں کو یونانی اور ایرانی خود غرضوں کے مقابلہ میں سو گنا زیادہ برتر بنا دیا تھا" [۱]

امریکہ کا مشہور فاضل پروفیسر فلپ ہٹی لکھتا ہے :-

" حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی فتوحات گویا مشرق قریب کی اپنے دیرینہ اقتدار کو دوبارہ حاصل کرنیکی ایک کوشش تھی۔ اسلام کے جذبہ اور جوش کے ماتحت مشرق بیدار ہو گیا تھا اور اب وہ صدیوں کے مغربی تسلط و استیلا کے بعد پھر اپنی انفرادیت قائم کرنیکی جدوجہد کر رہا تھا" [۲]

غرضکہ یہ اسباب تھے جن کے باعث ارتداد و بغاوت کا سرزمین حجاز و یمن سے خاتمہ کرنے کے بعد ہی فوراً حضرت ابوبکر صدیق نے عراق و شام کی طرف توجہ کی۔

---

[۱] The orient Under The Caliphs p.92

[۲] "History of The Arabs" 1949 Edition, p.143

عراق پر لشکر کشی

مسلمان مورخین عراق کو دو حصوں پر تقسیم کرتے ہیں۔ عراق عرب اور عراق عجم۔ عراق عرب اُس علاقہ کا نام ہے جو عرب سے متصل ہے۔ قرونِ وسطیٰ میں اس کا دارالسلطنت مداین تھا۔ بعد میں بغداد ہوا۔ کوفہ۔ بصرہ۔ اور واسطہ اس علاقہ کے مشہور شہر ہیں اس کے حدودِ اربعہ یہ ہیں:۔ شمال میں صوبۂ جزیرہ۔ جنوب میں خلیج فارس۔ جنوب مشرق میں خوزستان مشرق میں عراق عجم اور مغرب میں صحرائے شام۔

اس وقت ایران میں جو حکومت قائم تھی وہ ساسانی خاندان کی تھی جس کا بانی اردشیر بن بابک تھا۔ جس نے ملک میں طوائف الملوکی کا خاتمہ کر کے اسے ایک وحدت (UNIT) بنا دیا تھا یہ واقعہ ۲۲۶ء کا ہے۔ ساتھ ہی اُس نے عراق اور اُس کے ہمسایہ عرب شہروں پر قبضہ کر لیا اس کا لقب شہنشاہ تھا۔ اردشیر کے بعد حکومتِ ایران دست بدست اُس کی اولاد میں منتقل ہوتی رہی۔ انوشیروان جو اپنے عدل و انصاف کیلئے ضرب المثل ہے اور جس کے عہد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت ہوئی ہے اسی خاندان کا بادشاہ تھا اسکے بعد ہرمز اس کا جانشین ہوا۔ اور ہرمز کے بعد خسرو پرویز تخت پر بیٹھا۔ یہ وہ ہی شہنشاہِ ایران ہے جس کے نام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خط بھیجا تھا اور جس کا ذکر اُوپر آچکا ہے۔ اس نے مکتوبِ گرامی کیساتھ جو گستاخی کی تھی اُس کا ادبار اُس پر ایسا پڑا کہ اپنے بیٹے شیرویہ کے ہاتھوں قتل ہوا شیرویہ ڈیڑھ برس کے قریب بادشاہ رہا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا اردشیر تاج و تخت کا مالک ہوا لیکن چونکہ یہ کمسن تھا اس لئے ایک سردار فوج نے اس کو قتل کر دیا اور خود بادشاہ بن بیٹھا۔ لیکن چالیس روز کے بعد خود یہ بھی قتل کر دیا گیا اور اب شیرویہ کی بہن بوران تخت و تاجِ ایران کی مالک ہوئی اس کے بعد ملک میں اختلال پیدا ہو گیا۔ یہاں تک کہ اس خاندان کا آخری فرمانروا یزدگرد تخت نشین ہوا۔ حضرت ابوبکر نے عراق پر پیش قدمی اسی یزدگرد کے عہدِ حکومت میں کی ہے

فوج کشی کی ابتدا عراق کی مہم کا آغاز اس طرح ہوا کہ مثنیٰ بن حارثہ الشیبانی ایک صحابی تھے۔ جو قبیلہ بنو بکر کے ایک سردار تھے۔ یہ قبیلہ بحرین میں رہتا تھا اور جب عام ارتداد کی ہوا چل رہی تھی تو یہ بھی مرتد ہو گیا تھا لیکن حضرت مثنیٰ چند ساتھیوں کے ساتھ اسلام پر ثابت قدم تھے۔ چنانچہ علاء بن حضرمی جو معرکۂ بحرین کے ہیرو ہیں انھوں نے مرتدین بحرین کے مقابلہ میں جہاں دوسرے مقامی مسلمانوں سے مدد لی۔ مثنیٰ کو بھی لکھا کہ وہ راستوں کی نگرانی کریں[1]۔ مثنیٰ نے اس فرض کو بڑی خوبی کیساتھ انجام دیا اور آٹھ ہزار مسلمانوں کی ایک جمعیت کو اپنے اردگرد جمع کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ بحرین کا معرکہ ختم ہو جانیکے بعد حضرت ابوبکر کی خدمت میں آئے اور درخواست کی کہ اُن کو اُنکی قوم کا سردار بنا دیا جائے تاکہ وہ اہل فارس سے اور اُن کے اطراف واکناف میں جو دشمن ہیں اُن کے ساتھ جنگ کر سکیں[2]۔ حضرت ابوبکر نے پہلے ہی انکے کارناموں کی جب شہرت سنی تھی تو دریافت کیا تھا کہ "یہ مثنیٰ کون ہیں"؟ اسکے جواب میں قیس بن عاصم بن سنان المنقری نے کہا تھا کہ "یہ مثنیٰ مشہور معروف النسب اور بہت مضبوط شخص ہیں[3]"۔ اس بنا پر اب مثنیٰ نے خود بارگاہِ خلافت میں حاضر ہو کر یہ درخواست کی تو حضرت ابوبکر کو کوئی تامل نہیں ہوا۔ فوراً انکو پروانۂ امارت لکھ کر عطا فرما دیا[4]۔

حضرت خالد کی نامزدگی لیکن حضرت مثنیٰ کے چلے جانیکے بعد حضرت ابوبکر کو خیال ہوا کہ عراق کی مہم بہت اہم ہے اکیلے مثنیٰ اسے سر نہ کر سکیں گے اسلئے حضرت خالد کو جو جنگ یمامہ سے فارغ ہونیکے بعد مدینہ میں مقیم تھے[5] حکم دیا کہ دس ہزار کا لشکر لیکر عراق کا رُخ کریں۔ یہ واقعہ محرم ۱۲ھ کا ہے[6]۔ اور ادھر مثنیٰ بن حارثہ اور مذعور بن عدی العجلی کو جنھیں حضرت ابوبکر نے ان کی قوم پر انکی درخواست کے مطابق امیر بنا دیا تھا ہدایات بھیجیں کہ وہ حضرت خالد کیساتھ ساتھ کوچ اور قیام کریں اور پورے

---

[1] طبری ج ۲ ص ۵۲۶ [2] الاصابہ ج ۳ ص ۳۴۱ [3] فتوح البلدان بلاذری ص ۲۵۰۔

[4] بلاذری ص ۲۵۰ [5] بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت خالد یمامہ میں ہی تھے اور حضرت ابوبکر نے ان کو یہ حکم وہیں بھیجا تھا لیکن عراق کی مہم کی اہمیت کے پیشِ نظر حضرت ابوبکر کی سیاست اور تدبر سے بعید تھا کہ وہ حضرت خالد کو بالا ہی بالا بھیجدیتے۔ اس لئے ہم نے مدینہ والی روایت کو اختیار کیا ہے۔ [6] ص ۲۵۰ –

طور پر ان کے مطیع اور فرماں بردار ہو کر رہیں۔ ان کے علاوہ حضرت عیاض بن غنم جو اس وقت بناج اور حجاز کے درمیان کسی مقام پر تھے ان کو بھی لکھا کہ حضرت خالد کے پاس پہونچیں اور ان کی قیادت میں کام کریں۔

حضرت خالد کو ہدایات | اس موقع پر حضرت ابوبکر نے حضرت خالد کو جو ہدایات دی ہیں وہ خلیفۂ رسول کی فوجی مہارت۔ تدبر اور غیر معمولی بیدار مغزی کی روشن دلیل ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ

(۱) عراق کا کوچ اُس کی بلند زمینوں کے ذریعہ کریں۔ مورخین کو اس میں دھوکہ ہو گیا ہے چنانچہ طبری نے ایک روایت نقل کی ہے کہ حضرت خالد کو عراق کی نشیبی زمینوں کے ذریعہ کوچ کرنے کا حکم ہوا تھا اور حضرت عیاض کو بلند زمینوں کے ذریعہ، بہر حال ان سب کو جمع ہونا تھا اُبلّہ کے مقام پر اور مقصد یہ تھا کہ مختلف فوجیں مختلف راستوں سے جائیں تو ہر طرف کی آبادی پر اثر پڑے۔

(۲) عراق کی سرزمین میں پہونچکر لوگوں کی دلجوئی کریں۔ اللہ کیطرف انکو دعوت دیں اگر وہ اس کو قبول کرلیں تو خیر! ورنہ اُن سے جزیہ طلب کریں اگر وہ اس سے بھی انکار کریں تو پھر اُن سے جنگ کی جائے۔

(۳) جو شخص اُن کے (حضرت خالد) ساتھ جانیکے لئے تیار نہ ہو، اُس پر جبر نہ کریں۔

(۴) جو لوگ مرتد ہو گئے تھے۔ مگر اب پھر مسلمان ہو گئے ہیں اُن سے کسی قسم کی کوئی مدد طلب نہ کریں

(۵) ان کے علاوہ جو مسلمان اُن کے پاس سے گزرے اُس کو ہمراہ لے لیں[۱]

اُبلّہ کی اہمیت | ساتھ ہی حکم دیا تھا کہ اپنی جنگی کارروائیوں کا آغاز اُبلّہ[۲] سے کریں[۳]۔ اس میں

---

[۱] البدایۃ والنہایۃ ج ۶ ص ۳۴۲۔ [۲] یہ مقام دجلۂ بصرہ کے کنارہ پر خلیج فارس کے کونہ میں جو شہر بصرہ تک آتا ہے واقع ہے۔ اور بصرہ چونکہ حضرت عمر فاروق کے عہد میں آباد ہوا ہے اس لئے اس سے مقدم ہے۔ [۳] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۶۱

مصلحت یہ بھی کہ اُبلہ میں شاہِ ایران کا تمام میگزین جمع تھا اور اس بنا پر اُس کی حیثیت فوجی چھاؤنی کی بھی تھی اس کے علاوہ آب و ہوا اور کاروبار تجارت کے اعتبار سے نہایت عمدہ جگہ سمجھی جاتی تھی۔ مشہور امام لغت اصمعی کا قول ہے "دنیا میں جنتیں تین ہیں۔ غوطۂ دمشق۔ نہر بلخ۔ اور اُبلہ[1]

اس کے علاوہ یہی وہ بندرگاہ تھی جس کے ذریعہ سے عرب اور ہند و سندھ میں تجارتی تعلقات قائم تھے اور ایک ملک کا مال دوسرے ملک میں آتا جاتا تھا۔ اسی وجہ سے حضرت ابوبکر نے اسکو "فرج الهند" کہا تھا۔

عراق میں حضرت خالد نے جو لڑائیاں لڑیں انکی ترتیب کیا ہے؟ اس میں روایات اس قدر مختلف ہیں کہ کسی ایک نتیجہ تک پہنچنا بہت دشوار ہے۔ اب ہم جس ترتیب سے واقعات لکھیں گے وہ زیادہ طبری اور ابن اثیر کے بیانات پر مبنی ہے اور جزئی ترمیم و تنسیخ کیساتھ ترتیب تقریباً وہی ہے جو ان دونوں بزرگوں کے ہاں ہے۔

جنگِ ذات السّلاسِل

عام مؤرخین کا رجحان یہ ہے کہ عراق میں جو پہلی جنگ لڑی گئی ہے وہ غزوہ حفیر یا ذات السلاسل کے نام سے مشہور ہے۔

حفیر خلیج فارس کے قریب اور کاظمہ کی سرحد پر واقع ہے۔ مدینہ سے بصرہ تک اگر ایک خطِ مستقیم کھینچا جائے تو حفیر اسی خط پر بصرہ سے پہلے واقع ہوگا۔ اس مقام کا حاکم ہرمز تھا جو حکومت ایران کے ماتحت تھا۔ ایرانیوں میں یہ دستور تھا کہ جو شخص جس مرتبہ اور درجہ کا ہوتا تھا اس کے مطابق اُس کی ٹوپی قیمتی ہوتی تھی۔ اسی بنا پر ہرمز چونکہ یہاں کے امراء اور اشراف میں سب سے بڑا تھا اس لئے اس کی ٹوپی ایک لاکھ کی تھی۔ حفیر کے اطراف و جوانب میں سرحدوں پر جو عرب قبائل آباد تھے ہرمز کا معاملہ ان کیساتھ نہایت بُرا تھا۔ چنانچہ عرب خباثتِ نفس اور

---

[1] معجم البلدان یاقوت حموی ج ۱ ص ۹۷ مطبوعہ لیپزگ۔

زشت خوئی کی ضرب المثل کے طور پر کہا کرتے تھے "وہ شخص ہرمز سے بھی زیادہ خبیث یا اس سے بھی بڑا کافر ہے۔ اس باہمی عناد و منافرت کا نتیجہ یہ تھا کہ ان عرب قبائل کے بنی اعمام جو جزیرہ نمائے عرب میں مقیم تھے وہ جب کبھی موقع ملتا تھا ہرمز کے علاقوں میں گھس کر غارتگری کرتے تھے اور ہرمز ان کیساتھ خشکی میں اور اہل ہند کیساتھ بحر میں جنگ و پیکار کرتا رہتا تھا۔ اس بنا پر حکومت ایران ہرمز کو اپنے ملک کے ناکوں کا محافظ اور پاسبان سمجھتی تھی۔

حضرت خالد مدینہ سے دس ہزار کی ایک فوج اپنے ساتھ لیکر روانہ ہوئے تھے۔ حدود عراق میں داخل ہوئے تو یہاں مثنیٰ بن حارثہ آٹھ ہزار کی جمعیت کیساتھ اُن کے استقبال کیلئے موجود تھے۔ حضرت خالد نے اب پوری فوج کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا اور حکم دیا کہ وہ مختلف راستوں سے چلکر حفیر میں جمع ہو جائیں۔ ان تین حصوں میں سے ایک حصہ کے سردار مثنیٰ بن حارثہ تھے۔ دوسرا حصہ عدی بن حاتم الطائی کی سرکردگی میں تھا۔ اور تیسرا خود حضرت خالد کے ماتحت تھا۔ یہ تینوں لشکر دو اور تین دن کے فاصلہ سے روانہ ہوئے۔ سب سے آخر میں حضرت خالد کی روانگی ہوئی۔ لیکن روانگی سے قبل حضرت خالد نے ہرمز کے نام ایک خط روانہ کر دیا تھا جس کا مضمون یہ تھا۔

فاسلم تسلم او اعتقد لنفسك وقومك الذمة واقرر بالجزية والا فلا تلومن الا نفسك فقد جئتك بقوم يحبون الموت كما تحبون الحياة "[1]

"تو اسلام لے آ تو محفوظ رہے گا۔ ورنہ اپنے اور اپنی قوم کیلئے ذمی ہونے کا یقین رکھ اور جزیہ کا اقرار کر۔ ورنہ پھر تو اپنے نفس کے علاوہ کسی اور کو ملامت نہیں کریگا۔ کیونکہ میں تیرے پاس اُن لوگوں کو لیکر آیا ہوں جو موت کو ایسا ہی محبوب رکھتے ہیں جیسا کہ تم لوگ زندگی کو محبوب رکھتے ہو۔"

ادھر ہرمز کو یہ خط ملا اور اُدھر اسے مسلمان افواج کی نقل و حرکت کی اطلاع ملی تو اُس نے شہنشاہ ایران اردشیر (یزدگرد) کو یہ تمام حالات لکھ کر بھیجے اور حضرت خالد کا مقابلہ کرنے کی غرض سے مقام کواظم میں فوجیں اتار دیں لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ اسلامی فوجیں حفیر کی طرف

[1] طبری ج ۲ ص ۵۵۴

بڑھ رہی ہیں تو بڑی تیزی کیساتھ اپنا لشکر لیکر حفیر پہنچا اور یہاں ایک گھاٹ پر پڑاؤ ڈال دیا۔ اب حضرت خالد نے کاظمہ کیطرف ہٹ کر اپنے لشکر کو یہاں خیمہ فگن ہونیکا حکم دیا تو لوگوں نے کہا کہ دشمن نے پانی پر قبضہ کر رکھا ہے اور ہمارے پاس پانی کہیں نہیں ہے لیکن خدا کی شان تھوڑی دیر کے بعد بارش ہوئی اور جل تھل بھر گئے۔

اب ہرمز نے صف بندی اس طرح کی کہ اُس کے لشکر کا میمنہ اور میسرہ شاہی خاندان کے دو جوانمرد قباذ اور انوشجان کی سرکردگی میں تھا اور جتنے مردان کارزار تھے سب نے اپنے آپ کو ایک دوسرے کیساتھ زنجیروں کیساتھ جکڑ لیا تھا تاکہ وہ بھاگ نہ سکیں۔ اسی وجہ سے یہ غزوہ ذات السلاسل کہلاتا ہے۔ یہ سب انتظامات ہو چکے تو جنگ شروع ہوئی۔ ہرمز نے آگے بڑھکر حضرت خالد کو دعوتِ مبارزت دی۔ حضرت خالد فوراً آگے بڑھے اور لڑائی ہونے لگی، ہرمز نے قواعدِ جنگ کے بالکل خلاف ازراہِ غدر و فریب پہلے سے اپنے شہسواروں کی ایک جمعیت کو اس پر آمادہ کر رکھا تھا کہ جب خالد تنِ تنہا ہرمز کے ساتھ مصروفِ جنگ ہوں تو یہ لوگ اچانک کمین گاہ سے نکل کر حضرت خالد پر حملہ کر دیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ لیکن ٹھیک اُس وقت جبکہ ہرمز کے شہسواروں نے حضرت خالد پر حملہ کرنا چاہا حضرت قعقاع بن عمرو[1] اچانک اسلامی فوج کی صف سے باہر نکل کر اس زور کیساتھ حملہ آور ہوئے کہ شہسواروں کے چھکے چھوٹ گئے۔ اتنے میں حضرت خالد نے پہلو بچا کر ہرمز کی پیشانی پر شدید ضرب کاری لگائی کہ وہ جانبر نہ ہو سکا۔ میدانِ جنگ کا یہ رنگ دیکھ کر مسلمانوں نے حملہ کر دیا۔ ایرانی شکست کھا کر بھاگے تو مسلمانوں نے اُن کا تعاقب کیا۔ یہاں تک کہ فرات کا بڑا پل جہاں بعد میں بصرہ آباد ہوا وہاں پہونچکر دم لیا۔ قباذ اور انوشجان جان بچا کر بھاگ نکلے لیکن ایرانیوں کی بڑی

---

[1] ان کی بہادری کا یہ عالم تھا کہ مدینہ سے حضرت خالد کی روانگی کے بعد حضرت ابوبکر کو خیال آیا تو حضرت قعقاع کو بھی پیچھے سے مدد کی غرض سے روانہ کیا۔ کسی نے پوچھا ایک آدمی سے کیا ہوگا۔ حضرت ابوبکر نے جواب دیا کہ جس لشکر میں قعقاع ہوں گے اُس کو کبھی شکست نہیں ہو سکتی۔

تعداد قتل ہوگئی۔

حضرت خالد نے مالِ غنیمت جس میں ایک ہاتھی اور ہرمز کی بیش قیمت ٹوپی بھی شامل تھی مدینہ بھیجا تو ہاتھی کو مدینہ کی گلیوں اور سڑکوں پر گھمایا گیا عربوں کے لئے یہ ایک بالکل نیا جانور تھا۔ اس لئے مدینہ کی بڑی بوڑھی عورتیں اور بچے اسے دیکھ کر خوش ہوتے اور تعجب کرتے تھے لیکن چونکہ یہ جانور شاہی تزک و احتشام کی علامت تھا اس لئے حضرت ابوبکر نے اس کو مدینہ میں رکھنا پسند نہیں کیا اور زر بن کلیب جو اسے لائے تھے انہیں کے ہاتھ اسے واپس کردیا[1]

فرات کے بڑے پل پر پہنچکر حضرت خالد نے مثنیٰ بن حارثہ کو تو ایرانیوں کے تعاقب میں روانہ کیا اور معقل بن مقرن المزنی کو اُبلہ روانہ کیا کہ اس کی فتح کی تکمیل و انصرام کا انتظام کریں

اُبلہ سے متعلق ایک بحث | اُبلہ جس کا ذکر اوپر آچکا ہے اُس سے متعلق مورخین میں اختلاف یہ ہے کہ یہ خلافتِ صدیقی میں فتح ہوا ہے۔ یا حضرت عمر فاروق کے عہدِ خلافت میں، ابنِ اثیر کی رائے یہ ہے کہ حضرت عتبہ بن غزوان کے ہاتھوں حضرت عمر کے عہد میں فتح ہوا ہے۔ چنانچہ معقل ابن مقرن والی مذکورۂ بالا روایت نقل کر کے انھوں نے اس کی تردید کی ہے اور اس کو اہلِ نقل کے علم کے خلاف کہا ہے[2] لیکن بلاذری[3] اور ابو اسمٰعیل محمد بن عبداللہ الازدی[4] نے نقل کیا ہے کہ جب حضرت خالد بصرہ پہونچے تو سوید بن قطبۃ الذہلی نے اُن سے ملکر کہا کہ اُبلہ[5] کے لوگ میرا مقابلہ کرنیکے لئے جمع ہو رہے ہیں اور میری رائے میں وہ اُس وقت تک باز نہیں آئینگے جب تک کہ آپ میری مدد نہ کریں۔ اس پر حضرت خالد نے ترکیب یہ چلی کہ سوید سے کہا میں دن کے وقت بصرہ سے چلا جاؤں گا۔ لیکن شب میں واپس ہو کر تمہارے لشکر میں آملوں گا۔ اب اگر صبح کے وقت اہلِ اُبلہ نے حملہ کیا تو ہم اُن سے جنگ کریں گے۔ اس قرارداد کے مطابق

---

[1] طبری ج ۲ ص ۵۵۶ وابن اثیر ج ۲ ص ۲۶۲۔ [2] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۶۳ [3] فتوح البلدان ص ۲۵۰ [4] فتوح الشام ص ۹۴ شائع کردہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال۔ [5] ابن خلکان کے بیان کے مطابق ابلہ بصرہ سے چار فرسنگ یعنی ایک دن کی مسافت پر تھا۔

حضرت خالد اپنے لشکر کو لیکر بصرہ سے نکل گئے جیسا کہ توقع تھی اہلِ اُبلّہ کو اس سے اطمینان ہوا اور انھوں نے سوید بن قطبہ پر حملہ کی تیاری شروع کر دی۔ لیکن دوسرے دن صبح کے وقت انھوں نے حملہ کیا تو چونکہ حضرت خالد شب میں واپس آکر سوید کے لشکر میں شامل ہو گئے تھے اسلئے اب اہلِ اُبلہ نے مسلمانوں کی خلافِ توقع اتنی بڑی تعداد دیکھی تو ادسان خطا ہو گئے اور اُنپر رعب کی کیفیت طاری ہو گئی حضرت خالد نے اس کو محسوس کر کے حملہ کرنے کا حکم دیا۔ فوراً تعمیل کی گئی اور اہلِ اُبلّہ شکست کھا گئے ان میں سے جو بھاگ نہیں سکے وہ یا قتل ہو گئے یا دریا میں غرق ہو کر موت کے گھاٹ اُتر گئے۔ حضرت خالد نے سوید سے فرمایا "ہم نے تمہارے نواح کے ایرانیوں کو اتنا پامال کر دیا ہے کہ وہ اب سر نہیں اٹھا سکیں گے۔"

بلاذری اور ازدی کی اس روایت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُبلّہ حضرت ابوبکر کے عہد میں ہی فتح ہو گیا تھا اور قرینِ قیاس بھی یہی ہے کیونکہ حضرت ابوبکر نے حضرت خالد کو روانہ کرتے وقت حکم یہ ہی دیا تھا کہ وہ اپنی کارروائیوں کا آغاز اسی مقام سے کریں پھر یہ کیونکر ممکن تھا کہ سب کچھ فتوحات ہو جاتیں لیکن ایک اُبلّہ ہی فتح نہ ہوتا درآنحالیکہ فوجی اعتبار سے یہ ایک نہایت اہم مقام تھا۔

اب سوال یہ ہے کہ اُبلّہ حضرت عمر کے عہد میں جو فتح ہوا ہے تو اس کے کیا معنیٰ ہونگے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے ان لوگوں نے ایک مرتبہ فتح ہو جانے کے بعد پھر بغاوت برپا کر دی ہو اور اس لیے حضرت عمر کے عہد میں وہ دوبارہ فتح کیا گیا ہو۔[۱]

---

[۱] یہاں ایک شبہ یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ بلاذری اور ازدی سے معلوم ہوتا ہے کہ ابلہ سوید کے ہاتھوں فتح ہوا۔ لیکن طبری اور ابن اثیر کے ہاں معقل بن مقرن کا نام ملتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اہلِ ابلہ کی دراصل جنگ تو ہوئی تھی سوید بن قطبہ ہی کے ساتھ اور انھوں نے ہی اس کو فتح کیا تھا، رہے معقل تو غزوۂ حفیر کے بعد حضرت خالد نے ابلہ مالِ غنیمت وغیرہ اکٹھا کرنے اور اس کا انتظام کرنے کے لئے بھیجا تھا اس سے التباس ہو گیا چنانچہ طبری کے الفاظ یہ ہیں:۔
وارسل معقل بن مقرن المزنی الی الابلة لیجمع له مالها والسبی فخرج معقل حتی نزل الابلة فجمع الاموال والسبایا۔ ج ۲ ص ۵۵۲

مذار کی جنگ

حضرت خالدؓ کے حکم کے مطابق مثنیٰ بن حارثہ ایرانیوں کا تعاقب کر رہے تھے اور مدائن تک پہونچنے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن جنگ حفیر کے موقع پر ہرمز نے شہنشاہ ایران کے پاس جو سفارت بھیجی تھی کچھ اُس کا اثر کچھ حفیر میں ایرانیوں کی شکست فاش کی خبر ان دونوں وجوہ کی بنا پر حکومت ایران نے حضرت خالدؓ سے جنگ کرنیکے لئے ایک لشکر جرار روانہ کردیا تھا جسکے مختلف دستوں کی قیادت ایران کے نامور اشراف و امراء کر رہے تھے۔ حضرت مثنیٰ کو اثنائے راہ میں یہ اطلاع ملی تو مدائن کا ارادہ ملتوی کردیا۔

ایرانی لشکر نے جس کیساتھ غزوہ حفیر کے شکست خوردہ بھی مل گئے تھے۔ مذار نامی ایک مقام پر جو دجلہ و فرات کے سنگم پر واقع ہے۔ پڑاؤ ڈالا۔ حضرت خالدؓ کو اطلاع ہوئی تو پیشقدمی کرکے وہاں پہونچے جنگ شروع ہوئی ایرانی فوج کی طرف سے ایران کا نامور بہادر قارن نکلا ادھر سے معقل بن الاعشیٰ آگے بڑھے۔ آخر قارن قتل ہوگیا اسی طرح نوشجان، عاصم کے ہاتھ سے اور قباذ حضرت عدی بن حاتم کے ہاتھوں قتل ہوا۔ ابن اثیر کا بیان ہے کہ قارن۔ نوشجان اور قباذ ایران کے اتنے بڑے لوگ تھے کہ پھر آئندہ کسی جنگ میں ایران کا ان جیسا کوئی نامور اور بلند مرتبہ شخص مسلمانوں کے ہاتھوں نہیں مارا گیا۔[1] طبری اور ابن اثیر کی روایت ہے کہ اس جنگ میں تیس ہزار ایرانی مارے گئے۔ جو بچ گئے تھے وہ کشتیوں میں بیٹھ بیٹھ کر بھاگ گئے اگر دریا درمیان میں حائل نہ ہوتا تو دشمن کی فوج کا ایک سپاہی بھی جان سلامت نہیں لیجا سکتا تھا۔ اس جنگ میں جو لوگ گرفتار ہوئے انھیں میں ایک ابو الحسن بصری بھی تھے جو بعد میں مسلمان ہوکر مشہور صاحب معرفت و طریقت ہوئے۔ یہ واقعہ ماہ صفر ۱۲ھ میں پیش آیا[2]

---

[1] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۶۳

[2] طبری ج ۲ ص ۵۵۷۔

جنگ ولجہ

حضرت خالد اب حیرہ جو خلیج فارس اور مدائن کے وسط میں ہے اس سے قریب تھے۔ اردشیر کو مذار میں ایرانیوں کی شکست فاش کی خبر ملی تو اس نے ایک اور لشکر ایران کے مشہور شہسوار اندر زغر کی سرکردگی میں روانہ کیا اور اس لشکر کے پیچھے پیچھے ایک اور لشکر ایران کے نامور شہسوار جادویہ (جسکو عرب مورخین جاذویہ لکھتے ہیں) کی قیادت میں بھیجا۔ اس مرتبہ ایرانیوں نے ایک چال یہ بھی چلی کہ وہ عرب قبائل جو دجلہ اور فرات کے درمیانی علاقوں میں بادیہ شام تک آباد تھے اور جن میں سے اکثر عیسائیت اختیار کر چکے تھے اُن کو بھی حریت اور آزادی کے نام پر اپنے ساتھ ملالیا۔ اب ان سب نے مقام ولجہ میں جو مقام دجلہ و فرات کے سنگم کے قریب تھا پڑاؤ ڈالا۔[1]

حضرت خالد کو مذار میں اطلاع ہوئی تو پورے سازوسامان کے ساتھ روانہ ہوئے لیکن مقابلہ آسان نہیں تھا۔ ایرانیوں اور عرب قبائل دونوں کے لشکر الگ الگ تھے اور ہر ایک لشکر کا سردار اُسی قوم سے تھا لیکن ان سب کا کمانڈر انچیف ایرانی تھا۔ جنگ شروع ہوئی فریقین نے شجاعت و جواں مردی کے وہ جوہر دکھائے کہ کسی ایک فریق کے متعلق بھی فتح و ظفر کی پیش گوئی نہیں کی جاسکتی تھی۔ ابن اثیر کے الفاظ یہ ہیں۔

حتی ظن الفریقان ان الصبر قد فرغ۔	دونوں فریق نے گمان کیا کہ صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا ہے۔

لیکن حضرت خالد نے مذار سے روانہ ہو کر اثنائے راہ میں ایک تدبیر یہ کی تھی کہ اپنے لشکر کے دو سرداروں کو اپنے سے الگ کر کے حکم دیا تھا کہ وہ دو مختلف راستوں سے میدان جنگ میں ایرانی لشکر کے عقب کی طرف سے پہونچیں، یہ تدبیر بہت کارگر ہوئی چنانچہ ٹھیک اسوقت

[1] ان عربوں میں اکثریت بنو بکر بن وائل کی مختلف شاخوں کی تھی۔

جبکہ معرکہ کارزار گرم تھا اور حضرت خالد دشمن پر دباؤ ڈالتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے ایرانی لشکر کے پیچھے مذکورۂ بالا امیر اپنا اپنا دستہ لیکر پہونچ گئے اب دشمن کو تابِ مقاومت نہیں رہی ایرانی بہت بری طرح شکست کھاکر بھاگ پڑے۔ ایک بڑی تعداد قتل ہوگئی۔ اندرزغر جان بچاکر نکل بھاگا تھا لیکن تشنگی کی وجہ سے وہ بھی ہلاک ہوگیا۔ یہاں بھی حضرت خالد نے کسانوں کیساتھ نرمی اور ملاطفت کا معاملہ کیا۔ ان سب کو امن دیدیا۔ اور یہ لوگ ذمی ہوگئے[1]

جنگِ اُلّیس

اس تیسری شکست نے ایرانیوں کو تو بدحواس کیا ہی تھا۔ لیکن سب سے زیادہ اثر عراق کے عرب قبائل پر ہوا جن کو جزیرہ نمائے عرب کے اپنے بنو اعمام کے ہاتھوں اس قدر شدید شکست اٹھانی پڑی تھی۔ ان کے غیظ و غضب کی حد نہ رہی اور ہم مذہبی کے رشتہ سے انھیں عرب قبائل میں جو اور عیسائی تھے وہ بھی مشتعل ہوگئے اور اب ان سب نے ایرانیوں سے خط و کتابت کرکے بہت بڑے پیمانہ پر جنگ کی تیاری شروع کردی۔ حیرہ اور ابلہ کے عین وسط میں دریائے فرات کے کنارہ پر ایک مقام اُلّیس ہے یہ سب وہاں جمع ہوئے۔ اردشیر نے بہمن جادویہ کو جو اس وقت ایک مقام قسیناثا میں مقیم تھا حکم بھیجا کہ عرب عیسائیوں کی اُلّیس پہونچکر مدد کرے۔ لیکن بہمن خود اردشیر سے بعض معاملات طے کرنیکی غرض سے مداین چلا گیا اور اپنی طرف سے جابان نامی سردار کو یہ کہکر بھیجدیا کہ جب تک میں ایس نہ آجاؤں تم جنگ میں پیشقدمی نہ کرنا لیکن اتفاق ایسا ہوا کہ بہمن مدائن پہونچا تو اس وقت اردشیر بیمار تھا۔ اس لئے بہمن کو وہاں قیام کرنا پڑا۔ ادھر یہ ہوا کہ جابان اُلّیس پہنچکر بہمن کا انتظار کر ہی رہا تھا کہ اتنے میں حضرت خالد پہونچ گئے اور دشمن کو سوچنے اور غور کرنیکا موقع دئے بغیر جنگ شروع کردی۔ مالک بن قیس جو بڑا بہادر تھا آگے بڑھا لیکن حضرت خالد کی

[1] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۶۴

تلوار نے اسکو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ یہ منظر دیکھ کر دشمن کی صفوں پر ہیبت طاری ہوگئی اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگے۔ یہاں ایک دلچسپ واقعہ یہ ہوا کہ یہ لوگ اپنا پکا پکایا کھانا چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ مسلمانوں نے جب کھانے پر قبضہ کیا تو اُن کو میدہ کی سفید روٹیاں بھی ملیں جن کو عربی میں "الرقاق البیض" کہتے ہیں۔ مسلمان عرب اس سے بالکل ناآشنا تھے۔ اسلئے کسی شخص نے پوچھا "یہ کیا ہے؟ تو دوسرے نے جواب دیا تم نے "دقیق الحیش" تو سنا ہی ہوگا اُسی مناسبت سے ان کو "رقاق البیض" کہتے ہیں۔

اُلّیس سے فارغ ہو کر حضرت خالد نے امغیشیا نامی ایک شہر کا رُخ کیا جو اُلّیس سے قریب تھا اور فرات اور نہر بادقلی کے سنگم پر واقع تھا۔ لیکن یہاں جنگ کی نوبت نہیں آئی۔ اہلِ شہر نے پہلے ہی ہتھیار ڈالدیئے۔ حضرت ابوبکر کو ان پیہم فتوحات کا علم ہوا تو خوش ہو کر فرمایا "عورتیں خالد جیسا کوئی پیدا کرنے سے عاجز ہیں۔"[1]

ابن جریر طبری۔ ابن اثیر اور ابن کثیر کا بیان ہے کہ جنگ اُلّیس میں فریق ثانی کے ستر ہزار افراد قتل ہوئے تھے۔ سر ولیم میور اسکو مبالغہ کہتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ اعداد و شمار کا نظم و ضبط اُس زمانہ میں ایسا نہیں تھا جیسا کہ آج کل ہے۔ اس لئے ممکن ہے کہ پورے ستر ہزار نہ ہوں اور چونکہ ستر کا عدد کثرت کو ظاہر کرنیکے لیے عربی زبان میں عام طور پر بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں "اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً" میں یہ لفظ اسی معنی میں مستعمل ہوا ہے اس بنا پر یہاں ستر ہزار سے کثرت ہی مراد ہو۔

حیرہ کی فتح

ان پیہم شکستوں نے اگرچہ ایرانیوں کا حوصلہ پست کر دیا تھا۔ لیکن اُلّیس کی جنگیں عراق کے عرب قبائل پیش پیش رہے تھے اور اس وقت ایرانیوں کا بڑا سہارا یہی عرب تھے اس

---

[1] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۶۴ - ۲۶۵ -

بنا پر فوجی نقطۂ نظر سے ضروری تھا کہ حیرہ پر جو عراق عرب کا پایۂ تخت تھا قبضہ کیا جائے تاکہ ان عرب قبائل کو قابو میں رکھا جا سکے۔ چنانچہ امغیشیا سے فارغ ہونیکے بعد حضرت خالد نے حیرہ کا رُخ کردیا۔ حکومتِ ایران کی طرف سے حیرہ کا گورنر اس وقت آزادیا (آزاذیہ) نامی ایک ایرانی تھا۔ اسکو اسلامی فوج کی نقل وحرکت کا علم ہوا تو لشکر لیکر آگے بڑھا اور ساتھ ہی چونکہ حضرت خالد دریائی راستہ سے آرہے تھے اس بنا پر اُس نے اپنے بیٹے کو بھیجکر دریا کا پانی منقطع کرادیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کشتیاں زمین سے لگ گئیں۔ حضرت خالد اپنا ایک دستہ لیکر کشتیوں سے اُترے دریائے فرات کے کنارہ پر آزادیا کے لڑکے سے جنگ کی۔ اُسکو اور اُس کے ساتھیوں کو قتل کیا اور پھر روانہ ہوگئے۔ آزادیا کے لئے یہ وقت بڑا نازک تھا۔ ایک طرف اردشیر شہنشاہِ ایران کے مرنے کی خبر ملی اور دوسری جانب خود اُس کا بیٹا اور اُس کے ساتھی قتل ہوگئے تھے۔ اسلئے بجز فرار کے اُس کیلئے کوئی اور چارہ کار نہ تھا۔ اہلِ حیرہ نے یہ رنگ دیکھا تو قلعہ بند بیٹھ گئے۔[1] حیرہ مختلف اعلیٰ قسم کے محلات کیلئے مشہور تھا جن میں سے خورنق اور سدیر بہت مشہور ہیں اور عربی اشعار میں ان کا ذکر آتا ہے۔ مسلمانوں نے ان سب کا محاصرہ کرلیا۔ محاصرہ کو جب ایک دن اور ایک رات گذر گئے تو مسلمان کسی طرح محلات کے اندر گھس پڑنے میں کامیاب ہوگئے۔ اب ان لوگوں کیلئے اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ صلح کرلیں۔ چنانچہ ایک بڈھے اور تجربہ کار شخص عبد المسیح (طبری نے نام عمرو بن عبد المسیح لکھا ہے) اور ایاس بن قبیصہ کی معرفت صلح کی گفت وشنید ہوئی۔ آخر کار ایک لاکھ نوے ہزار درہم سالانہ پر صلح ہوگئی اور یہ شرط طے پائی کہ اہلِ حیرہ مسلمانوں کیلئے ایرانیوں کے برخلاف جاسوسی کی خدمات انجام دیں گے اور مسلمان نہ اُن کا کوئی گرجا ہدم کریں گے اور نہ کوئی محل۔[2]

حضرت خالد نے حضرت ابوبکر کو جب فتح حیرہ کی خبر بھیجی تو ساتھ ہی کچھ ہدایا بھی بھیجے لیکن حضرت ابوبکر نے اُن ہدایا کو اہلِ حیرہ کے جزیہ میں محسوب کرلیا اور حضرت خالد کو لکھا کہ جزیہ

---

[1] ابن اثیر ج۲ ص ۲۶۶ [2] فتوح البلدان بلاذری ص ۲۵۲ - ۲۵۳ -

کی باقی رقم کی وصولیابی بھی کریں اور اُس کو بھی اہلِ حیرہ کی طرف سے ہدایا ہی سمجھ لیں[۱]

یہ فتح ربیع الاوّل سنہ ۱۲ھ میں ہوئی۔[۲]

بنتِ بقیلہ کا افسانہ اس موقع پر طبری، بلاذری۔ ابنِ اثیر اور ابنِ کثیر جیسے مورخین تک نے ایک روایت نقل کی ہے جو درحقیقت ایک غلط افسانہ سے زیادہ نہیں ہے۔ ہم پہلے اصل روایت نقل کرتے ہیں اور پھر اس پر جرح و نقد کریں گے۔

روایت یہ ہے کہ خریم بن اوس الطائی نے ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا تھا کہ اگر اللہ آپ کے ہاتھوں حیرہ فتح کرا دے تو آپ بنتِ بقیلہ (حیرہ کے ایک نامور خاندان کی لڑکی) مجھ کو عطا فرمائیے گا۔ چنانچہ اب جب حضرت خالد نے اہلِ حیرہ سے صلح کرنی چاہی تو خریم نے اُن سے کہا کہ بنتِ بقیلہ کو آپ صلح میں داخل نہ کریں۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُسکو مجھے دے چکے ہیں۔ خریم کے اس دعوی کی تصدیق بشیر بن سعد اور محمد بن مسلمہ نے بھی کر دی تو حضرت خالد نے اُس عورت کو صلح میں شامل نہیں کیا اور وہ خریم کے حوالہ کر دی لیکن چونکہ یہ عورت اس وقت اسّی برس کی بڑھیا تھی اس لیے خریم نے اس عورت کے اہلِ خاندان سے ایک ہزار درہم لیکر وہ ان کو واپس کر دی۔ جب لوگوں نے خریم سے کہا یہ آپ نے کیا کیا کہ بنت بقیلہ کو اتنے سستے داموں فروخت کر دیا تو خریم نے جواب دیا کہ مجھکو معلوم ہی نہیں تھا کہ ایک ہزار سے اوپر بھی کوئی عدد اور ہے۔[۳]

یہ روایت اصولِ روایت کے اعتبار سے بھی غلط ہے اور درایۃً بھی اور اس کے دلائل یہ ہیں۔

(۱) پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ واقعہ کس شخص کا ہے اس میں ہی اختلاف ہے۔ بلاذری نے اس کو خریم بن اوس جو قبیلۂ بنو طے سے تعلق رکھتے تھے اُن کا واقعہ بتایا ہے لیکن ساتھ ہی کہتے ہیں کہ ایک حدیث میں یہ بھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنت بقیلہ کو دینے کا وعدہ

[۱] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۶۷، [۲] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۶۷۔ [۳] فتوح البلدان ص ۲۵۳۔

قبیلہ ربیعہ کے ایک شخص سے کیا تھا[۱] حافظ عماد الدین ابن کثیر نے اس شخص کا نام شویل لکھا ہے۔ اور طبری اور ابن اثیر نے بھی یہی نام لکھا ہے[۲]

(۲) طبری نے اس عورت کا نام کرامتہ نقل کیا ہے۔ لیکن حافظ ابن حجر نے اس کا نام لیشیما، لکھا ہے[۳]

(۳) طبری میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ وسلم نے بنت بقیلہ دینے کا وعدہ اس شرط پر کیا تھا کہ حیرہ بزورِ شمشیر (عنوۃً) فتح ہو۔ "ھی لک اذا فتحت عنوۃً"[۴] اور ظاہر ہے کہ یہاں حیرہ جبراً نہیں بلکہ صلحاً فتح ہوا تھا اس لئے نہ خریم یا شویل کو اس کے طلب کرنیکا حق تھا اور حضرت خالد اس مطالبہ کو منظور کر سکتے تھے۔

(۴) روایت میں ہے کہ جب حضرت خالد نے بنتِ بقیلہ کو شرائطِ صلح سے مستثنیٰ رکھنا اور اسکو مدعی کے حوالہ کر دینے کا فیصلہ کر لیا تو بنت بقیلہ کے رشتہ داروں کو اُسپر اعتراض ہوا لیکن بنت بقیلہ نے ان لوگوں سے کہا کہ آپ لوگ مجھ کو روکیں نہیں۔ جانے دیں اصل بات یہ ہے کہ اس شخص نے مجھ کو جوانی میں دیکھا تھا اور یہ شاید یہ سمجھتا ہے کہ جوانی ہمیشہ رہتی ہے اب مجھ کو دیکھے گا کہ میں اسّی برس کی بڑھیا ہو گئی ہوں تو یہ خود مجھ کو واپس کر دیگا۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر اس شخص نے بنتِ بقیلہ کو اُس کے عہدِ شباب میں دیکھا تھا اور وہ اُسکو دل دے بیٹھا تھا تو یقینی بات ہے کہ یہ خود بھی اُس وقت جوان ہوگا۔ پھر یہ کیا بات ہے کہ اس عرصہ میں بنت بقیلہ تو شباب اور کہولت کی منزلیں طے کر کے ہشتاد سالہ عجوزہ بن گئی لیکن یہ شخص جوان کا جوان ہی رہا جو اس جذبہ کیساتھ بنت بقیلہ کو حضرت خالد سے طلب کرتا ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ اس شخص کی بے خبری کا عالم یہ ہے کہ وہ خود اس کا اندازہ ہی نہیں کر سکا کہ اس مدت میں بنت بقیلہ بڑھیا بھی ہو چکی ہوگی۔ بنتِ بقیلہ اس کے متعلق

---

[۱] البدایۃ والنہایۃ ج ۶ ص ۳۴۷۔ [۲] طبری ج ۲ ص ۵۶۹ و ابن اثیر ج ۲ ص ۲۶۷ [۳] الاصابہ ج ۳ ص ۳۵۱۔ ترجمہ محمد بن بشیر و جلد اول ص ۴۳۳ ترجمہ حریم [۴] طبری ج ۲ ص ۵۶۹

یہ کہتی ضرور ہے کہ وہ شباب کو پائیدار اور دوامی سمجھتا ہے لیکن کیا درحقیقت دنیا میں ایسا کوئی احمق ہے بھی!

(۵) اس شخص کو جب لوگوں نے سستے داموں بیچ دینے پر بُرا بھلا کہا تو اس نے کہا کہ میں ایک ہزار کے بعد بھی کوئی عدد ہے یہ جانتا ہی نہیں تھا۔ اس بات کو بھی آخر کون یاد رکھ سکتا ہے۔ حضرت خالد کی فوج میں کتنے مسلمان تھے؟ مالِ غنیمت کس کثیر مقدار اور تعداد میں مسلمانوں کے ہاتھ پڑ رہا تھا؟ کیا یہ سب چیزیں اس شخص کو معلوم نہیں تھیں اور اگر تھیں تو وہ ان کا شمار کس طرح کرتا تھا۔

حیرہ میں حضرت خالد کا طویل قیام | حضرت خالد کے سامنے سب سے بڑا مرحلہ مدائن کے فتح کرنے کا تھا۔ لیکن چونکہ حضرت ابوبکر نے احکام بھیج دیئے تھے کہ جب تک حضرت عیاض اُن سے آکر نہ مل جائیں اور میری اجازت نہ ہو اس وقت تک مدائن کی طرف پیش قدمی نہ کی جائے اس لئے حضرت خالد نے حیرہ کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنا لیا اور کم و بیش سال بھر یہاں مقیم رہے۔ اس قیام سے یہ فائدہ ہوا کہ اطراف و جوانب کے بڑے بڑے زمین داروں اور جاگیرداروں (دہاقین) نے جب یہ دیکھا کہ اسلامی فوج کے قائدِ اعلیٰ کا معاملہ اہلِ حیرہ کے ساتھ بہت ہی روادارانہ اور منصفانہ ہے تو اب ان لوگوں نے بھی خدمت میں حاضر ہو کر صلح کی پیش کش کی اور یہ سب جزیہ ادا کرنے کا عہد و پیمان کر کے حضرت خالد کے سایۂ عاطفت میں آگئے۔[1]

اب جنوب میں خلیج فارس۔ شمال میں حیرہ۔ مغرب میں بلادِ عرب اور مشرق میں دجلہ تک کے وسیع علاقہ پر مسلمانوں کا قبضہ تھا۔ حضرت خالد نے ضرار بن الازور۔ ضرار بن الخطاب۔ قعقاع بن عمرو اور مثنیٰ بن حارثہ وغیرہم نامور بہادروں کی سرکردگی میں ایک ایک دستۂ فوج دے کر اُن کو ان تمام علاقوں میں منتشر کر دیا۔ تاکہ نظم و ضبط قائم رہے اور کسی کو بغاوت و سرکشی کی جرأت نہ ہو۔ اس سے فارغ ہو کر حضرت خالد نے اہلِ ایران عوام و خواص (مرازبہ) کے نام الگ الگ

---

[1] طبری ج ۲ ص ۵۷۰ - ۵۷۳ -

خطوط روانہ کئے جن میں اُن کو اسلام کی دعوت دی گئی تھی۔ ایرانیوں کا اُسوقت حال یہ تھا کہ شاہِ ایران اردشیر کے مرجانے سے طوائف الملوکی کی شکل پیدا ہو گئی تھی لیکن اسلامی فتوحات نے اُنکو ایک مرکز پر لاکر کھڑا کر دیا تھا اس بنا پر انھوں نے انبار اور عین التمر میں جو حیرہ سے قریب ہی تھے فوجیں جمع کرنی شروع کردیں۔

واقعۂ انبار[۱]

حضرت خالد کو علم ہوا تو قعقاع کو حیرہ میں اپنا قائم مقام کرکے دریائے فرات کے کنارے کنارے انبار کے ارادہ سے روانہ ہوئے۔ اقرع بن حابس مقدمۃ الجیش کا کام کر رہے تھے۔ ایرانیوں کو اسلامی لشکر کی نقل و حرکت کی اطلاع ہوئی تو قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئے قلعہ کے چاروں طرف خندق تھی اس لئے مسلمان قلعوں تک پہونچ نہیں سکتے تھے اور اس پر طُرہ یہ ہوا کہ ایرانی قلعوں کی فصیل سے تیروں کی بارش کر رہے تھے۔ حضرت خالد نے یہ رنگ دیکھا تو اپنے قدر اندازوں کو حکم دیدیا کہ وہ دشمن کی آنکھ کو نشانہ بناکر تیر چلائیں نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان خدنگ افگنوں نے ایک ہزار آنکھوں کو ٹھکانہ لگایا اسی وجہ سے اس جنگ کا نام ذات العیون بھی ہے۔[۲]

ایرانی فوج کا قائد شیرزاد اپنے زمانہ کا مشہور عقلمند اور مدبر تھا۔ اُس نے تنگ آکر صلح کی پیش کش کی لیکن شرائط صلح ایسے تھے کہ حضرت خالد منظور نہیں کرسکتے تھے اسلئے اس پیش کش کو رد کردیا گیا۔ اور اب حکم ہوا کہ مجاہدین کے جتنے کمزور اونٹ ہیں اُن کو ذبح کرکے خندق میں پھینکدیا جائے۔ ایسا کرنے سے خندق پُر ہوگئی اور مُسلمانوں نے اسے عبور کرنا شروع کردیا اس منظر کو دیکھ کر شیرزاد پر

---

[۱] اس کو انبار کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہاں غلہ اور اناج کے انبار لگے رہتے تھے۔ نعمان بن منذر کے خاص لوگ اور اُس کے دستکاروں کو یہیں سے غلہ فراہم کیا جاتا تھا بلاذری ص۲۵۵ - انبار میں بڑی آبادی عربوں کی تھی جن کے آباد اجداد بخت نصر کے عہد میں یہاں آکر آباد ہو گئے تھے یہ لوگ عربی لکھنا بھی جانتے تھے۔ طبری ج۲ ص ۵۰۶

[۲] ابن اثیر ج۲ ص ۲۶۹۔

ایسا خوف طاری ہوا کہ حضرت خالد کی جو شرائط صلح تھیں اُن کو بے چون وچرا مان لیا۔ شیرزاد یہاں سے جان سلامت لیکر بہمن جادویہ کے پاس چلاگیا اور انبار پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔[1] شعبی سے روایت ہے کہ

لاهل الانبار عهد وعقد[2] — اہل انبار کے ساتھ عہد وپیمان ہوا تھا۔

فتح عین التمر

یہاں سے فارغ ہوکر حضرت خالد نے زبرقان بن بدر کو انبار میں چھوڑا اور خود ایک لشکر لے کر عین التمر کیلئے روانہ ہوئے۔ عین التمر عراق اور بادیۂ شام کے درمیان صحرا کے کنارے پر واقع ہے تین دن کے سفر کے بعد یہاں پہونچ گئے۔ بہرام چوبین کا بیٹا مہران حکومت ایران کی طرف سے اس جگہ کا حاکم تھا اُس کے پاس ایرانیوں کی ایک بڑی فوج کے علاوہ بنو نمر تغلب۔ اور بنو ایاد بادیہ شام کے عرب قبائل کا بھی ایک عظیم لشکر تھا عرب قبائل کا سردار عقہ بن ابی عقہ تھا۔ حضرت خالد کے پہونچنے کی اطلاع ہوئی تو عقہ نے مہران سے کہا کہ لوہا لوہے کو کاٹتا ہے۔ ہم بھی عرب ہیں اور خالد اور اُن کے ساتھی بھی عرب ہیں اس لئے بس ہم دونوں کو لڑنے دو" مہران نے اس تجویز کو بخوشی منظور کرلیا۔ جب اُس کے لوگوں نے اس پر ملامت کی تو بولا" میں نے یہ ایک بڑی چال چلی ہے جو تم لوگوں کیلئے بہت مفید ہوگی۔ اگر عقہ۔ خالد کے مقابلہ میں کامیاب ہوگیا تو ہو المراد، ورنہ مسلمان عقہ اور اس کی فوج سے لڑتے لڑتے کمزور ہو جائینگے اتنے میں ہم تازہ دم ہوں گے ہی مسلمانوں پر حملہ کردیں گے اور اس طرح فتح ہماری ہی ہوگی چنانچہ عقہ اپنی فوج کو لیکر حضرت خالد کی طرف بڑھا۔ اس کے میمنہ پر بجیر بن فلان تھا اور میسرہ پر ہذیل بن عمران عقہ اور مہران کے درمیان چند میلوں کی مسافت تھی۔ عقہ نے ایک مقام پر پہنچ کر صف بندی شروع کی۔ حضرت خالد بھی اُس کے مقابلہ میں اپنی فوج کو ترتیب دینے لگے۔ جب

---

[1] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۶۹ [2] فتوح البلدان ص ۲۵۵

دونوں طرف صفیں آراستہ ہوگئیں تو عقہ نے پیش قدمی کرکے حضرت خالد پر حملہ کیا۔ دونوں ایک دوسرے پر وار کرتے رہے۔ آخر حضرت خالد نے پہلو بچا کر عقہ پر اچانک اس زور کا حملہ کیا کہ عقہ کو اپنے بازوؤں میں تھام لیا اور اسے گرفتار کرلیا۔ عقہ کی گرفتاری نے اس کی فوج کے پاؤں اکھاڑ دیئے۔ بدحواس ہوکر بھاگے لیکن پھر بھی بہت سے لوگ گرفتار ہوگئے۔

مہران کو عقہ کی اس شکست کی خبر پہونچی تو اپنے لشکر کو لے قلعہ سے نکل بھاگا۔ اب حضرت خالد کیلئے میدان صاف تھا۔ چنانچہ جب قلعۂ عین التمر میں پہونچے ہیں تو جو لوگ یہاں رہ گئے تھے اُن سبکو گرفتار کرکے قلعہ پر قبضہ کرلیا اور عقہ اور اس کے ساتھی جو سخت قسم کے فتنہ پرداز تھے انکو قتل کردیا۔

یہاں ایک واقعہ بھی پیش آیا کہ حضرت خالد نے ایک گرجا دیکھا جس کا دروازہ اندر سے بند تھا حضرت خالد کے حکم سے جب دروازہ توڑا گیا تو اندر چالیس لڑکے ملے جو انجیل پڑھ رہے تھے۔ حضرت خالد نے پوچھا "تم کون لوگ ہو؟" انھوں نے جواب دیا "ہم یہاں گروی ہیں" حضرت خالد نے اُن کو وہاں سے نکال کر مجاہدین میں تقسیم کردیا۔ ابوموسیٰ بن نصیر جو اندلس کے مشہور فاتح ہیں اور ابو محمد بن سیرین جو بصرہ کے نامور فقیہ ہیں وہ بھی انہیں لڑکوں میں تھے۔[1]

معرکۂ دومۃ الجندل

دومۃ الجندل عین التمر سے جنوب مغرب میں تین سو میل کی مسافت پر اُس راستہ پر واقع ہے جو حیرہ اور عراق کی طرف جاتا ہے۔ بادیہ اور صحرائے نفود دونوں کے درمیان میں حائل ہے۔

ربیع الاوّل ۵ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ملی کہ دومۃ الجندل میں دشمنوں کی ایک بڑی فوج مجتمع ہورہی ہے تو آپ ایک ہزار مسلمانوں کی جمعیت لیکر مدینہ سے روانہ ہوئے ان لوگوں کو خبر ہوئی تو بھاگ نکلے۔ اس لئے کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ اس کے بعد اکیدر بن عبدالملک الکندی ایک عربی سردار تھا جو قیصر کے زیر اثر تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے مقابلہ کے

[1] طبری ج ۲ ص ۵۷۷

لئے حضرت خالد کو ماہ شوال ۹ھ میں بھیجا۔ حضرت خالد اس کو گرفتار کر کے مدینہ لے آئے یہاں اکیدر مسلمان ہو گیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کے اور اہل دومتہ کیلئے پروانۂ امن عطا فرما دیا۔ لیکن آپؐ کی وفات کے بعد اُس نے زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کر دیا اور عہد شکنی کر کے مرتد ہو گیا۔[1]

ان وجوہ کی بنا پر حضرت ابوبکرؓ نے جب حضرت خالد کو عراق کی طرف روانہ کیا تو عیاض بن غنم کو دومتہ الجندل بھیجا۔ آپ کو توقع تھی کہ دومتہ کی مہم جلد سر ہو جائیگی لیکن کم و بیش ایک سال گزر گیا اور یہ مورچہ فتح نہیں ہوا۔ بنو کلب۔ بہراء اور غسان کے قبائل جو عراق میں حضرت خالد کے ہاتھوں شکست کھا کر بھاگے تھے انھوں نے بھی دومتہ الجندل میں آ کر پناہ لے لی تھی تاکہ حضرت خالد کا بدلہ حضرت عیاض سے لیکر اپنے دل کو تسکین دے سکیں۔ اس بنا پر دشمنوں کی جمعیت میں اضافہ ہو رہا تھا اور اُس کی وجہ سے حضرت عیاض کو بڑی دقتوں اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔

عین التمر کی فتح کے بعد حضرت خالد نے مال غنیمت کیساتھ مژدۂ فتح ولید بن عقبہ کے ہاتھ حضرت ابوبکر کی خدمت میں مدینہ روانہ کیا تو حضرت ابوبکر نے ولید بن عقبہ کو مع سازوسامان کے بطور کمک حضرت عیاض کے پاس بھیجدیا۔ ولید نے صورت حال کی نزاکت محسوس کر کے عیاض سے کہا کہ آپ حضرت خالد کی مدد طلب کیجئے۔ ورنہ اس کے بغیر یہ مورچہ فتح نہیں ہوگا۔ عیاض نے فوراً اس مشورہ پر عمل کیا۔ حضرت خالد کو عیاض کا خط ملا تو فوراً اُن کو لکھا کہ "میں تو خود ہی تمہارے پاس آنیوالا تھا" اور اُس کے بعد یہ رجزیہ اشعار لکھے:۔

لَبِثْ قلیلاً تأتك الحلائب ۔۔۔ یحملن آساداً علیها القاشب

کتائبٌ یتبعها کتائب

کچھ اور انتظار کرو۔ تمہارے پاس اونٹنیاں آ رہی ہیں جن پر شیر سوار ہیں اور اُنپر تلواریں ہیں

[1] فتوح البلدان بلاذری ص ۶۸ - ۶۹۔

لشکر پر لشکر آگے پیچھے آرہے ہیں۔

چنانچہ حضرت خالد شام و لفود کے بادیہ وصحرا میں گھوڑا اڑاتے ہوئے دس روز سے بھی کم کی مدت میں تین سو میل کی مسافت طے کر کے دومۃ الجندل کے مقام پر پہونچ گئے۔ یہاں بہرا، کلب۔ غسان۔ تنوخ اور ضجاعم یہ سب عرب قبائل اُن کے مقابلہ میں صف آرا تھے۔

دومۃ الجندل کی ریاست دو شخصوں میں تقسیم تھی۔ ایک اکیدر اور دوسرا جودی بن ربیعہ۔ اکیدر چونکہ حضرت خالد کے پنجۂ شیر افگن سے واقف تھا اسلئے اُس کی رائے ہوئی کہ جنگ کرنی چاہئے لیکن عرب قبائل اور اُن کا دوسرا سردار جودی اس پر رضامند نہیں ہوئے۔ اس لئے اکیدر نے ان سے جُدا ہو کر اپنی راہ لی۔ حضرت خالد کو اس کی خبر ہوئی تو عاصم بن عمرو کو تعاقب میں روانہ کیا۔ عاصم نے اکیدر کو گرفتار کر کے پیش کیا۔ چونکہ باغی اور مرتد تھا اس لئے حضرت خالد کے حکم سے قتل کر دیا گیا۔[1]

اب حضرت خالد نے صف بندی کی۔ جودی عربوں کا ایک دستہ لیکر مقابلہ کیلئے بڑھا۔ اور ایک دستہ عیاض کی طرف بھیجا۔ حضرت خالد اور عیاض نے دومۃ الجندل کو درمیان میں لے لیا تھا۔ جودی حضرت خالد کے مقابلہ میں شکست کھا گیا۔ اور گرفتار ہو گیا۔ اُس کے لشکر کے لوگ بدحواس ہو کر قلعہ کی طرف بھاگے۔ لیکن قلعہ سب کو سما نہیں سکتا تھا۔ اس لئے جتنے آدمی اندر آسکتے تھے انھوں نے گھُس کر دروازہ بند کر لیا۔ ایک بڑی تعداد جو قلعہ سے باہر رہ گئی تھی لقمۂ اجل بن گئی۔ کلب کے قیدیوں کو بنو تمیم اُن کے حلیف ہونیکی وجہ سے امن دے چکے تھے۔ اسلئے حضرت خالد نے اُن کی جان بخشی کر دی۔ اس کے بعد حضرت خالد نے قلعہ پر حملہ کیا اور اسکو بزورِ شمشیر فتح کیا جودی جو کہ عرب قبائل کا سردار تھا۔ قتل کر دیا گیا اور اس کی بیٹی سے جو حسن و جمال میں مشہور تھی گرفتار ہو کر آئی تو حضرت خالد نے پہلے اسکو خریدا اور پھر آزاد کر کے نکاح کر لیا۔[2]

---

[1] الکامل لابن اثیر ج ۲ ص ۲۷۰

[2] فتوح البلدان بلاذری ص ۶۹

عراق میں بغاوت

حضرت خالد دومۃ الجندل میں مقیم تھے کہ ایرانیوں اور عراق کے عرب قبائل نے انکی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر عَلَم بغاوت بلند کر دیا۔ بنو تغلب جن کا سردار عقہ مارا گیا تھا وہ اس میں پیش پیش تھے۔ قعقاع جن کو حضرت خالد حیرہ میں اپنا قائم مقام چھوڑ کر آئے تھے۔ ان باغیوں سے عہدہ برآ ہونا تنہا اُن کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس لئے حضرت خالد بغاوت کی خبر پاتے ہی دومہ سے روانہ ہو گئے۔ اقرع بن حابس مقدمۃ الجیش پر تھے۔ ان باغی ایرانیوں اور عربوں نے اپنی جمعیت کو کئی محاذوں پر تقسیم کر دیا تھا۔ ایرانی سردار روزمہر اور روزبہ نے انبار کا رُخ کیا تھا اور دوسرے فوجی دستے حصید۔ خنافس وغیرہ مقامات جو انبار کے قرب وجوار میں تھے۔ ان میں بغاوت کی آگ بھڑکا رہے تھے۔ حضرت خالد نے حیرہ پہونچکر قعقاع کو حصید کے موقع پر متعین کیا جہاں اس وقت روزمہر اور روزبہ فروکش تھے اور ابولیلی کو خنافس کے محاذ پر روانہ کیا۔ حصید میں جنگ بڑی شدید قسم کی ہوئی۔ لیکن آخر قعقاع غالب آگئے اور روزمہر تلوار کے گھاٹ اتار دیا گیا[1] اب رہا روزبہ اسکو عصمۃ بن عبد اللہ الضبی نے ٹھکانہ لگا دیا۔ اور ایرانی شکست کھا گئے۔

یہاں سے بھاگ کر ان لوگوں نے خنافس کے مورچہ پر پاؤں جمائے۔ ایرانی فوج مہبوذان کے ماتحت تھی۔ لیکن مقابلہ کی نوبت نہیں آئی۔ مہبوذان ابولیلی کی خبر آمد سنتے ہی بھاگا اور مُصَیَّخ نامی ایک مقام پر پہنچکر ھذیل بن عمران کے دامن میں پناہ لی۔ حضرت خالد کو ان واقعات کا علم ہوا تو قعقاع۔ ابولیلی۔ اعبد اور عروہ جو مختلف محاذوں پر متعین تھے اُن کو لکھا کہ فلاں شب میں فلاں وقت سب لوگ مُصَیَّخ میں جمع ہو جائیں، جب سب لوگ جمع ہو گئے تو ہذیل

[1] اس موقع پر قعقاع نے جو شعر کہے تھے یاقوت نے معجم البلدان میں اُن کو نقل کیا ہے وہ شعر یہ ہیں۔

الا ابلغا اسماء ان خلیلها — قضی وطرا من روزمهر الاعاجم

غداة صبحنا فی حصید جموعهم — بهندیة تفری فراخ الجماجم

پر شبخون مارنے کا حکم ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کشتوں کے پشتے بندھ گئے۔ لیکن ہذیل اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ جان بچا کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔

دو مسلمانوں کا سہواً قتل

مُصَیّخ کے شبخون میں جو لوگ مارے گئے اُن میں عبد العزیٰ اور لبید بن جریر بھی تھے۔ یہ دونوں مسلمان ہو چکے تھے اور اُن کے پاس حضرت ابوبکر کا ایک تصدیق نامہ بھی تھا۔ اس لئے حضرت ابوبکر کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے ان دونوں کا خون بہا ادا کیا اور حکم دیا کہ انکی اولاد کیساتھ حُسنِ سلوک برتا جائے۔ حضرت عمر نے حضرت خالد کو جس طرح مالک بن نویرہ کے قتل کا مجرم قرار دیا تھا وہ ان دونوں شخصوں کے قتل ناحق کا الزام بھی ان پر لگاتے تھے[1] لیکن حق یہ ہے کہ حضرت خالد کیلئے سب سے بڑا اور معقول عذر یہ تھا کہ یہ دونوں شخص مسلمان ہونے کے باوجود دشمن کے کیمپ میں موجود اور ہذیل کے ساتھیوں میں تھے۔ چنانچہ جب اس معاملہ میں حضرت عمر نے حضرت ابوبکر سے گفتگو کی اور حضرت خالد کے خلاف اپنی ناراضگی اور برہمی کا اظہار کیا تو حضرت ابوبکر نے صاف جواب دیا۔

کذالک یلقی من نازل اھل الشرک[2] ۔ جو کوئی اہلِ شرک کے ساتھ قیام کرتا ہے اس کا حشر یہی ہوتا ہے۔

لیکن طبری میں یہ واقعہ اس طرح پر ہے کہ حضرت ابوبکر نے ان شخصوں کا جب خون بہا ادا کیا تو ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا

اما ان ذالک لیس علیّ	(میں خون بہا ادا کرتا ہوں) لیکن میرے ذمہ یہ واجب نہیں ہے
اذ نازلا اھل الحرب[3] ۔	کیونکہ یہ دونوں اہلِ حرب کے ہاں مقیم اور ان کے مہمان تھے۔

چونکہ بغاوت کا یہ سارا فتنہ پیدا کیا ہوا بنو تغلب کا تھا اور ایرانی جو کچھ کر رہے تھے انہیں کے بل بوتہ پر کر رہے تھے اور ان کی اسلام دشمنی بہت پرانی اور نہایت شدید تھی اس بنا پر حضرت خالد نے قسم کھائی تھی کہ وہ بنو تغلب کو تہس نہس کئے بغیر دم نہیں لیں گے۔ چنانچہ اب وہ مُصَیّخ سے

[1] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۷۲ [2] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۷۲۔
[3] طبری ج ۲ ص ۵۸۱ ۔

فارغ ہو گئے تو قعقاع اور ابو لیلیٰ ان دونوں کو دو مختلف راستوں سے روانہ کیا اور ایک رات مقرر کر دی کہ اُس میں بنو تغلب پر حملہ کیا جائے۔ ان دونوں کی روانگی کے بعد خود بھی روانہ ہوئے پہلے مقام ثنی میں اور اُس کے بعد مقام زمیل میں (جو بنو تغلب کے خاص مرکز تھے) پہونچ کر تین طرف سے اس قدر زور کا حملہ کیا کہ بنو تغلب کا کوئی شخص دوسروں تک اُن کی خبر پہنچانیوالا بھی نہیں بچا۔ اس حملہ میں جو عورتیں گرفتار ہوئی تھیں انھیں میں ربیعۃ بن بجیر التغلبی کی بیٹی بھی تھی[1] یہ سب مال غنیمت اور گرفتار شدہ عورتیں مدینہ پہونچیں تو حضرت علیؓ نے بنت ربیعہ کو جس کا نام الصہبا اور کنیت ام حبیب تھی خرید لیا اور اُس کے بطن سے عمر اور رقیہ پیدا ہوئے[2]

یہاں سے فارغ ہو کر حضرت خالد نے رضاب کا رُخ کیا۔ اس جگہ عقبہ کے بیٹے ہلال نے بغاوت برپا کر رکھی تھی لیکن ہلال کے ساتھی حضرت خالد کے پہونچنے کی خبر سنتے ہی اسکو چھوڑ کر بھاگ پڑے۔ اس لئے جنگ کی نوبت نہیں آئی۔

جنگِ فراض

فراض۔ عراق اور شام کی سرحد پر دریائے فرات کے شمالی حصہ میں واقع ہے حضرت خالد عراق کی بغاوت کا سر قلم کر دینے کے بعد فراض پہونچے اور دریائے فرات کے کنارے پر خیمہ فگن ہو گئے۔ رمضان کا مہینہ آیا وہ بھی یہیں گذار دیا۔ رومیوں نے اسلامی لشکر کو اس حالت میں دیکھا تو اُن کے غصہ کی حد نہ رہی۔ اہلِ ایران کی جو فوجی چھاؤنیاں قرب وجوار میں تھیں اور ان کے علاوہ جو عرب قبائل قیصر کے باج گزار تھے اُن سب سے رومیوں نے مدد

---

[1] اُن کا نام صہبا اور کنیت ام حبیب تھی [2] طبری وابن اثیر والبدایۃ والنہایۃ ج ۶ ص ۳۵۲،

بلاذری نے اس واقعہ کا ذکر فتوح الشام کے زیر عنوان لکھا ہے۔ اور بجائے بنت ربیعہ کے بنت حبیب بن بجیر لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خاتون ربیعۃ بن بجیر کی بیٹی نہیں بلکہ بھتیجی تھیں۔ فتوح البلدان ص ۱۱۷۔

طلب کی اور اس طرح مسلمانوں کے مقابلہ میں ایک نہایت عظیم الشان فوج تیار ہو گئی۔
۱۵ ذی قعدہ ۱۲ھ تک دونوں فوجیں اسی طرح آمنے سامنے پڑی رہیں کہ صرف ایک
دریا اُن کے درمیان حائل تھا۔ آخر رومیوں نے پہل کی اور دریا پار کر لیا۔ حضرت خالد نے صفیں
آراستہ کیں اور جنگ شروع ہو گئی۔ نہایت گھمسان کا رن پڑا۔ لیکن حضرت خالد نے حکم دیا تھا
کہ دشمن کی فوج کو منتشر نہ ہونے دیں اور اُسے چاروں طرف سے گھیر کر لڑیں، مسلمانوں نے
اس پر عمل کیا اور رومیوں۔ ایرانیوں اور عرب قبائل کا بادل دم کے دم میں صاف ہو گیا۔
مؤرخین کا عام بیان ہے کہ اس معرکہ میں دشمن کی فوج کے ایک لاکھ سپاہی مارے گئے۔
ہماری رائے میں یہاں بھی مراد صرف کثرتِ مقتولین کا بیان مقصود ہے۔ ورنہ ظاہر ہے
اُس زمانہ میں کسی فریق کیلئے اتنی بڑی فوج کا میدانِ جنگ میں انتظام کرنا ممکن نہیں تو
سخت دشوار ضرور تھا۔

حضرت خالد کا حج

فراض کی جنگ سے ۲۵ ذی القعدہ ۱۲ھ کو فراغت ہوئی تھی اب حج
میں صرف پندرہ دن باقی تھے۔ حضرت خالد نے اچانک حج کا ارادہ کر لیا اور نہایت دشوار
گزار طویل مسافت کو ان چند دنوں میں طے کر کے اس رازداری کیساتھ مکہ معظمہ آئے اور گئے کہ
فراض کی جنگ سے فارغ ہو کر جس فوج کو حیرہ واپس کیا تھا حج سے فارغ ہو کر پھر اسی فوج
سے آملے حیرہ میں ساتھ ساتھ داخل ہوئے اور اُن لوگوں کو پتہ بھی نہیں چلا کہ حضرت خالد حج
کر آئے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ ایک روایت کے مطابق اس سال
امیرِ حج خود حضرت ابوبکر تھے۔ اور دوسری روایت کے مطابق حضرت عمر فاروق تھے۔ بہر حال
امیر الحج کو بھی ذرا خبر نہیں ہوئی کہ اُن کے قافلۂ حجاج میں خود خالد بن الولید بھی ہیں جو شام
کی سرحد پر مصروفِ جنگ تھے۔
اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حضرت خالد کا یہ فعل اُن کے کمالِ عزم و ہمت شجاعت و شہامت
اور جوانمردی و قوت کی دلیل ہے لیکن چونکہ خلیفہ کی اجازت کے بغیر محاذِ جنگ سے اس طرح

چلا جاتا ڈسپلن اور نظم کے خلاف تھا اس لئے حضرت ابوبکر کو اس کی اطلاع ہوئی تو حضرت خالد کو ایک عتاب نامہ لکھا کہ تم کو اپنی فتوحات پر گھمنڈ نہیں کرنا چاہئے اور سخت تاکید کی کہ آئندہ اس طرح کی کوئی حرکت سرزد نہ ہو۔[1]

عراق میں حضرت خالد کا قیام محرم ۱۲ھ سے صفر ۱۳ھ تک کم وبیش ایک برس اور دو مہینہ رہا لیکن اس قلیل مدت میں انھوں نے جو فتوحات حاصل کیں وہ جنگ وحرب کی تاریخ کا ایک نادر واقعہ ہے، ان جنگوں کا دائرہ خلیج فارس سے شام کی سرحد فراض تک وسیع ہے اور پھر جنگ صرف کسی ایک قوم سے نہیں بلکہ ایرانی رومی اور عرب قبائل ان تینوں کے متحدہ لشکروں سے ہے جو تعداد میں سازوسامان اور اسلحہ میں مجاہدین اسلام سے ہر طرح برتر تھے۔ ان تمام معرکوں میں ایک موقع بھی ایسا نہیں ہے جہاں مسلمانوں کو شکست ہوئی ہو۔

اس کے علاوہ اس پر بھی غور کرو کہ اُس زمانہ کے عام قاعدہ کے برخلاف حضرت خالد جس شہر یا قصبہ کو فتح کرتے تھے اس کے نظم وضبط کا باقاعدہ بندوبست بھی کرتے تھے، ایک امیر پورے علاقہ کا نگراں اور حاکم ہوتا تھا اور اُس کے ماتحت ٹیکس وصول کرنے والے دوسرے لوگ ہوتے تھے۔ کسانوں کیساتھ ہمیشہ غیر معمولی رعایت اور ملاطفت کا معاملہ کیا جاتا تھا اور زمیں داروں اور جاگیرداروں کے ظلم سے انکو نجات دلائی جاتی تھی۔ اس بنا پر حضرت خالد کی حیثیت ایک فاتح اعظم کی تھی نہ کہ محض ایک حملہ آور کی، اُن کی فتح کا مقصد تعمیر تھا نہ کہ تخریب۔

---

[1] طبری ج ۴ ص ۵۸۴

فتوحاتِ شام

شام کی فتوحات سے متعلق مؤرخین کے بیانات بڑے مختلف اور پیچیدہ ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے پہلا لشکر کب بھیجا؟ اور وہ لشکر کونسا تھا؟ ان لشکروں کے امراء کون کون تھے؟ یہ چند سوالات ہیں جن کا جواب ایک نہیں ہے۔ طبری میں متعدد روایات ہیں جن سے متعدد باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ بلاذری کے بیانات بہت بے ترتیب اور اُلجھے ہوئے ہیں جن سے ایک شخص کوئی قطعی نتیجہ نہیں نکال سکتا۔ ان میں سے بعض بیانات طبری کی روایتوں کے ساتھ مطابقت رکھتے ہیں اور بعض اُن کی بالکل ضد ہیں۔ ابو اسمٰعیل الازدی اور واقدی کے بیانات کا حال بھی یہی ہے۔ ابن اثیرؒ، ابن خلدون اور عماد الدین ابن کثیرؒ نے زیادہ تر طبری کی روایات کا ہی تتبع کیا ہے۔ لیکن ہم نے ان سب مآخذ کو سامنے رکھ کر واقعاتِ شام کو ایک خاص طرز پر مرتب کیا ہے جس سے واقعات میں تاریخی تسلسل بھی باقی رہتا ہے اور منطقی ترتیب بھی قائم رہتی ہے، صفحاتِ آئندہ سے قارئین کو خود اس کا اندازہ ہو جائیگا۔

شام کی سرحد پر لشکر کا تعین مؤرخین عام طور پر لکھتے ہیں کہ جب حضرت ابوبکرؓ اہلِ ارتداد کے معاملہ سے فارغ ہوگئے تو آپ نے شام کی طرف توجہ کی[1] لیکن ہمارے خیال میں زیادہ صحیح یہ ہے کہ تبوک اور موتہ کے واقعات نے ہرقل (قیصر روم) کو ہوشیار کر ہی دیا تھا کہ اس کے

---

[1] بلاذری ص ۱۱۴ و تاریخ ابن خلدون ج ۲ ص ۸۳ -

بعد ہی حضرت اُسامہ کو شام میں غیر معمولی کامیابی ہوئی۔ اس صورت حال نے قیصر روم کو جو ایرانیوں پر اپنی فتوحات کے نشہ میں غرق تھا بوکھلا دیا اور اس نے اپنی سرحدوں پر فوجی دستے متعین کرنے شروع کر دیئے۔ چنانچہ ابن عساکر لکھتے ہیں:-

فبلغ ذالك هرقل وهو بحمص فدعى بطارقته فقال هذا الذى حذرتكم فابيتم ان تقبلوه منى قد صارت العرب تاتى من مسيرة شهر فتغير عليكم ثم تخرج من ساعتها ولم تكلم قال اخوه ىناف فابعث رابطة تكون بالبلقاء فبعث رابطة واستعمل عليهم رجلاً من اصحابه فلم يزل مقيماً حتى تقدمت البعوث الى الشام فى خلافة ابى بكر وعمر [1]	ہرقل حمص میں تھا جب اس کو (جیش اسامہ کی کامیابی کی) خبر پہنچی تو اس نے اپنے پادریوں کو بلایا اور کہا یہی وہ بات ہے جس سے میں تم کو ڈرایا کرتا تھا لیکن تم اس کو ماننے سے انکار کرتے تھے۔ دیکھو یہ عرب ایک مہینہ کی مسافت پر آتے ہیں تم پر لوٹ مار مچاتے ہیں۔ اور فوراً ہی زخم کھائے بغیر واپس چلے جاتے ہیں۔ ہرقل کے بھائی ینٖاف نے کہا تو آپ بلقا میں ایک دستۂ فوج متعین کر دیجئے۔ چنانچہ ہرقل نے ایسا ہی کیا، ایک دستہ متعین کر دیا اور اپنا ایک معتمد اکا انچارج افسر بنا دیا۔ یہ دستہ اس وقت تک برابر رہا جبکہ ابوبکر و عمر کی خلافت کے زمانہ میں شام کی طرف لشکر آنے شروع ہوئے ہیں۔

ظاہر ہے ادھر جب قیصر روم یہ سب کچھ سرحدی انتظامات کر رہا تھا تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ اس طرف حضرت ابوبکر کو اس کی خبر نہ ہوتی اور آپ اس کے جواب میں اپنی سرحدوں پر کوئی فوجی دستہ حفظ ما تقدم کے طور پر متعین نہ فرماتے۔ اس کی ضرورت خاص طور پر اس لیے بھی تھی کہ مسلمان جس زمانہ میں باغیوں کے ساتھ اُلجھے ہوئے تھے اُن کی اس مصروفیت سے فائدہ اٹھانے کی غرض سے قیصر روم اندرون عرب گھس کر مسلمانوں پر حملہ کرنے کا خیال کر سکتا تھا۔

[1] تاریخ ابن عساکر ج ۱ ص ۱۲۴ -

چنانچہ اس مقصد کیلئے عین اُس زمانہ میں جبکہ حروبِ ارتداد جاری تھیں۔حضرت ابوبکر نے خالد بن سعید کو جو السابقون الاولون میں سے تھے شام کی سرحد پر ایک دستہ فوج کا امیر بنا کر بھیجا چونکہ مؤرخین نے جیسا کہ ہم نے شروع میں کہا ہے۔شام کے واقعات کو ایک دوسرے سے خلط ملط کر دیا ہے اس لئے وہ عام طور پر خالد بن سعید کے تقرر کو حروبِ ارتداد کے بعد کا واقعہ لکھتے ہیں جبکہ شام کی طرف باقاعدہ فوجیں روانہ ہونی شروع ہوئی ہیں۔لیکن ہمارا قیاس یہی ہے کہ خالد بن سعید کا تقرر عام فوجوں کی روانگی سے بہت پہلے در اصل سرحد کی حفاظت کی غرض سے ہوا تھا چنانچہ حافظ ابن حجر ایک روایت نقل کرتے ہیں۔

ان ابا بکر امّرہٗ علی مشارف الشام فی الردۃ [1] — ابو بکر نے ان کو ارتداد کے دنوں میں شام کی چوٹیوں کا امیر مقرر کیا تھا۔

اس کی تائید طبری کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے کہ حضرت ابو بکر نے جب خالد بن سعید کو تیمار کیطرف روانہ کیا جو شام کی سرحد پر واقع ہے تو ساتھ ہی ہدایت کی کہ وہاں قرب وجوار کے لوگوں کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کریں۔جو لوگ مرتد نہیں ہوئے تھے صرف اُن کی خدمات قبول کریں اور نیز یہ کہ جب تک خود حضرت ابو بکر کا حکم نہ پہنچے اور وہ لوگ خود جنگ میں پہل نہ کریں اس وقت تک وہ جنگ نہ کریں [2]

اس کے علاوہ ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت عمر فاروق کو خالد بن سعید کی طرف سے کچھ تکدر تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت ابو بکر کی بیعتِ خلافت سے ایک یا دو مہینہ کے بعد جب یہ یمن سے جہاں وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیطرف سے متعین تھے۔مدینہ واپس آئے تو انھوں نے حضرت علی اور حضرت عثمان سے حضرت ابو بکر کی خلافت پر اپنی ناگواری کا اظہار کیا تھا۔لیکن جب حضرت علی نے صاف لفظوں میں فرمایا کہ ابو بکر کی خلافت صحیح خلافت ہے نہ کہ تغلب تو وہ چُپ ہو گئے۔اس تکدر کی وجہ سے حضرت ابو بکر نے خالد بن سعید کو مشارف شام

---

[1] الاصابہ ج ۱ ص ۴۰۶ تذکرۂ خالد بن سعید۔ [2] طبری ج ۲ ص ۵۸۷

کا امیر مقرر کیا تو حضرت عمر نے اس پر اعتراض کیا اور خالد بن سعید کو امارت سے معزول کردینے کا مطالبہ کیا۔ حضرت ابوبکر نے حضرت عمر کے اس مشورہ کو اس صورت میں قبول فرمایا کہ خالد کو امارت سے تو معزول کردیا لیکن مسلمانوں کے مددگار کی حیثیت سے اُن کو شام بھیجدیا۔

اصل الفاظ یہ ہیں :-

"وجعلہ ردأ للمسلمین بتیماء"[۱] اور اُن کو تیما میں مسلمانوں کا مددگار بنادیا۔

یہاں اس سے بحث نہیں کہ واقعہ کی اصل صورت کیا تھی؟ بہرحال ردأ جسکا انگریزی میں ٹھیٹ ترجمہ AUXILIARY FORCE ہے اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ خالد بن سعید لڑنیکے لئے نہیں بلکہ صرف سرحد کی حفاظت اور اسکی نگہداشت کیلئے بھیجے گئے تھے تاکہ اگر قیصر کی طرف سے کوئی حملہ ہو تو اس کی روک تھام کی جاسکے۔

جب تک عرب میں ارتداد و بغاوت اور اس کے ساتھ جنگ کا ہنگامہ برپا رہا۔ غالباً قیصر اس خیال میں رہا کہ اسلام اس سے عہدہ برآنہ ہو سکے گا اور وہ خانہ جنگیوں کی اسی آگ میں جل بھن کر بھسم ہو جائیگا۔ اسکے علاوہ اسکو یہ خیال بھی ہوگا کہ اگر ان حالات میں اُس نے خود حملہ کردیا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ متحدہ قومیت عرب کی رگ حمیت میں جوش پیدا ہو اور اس کی وجہ سے پورا عرب باہمی جنگ کو بالائے طاق رکھ کر خود اُس کے مقابلہ پر آجائے۔ بہرحال یہ یا اسی طرح کے کچھ اور اسباب تھے کہ قیصر نے اپنی سرحدوں پر جو دستے متعین کئے تھے وہ اسی طرح وہاں پڑے رہے اور انھوں نے کوئی حملہ یا جنگی اقدام نہیں کیا۔

قیصر روم کی جنگی تیاری

لیکن یمن۔ حضرموت اور عمان کے علاقوں میں مسلمانوں کو پے درپے جو فتوحات حاصل ہو رہی تھیں انھوں نے قیصر کو بدحواس کردیا۔ اور اب اس نے بہرا۔ تنوخ سلیح۔ غسان۔ کلب۔ لخم۔ اور جذام وغیرہ عرب قبائل جو حدودِ شام میں آباد اور قیصر کے باج گزار تھے اُن سب کو اپنے ساتھ ملاکر اسلام کیخلاف ایک نہایت عظیم الشان فوج جمع کرلی

[۱] فتوح الشام للواقدی۔ شائع کردہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال۔ ص ۲

اور بڑے پیمانہ پر جنگ کی تیاریاں شروع کردیں۔ ادھر مسلمانوں کو حروبِ ارتداد میں خاطر خواہ کامیابی ہو چکی تھی۔ یمن اور اُس کے آس پاس کے علاقے اُن کے قبضہ میں آگئے تھے اور دوسری جانب حیرہ فتح ہو گیا تھا۔ دومۃ الجندل نے مجاہدینِ اسلام کیلئے اپنے دروازے کھول دے تھے اور اسکی وجہ سے وادی سرحان کے راستے شام میں داخل ہونا آسان ہو گیا تھا۔ اس لئے اب حضرت ابوبکر کو قیصرِ روم کی عظیم الشان جنگی تیاریوں کی اطلاع ہوئی تو آپنے بھی شام پر حملہ کرنیکا ارادہ کرلیا۔

مشاورت | چونکہ یہ ایک نہایت اہم اقدام اور غیر معمولی مہم تھی اس لئے صحابہ سے مشورہ لینا اور ان کی رائے معلوم کرنا ضروری تھا چنانچہ ماہِ صفر ۱۳ھ میں حضرت ابوبکر نے ایک مجلسِ مشاورت طلب کی جس میں حضرت عمرؓ۔ عثمانؓ۔ علیؓ۔ طلحہؓ۔ زبیرؓ۔ عبدالرحمن بن عوفؓ۔ سعد بن ابی وقاصؓ۔ ابوعبیدۃ بن الجراحؓ۔ اور معاذ بن جبلؓ وغیرہم تمام اکابر صحابہ اور نامورانِ مہاجرین وانصار شریک تھے۔ اس مجلس میں پہلے حضرت ابوبکر نے تقریر کی اور فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شام کی طرف اپنی توجہ مبذول فرمائی تھی لیکن اسی درمیان میں اللہ نے آپکو اپنے پاس بلالیا۔ عرب ایک ہی باپ اور ماں کی اولاد ہیں۔ اب میں چاہتا ہوں کہ ان لوگوں کو شام روانہ کروں آپ حضرات کی کیا رائے ہے؟ سب نے یک زبان ہو کر کہا "اے خلیفۂ رسول! آپکی اطاعت ہم پر واجب ہے۔ آپ جہاں کہیں جانیکا ہم کو حکم کریں گے اُس کا بجالانا ہمارا فرض ہوگا۔[۱]

ابو اسمٰعیل الازدی نے اس موقع پر نقل کیا ہے کہ اس مجلسِ مشاورت میں خالد بن سعید الاموی بھی شریک تھے اور انھوں نے ہی سب سے پہلے شام جانیکے لئے اپنا نام پیش کیا تھا۔ لیکن طبری۔ ابن اثیر اور ابن خلدون کے بیانات سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی اس لئے صحیح وہی ہے جو ہم نے اوپر لکھا ہے یعنی یہ کہ خالد بن سعید اس وقت تیما میں تھے اور یہ مجلس درحقیقت ہوئی ہی تھی اُس وقت جبکہ حضرت ابوبکر کو خالد کے خط سے ہرقل کی جنگی تیاریوں کا علم ہوا تھا۔

دعوت نامے | جب سب صحابہ نے حضرت ابوبکر کی رائے سے اتفاق ظاہر کیا اور اُس پر

---

[۱] فتوح الشام للازدی ص ۴

مہر تصدیق ثبت کردی تو چونکہ قیصر روم کی طاقت اُسوقت دُنیا کی سب سے بڑی طاقت تھی۔ اور اسی درجہ سے مجلس مشاورت میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے فرمایا تھا "انھا الروم وبنوا الاصفر، حد حدید ورکن شدید"۔ یہ اہل روم بہت تیز دھار اور مضبوط ستون ہیں، اس بنا پر حضرت ابوبکر نے حجاز اور یمن کے تمام امرائے قبائل کے نام شرکت جہاد کے دعوت نامے بھیجے۔

قبائل کا جوش وخروش اور انکی مدینہ میں آمد

قبائل نے بڑی خوش دلی اور جوش وخروش کیساتھ اس دعوت کو لبیک کہا اور جوق در جوق مدینہ آنا شروع کردیا۔ چنانچہ ذوالکلاع الحمیری نے حضرت ابوبکر کے خط کا مضمون سُنا ہی تھا کہ فوراً ہتھیار سج۔ گھوڑے پر بیٹھ اپنی قوم اور یمن کے دوسرے لوگوں کو ساتھ لے روانہ ہوگئے۔ اسی طرح قیس بن ہبیرۃ المرادی۔ مذحج کو جندب بن عمرو الدوسی قبیلۂ ازد کو۔ اور حابس بن سعد الطائی قبیلۂ طے کے مجاہدین کو ساتھ لیکر چل پڑے۔ انس بن مالک جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم خاص تھے حضرت ابوبکر کے یہ تمام خطوط لیکر گئے تھے۔ انہوں نے واپس آکر حضرت ابوبکر کو مژدہ سنایا کہ آپکی دعوت جہاد کا یہ اثر ہوا ہے کہ قبائل یمن جس حالت میں تھے اُسی میں وہ اپنی عورتوں، بال بچوں اور جمع پونجی کو لیکر روانہ ہوگئے ہیں، یہ سُنکر آپ کو بیحد مسرت ہوئی۔ دُوسرے دن اہل مدینہ کو ساتھ لیکر ان مجاہدین اسلام کے استقبال کیلئے مدینہ سے باہر تشریف لائے۔ قبائل یمن میں سب سے پہلے قبیلۂ حمیر پہونچا جو ہتھیار بند تھا ذوالکلاع ایک عمامہ باندھے اس قبیلہ کی پیشوائی کررہے تھے۔ حضرت ابوبکر ابھی ان کا استقبال کر ہی رہے تھے کہ قبیلوں کی آمد کا تانتا بندھ گیا۔ مدینہ کے قریب مقام جرف میں ان سب قبائل کیلئے خیمے لگادیے گئے تھے۔ وہیں انکو ٹھہرایا گیا۔ [1]

---

[1] فتوح الشام للواقدی ص ۳-۴ - وفتوح الشام للازدی ص ۷، وتاریخ ابن عساکر ج ۱ ص ۱۲۹

قیصرِ روم کے نام حضرت ابو بکر کی سفارت

اسی درمیان میں اتمام حجت کرنے کی غرض سے حضرت ابو بکر نے قیصرِ روم کے پاس ایک سفارت بھیجی تھی جس کے ذریعہ اسکو اسلام کی دعوت دی گئی تھی۔ حافظ ذہبی نے اس سفارت کا حال بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔[۱] ڈاکٹر حمید اللہ اس سلسلہ میں لکھتے ہیں۔

"ارمنی مورخ سابیوس (SABEOS) نے بھی ذکر کیا ہے کہ اس زمانہ میں قیصر کے پاس ایک اسلامی سفارت آئی تھی اس کے بیان کا ترجمہ ہیولشمان نے اپنی کتاب میں کیا ہے اور وہ یہ ہے۔

"انھوں (مسلمانوں) نے تب ایک سفارت بیزنطینی شہنشاہ کے پاس بھیجی اور کہا۔ خدا نے یہ علاقہ ہمارے جد (حضرت ابراہیم) اور اُن کی ذریت کو عطا کیا تھا تو اسپر بہت دنوں سے قابض ہے وہ ہمیں صلح اور آشتی کیساتھ واپس کردے۔ پھر ہم تیرے ملک میں نہیں آئیں گے۔ قیصر نے انکار کیا اور وہ جواب نہیں دیا جسکی سفیر کو توقع تھی۔ قیصر نے کہا "یہ ملک میرا ہے اور تیرا حصہ تو صحرا ہے۔ جا وہاں امن سے رہ"۔[۲]

قبائل کی بے قراری

اس اتمام حجت کے بعد حضرت ابو بکر فوجوں کی ترتیب اور ان کیلئے ساز و سامان کی فراہمی میں مصروف ہوگئے۔ چونکہ مہم نہایت اہم درپیش تھی اسلئے حضرت ابو بکر جو قدم اٹھاتے تھے کامل غور و فکر اور پورے حزم و احتیاط کے ساتھ اٹھاتے تھے۔ اس بنا پر فوجوں کی روانگی میں تاخیر ہو رہی تھی۔ یمن اور حجاز کے جو قبائل جرف میں خیمہ فگن تھے اُن کی بیقراری کا یہ عالم تھا کہ جب کچھ زیادہ دن ہوگئے تو قیس بن ہبیرہ المرادی اور چند لوگوں کو اپنا نمائندہ بنا کر حضرت ابو بکر کے پاس بھیجا اور درخواست کی کہ ہمارا پیمانۂ صبر لبریز ہوگیا ہے یا تو ہمیں شام روانہ کیجئے ورنہ اجازت دیجئے کہ اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جائیں حضرت ابو بکر نے ان کو اطمینان

[۱] تاریخ کبیر حالات ابو بکر مخطوطہ بزم ادب حیدر آباد۔

[۲] منقول از "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی زندگی" ص ۲۸۰۔

دلایا کہ تم ہی لوگوں کے انتظامات کی تکمیل کی وجہ سے دیر ہو رہی ہے۔[1]

اسلامی فوج کے عناصر ترکیبی | شام کیلئے جو فوج روانہ ہونیوالی تھی اس کی یہ خصوصیت خاص طور پر لحاظ میں رکھنے کے قابل ہے کہ اس میں یمن اور حجاز کے ممتاز بہادر اور جنگجو قبائل کے علاوہ اکابر صحابہ جو بدر و احد کے معرکوں میں شریک رہ چکے تھے اور اجلۂ مہاجرین و انصار جو اسلام کی عمارت کے ستونِ اعظم تھے یہ بھی شامل تھے' ایسے صحابہ کی تعداد تین سو بیان کی جاتی ہے۔ ان کے علاوہ عکرمۃ بن ابی جہل جو حروبِ ارتداد کے سلسلہ میں کندہ حضر موت اور عمان وغیرہ کی مہم سر کر کے مدینہ پہونچ چکے تھے ان کو بھی ایک تازہ دم فوج دیکر شام کے محاذ پر روانہ کیا گیا۔ عمرو بن العاص مرتدین کے استیصال کے بعد سے قضاعہ میں مقیم تھے اُن سے پوچھا گیا کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔" انھوں نے جواب دیا کہ اے امیر المومنین! میں اللہ کا تیر ہوں جس طرح آپ چاہیں اُس کو استعمال کر سکتے ہیں' اس جواب کے بعد انکو بھی مدینہ طلب کر لیا گیا۔[2]

افواج کی روانگی | اب فوجوں کی روانگی کا وقت آگیا تھا حضرت ابوبکر نے ایک ٹیلہ پر چڑھکر مجاہدینِ اسلام کے اجتماعِ عظیم کا جائزہ لیا اور اُن کے جوش و خروش اور جذبہ کو دیکھ کر بہت مسرور ہوئے۔ پھر مجاہدین کو چار لشکروں میں تقسیم کیا۔ واقدی نے ان لشکروں کو ایک ایک ہزار افراد پر مشتمل بتایا ہے اور لشکروں کی تعداد تین لکھی ہے[3] لیکن حافظ عماد الدین ابن کثیر نے لشکروں کی تعداد چار بتائی ہے۔ اور ہر ایک لشکر کو تین تین ہزار مجاہدین پر مشتمل لکھا ہے[4] اور ہمارے نزدیک زیادہ صحیح یہی ہے۔ اصل یہ ہے کہ اس مسئلہ میں روایات کے اختلاف کی بڑی وجہ یہ ہے کہ لشکر آگے پیچھے روانہ ہوئے ہیں اور بعض چھوٹے لشکروں کو کسی ایک بڑے لشکر کیساتھ ضم کر دیا گیا ہے۔ اس بنا پر امرا کی تعداد میں بھی اختلاف ہے اور خود لشکر کی تعداد میں بھی۔

ان چار لشکروں میں سب سے بڑا لشکر یزید بن ابی سفیان کا تھا جس میں اہلِ مکہ اور اہلِ یمن دونوں قسم کے حضرات شامل تھے ان کے علاوہ ایک لشکر ابو عبیدۃ بن الجراح۔ دوسرا

[1] فتوح الشام واقدی ص ۶ [2] واقدی ص ۶ [3] فتوح الشام ص ۶ [4] البدایۃ والنہایۃ ج ۷ ص ۳

عمرو بن العاص اور تیسرا شرجیل بن حسنہ کی سرکردگی میں تھا۔ مؤرخین نے لشکروں کی تعداد جو تین یا چار لکھی ہے ہماری رائے میں اُس سے مراد بڑے اور کسی نہ کسی حیثیت سے اہم لشکر ہیں ورنہ درحقیقت لشکروں کی تعداد چار سے بھی زیادہ تھی چنانچہ عکرمہ بن ابی جہل کی قیادت میں جو لشکر تھا اس کا ذکر اوپر بھی چکا ہے۔ حضرت ابوبکر ان لشکروں کو الگ الگ روانہ کرتے اور اُن کو الوداع کہنے کیلئے مدینہ کے باہر تک پاپیادہ تشریف لاتے تھے۔ رخصت کرنے سے قبل ہر ایک لشکر کو خاص خاص ہدایا اور نصائح تلقین فرماتے جن کا ذکر آگے اپنی جگہ پر آئیگا۔ اور پھر اُن کے حق میں بارگاہ ایزدی میں کمال خضوع و خشوع کے ساتھ دعا کرنے کے بعد۔ خدا حافظ کہدیتے تھے۔ ان لشکروں کو آپ نے جو ہدایات دیں اُن میں ایک یہ ہدایت بڑی اہم تھی کہ وہ سب ایک راستے سے نہ جائیں بلکہ مختلف راستے اختیار کریں۔ چنانچہ یزید بن ابی سفیان جن کو دمشق کے محاذ پر بھیجا گیا تھا انکو حکم ہوا کہ تبوک کے راستہ سے جائیں۔ عمرو بن العاص جو فلسطین کے محاذ کیلئے مقرر ہوئے تھے وہ ایلہ کی راہ گئے اور باقی امراء جو حمص اور دوسرے محاذوں کیلئے نامزد ہوئے تھے وہ بلقاء کے راستہ سے گئے۔ بلاذری کا بیان ہے کہ ان لشکروں کی روانگی جمعرات کے دن یکم صفر ۱۳ھ کو ہوئی تھی۔[۱]

ظاہر ہے شام کے محاذ کیلئے یہ بارہ ہزار مسلمانوں کا لشکر کافی نہیں ہو سکتا تھا اسلئے حضرت ابوبکر کو اطلاع ہوئی کہ قیصر نے بہت بڑے پیمانہ پر جنگ کی تیاریاں کی ہیں تو آپ نے بعد میں اور لشکر بھی آگے پیچھے روانہ کئے۔ بلاذری کا بیان ہے کہ شدہ شدہ ہر امیر کے ماتحت ساڑھے سات سات ہزار مجاہدین کا لشکر ہو گیا تھا۔ اور اس طرح کل تعداد چوبیس ہزار تھی۔[۲] لیکن ظاہر ہے یہاں پھر مؤرخین کو التباس ہو گیا ہے۔ کیونکہ لشکر تین مانے جائیں یا چار بہرحال اگر ہر لشکر میں ساڑھے سات سات ہزار کی مساوی تعداد تسلیم کر لی جائے تو اس حساب سے مجموعی تعداد چوبیس ہزار نہیں ہوتی۔

[۱] بلاذری ص ۱۱۴ [۲] فتوح البلدان ص ۱۱۵

رومیوں سے پہلا مقابلہ

یاد ہوگا کہ خالد بن سعید پہلے سے تیمار میں متعین تھے ہی۔ ان کو حضرت ابوبکر نے تاکید کر رکھی تھی کہ اُن کی اجازت کے بغیر اقدام جنگ نہ کریں۔ چنانچہ جب انھوں نے قیصر کی فوجوں کا اجتماعِ عظیم دیکھا تو حضرت ابوبکر کو اس کی اطلاع کی۔ آپ نے حکم بھیجا کہ "اچھا اب آگے بڑھو لیکن ساتھ ہی تاکید کی کہ اندرونِ ملک گھسے مت چلے جانا ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ دشمن تمکو پیچھے سے آدبائے"[1] لیکن خالد بن سعید نے جوش میں اس نصیحت کی کچھ پروا نہیں کی۔ انھوں نے اقدام کیا اور رومی اُس سے پسپا ہوئے تو یہ اپنی فوج لئے اندرونِ ملک گھسے چلے آئے۔ رومی فوج کا افسر اعلیٰ باہان تھا جو اپنے عہد کا نامور ماہرِ جنگ تھا۔ باہان نے دمشق کا رُخ کر دیا۔ خالد بھی اُسی طرف اُس کے تعاقب میں چل پڑے ان کا ارادہ یہ تھا کہ واقوصہ اور دمشق کے درمیان مرج الصُّفّر کے نام سے جو مقام ہے۔ وہاں پہنچکر دم لیں گے۔ اور اُسکو اپنی فوجی قیام گاہ بنائیں گے۔ لیکن درحقیقت باہان کی یہ پسپائی نہیں تھی بلکہ ایک زبردست جنگی چال تھی۔ چنانچہ ابھی خالد بحیرہ طبریہ کے شرق کیجانب مرج الصفر کے قریب ہی تھے کہ باہان اچانک راستہ بدلکر اسلامی فوج کے عقب میں آگیا اور اس طرح اسکو گھیر لیا کہ اب لوٹنے کی بھی گنجائش نہیں تھی۔ خالد بن سعید کا بیٹا مسلمانوں کی ایک جماعت کے ساتھ کہیں الگ تھلگ رہ گیا تھا۔ باہان کا قابو چل گیا اور ان سب کو قتل کر دیا۔

خالد کو بیٹے کے اس طرح مارے جانیکا صدمہ اس قدر شدید ہوا کہ پاؤں اُکھڑ گئے اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگ پڑے۔ مدینہ کے قریب ایک مقام ذوالمروہ ہے وہاں پہونچ کر دم لیا۔ حضرت ابوبکر کو اس کی اطلاع ہوئی تو سخت ملال ہوا۔ اور خالد کو لکھا جو کچھ ہوا سو ہوا لیکن اب اپنی جگہ نہ چھوڑو۔ بلکہ یہاں تک فرمایا" اگر میں خالد کے متعلق عمرؓ اور ابو عبیدہ کی (یہ دونوں خالد کو امیر مقرر کرنیکے خلاف تھے) رائے مان لیتا تو یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔"[2]

---

[1] تاریخ ابن عساکر ج ۱ ص ۱۳۱ و طبری و ابن اثیر۔

[2] طبری ج ۲ ص ۵۸۹

اسلامی لشکر کے مختلف محاذ

یہ واقعہ اُس وقت پیش آیا جبکہ حضرت ابو بکرؓ نے مدینہ سے جو لشکر روانہ کئے تھے انھوں نے خلیفۂ رسولؐ کے حکم کے مطابق مختلف محاذوں پر پہنچکر پڑاؤ ڈال دیا تھا۔ چنانچہ ابو عبیدہؓ دمشق کے راستہ میں شرحبیل بن حسنہ[1] طبریہ اور نہر اردن کے بالائی حصہ میں۔ یزید بن ابی سفیان بلقاء میں جہاں سے وہ بصریٰ پر آسانی سے حملہ کر سکتے تھے اور عمرو بن العاص عربہ میں حبرون کیلئے خطرہ کی گھنٹی بنے پڑے تھے۔ یہ لشکر اگرچہ الگ الگ اور ایک دوسرے سے علیحدہ تھے لیکن ان کے امراء میں باہمی مراسلت و مشاورت کا سلسلہ برابر جاری تھا۔ ان تمام اسلامی لشکروں کی مجموعی تعداد عام روایات کے مطابق تیس ہزار تھی۔

قیصر رُوم کے لشکروں کی ترتیب

قیصر روم کو ان اسلامی لشکروں کا علم ہوا تو اُس نے بہت بڑے پیمانہ پر اپنے لشکر مرتب کئے۔[2] اُس کی بنیادی پالیسی یہ تھی کہ اسلامی لشکروں کو کسی ایک محاذ پر جمع نہ ہونے دے تاکہ وہ سب اجتماعی قوت کیساتھ دشمن کا مقابلہ نہ کر سکیں اور چونکہ اُس کے پاس فوج بے شمار تھی اس لئے اُس کو یقین تھا کہ مسلمان مختلف محاذوں پر بٹ کر اُس کی فوج کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ چنانچہ قیصر پہلے خود حمص آیا جہاں شام کی ایک عظیم الشان فوجی چھاؤنی تھی اور یہاں لشکروں کی ترتیب۔ اُن کیلئے ساز و سامان اور اسلحہ وغیرہ کی فراہمی کا کام شروع کر دیا۔ جب سب تیاریاں مکمل ہو گئیں تو اُس نے چار لشکر اس طرح روانہ کئے :-

(۱) ایک لشکر جو سب سے بڑا اور نوّے ہزار بہادروں پر مشتمل تھا۔ عمرو بن العاص کے مقابلہ کیلئے روانہ کیا۔ اس لشکر کی قیادت ہرقل کا حقیقی بھائی تھیوڈرس (THEODOROIES) کر رہا تھا۔ اس نوّے ہزار کے لشکر کے مقابلہ میں عمرو بن العاص کے پاس جو لشکر تھا وہ سات

---

[1] شرحبیل بن حسنہ دراصل حضرت خالد بن الولید کی طرف سے عراق کا مژدۂ فتح لے کر آئے تھے۔ لیکن یہاں شام کی مہم درپیش تھی اس لئے حضرت ابو بکرؓ نے اُن کو ایک لشکر دیکر سیدھا شام بھیجدیا۔ [2] ابن اثیر نے لکھا ہے کہ ہرقل (HERACLINS) نے شروع میں رومی سرداروں اور اُن کے مذہبی پیشواؤں کو مشورہ دیا تھا کہ مسلمانوں کے ساتھ صلح کر لیں لیکن ان لوگوں نے جب اس کی ایک نہیں سنی تو پھر مجبور ہو کر اس کو جنگ کی تیاری کرنی پڑی۔ ج ۲ ص ۲۷۸

آٹھ ہزار سے زیادہ نفوس پر مشتمل نہیں تھا۔

(۲) دوسرا لشکر جو ساٹھ ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھا ابو عبیدۃ کے مقابلہ پر بھیجا گیا تھا۔ اس لشکر کا قائد پیٹر (PETER) تھا جس کو عرب مؤرخین فیقار بن نسطوس لکھتے ہیں۔ حضرت ابو عبیدۃ کی فوج بھی سات آٹھ ہزار کے درمیان تھی۔

(۳) تیسرا لشکر جس کا قائد سرجیس (SERGIUS) تھا۔ عرب مؤرخین اس کو جرجہ بن توذرا لکھتے ہیں یزید بن ابی سفیان کے مقابلہ میں روانہ ہوا۔

(۴) چوتھا لشکر دراقص کے ماتحت تھا جو شرجیل بن حسنہ کیساتھ جنگ کرنیکے لئے بھیجا گیا تھا مسلمانوں کو ان لشکروں کے اجتماعِ عظیم اور اُن کی تیاریوں کا علم ہوا تو اپنی قلتِ تعداد کی وجہ سے کچھ اندیشہ ہوا۔ اور عمرو بن العاص کو لکھا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ ادھر ان لوگوں نے (ازدی نے لکھا ہے کہ خود عمرو بن العاص نے) حضرت ابو بکر کو دشمن کی کثرتِ تعداد کی اطلاع دی تو بارگاہِ خلافت سے جواب آیا کہ "تم سب ایک جگہ ہو جاؤ اور ایک لشکر بنالو اسکے علاوہ یہ بھی لکھا کہ اپنی قلتِ تعداد کا غم نہ کرو۔ تم اللہ کے دین کے اعوان و مددگار ہو وہ ضرور تمہاری مدد کرے گا۔ پھر حکم دیا کہ تم سب لوگ یرموک میں جمع ہو جاؤ"

اجتماعِ یرموک | یرموک دراصل ایک دریا کا نام ہے جو حوران کے پہاڑوں سے نکلتا ہے اور مختلف پہاڑیوں کے درمیان سے گزرتا ہوا اردن کے دریا اور بحرِ منجمد DEAD SEA میں جا ملتا ہے۔ یرموک کا یہ دریا اردن کے دریا سے جہاں ملتا ہے اُس سے تیس یا چالیس میل کے فاصلہ پر ایک مقام ہے جس کا نام واقوصہ ہے۔ یہ مقام ایک وسیع نشیبی علاقہ میں ہے اور تین طرف سے پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے۔ چونکہ یہ بہت وسیع مقام تھا اس لئے قیصری فوجوں نے اپنے ہیڈ کوارٹر کیلئے اسی کو منتخب کیا۔

رومی یہاں پہنچکر لشکر انداز ہو گئے۔ مسلمان دریائے یرموک کے دائیں بازو کو عبور کر کے رومیوں کے بالمقابل فروکش ہو گئے۔ اب تین طرف سے رومی پہاڑوں سے گھرے ہوئے تھے

اور انکے روبرو جو راستہ تھا اس پر اسلامی فوج قابض تھی۔ اس طرح وہ محصور ہو کر رہ گئی۔ چنانچہ عمرو بن العاص نے اس قدرتی صورتِ حال پر اظہارِ مسرت کیا اور مسلمانوں کو مبارک باد دی۔ اس وقت قیصرِ روم کی فوج تذارق (تھیوڈرس) کے ماتحت تھی۔ مقدمۃ الجیش پر سرجس۔ دونوں بازوؤں پر باہان اور دراقص اور میدانِ جنگ کا انچارج پیٹر تھا۔

حضرت خالد بن ولید کی نامزدگی

مسلمان اور رومی دونوں ایک دوسرے کے مقابل اسی حالت میں دو ماہ تک پڑے رہے۔ اس مدت میں معمولی جھڑپوں کے علاوہ کھل کر کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ حضرت ابو بکر صدیق کو اس صورتِ حال کی اطلاع ہوئی تو فکر مند ہوئے اور آپ نے حضرت خالد بن ولید کو حکم بھیجا کہ عراق میں مثنیٰ کو اپنا قائم مقام بنا کر فوراً شام کے لئے روانہ ہو جائیں۔

اگرچہ حضرت خالد یہاں حیرہ میں مدائن پر حملہ کرنے کا خیال کر رہے تھے لیکن اول تو خلیفۂ رسول کا حکم اور پھر اس وقت شام کے محاذ کی اہمیت بہت زیادہ تھی اس لئے شام کے لئے روانہ ہونے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔[1]

اس موقع پر بعض مورخین کا خیال ہے کہ حضرت خالد صرف لشکرِ شام کی مدد کے لئے بھیجے گئے تھے اور ان کو وہاں کی افواج کا سپہ سالارِ اعظم مقرر نہیں کیا گیا تھا لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ شام کے محاذ پر کیا کچھ نہیں تھا۔ کسر تھی تو خالد ایسے سپہ سالار کی تھی اور اسی کسر کو پورا کرنے کیلئے ان کو عراق سے ہٹا کر شام جانے کا حکم ہوا تھا۔ چنانچہ طبری میں ہے کہ

---

[1] مورخین کا اس میں بھی بڑا اختلاف ہے کہ شام کے لئے روانگی کے وقت حضرت خالد کے ساتھ فوج کتنی تھی۔ کسی نے نو ہزار، کسی نے چھ ہزار، کسی نے آٹھ سو۔ چھ سو۔ پانچ سو تعداد بتائی ہے (ابن اثیر ج ۲ ص ۲۷۹) لیکن بلاذری نے آٹھ سو سے پانچ سو تک کی تعداد لکھی ہے (ص ۱۱۶) اور ہمارے نزدیک یہی صحیح ہے کیوں کہ شام کے محاذ پر صرف حضرت خالد جیسا سپہ سالار عساکر درکار تھا۔ فوج تو یوں بھی کافی تھی اور مدینہ سے دستے برابر آرہے تھے۔ اس کے علاوہ اب جبکہ حضرت خالد عراق سے جا رہے تھے ضروری تھا کہ وہاں فوج کافی تعداد میں رہے۔

اس حکم نامہ میں حضرت ابوبکر کے الفاظ یہ تھے۔

سر حتی تاتی الجموع من المسلمین	تم روانہ ہو یہاں تک کہ یرموک میں جو مسلمان مجتمع ہیں
بالیرموک فانهم قد شجوا واشجیا [1]	اُن سے ملو۔ کیونکہ وہ غم زدہ ہیں ؟

اس کے علاوہ ابو اسمٰعیل الازدی نے حضرت خالد کے نام حضرت ابوبکر کا جو خط نقل کیا ہے اس میں اُس کی صاف تصریح ہے کہ "جب تم وہاں پہنچ جاؤ اور لوگوں سے ملو تو پھر امیر جماعت تم ہی ہو گے۔[2]

اس سے بھی زیادہ واضح الفاظ واقدی کی فتوح الشام (ص ۴۰) میں ہیں اس میں اس بات کی صاف تصریح ہے کہ حضرت ابوبکر نے حضرت خالد کو تمام لشکرِ شام اور خود حضرت ابوعبیدہ ابن الجراح پر امیر بنا کر بھیجا تھا" طبری کی ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ جب حضرت ابوبکر کے پاس امرائے شام کا خط پہونچا جس میں مدد بھیجنے کی درخواست کی گئی تھی تو اسے پڑھتے ہی حضرت ابوبکر نے فرمایا "خالد لها" یہ معرکہ تو خالد سے ہی سر ہوگا۔[3]

حضرت خالد کی روانگی اب حضرت خالد روانہ ہوئے تو پہلے تدمر آئے جو صحرائے شام کے کنارہ پر وادی فرات سے متصل ہے اور دمشق سے ڈیڑھ سو میل دور اُس کے شمال مشرق میں واقع ہے۔ راستہ میں پانی کی قلت کے باعث بڑی دشواریاں پیش آئیں اس اثنا میں بعض قبائل سے مڈبھیڑ بھی ہوئی۔ حضرت خالد ان سب کو پسپا کرتے بڑھتے چلے گئے۔ تدمر سے ثنیۃ العقاب[4] اور وہاں سے مرج راہط پہونچے جو غوطۂ دمشق کے مشرق میں ہے۔ یہاں سے جنوبی سمت میں روانہ ہو کر بصریٰ پہونچے۔

مرج راہط جو دمشق سے پندرہ میل کی مسافت پر ہے غسانیوں کا جنھوں نے عیسائی مذہب قبول کر لیا تھا ایک بڑا مرکز تھا۔ یہاں حضرت خالد نے جنگ کے بعد ان لوگوں کو مغلوب کیا۔

[1] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۰۲ [2] فتوح الشام ص ۵۸۔ [3] طبری ج ۲ ص ۵۹۱ [4] عقاب حضرت خالد کے عَلَم کا نام تھا۔ آپ نے اس جگہ پہونچکر یہ عَلَم نصب کیا تھا اس لئے اس جگہ کا نام ثنیۃ العقاب ہو گیا۔

اس کے بعد بصری پہونچے تو یہاں حضرت ابوبکر کے حکم کے مطابق شرحبیل بن حسنہ اور یزید بن ابی سفیان اس شہر کا محاصرہ کئے پڑے تھے مگر وہ فتح نہیں ہوتا تھا۔ لیکن حضرت خالد نے آتے ہی اس زور کا حملہ کیا کہ رومیوں کا سپہ سالار رومانس (ROMANUS) پسپا ہو کر بصری شہر کے اندرونی حصہ میں گھس کر پناہ گزیں ہو گیا۔ اور شہر فتح ہو گیا۔

واقدی نے رومانس کے متعلق لکھا ہے کہ یہ شخص کتب قدیمہ کا عالم تھا اور اس بنا پر اسکو معلوم تھا کہ رومیوں کا زوال ایک پیغمبر عرب کے ہاتھوں یقینی ہے اس لئے وہ مسلمان ہونا چاہتا تھا۔ لیکن اس کی قوم کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو وہ اس کو قتل کرنیکے درپے ہو گئے اور وہ جان کے ڈر سے مجبوراً رومیوں کیساتھ حضرت خالد کی فوج کے مقابلہ میں آنکلا لیکن بعد میں مسلمان ہو گیا اور اسلام کی حمایت میں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔

ابو اسمعیل الازدی نے بصری میں رومی فوج کے سپہ سالار کا نام درنجار لکھا ہے۔ اور رومیوں کی تعداد پانچ ہزار اور مسلمانوں کی ایک ہزار بتاتی ہے۔ اس کے علاوہ بصری کی فتح سے قبل جو جنگ ہوئی اس کی تفصیل بھی لکھی ہے [۱]

معرکۂ اجنادین

بصری کی فتح کے بعد حضرت خالد کا ارادہ تھا کہ دمشق کی طرف پیش قدمی کریں۔ لیکن اچانک اطلاع ملی کہ قیصر روم نے ایک لاکھ کا لشکر جرار اجنادین میں جمع کر دیا ہے اور اسکے علاوہ چونکہ عیسائی مذہب کے پیشواؤں۔ پادریوں اور بشپوں نے تمام ملک کا دورہ کر کے مسلمانوں کے خلاف آگ لگا دی ہے اس لئے اطراف واکناف سے بھی چھوٹے چھوٹے لشکر برابر آرہے ہیں۔ یہ خبر سنکر حضرت خالد نے پہلی تدبیر یہ کی کہ اسلامی لشکر جو مختلف حصوں میں بٹے ہوئے اور مختلف محاذوں پر تھے اُن سب کے امیروں کو خط لکھا کہ اجنادین کے محاذ پر

[۱] فتوح الشام ص ۷۱ - ۷۲۔

آکر جمع ہو جائیں اس حکم کی تعمیل میں حضرت ابو عبیدہؓ اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ روانہ ہوئے تو اہلِ دمشق نے ہزاروں کی تعداد میں عقب سے آکر حملہ کر دیا۔ حضرت خالد کو اس کا علم ہوا تو فوراً ایک لشکر لیکر موقع پر پہونچے اور رومیوں کو پسپا کر کے دمشق کی طرف چلے جانے پر مجبور کر دیا۔

اس سے فارغ ہو کر حضرت خالد جس وقت اجنادین کے مقام پر پہونچے ہیں ٹھیک اسی وقت وردان جو ایک نامور رومی سپہ سالار تھا۔ ایک لشکر جرار لئے ہوئے اجنادین پہونچ گیا۔ لیکن دوسری طرف اس وقت تک حضرت عمرو بن العاص یزید بن ابی سفیان اور شرجیل بن حسنہ بھی حضرت خالد کی دعوت پر اپنی اپنی سپاہ کے ساتھ یہاں پہونچ چکے تھے۔

حضرت خالد نے اب پوری اسلامی فوج کا جائزہ لیا۔ اُن کی صف بندی کی۔ اور ایک ایک دستہ کے پاس پہونچکر اُن کو جہاد اور قتال فی سبیل اللہ کی اہمیت یاد دلائی۔ خواتین اسلام بھی اس جنگ میں ساتھ تھیں ان کو مردوں کی صفوں کے پیچھے کھڑا کر دیا اور فرمایا کہ اگر کوئی مسلمان میدانِ جنگ چھوڑ کر بھاگتا ہوا تمہارے پاس سے گزرے تو اس کو عبرت دلانا اور شرمندہ کرنا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ عموماً جنگ ظہر کی نماز کے بعد شروع کرتے تھے۔ حضرت خالد نے اس اسوۂ نبویؐ پر عمل کرنیکے خیال سے نمازِ ظہر کے وقت تک کیلئے جنگ کو ٹالنا چاہا لیکن رومیوں نے پیش قدمی کر کے حملہ کر دیا۔ اسلامی فوج کے میمنہ پر معاذ بن جبل اور میسرہ پر حضرت عمرؓ کے بھتیجہ سعید بن زید تھے۔ رومیوں نے اسلامی لشکر کے ان دونوں بازوؤں پر اس زور کی تیر باری کی کہ مجاہدین کے گھوڑے بدکنے لگے اور خود مسلمانوں میں انتشار پیدا ہو گیا۔ حضرت خالد نے یہ رنگ دیکھا تو شہسواروں کو حکم دیا کہ حملہ کریں اور خود اس میں پیش قدمی کی۔ حضرت خالد کا حملہ کرنا تھا کہ پوری اسلامی فوج ایک سیلِ رواں کی طرح آگے بڑھی اور دشمنوں پر چھا گئی۔ اب دشمن کیلئے بھاگنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ حمص اور دمشق میں جا کر پناہ لی۔ تھیوڈور جو رومی افواج کا سپہ سالارِ اعظم تھا اس نے بھاگ کر

حمص میں جہاں قیصر پہلے سے موجود تھا، پناہ لی۔ قیصر نے بڑی ذلت وخواری کے ساتھ اس کو معزول کر دیا اور آخر اسی حالت میں وہ مرگیا۔ ابو اسمٰعیل الازدی کے بیان کے مطابق تین ہزار رومی مارے گئے۔ اور مسلمانوں کا بھی نقصان کافی ہوا۔[1] بلاذری کا بیان ہے کہ یہ جنگ ۱۸ جمادی الاولی یا ۲ جمادی الاخریٰ ۱۳ھ کو ہوئی ہے۔[2] لیکن ابو اسمٰعیل الازدی نے لکھا ہے کہ اجنادین کی جنگ جو شام میں سب سے پہلی بڑی جنگ تھی ہفتہ کے دن ۲۸ جمادی الاولی ۱۳ھ کو دوپہر کے وقت ہوئی تھی۔

حضرت خالد کا خط حضرت ابوبکر صدیق کے نام

فتح کے بعد حضرت خالد بن الولید نے عبدالرحمٰن بن حنبل الجمحی کے ہاتھ حضرت ابوبکر کے نام ایک خط بھیجا جس میں لکھا تھا کہ "ہم میں اور مشرکوں میں[3] جنگ ہوئی۔ اُن لوگوں نے ہمارے مقابلہ میں بڑے بڑے لشکر مقام اجنادین میں جمع کر رکھے تھے۔ یہ لوگ اپنی صلیبیں اور کتابیں اٹھائے ہوئے تھے اور اس بات کی قسم کھائی تھی کہ میدانِ جنگ سے فرار اختیار نہیں کریں گے اور ہم کو اپنے ملک سے باہر نکال کر ہی دم لیں گے۔ ہم اللہ پر بھروسہ کر کے اُن کے مقابلہ کو آگے بڑھے۔ پھر ہم نے تیروں سے کام لیا۔ اس کے بعد تلوار کی نوبت آئی اور شمشیر کی جنگ ہوئی۔ آخر اللہ نے ہم پر اپنی مدد نازل کی اور اپنا وعدہ پورا فرمایا۔

یہ واقعہ حضرت ابوبکر کی وفات سے چوبیس دن پہلے کا ہے۔ آپ کو حضرت خالد کا یہ مکتوب ملا تو پڑھ کر بے حد مسرور ہوئے اور فرمایا "جمیع حمد ثابت ہے اُس اللہ کے لئے جس نے مسلمانوں کی مدد کی اور میری آنکھیں اس مژدۂ فتح سے ٹھنڈی کیں۔"[4]

جنگِ اجنادین کے بعد کیا ہوا؟ اس باب میں بھی روایات مختلف ہیں۔ ابو اسمٰعیل الازدی

---

[1] فتوح الشام از صفحہ ۷۰ تا ۹۰۔ [2] فتوح البلدان ص ۱۲۰۔ [3] اہل روم درحقیقت عیسائی تھے لیکن حضرت خالد نے اُن کو مشرک اس لئے کہا ہے کہ یہ لوگ اہل عیسائیت سے گمراہ ہو کر حضرت عیسیٰ کو ابن اللہ کہنے لگے تھے۔ اور بجائے توحید کے تثلیث کے قائل ہو گئے تھے اس لئے وہ مشرک ہو گئے تھے۔ [4] فتوح الشام الازدی ص ۸۱ –

کا بیان ہے کہ حضرت خالد نے دمشق کا رُخ کیا۔ اور فوج لے جاکر شہر کا محاصرہ کر لیا۔ ابھی تک اس کا فیصلہ نہیں ہوا تھا کہ حضرت ابوبکر کی وفات ہو گئی۔ لیکن بلاذری کی روایت یہ ہے کہ اجنادین کے بعد رومیوں کا اجتماع واقوصہ (بلاذری میں یاقوصہ لکھا ہے) میں ہوا۔ حضرت خالد کو اطلاع ہوئی تو واقوصہ پہونچکر جنگ کی۔ رومی شکست کھا کر بھاگے اور شام کے بڑے بڑے شہروں میں پھیل گئے۔ بلاذری لکھتے ہیں کہ مسلمان ابھی واقوصہ میں ہی تھے کہ خلیفۂ رسُول کی وفات کی اطلاع ملی [۱]

ایک بحث جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں خلافتِ صدیقی کے عہد میں شام میں جو فتوحات ہوئی ہیں اُن سے متعلق بڑے شدید اختلافات ہیں۔ یہاں تک کہ خود اس میں بھی اختلاف ہے کہ یرموک کا واقعہ عہدِ صدیقی میں پیش آیا ہے۔ یا خلافتِ فاروقی میں ؟ طبری اور ابنِ اثیر یرموک کے اس واقعہ کو اجنادین سے پہلے مانتے ہیں۔ لیکن ازدی۔ واقدی اور بلاذری کے ہاں سب سے بڑا معرکہ جو شام میں خلافتِ صدیقی میں ہوا ہے وہ اجنادین ہے۔ اور یرموک کا واقعہ ۱۵ھ میں پیش آیا ہے۔

ہمارے نزدیک غالباً شکل یہ پیش آئی ہے کہ حضرت خالد کی عراق سے روانگی سے قبل قیصر روم نے اپنی فوجیں مقام واقوصہ میں جو یرموک سے متصل تھا جمع کر دی تھیں تاکہ یہاں ایک فیصلہ کُن جنگ شام کی قسمت کا آخری فیصلہ کر دے۔ اسلامی اور رُومی دونوں فوجیں آمنے سامنے تقریباً دو ماہ تک پڑی رہیں لیکن معمولی جھڑپوں کے علاوہ کوئی باقاعدہ جنگ نہیں ہوئی۔ حضرت ابوبکر صورتِ حال کے اس جمود سے جس کا نتیجہ مسلمانوں کے حق میں خطرناک ہو سکتا تھا اکتا گئے تو حضرت خالد کو حکم بھیجا کہ عراق کا محاذ مثنّیٰ کے سپرد کر کے شام کیلئے روانہ ہو جائیں۔ وہاں تعمیل حکم میں کیا دیر ہو سکتی تھی۔ راستہ میں متعدد مقامات پر حرب وضرب کی نوبت آئی اور حضرت خالد کامیابی کے ساتھ اُن سب سے عہدہ برآ ہوتے ہوئے جنوب مشرق کی سمت سے حدودِ شام

---

[۱] فتوح البلدان ص ۱۲۱۔

میں داخل ہوئے یہاں انھوں نے فوراً محسوس کرلیا کہ جنگی نقطۂ نظر سے واقوصہ (یا یرموک) کو میدانِ جنگ بنانا مناسب نہیں ہے۔ پہلے گزر چکا ہے کہ یہ مقام تین طرف سے پہاڑوں سے گھرا ہوا اور ایک طرف سے کھلا تھا۔ اسی کو دیکھ کر حضرت عمرو بن العاص نے خوشی کا اظہار کیا تھا اور فرمایا تھا کہ دشمن محصور ہوگیا ہے۔ یہ حضرت عمرو بن العاص کی ذاتی رائے تھی لیکن حضرت خالد جانتے تھے کہ دشمن کو اس طرح گھیر کر علی الخصوص اس وقت جبکہ وہ بڑی شان وشوکت اور ساز و سامان کیساتھ آیا ہو جنگ کرنا دانشمندی نہیں ہے بلکہ جنگ ہمیشہ دشمن کیلئے راہِ فرار رکھ کر لڑنی چاہیے اس بنا پر حضرت خالد نے اوّلاً واقوصہ کے بجائے دمشق کا رُخ کیا۔ اب اسلامی فوجیں جو اس وقت تک واقوصہ میں رومیوں کا راستہ روکے بیٹھی تھیں وہاں سے ہٹیں تو رومیوں نے اجنادین میں مورچہ جمادیا اور تمام فوجیں لاکر یہاں جمع کردیں۔ حضرت خالد کو اس کی اطلاع ہوئی تو دمشق کا ارادہ ترک کرکے اجنادین پہونچ گئے اور پھر وہاں جو کچھ ہوا تم اُس کا حال پڑھ ہی آئے ہو۔

اس تقریر کی روشنی میں دونوں روایتوں میں تطبیق اس طرح ہوجاتی ہے کہ درحقیقت حضرت ابوبکر کے عہد میں یرموک میں جنگ نہیں ہوئی بلکہ وہاں صرف دونوں طرف کی فوجوں کا اجتماع ہوا ہے۔ اس عہد میں سب سے بڑی جو جنگِ شام ہوئی ہے وہ اجنادین کی ہے چنانچہ طبری جو واقعہ یرموک کو خلافتِ صدیقی سے منسوب کرتے ہیں انھوں نے بھی علی بن محمد کی اسناد سے صفحہ ۲۱۱۶ پر بعینہٖ یہی بات لکھی ہے۔ جن لوگوں نے واقوصہ میں افواج کے اجتماع کو ہی جنگ یرموک سمجھ لیا ہے انھوں نے یرموک کو اجنادین پر مقدم کردیا ہے لیکن جن کی نظر اصل جنگ پر ہے۔ انھوں نے یرموک کے واقعہ کو ۱۵ھ کا واقعہ لکھا ہے۔[1] واللہ اعلم۔

---

[1] اب جبکہ شام کی فتوحات کا باب ختم ہو رہا ہے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اس باب کو لکھتے وقت فتوح الشام جو واقدی کی طرف منسوب ہے وہ بھی ہمارے پیشِ نظر رہی ہے۔ اس کتاب کو سر ولیم نسر لیس {SIR WILLIAM NASSAR LEES} نے جو اسپرنگر کے بعد [illegible] سے [illegible] تک مدرسہ عالیہ کلکتہ کے پرنسپل رہے تھے بڑی تحقیق اور قابلیت سے اڈٹ کیا اور (مائل) ایشیاٹک سوسائٹی بنگال نے اس کو شائع کیا تھا لیکن افسوس ہے ہم اپنی کتاب میں اس سے (باقی صفحہ ۲۸۷ پر)

عراق میں بغاوت

حضرت خالد کے عراق سے روانہ ہو جانے کے بعد مثنیٰ بن حارثہ نے ادھر اُدھر چھاؤنیاں قائم کردیں اور جاسوس جگہ جگہ متعین کر دیئے اور خود حیرہ میں مقیم ہو گئے۔ ایرانیوں نے میدان حضرت خالد سے خالی پایا تو اُن کا حوصلہ بڑھا اور ادھر کچھ دنوں تک طوائف الملوکی کے بعد شہر براز[1] بن اردشیر بن شہریار کی بادشاہت پر سب ایرانیوں کا اتفاق ہو جانیکے باعث ایران میں ایک مضبوط حکومت قائم ہو گئی تھی اس بنا پر شہنشاہ ایران نے دس ہزار کی جمعیت کے ساتھ ہرمز جاذویہ کو حضرت مثنیٰ کے مقابلہ پر روانہ کیا اس لشکر کیساتھ ہاتھی بھی تھا جسکے ساتھ جنگ کرنا عربوں کا پہلا تجربہ تھا۔ مثنیٰ کو اس فوج کی نقل وحرکت کا علم ہوا تو مختلف چھاؤنیوں پر جو فوج منتشر تھی اس سبکو یکجا کرلیا۔ اپنے بھائی مُعنّی اور مسعود کو فوج کے دونوں بازوؤں پر مقرر کیا اور بابل میں خیمہ زن ہو گئے۔ یہاں حضرت مثنیٰ کو کسریٰ کا ایک خط ملا جس میں اُس نے بڑے گھمنڈ اور غرور کے لہجہ میں لکھا تھا کہ میں تم لوگوں کی طرف جو لشکر بھیج رہا ہوں یہ مُرغیاں اور خنازیر چرانیوالوں کا لشکر ہے اور تمہاری حیثیت یہ ہی ہے کہ میں تمہارے مقابلہ میں اسی درجہ کے لوگ بھیجوں۔ مثنیٰ نے جواب لکھا "تو یا تو باغی ہے یا کاذب ہے۔ اگر باغی ہے تو اسکا انجام تیرے حق میں بُرا ہوگا اور ہمارے لئے اچھا۔ اور اگر کاذب ہے تو جن کاذبوں کو اللہ کے ہاں سب سے زیادہ عذاب اور دنیا میں سب سے زیادہ رسوائی ہوگی وہ بادشاہ ہیں۔

اسکے بعد لکھا کہ رہی مُرغیاں اور خنازیر چرانیوالوں کی بات! تو معلوم ہوتا ہے کہ اب لے دیکے

(بقیہ صفحہ ۲۸۶) کچھ زیادہ استفادہ نہیں کرسکے۔ کیونکہ اوّل تو اس بات کا قطعی ثبوت نہیں کہ یہ کتاب دراصل واقدی کی ہے بھی اور اگر اس کا ثبوت ہو بھی تو اس میں افسانہ طرازی کا رنگ اس قدر غالب ہے کہ وہ زیبِ داستان کا کام تو دے سکتی ہے تاریخ کا سرمایہ نہیں بن سکتی۔

[1] اس نام کو مختلف طریقوں سے لکھا گیا ہے۔ شہر بازان۔ شہر بازار شہر براز اور شہر یران یہ سب روایات ہیں۔

تیرے پاس اسی درجہ اور مرتبہ کے لوگ رہ گئے ہیں ہم کو اس پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔

کسریٰ کو یہ جواب ملا تو بڑا گھبرایا اور ادھر ایرانیوں کو کسریٰ کے خط کا علم ہوا تو انھوں نے ناراض ہو کر کسریٰ سے کہا کہ نہ آپ ایسا خط لکھتے اور نہ اُس کے جواب میں ایسی بات سُنتے۔ آئندہ کیلئے ان لوگوں نے کسریٰ کو تاکید کی کہ اب جب کسی کو بھی وہ خط لکھے اُن سے پوچھ کر لکھے۔

بابل میں دونوں لشکر آمنے سامنے صف آرا ہوئے اور جنگ شروع ہوئی۔ لیکن ہرمز کا ہاتھی جس طرف رُخ کرتا تھا مُسلمانوں کی فوج کے بادل پھٹ جاتے تھے۔ حضرت مثنیٰ کیلئے یہ صورتِ حال بڑی تشویش انگیز تھی۔ آخر انھوں نے۔ جو مسلمان ان کے ساتھ تھے ان سب کو ایک جگہ اکٹھا کر کے حکم دیا کہ بیک وقت حملہ کریں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہاتھی قتل ہو گیا اور ایرانی شکست خوردہ ہو کر بھاگے۔ مسلمانوں نے مدائن تک اُن کا تعاقب کیا۔ جو ایرانی اُن کے ہاتھ لگے اُنھیں تلوار کے گھاٹ اُتار دیا۔ ایک شاعر عبدۃ بن الطبیب السعدی اسی واقعہ کو اشعارِ ذیل میں بیان کرتا ہے۔

حلت خویلۃ فی حی عھدتھم ‏ ‏ ‏ ‏ دون المدائن فیھا الدیك والفیل

یقارعون رؤس العجم ضاحیۃ ‏ ‏ ‏ ‏ منھم فوارس لا عزل ولا میل

فرزدق کا بھی ایک شعر ہے جس میں اُس نے مثنیٰ کے ہاتھوں ہاتھی کے قتل ہونے کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا ہے۔

وبیت المثنیٰ قاتل الفیل عنوۃ ‏ ‏ ‏ ‏ ببابل اذ فی فارس ملك بابل

شہر براز کو اس شکست کی اطلاع ملی تو بیمار پڑ گیا اور چند روز کے بعد ہی مر گیا۔ اب ایرانیوں نے کسریٰ کی بیٹی کو بادشاہ بنایا لیکن تاج و تخت اُس کے سازگار نہیں آیا جلد ہی معزول کر دی گئی اس کے بعد سابور بن شہر براز بادشاہ ہوا۔ سابور نے وزارت کیلئے فرخ زاد کو منتخب کیا اور اس پر اس درجہ مہربان ہوا کہ کسریٰ کی بیٹی آزرمیدخت سے اسکی شادی کر دینے کا ارادہ کر لیا۔ آزرمیدخت کو اس کی خبر ہوئی تو سخت برہم ہوئی اور بولی "کیا! ای بھائی (ابن عم)

آپ میرے ہی غلام سے میرا نکاح کرنا چاہتے ہیں" لیکن سابور نے ندا پروانہ کی اور آزرمیدخت کو برا بھلا کہہ کر خاموش کر دیا۔

سیاوخش الرازی نام کا ایک بڑا مشہور حملہ باز ایرانی تھا۔ آزرمیدخت نے اُس سے سازباز کر لی۔ چنانچہ شب عروسی میں جب فرخ زاد۔ آزرمیدخت کے کمرہ میں داخل ہوا تو سیاوخش نے اچانک کمین گاہ سے نکل کر حملہ کر دیا اور فرخ زاد کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس کے بعد سیاوخش، آزرمیدخت اور اُن کے ساتھیوں نے سابور کے محل میں گھس کر اُسے قتل کیا اور اس کی جگہ آزرمیدخت کو تختِ سلطنت پر بٹھا دیا۔

حضرت مثنیٰ کو اس افراتفری اور طوائف الملوکی کی خبریں پہنچیں تو اطمینان ہوا۔ تاہم اگر آج یہ حالت تھی تو ضروری نہیں کہ کل بھی یہی رہیگی۔ اس لئے اس موقع کو غنیمت جان کر انھوں نے اپنی فوج کے ساتھ پیش قدمی شروع کر دی اور مدائن جو ایران کا دارالسلطنت تھا اُس کے دروازوں تک پہنچ گئے۔ لیکن اُن کے پاس جو فوج تھی وہ مدائن فتح کرنیکے لئے کافی نہیں ہو سکتی تھی اس لئے حضرت ابوبکر کو خط پر خط لکھے کہ کمک روانہ فرمادیں لیکن حضرت ابوبکر صدیق اُس وقت کیا کر سکتے تھے۔ پورا اسلامی لشکر تو شام کے محاذ پر مصروف کارزار تھا اس لئے بارگاہِ خلافت کی طرف سے کوئی جواب نہیں گیا۔ حضرت مثنیٰ کو اس خاموشی سے تشویش ہوئی اور وہ خود مدینہ پہونچ گئے۔ یہاں دیکھا کہ حضرت ابوبکر صدیق سخت علیل ہیں اور صحت یاب ہونیکی کوئی امید نہیں ہے اس کے باوجود مثنیٰ کو شرف باریابی عطا فرمایا۔ عراق کی محاذ کی پوری روئیداد سُنی اور فوراً حضرت عمر کو طلب فرمایا۔ حضرت ابوبکر اس وقت حضرت عمر فاروق کو اپنا جانشین منتخب فرما چکے تھے۔ جب حضرت عمر آئے تو ارشاد ہوا۔ "اے عمر! جو کچھ میں کہتا ہوں تم اُس کو سُنو اور اس پر عمل بھی کرو۔ میں خیال کرتا ہوں کہ میں آج دنیا سے رخصت ہو جاؤں گا۔ اگر واقعی ایسا ہو تو تم شام ہونے سے پہلے پہلے لوگوں کو مثنیٰ کیساتھ روانہ کر دو۔ اور اگر میں نے شام پکڑلی تو تم صبح ہونے سے پہلے ایسا کر گزرو۔ اس کے بعد تاکید

کی کہ کوئی مصیبت خواہ کیسی ہی بڑی ہو۔ بہر حال تم کو دین کے کام اور حکم خداوندی کی بجا آوری سے باز نہ رکھے۔ پھر خود حضرت ابوبکر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عین وفات کے دن بیعت خلافت کے بارے میں جو کچھ کیا تھا اسے یاد دلایا۔ اور آخر میں وصیت کی کہ شام کا معرکہ سر ہو جائے تو خالد کو پھر عراق واپس بلا لینا[1]

اس کے بعد عراق میں جو فتوحات ہوئیں ان کا تعلق حضرت عمر فاروق کے عہدِ خلافت سے ہے اس لئے وہ اس کتاب کے دائرۂ بحث سے خارج ہے۔

فتوحات کے اسباب

عراق و شام کی فتوحات کا حال پڑھنے کے بعد قدرتی طور پر تاریخ کے ایک طالب علم کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہونا چاہئے کہ ایرانی اور رُومی یہ دونوں اُس عہد کی نہایت عظیم الشان اور ترقی یافتہ سلطنتیں تھیں۔ مال و دولت۔ جاہ و حشم، فوج و سپاہ۔ ان چیزوں کے اعتبار سے مسلمانوں کو ان دونوں حکومتوں کیساتھ کوئی نسبت ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ شام کے معرکہ میں تم نے پڑھا ہے کہ مسلمان افواج کی کُل تعداد مل ملا کر چھیالیس ہزار تھی اور اس کے مقابلہ میں کم و بیش دو لاکھ انسانوں کا پہاڑ تھا جو اُن کے سامنے کھڑا تھا۔ پھر آلاتِ حرب کے اعتبار سے دونوں میں یہ فرق تھا کہ ایک ایک ایرانی اور رومی فوجی خود۔ زرہ بکتر۔ چلتہ۔ جوشن۔ چار آئینہ آہنی دستانے۔ موزے۔ جھلم۔ برگستوان۔ گوپال۔ گرز۔ تیغ۔ سپر۔ درقہ۔ خنجر۔ ژدہ بین۔ تیر۔ خدنگ۔ کمند۔ سنان۔ وغیرہ سے آراستہ ہوتا تھا۔ ان تمام آلات و اسلحۂ جنگ کی تفصیل فردوسی کے شاہنامہ سے معلوم ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کے مقابلہ میں مسلمانوں کا کیا حال تھا اُن کے پاس صرف زرہ ہوتی تھی اور وہ بھی چمڑے کی۔ رکاب لوہے کے بجائے لکڑی کے ہوتے تھے آلاتِ حرب میں عرب تلوار۔ نیزہ اور چھوٹے خنجر کے علاوہ کسی اور چیز کو جانتے تک نہیں تھے

[1] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۸۶

گھوڑے تھے لیکن اکثروں کے گھوڑوں کو زین تک میسّر نہیں تھی۔ پس جب ان حکومتوں کے جاہ و جلال۔ تہذیب و تمدن۔ نظم و ترتیب۔ اور ترقی و وسعت کا یہ عالم تھا تو پھر یہ کس طرح ممکن ہوا کہ چند ہزار بے سروسامان صحرانشینوں نے ریگستانِ عرب سے نکل کر دونوں حکومتوں کا تختہ اُلٹ دیا؟ کہ قیصر و کسریٰ کے قصرِ عظمت و جلال میں خاک اُڑنے لگی۔ انکے صحیفۂ اقتدار و حکومت کا ورق ورق پریشان ہوگیا۔ اور وہ بھی صرف چند مہینوں کی مدت میں[1]

مغربی مصنفین کے نزدیک ان فتوحات کے اسباب

مغربی مصنفین نے اپنے مذاق کے مطابق اس سوال کے جو مختلف جوابات دیئے ہیں ان کا خلاصہ ہم ذیل میں نقل کرتے ہیں:۔

وان کریمر لکھتا ہے:۔

"عرب اور عراق و شام کی سرحدوں پر جو عرب قبائل آباد تھے انھوں نے اپنا فائدہ اس میں ہی دیکھا کہ وہ اپنی حلیف یا سرپرست حکومتوں سے تعلق منقطع کرکے اپنے ہم قوم عربوں کیساتھ ملکر اُن کا مذہب قبول کرلیں اور اس طرح مالِ غنیمت میں اُن کے شریک ہوجائیں۔ اس طرح مدینہ کا وہ چھوٹا سا لشکر جو عراق و شام میں گھس آیا تھا۔ یک بیک ایک کوہِ آتش فشاں بن گیا اور اُس کے راستہ میں جو رکاوٹیں تھیں اُن کو پارہ پارہ کردیا"[2]

ول ڈورینٹ (WILL DURANT) لکھتا ہے:۔

عربوں کی فتوحات کے اسباب بہت سارے ہیں۔ اُن کا اقتصادی سبب ہیں۔ پیغمبرِ اسلام سے ایک صدی پہلے عربوں کا نظامِ آبپاشی بہت خراب ہوگیا تھا

[1] فتوحات کی تکمیل اگرچہ حضرت عمر فاروق کے عہد میں ہوئی ہے۔ جس میں کئی برس لگے۔ لیکن درحقیقت ایران و رُوم کو ضرب کاری حضرت ابوبکر کے عہد میں ہی لگ چکی تھی جس سے ان کا بچنا آسان نہیں تھا۔

[2] THE ORIENT UNDER THE CALIPHS. P. 97

اور اس کی وجہ سے پیداوار بہت کم ہوگئی تھی اس لئے ان میں عراق و شام کی سرسبز زمینوں کو فتح کرنے کا جذبہ پیدا ہوا۔ اس کے علاوہ سیاسی سبب یہ تھا کہ رومی اور ایرانی دونوں حکومتیں اپنی باہمی جنگوں کے باعث تباہ و برباد ہو گئی تھیں۔ نظم و نسق حکومت اور امن و امان مفقود تھے۔ لیکن اس کے باوجود مملکت میں بھاری بھاری ٹیکس لگے ہوئے تھے۔ پھر جو نسلی تعلقات حجاز کے اور عراق و شام کی سرحدوں پر آباد قبائل کے درمیان تھے ان کا بھی اس میں بڑا دخل تھا۔ ان پر مزید یہ ہوا باز نطینیوں نے۔ موحدین۔ نسطوری اور دوسرے فرقوں کے ساتھ تعصب اور تشدد کی جس پالیسی پر عمل کیا تھا اس کی وجہ سے شام کی ایک بہت بڑی اقلیت تھی جو اُن سے بیزار تھی۔ یہ بیزاری صرف شہری باشندوں میں نہیں تھی بلکہ شامی فوج کے بعض دستے تک اس سے متاثر تھے۔ اس کے مقابلہ میں مسلمانوں کا حال یہ تھا کہ ان کے لیڈر محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے جاں نثار پیرو تھے۔ جتنا وہ لڑتے تھے اس سے زیادہ دعائیں کرتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ مقدس جنگ میں جو مارا جاتا ہے اُس پر جنت کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ عرب مسلمان اخلاقی اعتبار سے بھی بہت بلند تھے۔ مسیحی اخلاق اور عقیدۂ تثلیث نے مشرق قریب میں جنگ کیلئے وہ آمادگی اور مستعدی باقی نہیں رکھی تھی جو اسلام کی تعلیمات اور عربوں کے جوہرِ فطری کا خاصہ تھی عرب فوجیں ڈسپلن اور جفاکشی میں ممتاز تھیں اور ان کے قائد بڑے قابل اور لائق تھے۔ یہ لوگ بھوکے پیٹ جنگ کر سکتے تھے۔ لیکن یہ وحشی نہیں تھے۔"[1]

پروفیسر فلیلی اور ویچ (PROF, FLEULEY & WEECH) لکھتے ہیں۔

"ایک نئے مذہب (اسلام) نے عربوں میں باہمی اتحاد۔ جذبۂ قیادت اور فتوحات

[1] THE AGE OF FAITH P.188.

کے لئے ایک زبردست محرک پیدا کر دیا تھا اس کے علاوہ ان فتوحات کے کچھ اور بھی اسباب ہیں۔ مثلاً شام کے عربوں کا حجاز کے عربوں کے ساتھ نسلی تعلق اور عین اُس وقت جبکہ عرب پھیل جانے کیلئے تیار کھڑے تھے۔ مشرقی رُومی سلطنت اور ایرانی حکومت کا مسلسل باہمی جنگوں کی وجہ سے شکستہ حال ہو جانا مشرقی رومی سلطنت نے اپنے دشمنِ دیرینہ ایران کو شکستِ فاش ضرور دی تھی لیکن اس کا بہت بڑا خمیازہ اس صورت میں بھگتنا پڑا کہ خود رُومی سلطنت میں مذہبی اختلافات اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس کے علاوہ عرب بڑے بہادر جنگ آزمودہ اور جفاکش زندگی کے عادی تھے۔" [1]

عہدِ حاضر کا مشہور مصنف ایچ۔ جی۔ ویلز لکھتا ہے :۔

"اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ اسلام کا سیلاب۔ ایرانی۔ رومی۔ یونانی یا مصری بہتر تہذیب کو بہا کر لے گیا تو تم جس قدر جلد اس غلط خیال کو دماغ سے نکال دو اتنا ہی اچھا ہے۔ اسلام کو جو غلبہ اور اقتدار حاصل ہوا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اُس زمانہ کا ایک بہترین معاشرتی اور سیاسی نظام تھا۔ اسلام جہاں کہیں پہونچا اس کو ایسے لوگ نظر آئے جو سیاسی اعتبار سے اپنی اپنی حکومتوں سے نفرت رکھتے تھے۔ یہ لوگ لُٹے گھسٹے تھے۔ مظلوم و پامال تھے۔ احمق بنائے ہوئے تھے۔ غیر تعلیم یافتہ اور غیر منظم تھے اور جن کی خود غرض اور فاسد حکومتیں اُن کیساتھ کوئی ربط و تعلق نہیں رکھتی تھیں۔ اسلام وسیع ترین۔ تازہ ترین۔ اور سب سے زیادہ صاف ستھرا اور پاکیزہ سیاسی فکر تھا جو دنیا میں آیا اور جس نے پوری انسانیت کو ایسا بہتر نظام دیا جو آج تک کسی نے نہیں دیا تھا۔ رُومی شہنشاہیت کا سرمایہ دارانہ اور غلام ساز نظام۔ اور یورپ کا لٹریچر۔ کلچر اور

[1] ورلڈ ہسٹری۔

اس کی سوشل روایات یہ سب کے سب اسلام کے عروج دار تقا کے سامنے شکست کھاکر پارہ پارہ ہوگئے۔[1]

پروفیسر فلپ۔کے۔ ہٹی لکھتے ہیں:۔

"اسلام کا نعرۂ جنگ بھی ایسا ہی تھا جیسا کہ دُنیا کی دو عظیم جنگوں میں نعرۂ جنگ جمہوریت تھا۔اس کے علاوہ اسلام نے اُن قبائل میں اتحاد پیدا کر دیا تھا جو اب سے پہلے کبھی متحد نہیں ہوئے تھے اگرچہ مسلمانوں کا یہ جوش اور ولولہ بڑی حد تک اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور اُس کے نتیجہ میں حصولِ جنت کے جذبہ پر مبنی تھا۔ تاہم ہلالِ خصیب کی سرسبز زمین کے عیش و آرام سے لُطف اندوز ہونے کی خواہش بھی بہت سے مسلمانوں کے دلوں میں موجزن تھی اور اُن کے جذبۂ جہاد کی محرک تھی۔"[2]

فتوحات کے اصل اسباب مغربی مصنفین نے مذکورۂ بالا سطور میں جو کچھ لکھا ہے۔ اگرچہ وہ سب صحیح نہیں ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ صداقت سے بالکل دُور بھی نہیں ہے۔ مسلمان مصنفین اور خاص طور پر وہ حضرات جو قدیم طرزِ تعلیم کے حامل ہیں اُن کا خاصہ ہے کہ اگر کوئی مغربی مصنف مسلمانوں کی غیر معمولی کامیابی میں کسی اقتصادی اور معاشی وجہ کو دخیل مانتا ہے تو وہ چڑ سے جاتے ہیں حالانکہ خود صحابہ کے طرزِ عمل سے ثابت ہے کہ نو آبادکاری میں اور ایک مُلک سے دوسرے مُلک کی طرف منتقل ہونے میں اقتصادی وجوہ کو بڑا دخل ہوتا تھا۔

چنانچہ جنگِ ولجہ کے موقع پر حضرتِ خالد نے جو تقریر کی تھی اُس کے متعلق طبری کے الفاظ یہ ہیں:۔

وقام خالدؓ فی الناس خطیباً	حضرتِ خالد خطبہ دینے کھڑے ہوئے تو انھوں
یرغبھم فی بلادِ العجم	نے لوگوں کو بلادِ عجم کی طرف رغبت دلائی اور بلادِ
ویزھدھم فی بلادِ العرب	عرب کی طرف سے اُن میں بے رغبتی پیدا کی۔

[1] HISTORY OF THE WORLD P.329

(بقیہ صفحہ ۲۹۵ پر)

آپ نے عراق کی سرسبزی و شادابی کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا "کیا تم نہیں دیکھتے۔ یہاں مٹی کے تودوں کی طرح کھانے کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ خدا کی قسم! اگر جنگ سے ہمارا مقصد اللہ کے راستہ میں جہاد کرنا اور لوگوں کو اُس کے دین کی طرف بلانا نہ ہوتا۔ اور صرف معاش ہوتا تب بھی صائب رائے کی بات یہی ہوتی کہ ہم ان سرسبز و شاداب علاقوں کیلئے جنگ کرتے۔ تاکہ ہم ان کے مالک بن جاتے اور بھوک اور قلتِ طعام اُن لوگوں کیلئے چھوڑ دیتے جو سستی اور کاہلی کی وجہ سے تمہاری جد وجہد میں تمہارے شریک نہیں ہیں" ؎۱

اسی طرح ایک مرتبہ جریر بن عبداللہ البجلی اپنے قبیلہ کے سات سو آدمیوں کو لیکر حضرت عمر فاروق کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہم سب لوگ شام میں آباد ہونا چاہتے ہیں۔ جہاں ہمارے آباؤ اجداد پہلے سے موجود ہیں۔ حضرت عمر نے فرمایا "تم لوگ شام میں آباد ہو کر کیا کرو گے۔ اللہ نے اُس کی شان و شوکت کم کر دی ہے۔ ہاں البتہ عراق جاؤ اہلِ عراق اور اُس قوم سے جہاد کرو جو زندگی کی تمام راہوں پر خود قابض ہو کر بیٹھ گئے ہیں، ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ تم لوگوں کی انصاف پسندی سے عراق کے اسبابِ معیشت میں تم کو بھی اُن لوگوں کا شریک بنا دے اور تم بھی اُن کے ساتھ ساتھ زندگی بسر کر سکو۔ ؎۲

اس کے علاوہ اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ اُس زمانہ میں ایران اور روم دونوں کی اخلاقی حالت انتہا درجہ سقیم اور زبوں تھی۔ حکمراں طبقہ عوام پر ظلم و ستم کرنا۔ اپنے عیش و آرام کیلئے اُن پر بھاری بھاری ٹیکس لگانا اپنا موروثی اور طبعی حق سمجھتا تھا۔ ایران میں مزدکی تعلیم نے اور شام میں عیسائیت کی محرف شکل اور مذہبی پیشواؤں کی اقتدار پسندی نے مُلک بھر میں منکرات

بقیہ صفحہ ۲۹۴:- ؎۳ HISTORY OF SYRIA PAGE 419 - مغربی مصنفین کے جو حوالے اوپر گزرے ہیں اُن کو ڈاکٹر عطامی الدین نے اپنی قابلِ قدر کتاب "ابوبکر" میں جو انگریزی زبان میں ہے اور جس کو فیروز اینڈ سنز لاہور نے شائع کیا ہے ایک جگہ جمع کر دیا ہے ہم نے یہ حوالے اختصار کے ساتھ اسی کتاب سے اخذ کئے ہیں۔ ؎۱ طبری ج ۲ ص ۵۵۹

؎۲ طبری ج ۲ ص ۶۴۷ ذکر واقعہ بویب۔

وفواحش کو عام کر دیا تھا اور اس کے بالمقابل ہر ہر مسلمان عرب اخلاق و مکارم کا نمونہ تھا اس بنا پر بقائے اصلح (SURVIVAL OF THE FITTEST) کے قانون فطرت کے مطابق مسلمانوں کے سامنے ان دونوں کا شکست کھا جانا یقینی امر تھا۔ قرآن مجید میں ہے۔

لکل امۃ اجل۔ فاذا جاء اجلھم لا یستاخرون ساعۃ ولا یستقدمون ٥	ہر قوم کی ایک مدت ہوتی ہے۔ جب وہ مدت پوری ہو جاتی ہے تو پھر نہ ایک گھڑی آگے ہوتے ہیں اور نہ پیچھے۔

ان اقتصادی اور اخلاقی اسباب کے علاوہ جہاں تک مادی اسباب کا تعلق ہے یہ تسلیم کرنا ناگزیر ہے کہ ان فتوحات میں حضرت خالد بن الولید کی غیر معمولی شجاعت و بسالت، حیرت انگیز فوجی تدبر اور جنگی فراست و دُور اندیشی کو بھی بہت بڑا دخل ہے۔ تم پڑھ آئے ہو کہ مقام واقوصہ میں مسلمان اور رُومی فوجیں کم و بیش تین ماہ تک ایک دوسرے کے مقابل پڑی رہیں اور معمولی جھڑپوں کے علاوہ کسی طرف سے بھی کوئی بڑا اقدام نہیں ہوا۔ لیکن حضرت خالد نے پہونچتے ہی میدانِ کارزار کا نقشہ بدل دیا اور کل چھپالیس ہزار فوج سے دو لاکھ سے زائد رومیوں کی صفیں اُلٹ کر رکھ دیں۔

یہ جو کچھ کہا گیا اپنی جگہ سب مسلّم اور درست ہے لیکن درحقیقت فتوحات کا سب سے بڑا اور بنیادی سبب یہ ہے کہ چونکہ مسلمانوں کی جنگ اللہ کے لئے۔ اور ایک اعلیٰ ترین مقصدِ حیات کی تکمیل کی غرض سے تھی اس بنا پر جو بے نفسی، بےغرضی۔ اور مخلصانہ جوش اور ولولہ اُن میں ہو سکتا تھا کسی اور میں نہ تھا۔ پھر قرآن مجید کی آیات اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات جو عراق و شام کی فتوحات سے متعلق تھے ان سب نے مسلمانوں میں اس درجہ یقین، اطمینان اور اعتماد پیدا کر دیا تھا کہ بڑے سے بڑے خطرات میں محصور ہو کر بھی وہ گھبراتے نہیں تھے۔ ایک انسان کو سب سے زیادہ خوف موت کا ہو سکتا ہے لیکن مسلمانوں کے عقیدہ میں یہ موت جو اللہ کے راستہ میں آئے موت نہیں بلکہ عین حیات اور اصل زندگی تھی۔ پھر فطرۃً و طبعاً جو جفاکشی، سخت کوشی اور مصائب میں نہ گھبرانے کا ملکہ عربوں میں تھا ایران اور روم کے خوش عیش سپاہیوں سے اس کی توقع نہیں ہو سکتی تھی۔

مرضِ الموت اور وفات

اتوار کا دن تھا جمادی الاخری ۱۳ھ کی ساتویں تاریخ تھی اس روز سردی شدید تھی حضرت ابوبکرؓ نے غسل کیا اور اس کے بعد ہی بخار ہو گیا جو وفات کے روز تک مسلسل پندرہ دن چڑھا رہا۔ ہر چند علاج معالجہ کرایا گیا مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ لوگ حضرت ابوبکرؓ سے دریافت کرتے تھے کہ آپ نے طبیب کو بھی دکھایا؟ فرماتے "ہاں اس نے مجھ کو دیکھا ہے" پھر پوچھتے "وہ کیا کہتا ہے" جواب دیتے "وہ کہتا ہے کہ" افعل ما اشاء " جو میں چاہتا ہوں کرتا ہوں
ضعف اتنا شدید ہو گیا کہ باہر نماز کیلئے بھی نہیں جا سکتے تھے تو حضرت عمرؓ کو حکم دیا کہ وہ نماز پڑھائیں۔

بعض روایتوں میں مرض کا سبب یہ بیان کیا ہے کہ حارث بن کلدہ کے ساتھ حضرت ابوبکرؓ کو ایک یہودی نے چاول میں ملا کر زہر کھلا دیا تھا۔ یہ سال بھر کے بعد اس زہر کا اثر تھا[1] حاکم نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کی ہے کہ دراصل حضرت ابوبکرؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جدائی کا غم اس قدر شدید ہوا تھا کہ وہ اندر ہی اندر گھلتے اور پگھلتے رہے اور ان کو اس سے پنپنا نصیب ہی نہیں ہوا۔ تمام صحابہ کرام کو سخت تشویش تھی۔ عیادت کے لئے آتے رہتے تھے لیکن چونکہ حضرت عثمانؓ پڑوس میں ہی رہتے تھے اس لئے صحابہ میں سب سے زیادہ تیمارداری کا شرف انہیں کو حاصل ہوا[2]

جانشینی کے لئے مشورہ لیکن بیماری کی اس شدت کے باوجود کیا مجال تھی کہ امورِ خلافت و امامت اور مسلمانوں کے اہم معاملات کی طرف سے بے توجہی برتی جاتی۔ اس وقت سب سے

---

[1] طبری ج ۲ ص ۶۱۱ [2] طبری ص ۶۱۲

اہم معاملہ آپ کی جانشینی کا تھا۔ آپ کے سامنے وقت کا اہم سوال یہ تھا کہ اگر خود کسی کی نامزدگی نہیں کرتے ہیں تو اندیشہ ہے کہ فتنہ وفساد ہو اور اگر نامزدگی کریں تو کس کی؟ ایک سے ایک بڑھ کر معدنِ اسلام کا لعل وگوہر تھا۔ اگرچہ آپ کا ذاتی رجحان حضرت عمرؓ کیطرف تھا لیکن اکابر صحابہ سے مشورہ کئے اور اُن کی رائے معلوم کئے بغیر اس کا اعلان نہیں کر سکتے تھے۔ سب سے پہلے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف آئے تو اُن سے یہ گفتگو ہوئی۔

حضرت ابوبکر :۔ عمر کی نسبت تمہاری کیا رائے ہے ؟

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف :۔ آپ مجھ سے ایک ایسی بات پوچھتے ہیں جس کو آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔

ابوبکر :۔ پھر بھی ! آخر تمہاری رائے بھی تو معلوم ہو۔

عبدالرحمٰن :۔ اس میں کیا شبہ ہے کہ وہ بہترین آدمی ہیں لیکن مزاج میں سختی اور تشدد ہے۔

ابوبکر :۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مجھ کو نرم دیکھتے ہیں جب اُن کو خلافت مل جائیگی تو وہ خود سختی چھوڑ دیں گے۔

اس کے بعد حضرت عثمان بن عفان آئے تو اُن سے گفتگو اس طرح ہوئی۔

ابوبکر :۔ عمر کی نسبت تمہاری کیا رائے ہے ؟

عثمان :۔ اس بات کو آپ ہم سے زیادہ جانتے ہیں۔

ابوبکر :۔ اے ابوعبداللہ ! میں تم سے تمہاری اپنی رائے پوچھتا ہوں مجھ کو بتاؤ۔

عثمان :۔ مجھ کو اتنی بات معلوم ہے کہ عمر کا باطن اُن کے ظاہر سے اچھا ہے اور اُن جیسا ہم میں کوئی نہیں ہے۔

پھر حضرت اسید بن حضیر آئے اور ان سے اُن کی رائے دریافت کی تو انھوں نے جواب دیا۔

"میں آپ کے بعد عمر کو بہترین آدمی سمجھتا ہوں، وہ خوش ہونے کی باتوں پر خوش اور ناراض ہونے کی باتوں پر ناراض ہوتے ہیں۔ اُن کا باطن اُن کے ظاہر سے بہتر ہے۔ آپ کے بعد خلافت کا مستحق اُن سے زیادہ قوی اور مضبوط دوسرا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔"

ان حضرات کے علاوہ سعید بن زید اور اکابر مہاجرین و انصار سے بھی آپ نے مشورہ کیا اور سب نے حضرت عمر کے حق میں رائے دی لیکن باہر لوگوں میں اس کا چرچا ہوا کہ حضرت عمر خلیفہ ہونے والے ہیں تو طلحہ بن عبداللہ آئے اور بولے۔ "اے ابوبکر! آپ کو معلوم ہے کہ عمر کے مزاج میں کس قدر تشدد اور سختی ہے اس کے باوجود آپ اُن کو اپنا جانشین نامزد کر رہے ہیں تو کل اپنے پروردگار کو جب وہ آپ سے باز پُرس کرے گا کیا جواب دیں گے۔"

حضرت ابوبکر لیٹے ہوئے تھے طلحہ کی زبان سے یہ بات سُن کر آپ کو طیش آگیا۔ بولے "ذرا مجھ کو بٹھا تو دو" لوگوں نے بٹھا دیا تو فرمایا "کیا تم مجھ کو میرے پروردگار سے ڈراتے ہو؟ میں جب اپنے رب سے ملوں گا اور وہ مجھ سے سوال کرے گا تو میں کہوں گا کہ اے خدا! میں نے تیرے بندوں پر ایک تیرے بہترین بندہ کو خلیفہ مقرر کیا ہے۔"[1]

حضرت عمر کی نامزدگی جب سب لوگ چلے گئے تو حضرت ابوبکر نے حضرت عثمان سے کہا کہ حضرت عمر کی جانشینی کا پروانہ لکھیں، وہ قلم دوات لیکر بیٹھے تو حضرت ابوبکر نے کہا لکھو۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ ھذا ما عھد ابوبکر بن ابی قحافۃ الی المسلمین۔ اما بعد" یہیں تک بولنے پائے تھے کہ غشی طاری ہوگئی۔ حضرت عثمان کو پہلے سے معلوم تو تھا ہی۔ انھوں نے اس خیال سے کہ اگر اسی بے ہوشی کے عالم میں حضرت ابوبکر کی وفات ہو گئی اور یہ پروانہ یوں ہی نامکمل رہا تو کہیں ملک میں کوئی فتنہ نہ کھڑا ہو جائے اما بعد کے بعد از خود استخلفت علیکم عمر بن الخطاب ولم آل لکم خیرا۔ (میں نے تم پر عمر بن الخطاب کو خلیفہ بنا دیا ہے اور میں نے اس معاملہ میں تمہاری خیر خواہی میں کوئی کوتاہی نہیں کی)

---

[1] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۹۲۔

کی عبارت لکھ لی۔ اب حضرت ابوبکر کو غشی سے افاقہ ہوا اور حضرت عثمان نے ان کو یہ عبارت پڑھ کر سُنائی تو حضرت ابوبکر نے خوشی میں اللہ اکبر کہا اور حضرت عثمان کو دعا دی۔ پھر حضرت عثمان کو ہی حکم ہوا کہ لوگوں کو سُنا دیں۔ حضرت عثمان کی دعوت پر سب جمع ہو گئے تو حضرت ابوبکر نے اپنے ایک خاص غلام کے ہاتھ یہ پروانہ بھیجا۔ حضرت عمر بھی ساتھ تھے۔ مجمع میں شور و غل تھا۔ حضرت عمر نے یہ کہہ کر کہ "مسلمانو! خلیفۂ رسول کا ارشاد سنو" اُن کو خاموش کر دیا تو حضرت عثمان نے پروانہ پڑھ کر سُنایا۔ سب نے بطیبِ خاطر اسے قبول کیا۔ اتنے میں خود حضرت ابوبکر بالاخانہ پر تشریف لے آئے۔ اور پوچھا "لوگو! میں نے تم پر جسکو خلیفہ مقرر کیا ہے وہ میرا عزیز قریب نہیں بلکہ عمر ہیں تم اُن کو قبول کرتے ہو؟" سب نے بیک آواز کہا "سمعنا واطعنا"

حضرت عمر کو وصایا و نصائح

اس سے فارغ ہو کر حضرت عمر کو بلایا اور فرمایا "میں نے تم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب پر خلیفہ مقرر کیا ہے۔ اس کے بعد اُن کو تقویٰ اور پرہیز گاری کی وصیت کی اور پھر حسبِ ذیل تقریر کی جو فصاحت و بلاغت۔ جوشِ خطابت اور علم و حکمت کا گنجینہ ہے۔ اس لئے ہم اصل تقریر مع ترجمہ کے نقل کرتے ہیں:-

یا عمر! ان للہِ حقاً باللیل لا یقبلہٗ	اے عمر! یقین جانو کہ اللہ کا جو حق شب میں ہے وہ اسکو
فی النہار وحقاً فی النہار لا یقبلہٗ	دن میں قبول نہیں کرے گا اور جو حق دن سے متعلق ہے
باللیل وانہ لا یقبل نافلۃ حتی	اللہ اُس کو شب میں قبول نہیں کرے گا (یعنی ہر عمل اُس
تؤدی الفریضۃ الم تر یا عمر،	کے وقت پر کرنا چاہیئے) اور اللہ نفل اُس وقت تک
انما ثقلت موازین من ثقلت	قبول نہیں کرے گا جب تک تم فرض ادا نہ کرو۔ اے عمر!
موازینہ یوم القیامۃ باتباعھم الحق و	کیا تم نہیں دیکھتے کہ درحقیقت ترازو اُن ہی لوگوں کی بھاری
ثقلہ علیھم وحق المیزان ان لا یوضع فیہ	ہے جن کی ترازو قیامت کے دن حق کی پیروی کرنے
غداً الا الحق ان یکون ثقیلاً، الم تر یا	کی وجہ سے بھاری ہو۔ اور حق بھی یہی ہے کہ کل قیامت
عمر، انما خفت موازین من خفت	کے دن جس ترازو میں حق کے سوا کچھ اور نہ ہو اُسکو ہی بھاری ہونا چاہیئے۔

موازینه یوم القیامة باتباعهم الباطل؟ وخفته علیهم وحق المیزان لا یوضع فیه الا الباطل ان یکون خفیفا. الم تر یا عمر انما نزلت الرخاء مع الشدة وآیة الشدة مع الرخاء لیکون المؤمن راغباً راهباً؟ لا یرغب رغبة یتمنی فیها علی الله مالیس له ولا یرهب رهبة یلقی فیها بیدیه الم تر یا عمر، انما ذکر الله اهل النار باسوأ اعمالهم فاذا ذکرتهم قلت: انی لارجوان لا اکون منهم؟ وانه انما ذکر اهل الجنة باحسن اعمالهم لانه تجاوز لهم عما کان من سیٔ۔ فاذا ذکرتهم۔ قلت: این عملی من اعمالهم؟ فان حفظت وصیتی فلا یکونن غائب احب الیك من حاضر من الموت لست بمعجزه[1]

اس کے برعکس اتباعِ باطل کیوجہ سے جن لوگوں کی ترازو قیامت کے دن ہلکی ہوگی اُن کی ہی ترازو ہلکی ہوگی اور جس ترازو میں باطل کے سوا کچھ اور نہ ہو اس کو ہلکا ہی ہونا چاہیئے اے عمر! کیا تم نہیں دیکھتے کہ دنیا میں تنگی اور فراخی کی آیات ایک ساتھ اُتری ہیں تاکہ مومن میں خوف بھی ہو اور رجا بھی مگر ہاں مومن کو اللہ سے ایسی ہی چیز کی تمنّا اور رغبت کرنی چاہیئے جو اُسکا حق ہو اور اسی طرح اُس کو ایسا خوف نہیں کرنا چاہئے کہ پھر وہ خود ہی اپنے ہاتھوں اُس میں واقع ہوجائے (یعنی آدمی خوف کرے تو اسے چاہئے کہ اُس سے بچے بھی) اے عمر کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے اہلِ دوزخ کا ذکر اُنکے بدترین اعمال کے ساتھ کیا ہے؟ جب تم اُن کو یاد کروگے تو کہوگے "میں امید کرتا ہوں کہ میں اُن میں سے نہیں ہونگا اور اللہ نے اہلِ جنّت کا بھی ذکر اُن کے بہترین اعمال کیساتھ کیا ہے کیونکہ اُن کے جو بُرے عمل تھے اللہ نے اُن سے درگزر فرمایا۔ جب تم اُن لوگوں کو یاد کروگے تو کہوگے میرا عمل اُن جیسا کہاں ہے؟ اگر تم نے میری وصیت یاد رکھی تو کوئی ایسا غائب جو تم کو حاضر کی بہ نسبت زیادہ محبوب ہو موت کے سوا" اور کچھ نہ ہوگا (یعنی موت تم کو سب سے زیادہ محبوب ہوگی) درآں حالیکہ تم موت کو عاجز کرنے والے نہیں ہو۔

حضرت مثنّیٰ جب، عراق سے مزید امدادی فوج طلب کرنیکی غرض سے مدینہ آئے تو حضرت ابوبکر اس وقت تک حضرت عمر کو اپنا جانشین نامزد کر چکے تھے۔ حضرت ابوبکر نے مثنّیٰ کی طلب پر حضرت عمر سے درخواست کی کہ سب کام چھوڑ چھاڑ کر عراق مزید فوج بھیجنے کا بندوبست کیا جائے

---

[1] ابن اثیر ج۲ ص ۲۹۲-۲۹۳

ذاتی معاملات کی طرف توجہ | قوم وملت کے ان مسائل سے فارغ ہونیکے بعد ذاتی اور خانگی امور ومعاملات کی طرف توجہ فرمائی۔ آپ نے حضرت عائشہؓ کو ایک جاگیر دی تھی۔ اب خیال آیا کہ اس سے دوسرے وارثوں کی حق تلفی ہوگی اس لئے فرمایا "بیٹی! امیری اور غریبی دونوں حالتوں میں تم مجھ کو سب سے زیادہ عزیز رہی ہو۔ میں نے تم کو جو جاگیر دی تھی کیا تم اس میں اپنے بھائی بہنوں کو شریک کر سکتی ہو؟" حضرت عائشہ نے اسکو بخوشی قبول کرلیا۔

اسی سلسلہ میں ایک مرتبہ پوچھا "مجھ کو (خلیفہ ہونے کے بعد سے) اب تک بیت المال میں سے کُل وظیفہ کتنا ملا ہے؟ حساب کرکے بتایا گیا "چھ ہزار درہم" ہندوستانی سکہ کے حساب سے کم وبیش ڈیڑھ ہزار روپیہ، حکم فرمایا کہ میری فلاں زمین فروخت کرکے یہ روپیہ بیت المال کو واپس کر دیا جائے۔ پھر دریافت کیا "میرے مال میں بیعت کے بعد سے کتنا اضافہ ہوا؟" پتہ چلا کہ (۱) ایک حبشی غلام جو بچوں کو کھلاتا ہے اور ساتھ ہی مسلمانوں کی تلواروں پر صیقل کرتا ہے (۲) ایک اونٹنی جس پر پانی لایا جاتا ہے اور (۳) ایک چادر جو سوا روپیہ کے لگ بھگ دام کی ہوگی۔ ارشاد ہوا کہ یہ تینوں چیزیں وفات کے بعد خلیفۂ وقت کی خدمت میں بھیجدی جائیں۔ اس حکم کی تعمیل میں جب یہ چیزیں حضرت عمر فاروق کی خدمت میں پہنچیں تو بیساختہ جی اُمنڈ آیا۔ روتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے "اے ابوبکر! تم اپنے جانشینوں کیلئے کام بہت دشوار چھوڑ گئے" [۱]

معیقیب دوسی حضرت ابوبکر کے گھر کے منتظم تھے وہ خود بیان کرتے ہیں حضرت ابوبکر کے مرضِ وفات میں حاضر ہوا تو میں نے سلام کیا اُس وقت حضرت ابوبکر استخلاف کے معاملہ میں مصروف تھے اُس سے فارغ ہو گئے تو مجھ سے مخاطب ہوئے اور فرمایا "اے معیقیب! تم ہمارے گھر کے منتظم تھے۔ بتاؤ میرا اور تمہارا کیا حساب ہے؟ میں نے عرض کیا "میرے پچیس درہم آپ کے ذمہ باقی ہیں وہ میں نے آپ کو معاف کئے۔" فرمایا "چپ رہو

---

[۱] طبقات ابن سعد قسم اول جز ۳ ص ۱۳۹

اور میرے توشۂ آخرت کو قرض سے مت تیار کرو" یہ سُنکر میں رونے لگا۔ صدیق اکبر نے فرمایا "معیقیب! آنسو نہ بہاؤ اور گھبراؤ نہیں۔ صبر کرو میں امید کرتا ہوں کہ میں اُس جگہ جا رہا ہوں جو میرے لئے بہتر اور پائیدار تر ہے۔ اس کے بعد عائشہ صدیقہؓ کو بلا کر حکم دیا کہ مجھ کو پچیس درہم ادا کر دیئے جائیں۔"[1]

تجہیز و تکفین کے متعلق وصیت حضرت عائشہ سے پوچھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کتنے کپڑوں میں کفنایا گیا تھا"؟ بولیں "تین کپڑوں میں" حضرت ابوبکر اُس وقت جو دو پھٹے پُرانے کپڑے پہنے ہوئے تھے اُن کی طرف اشارہ کر کے فرمایا "تو بس میرے یہ دونوں کپڑے ہیں ہی اور ایک تیسرا کپڑا بازار سے خرید کر مجھ کو کفن دیدینا" ام المومنین نے کہا "ابا جان! ہم تینوں نئے کپڑے بازار سے خرید سکتے ہیں" ارشاد ہوا "بیٹی! نئے کپڑوں کے زندہ لوگ بہ نسبت مُردوں کے زیادہ مستحق ہیں۔ یہ کفن کے دونوں کپڑے تو لہو اور پیپ کے لئے ہیں (یعنی خراب ہونیکے لئے)"[2]

اپنی بیوی حضرت اسماء بنت عمیس کو وصیت کی کہ مجھ کو غسل تم ہی دینا۔ انھوں نے کہا "مجھ سے یہ نہ ہو سکے گا" فرمایا "تمہارا بیٹا عبدالرحمٰن بن ابی بکر تمہاری مدد کریگا۔ وہ پانی ڈالتا رہے گا"[3]

اس کے بعد دریافت کیا کہ آج کون سا دن ہے، لوگوں نے کہا "دوشنبہ" پھر پوچھا "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کس روز ہوئی تھی؟ جواب ملا "دوشنبہ کے روز" ارشاد ہوا "تو پھر میں امید کرتا ہوں کہ میری موت بھی آج کے ہی دن ہوگی"[4] پھر وصیت کی کہ میری قبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں بنائی جائے۔

ان وصیتوں سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ سکراتِ موت شروع ہو گئے۔ عین اُس وقت جبکہ جانکنی کا وقت تھا حضرت عائشہ جو سرہانے بیٹھی تھیں حسرت سے یہ شعر پڑھنے لگیں۔

وابیض تستسقی الغمامُ بوجھہٖ　　　ثمال الیتامی عصمۃٌ للارامل

وہ پُر نور صورت جس کے چہرہ کا صدقہ دیکر بادلوں سے بارش مانگی جائے جو یتیموں پر مہربان ہو اور فقیروں کی پناہ ہو

---

[1] ازالۃ الخفا مقصد دوم ص ۴۱۔ [2] طبری ج ۲ ص ۶۱۳ [3] ایضاً [4] طبقات ابن سعد قسم اول ج ۳ ص ۱۳۶

حضرت ابوبکر کے کان میں یہ شعر پڑا تو چونکہ شاعر نے یہ شعر دراصل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کہا تھا اس لئے اُن کے جذبۂ احترام وادبِ نبویؐ نے اس کو گوارا نہیں کیا کہ وہ ہی شعر اُن کیلئے بھی پڑھا جائے۔ فوراً آنکھیں کھولدیں اور بولے "یہ شان تو صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی"۔

اسی شدتِ کرب کے عالم میں ایک مرتبہ حضرت عائشہ کی زبان پر بیساختہ یہ شعر جاری ہو گئے

وکل ذی ابل موروث — وکل ذی سلبٍ مسلوب

وکل ذی غیبۃٍ یؤوب — وغائبُ الموتِ لا یؤوب

(اور ہر اونٹ والے کو ایک دن اپنا مال وارث کو سونپنا ہے اور ہر لوٹنے والے کو خود لٹنا ہے۔ اور ہر غائب ہونیوالا واپس آجاتا ہے لیکن موت کا غائب واپس نہیں ہوتا)

حضرت ابوبکر نے یہ شعر سُنے تو فوراً فرمایا "نہیں بیٹی! بلکہ اصل وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:-

وَجَاءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ — اور موت کی جاں کنی حق کے ساتھ آگئی یہ وہی

ذَالِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيدُ۔ — ہے جس سے تو کترا تا تھا۔

آخر وہ گھڑی بھی آگئی جو مقرر تھی۔ ایک ہچکی آئی اور خلافت وامامت کا آفتاب عالمتاب دُنیا سے روپوش ہوگیا۔ آخر وقت زبانِ مبارک پر یہ دعا تھی۔

رَبِّ تَوَفَّنِي مُسْلِمًا وَّأَلْحِقْنِي بِالصَّالِحِيْنَ۔ اے رب تو مجھ کو مسلمان اٹھا اور صالحین کیساتھ حشر کر

۲۲ جمادی الثانیہ ۱۳ھ بروز دوشنبہ مغرب اور عشاء کے درمیان وفات ہوئی تھی، شب ہی میں وصیت کے مطابق حضرت اسماء بنت عمیس نے غسل دیا۔ حضرت عمر نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور پھر حضرت عمر۔ عثمان۔ طلحہ اور عبدالرحمٰن بن ابی بکر نے قبر میں اتر کر اس طرح آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مرقدِ انور کے پہلو میں لٹا دیا کہ آپ کا سر حضورِ اقدس صلعم کے

شانۂ مبارک تک آتا تھا۔ اللہ اکبر آقائے وشہنشاہِ کونین کا ادب واحترام کا مرنیکے بعد بھی یہ اہتمام ہے کہ برابر نہ ہوں بجائے ہمدوش ہونیکے زیرِ سایہ دوش ہی ہوکر رہیں۔[1] رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ، وفات کے وقت عمر ۶۳ برس تھی۔ مدتِ خلافت دو برس تین مہینے اور گیارہ دن ہے۔

صحابۂ کرام میں صفِ ماتم خلیفۂ رسول کی وفات۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد پہلا حادثہ تھا جس نے مدینہ کے بام و در پر لرزہ ڈال دیا اور پورے جزیرہ نمائے عرب میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ جو شخص حضرت ابوبکر سے جتنا زیادہ قریب تھا اُن کی خوبیوں کے براہِ راست علم کیوجہ سے اسی قدر اسس کو زیادہ ملال تھا۔ اس سلسلہ میں ہم چند اکابر صحابہ کی تقریروں کا اقتباس پیش کرتے ہیں حضرت علی کی تقریر طویل ہے لیکن ہم بعینہٖ اُس کو اس لئے درج کرتے ہیں کہ جن لوگوں کو حضرت ابوبکر اور حضرت علی کے باہمی تعلقات کے بارے میں کسی قسم کی غلط فہمی ہے اس تقریر سے اُن کے خیال کی اصلاح ہوگی۔

حضرت علی کا تعزیتی خطبہ حضرت علی کو خلیفۂ رسول کی وفات حسرت آیات کی خبر ملی تو فوراً إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۰ پڑھتے ہوئے مکان سے باہر تشریف لے آئے اور فرمایا۔

الیومَ انقطعت خلافۃ النبوۃ	آج خلافتِ نبوت کا انقطاع ہوگیا۔

اور پھر جس مکان میں حضرت ابوبکر کی نعش تھی اُس کے دروازہ پر کھڑے ہوکر مندرجہ ذیل خطبہ ارشاد فرمایا جو فصاحت وبلاغت کا شاہکار ہونیکے علاوہ حضرت ابوبکر کی حیاتِ طیبہ کا ایک نہایت حسین وجمیل اور ایمان افروز مرقع بھی ہے۔ آپ نے فرمایا۔

یرحمك الله یا ابابکر۔ کنت الف رسول الله صلی الله علیه وسلم وانسه ومستراحه وثقته و موضع سره ومشاورته۔ کنت اول القوم اسلاماً واخلصهم ایماناً واشدهم	اے ابوبکر! خدا تم پر رحم کرے۔ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب۔ مونس۔ راحت۔ معتمد اور اُنکے محرمِ راز ومشیر تھے۔ تم سب سے پہلے اسلام لائے اور تم سب سے زیادہ مخلص مومن تھے۔ تمہارا یقین سب سے زیادہ مضبوط تھا تم سب سے زیادہ

[1] طبری ج ۳ صفحہ ۴۲۳

یقیناً و اخوفہم للہ و اعظمہم	اللہ کا خوف کرنیوالے اور اللہ کے دین کے معاملہ
غناءً فی دین اللہ و احوطہم علی	میں سب سے زیادہ بے نیاز یعنی دوسری چیزوں کی
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و احدبہم	پروانہ کرنیوالے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے
علی الاسلام وایمنہم علی اصحابہ	نزدیک سب سے زیادہ معتبر۔ اسلام پر سب
واحسنہم صحبۃً و اکثرہم	سے زیادہ مہربان۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
مناقباً و افضلہم سوابق و	کے ساتھیوں کیلئے سب سے زیادہ بابرکت۔
ارفعہم درجۃً واقربہم	رفاقت میں اُن سب سے بہتر مناقب اور
وسیلۃً و اشبہہم برسول اللہ	نفضائل میں سب سے بڑھ چڑھ کر، پیش قدمیوں
صلی اللہ علیہ وسلم ھدیاً	میں سب سے افضل و برتر درجہ میں سب سے
وسمۃً ورأفۃً و فضلاً و	اُونچے اور وسیلہ کے اعتبار سے آنحضرت صلی اللہ
اشرفہم منزلۃً واکرمہم	علیہ وسلم سے سب سے زیادہ قریب اور آں حضرت صلی اللہ
علیہ واوثقہم عندہٗ	علیہ وسلم سے سب سے زیادہ مشابہ سیرت میں، عادت میں
فجزاک اللہ عن الاسلام	مہربانی اور فضل میں، صحابہ میں سب سے زیادہ اونچے
وعن رسولہ خیراً کنت	مرتبہ والے اور حضورؐ کے نزدیک سب سے زیادہ مکرم اور
عندہٗ بمنزلۃ السمع	معتمد تھے پس اللہ اسلام اور اپنے رسول کی طرف سے
والبصر صدقت رسول اللہ	تمکو جزائے خیر عطا فرمائے۔ تم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
صلی اللہ علیہ وسلم حین	کیلئے بمنزلۂ گوش و چشم تھے۔ تم نے حضورؐ کی تصدیق اُس
کذّبہ الناس فسماک اللہ	وقت کی جبکہ لوگوں نے آپکی تکذیب کی اسی لئے اللہ تعالیٰ
عزّ وجل فی تنزیلہ صدّیقاً فقال	نے اپنے کلام میں تمکو صدیق کہا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔
وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِہٖ۔ الّذی	"وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِہٖ" سچائی لانے
جاء بالصدق محمد وصدّق بہ ابوبکر۔	والے محمدؐ ہیں اور اس کی تصدیق کرنیوالے ابوبکر۔

واسيتَه حين بخلوا وقمت
به عند المكاره حين عنه قعدوا
وصحبته في الشدة اكرم الصحبة
ثاني اثنين وصاحبه
في الغار والمنزَّل عليه
السكينةُ ورفيقهُ في الهجرة
وخَلَفتَه في دين الله وامته
احسن الخلافة حين ارتدّ الناس
وقمت بالامر مالم يقم به
خليفةُ نبي فنهضت حين
وهن اصحابك وبرزت
حين استكانوا وقويت حين
ضعفوا لزمت منهاج رسول الله
صلى الله عليه وسلم اذ هووا۔
كنت خليفةً حقا لم تنازع
ولم تصدع برغم المنافقين
وكبتِ الكافرين وكره الحاسدين
وغيظ الباغين وقمت بالامر
حين فشلوا وثبتَّ اذ تتعتعوا
ومضيت بنور الله اذ وقفوا فاتبعوك
فهدوا وكنت اخفضهم صوتاً

تم نے حضور کیساتھ غم خواری اُس وقت کی جبکہ لوگوں نے
بخل کیا۔ اور تم ناگوار باتوں کے وقت حضور کیساتھ اُس وقت
بھی کھڑے رہے جبکہ لوگ آپؐ سے بچھڑ گئے۔ تم نے سختیوں میں
بھی حضورؐ کے ساتھ صحبت و رفاقت کا حق با حسن وجوہ ادا
کیا۔ تم ثانی اثنین اور رفیق غار (ثور) تھے اور تم پر سکون نازل
ہوا تھا۔ تم ہجرت میں آپؐ کے رفیق تھے اور اللہ کے دین میں
اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت پر تم آپؐ کے ایسے
خلیفہ بنے جس نے اُس وقت خلافت کا حق ادا کر دیا جبکہ
لوگ مرتد ہو گئے تھے اور تم نے خلافت کا وہ حق ادا کیا جو
کسی پیغمبر کے خلیفہ نے نہیں کیا تھا چنانچہ تم نے اُس وقت
مستعدی دکھائی جبکہ تمہارے ساتھی سُست ہو گئے تھے
اور تم نے اُس وقت جنگ کی جبکہ وہ عاجز سے ہو گئے تھے
جب وہ کمزور تھے تو تم قوی رہے اور تم نے رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کے راستہ کو اُس وقت تھامے رکھا جبکہ
لوگ پست ہو گئے تھے۔ تم بلا نزاع و تفرقہ خلیفہ برحق
تھے اگرچہ اس سے منافقوں کو غصہ کفار کو رنج۔ حاسدوں
کو کراہت اور باغیوں کو غیظ تھا۔ تم امر حق پر ڈٹے رہے
جبکہ لوگ بزدل ہو گئے اور تم ثابت قدم رہے جب وہ
ڈگمگا اٹھے تم اللہ کے نور کو لئے بڑھتے رہے جب لوگ
کھڑے ہو گئے۔ آخرکار انھوں نے آپ کی پیروی کی اور
ہدایت پائی۔ آپ کی آواز ان سب سے زیادہ پست تھی

واعلاهم فوقاً واماثلهم
كلاماً واصوبهم منطقاً
واطولهم صمتاً وابلغهم
قولاً واشجعهم نفساً و
اعرفهم بالامور واشرفهم
عملاً كنت والله للدين
يعسوباً اولاً حين نفر
عنه الناس وآخراً حين اقبلوا
كنت للمؤمنين اباً رحيماً
حتى صاروا عليك عيالاً
فحملت اثقال ما ضعفوا و
رعيت ما اهملوا وحفظت
ما اضاعوا وعلمت ما جهلوا
وشمرت اذ خضعوا وصبرت
اذ جزعوا فادركت اوتار ما
طلبوا وراجعوا برشدهم
برأيك فظفروا ونالوا بك
ما لم يحتسبوا كنت
على الكافرين عذاباً صباً
ولهباً وللمؤمنين
رحمةً وانساً و

مگر آپ کا مرتبہ ان سب سے اونچا تھا۔ تمہارا کلام سب سے
زیادہ سنجیدہ تھا۔ سب سے زیادہ تمہاری گفتگو درست
تھی۔ آپ سب سے زیادہ خاموش رہنے والے تھے۔
آپ کا قول سب سے زیادہ بلیغ تھا۔ شجاعت میں آپ
سب سے بڑھے ہوئے تھے۔ معاملات کو سب سے زیادہ
سمجھنے والے تھے۔ عمل کے اعتبار سے سب سے زیادہ
اشرف تھے۔ آپ بخدا دین کے اولین سردار تھے۔
جب لوگ دین سے ہٹے تو آپ آخری سردار تھے
جب وہ دین کی طرف متوجہ ہوئے آپ مومنین
کیلئے رحیم باپ تھے۔ یہاں تک کہ وہ آپ کی اولاد کی طرح
ہو گئے۔ جن بھاری بوجھوں کو وہ اٹھا نہ سکے تم نے انکو
اٹھالیا۔ جس چیز کو انھوں نے چھوڑ دیا تھا تم نے اس
کی نگرانی کی اور جو چیز انھوں نے ضائع کر دی تھی تم نے
اس کی حفاظت کی جس کو وہ نہیں جانتے تھے تم نے وہ
چیز اُن کو سکھائی۔ جب وہ عاجز و ماندہ ہوئے تو تم
نے مستعدی دکھائی جب وہ گھبرائے
تو تم نے صبر کیا نتیجہ یہ ہوا کہ ان لوگوں کی تم نے داد دی
کی اور وہ اپنی ہدایت کیلئے تمہاری رائے کی طرف رجوع
ہوئے اور کامیاب ہوئے اور جس چیز کا ان کو اندازہ بھی
نہیں تھا وہ انھوں نے پالی۔ تم کافروں کیلئے عذاب کی
بارش اور آگ کا شعلہ تھے۔ مومنین کیلئے رحمت۔ انسیت اور

حِصنًا۔ فطرتَ واللّٰه بنعمائها
وفزتَ بحبائها وذهبتَ بفضائلها
وادرکتَ سوابقها لم تفلل
حجتك ولم تضعف بصیرتك ولم
تجبن نفسك ولم یزغ قلبك
ولم یخنہ۔ کنت کالجبل الذی
لا تحرکهٗ العواصف وکنت کما قال
رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم أمَنّ
الناس علینا فی صحبتك وذات
یدك وکنتَ کما قال ضعیفاً فی
بدنك قویاً فی امر اللّٰه متواضعاً
فی نفسك عظیماً عند اللّٰه
جلیلاً فی اعین الناس کبیراً
فی انفسهم لم یکن لاحدٍ فیك مغمزٌ
ولا لقائلٍ فیك مهمز ولا لاحدٍ
فیك مطمعٌ ولا لمخلوق عندك هوادةٌ
الضعیف الذلیلُ عندك قوی عزیزٌ حتی
تاخذ بحقه والقوی عندك ضعیفٌ
ذلیلٌ حتی تاخذ منه الحق۔ القریبُ
والبعید عندك فی ذالك سواءٌ۔
اقرب الناس الیك اطوعهم للّٰه وَ

پناہ تھے تم نے اوصاف و کمالات کی فضا میں پرواز کی۔ تم نے اُن کا عطیہ پایا۔ اُس کی اچھائیاں لے لیں۔ تمہاری حجت کو شکست نہیں ہوئی۔ تمہاری بصیرت کمزور نہیں ہوئی۔ تمہارا نفس بزدل نہیں ہوا۔ تمہارے دل میں خوف پیدا نہیں ہوا اور وہ کمزور نہیں ہوا۔ تم اُس پہاڑ کی مانند تھے جس کو آندھیاں حرکت نہیں دے سکتیں اور جیسا کہ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا تم رفاقت اور مالی خدمت دونوں کے اعتبار سے سب سے زیادہ احسان کرنے والے تھے اور ارشادِ نبویؐ کے مطابق جسمانی اعتبار سے گو کمزور لیکن اللّٰہ کے معاملہ میں قوی تھے۔ اپنے نفس کے اعتبار سے متواضع۔ اللّٰہ کے نزدیک بڑے اور لوگوں کی آنکھوں اور دلوں میں بھاری بھر کم اور بڑے تھے۔ تمہاری نسبت نہ کوئی طنز کرتا تھا اور نہ وہ حرف گیری کر سکتا تھا تم میں کسی کو طمع تھی اور نہ تم کسی کی رعایت کرتے تھے۔ ضعیف اور پست آدمی تمہارے نزدیک قوی تھا کہ تم اُس کو حق دلاتے تھے اور قوی تمہارے نزدیک ضعیف و ذلیل تھا کہ تم اُس سے حق لیتے تھے۔ دور و نزدیک دونوں قسم کے آدمی تمہاری نگاہ میں یکساں تھے۔ جو اللّٰہ کا سب سے زیادہ مطیع اور متقی ہوتا تھا وہی تمہارا سب سے زیادہ مقرب تھا۔ تمہاری شان حق۔ سچائی اور نرمی تھی۔ تمہارا قول حکم قطعی اور تمہارا معاملہ بردباری اور دور اندیشی تھا اور تمہاری رائے

أقامهم له - شانك الحق والصدق
والرفق - وقولك حكم وحتم وامرك
حلم وحزم ورأيك علم وعزم -
فاقلعت وقد نهج السبيل وسهل العسير
واطفيت النيران واعتدل بك الدين
وقوی بك الایمان وثبت الاسلام
والمسلمون وظهر امر الله ولو كره الكافرون
فسبقت والله سبقا بعيدا واتعبت من بعدك
اتعابا شديدا وفزت بالخير فوزا مبينا
فجللت عن البكاء وعظمت رزيتك في السماء
وهدت مصيبتك الانام فانا لله
وانا اليه راجعون - ورضينا عن الله
قضاه وسلمنا له امره فوالله لن يصاب
المسلمون بعد رسول الله صلى الله عليه وسلم
بمثلك ابدا - كنت للدين عزا وحرزا
وكهفا وللمومنين فئة وحصنا وغيثا وعلى
المنافقين غلظة وغيظا فالحقك الله
بنبيك صلى الله عليه وسلم ولا حرمنا اجرك
ولا اضلنا بعدك فانا لله وانا اليه راجعون ۔[١]

علم اور عزم تھا۔ اب آپ دنیا سے رخصت ہوئے جبکہ راستہ ہموار
ہو گیا اور مشکل آسان ہو گئی۔ آگ بجھ گئی اور دین معتدل
ہو گیا۔ ایمان قوی ہو گیا۔ اسلام اور مسلمان ثابت قدم
ہو گئے۔ اللہ کا امر غالب آ گیا اگرچہ کافروں کو اُس سے
تکلیف ہوتی تھی۔ تم نے سخت پیش قدمی کی اور اپنے
بعد میں آنے والوں کو تھکا دیا۔ تم خیر سے کامیاب ہوئے
تم اس سے بلند و بالا ہو کہ تم پر آہ و بکا کی جائے۔ تمہاری
موت کی مصیبت تو آسمان میں بری طرح محسوس کیجا رہی ہے اور تمہارا
مصیبت نے تو تمام دنیا کو ہلا دیا ہے۔ ہم سب اللہ کے
لئے ہیں۔ اُسی کی طرف لوٹنے والے ہیں اللہ کی قضا پر
ہم راضی ہیں ہم نے اپنا معاملہ اُس کے سپرد کر دیا ہے
بخدا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد
تمہاری موت جیسا کوئی حادثہ مسلمانوں پر کبھی نازل
نہیں ہوا۔ تم دین کی عزت۔ جائے پناہ ۔۔ اور
حفاظت گاہ تھے۔ مومنوں کیلئے ایک گروہ۔ قلعہ
اور دار الامن تھے۔ منافقوں کے واسطے تشدد اور
غضب تھے۔ پس اللہ تم کو تمہارے نبی سے ملا دے
اور ہم کو تمہارے بعد تمہارے اجر سے محروم اور گمراہ
نہ کرے۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون ۔

[١] الریاض النضرۃ المحب الطبری ج ٢ ص ١٨٣ و ١٨٤
حضرت علی کا یہ خطبہ تھوڑے بہت لفظوں کے اختلاف کیساتھ منتخب کنز العمال بر مسند امام احمد بن حنبل۔ ج ٢ ص ٣٦٦ پر بھی ہے

جب تک حضرت علیؓ یہ خطبہ پڑھتے رہے سب لوگ جو وہاں موجود تھے خاموش رہے لیکن خطبہ کے ختم ہوتے ہی سب بے تحاشا اس طرح روئے کہ چیخیں نکل گئیں اور سب نے بیک آواز کہا "ہاں بیشک اے رسول اللہؐ کے داماد آپ نے سچ فرمایا"

حضرت عائشہؓ نے فرمایا۔

"اے ابّا! اللہ آپ کو سرسبز و شاداب کرے اور آپ کو آپ کی بہترین کوششوں کا بدلہ عطا فرمائے۔ آپ نے دنیا سے منہ موڑا تو اس کو ذلیل کر دیا۔ اور آخرت کا رُخ کیا تو آپ نے اُس کو عزت بخشی۔ اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کا حادثۂ وفات سب سے بڑا حادثہ ہے۔ لیکن بہرحال اللہ کی کتاب ہم کو حکم کرتی ہے کہ ہم صبر کریں۔ اور یہ صبر ہی آپکی وفات کا سب سے اچھا عوض ہے۔ اور میں اللہ سے امید کرتی ہوں کہ وہ مجھ کو میرے صبر کا بدلہ دیکر اپنا وعدہ پورا کرے گا۔

اے ابّا! آپ اپنی اُس بیٹی کا آخری سلام قبول کیجئے جس نے آپ کی زندگی میں کبھی آپ کے ساتھ پرخاش نہیں رکھی۔ اور اب آپ کے مرنے پر وہ جزع و فزع نہیں کر رہی ہے۔"

حضرت عمر فاروقؓ گھر میں داخل ہوئے تو حضرت ابوبکرؓ کی نعش کو خطاب کر کے فرمایا۔

"اے خلیفۂ رسول اللہ! آپ نے دنیا سے رخصت ہو کر قوم کو سخت محنت و مشقت میں مبتلا کر دیا۔ آپ کا سا ہونا تو درکنار۔ اب تو کوئی ایسا بھی نہیں جو آپ کی گرد تک پہنچ سکے۔"

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک بشارت

یہ نوحہ و ماتم تو اس عالم آب و گل میں برپا تھا۔ لیکن عالم ملکوت میں اُس وقت کیا ہو رہا تھا؟ اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ خود حضرت ابوبکرؓ سے روایت ہے کہ میں نے ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے قرآن مجید کی یہ آیت تلاوت کی۔

يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً	اے نفس مطمئنہ تو اپنے پروردگار کی طرف ہنسی خوشی چلا آ۔

اور پھر عرض کیا کہ یا رسول اللہ یہ کیا خوب ارشادِ ربانی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا " ہاں! اے ابوبکر! جب تم کو موت آئے گی تو اس وقت جبرئیل امین تم سے یہی کہیں گے

نظامِ حکومت

آج کل کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور مہذب طرزِ حکومت جمہوری ہے اس لئے ہمارے مسلمان مصنفین اور اربابِ قلم بھی عام طور پر یہی کہنے لگے ہیں کہ اسلام خود جمہوری طرزِ حکومت کا قائل ہے اور خلفائے راشدین کا طرزِ حکومت بھی جمہوری تھا۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ قرآن مجید سُنتِ رسول۔ اور خلفائے راشدین کے عمل سے جو طرزِ حکومت ثابت ہوتا ہے وہ اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے آج کل کی دستوری اصطلاح میں نہ جمہوری ہے اور نہ شخصی۔ وہ نہ دینی (THEOCRATIC) ہے اور نہ اشراقی و خواصی (ARISTOCRATIC) بلکہ وہ یہ سب کچھ ہے اور ان سب سے الگ بھی ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ دینی حکومت (THEOCRATIC GOVARNMENT) میں بادشاہ کو خدا مانا جاتا ہے جیساکہ فراعنۂ مصر کے ہاں دستور تھا یا اس کو ظلِ خداوندی تسلیم کیا جاتا ہے جیساکہ یورپ کے قرونِ وسطیٰ میں رواج پایا جاتا تھا۔ ان دونوں صورتوں میں بادشاہ مطلق العنان ہوتا ہے۔ اُس کا ہر ہر لفظ فرمودۂ الٰہی ہوتا ہے اور اس بنا پر اُس سے انحراف کرنا تو کجا کوئی شخص اُس پر تنقید بھی نہیں کر سکتا۔

اسلام میں اس تخیل کیلئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ حکمراں و فرمانروا یا ایک خلیفہ تو الگ رہا خود پیغمبر جس کے متعلق معصوم ہونیکا عقیدہ ہوتا ہے وہ بھی حقوق العباد یا دُنیوی معاملات میں انھیں قوانین کا پابند ہوتا ہے جو عام لوگوں کیلئے ہوتے ہیں اور ان امور میں بھول چوک کا احتمال دوسروں کی طرح پیغمبر کے ساتھ بھی لگا رہتا ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا " انتم اعلم بامورِ دنیاکم " اور اس کے علاوہ احادیث و سیر کی کتابوں

[1] کنز العمال بر مسند امام احمد بن حنبل ج ۴ ص ۳۴۵

میں متعدد واقعات مذکور ہیں جن میں آپ نے خود اپنے خلاف مقدمات سُنے اور اُن کے بارہ میں منصفانہ فیصلہ کیا[۱] پس جب خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق الوہیت کا عقیدہ نہیں ہو سکتا تو خلیفۂ رسول اللہؐ کی نسبت یہ عقیدہ کیونکر ہو سکتا تھا یہی وجہ ہے کہ بیعت کے بعد جب لوگوں نے حضرت ابوبکر کو "یاخلیفۃ اللہ" کہہ کر مخاطب کیا تو آپ نے فوراً اس کی تردید کی اور فرمایا لست بخلیفۃ اللہ ولکنی خلیفۃ رسول اللہ میں اللہ کا خلیفہ نہیں ہوں۔ البتہ خلیفۂ رسول اللہ ہوں۔

بنو سقیفہ میں بیعت کے بعد حضرت ابوبکر نے جو خطبہ دیا تھا اور جس کو تم بیعت کے موقع پر پڑھ آئے ہو اُس میں صاف صاف کہا تھا کہ " اے لوگو! میں تم سے بہتر آدمی نہیں ہوں۔ میری تمنا تھی کہ یہ ذمہ داری کسی اور کو سپرد کی جاتی۔ لیکن بہر حال اب جبکہ تم نے مجھ کو منتخب کر لیا ہے تو اگر میں ٹھیک ٹھیک چلوں تو تم میری اطاعت کرو ورنہ اگر غلط راستہ پر گامزن ہوں تو تم مجھ کو ٹھیک اور درست کر دو۔"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ آج کل کی مروّجہ دستوری اصطلاح میں جس طرزِ حکومت کو دینی حکومت کہا جاتا ہے اُس کے اعتبار سے اسلامی طرزِ حکومت ہرگز دینی نہیں ہے۔ البتہ ہاں اس حیثیت سے بے شبہ وہ دینی حکومت ہے کہ اس حکومت کا منشور اور دستور قانونِ الٰہی ہے۔ منزل من اللہ ہے جس کی رُو سے فرماں روا اور سب مسلمان اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت و فرماں برداری کا عہد کرتے ہیں اور اوامر و نواہی شریعت کے پابند رہتے ہیں۔

اسی طرح یہ طرزِ حکومت اشراقی یا خواصی (ARISTOCRATIC) طرزِ حکومت بھی نہیں ہے کیونکہ یہ حکومت اُونچے طبقہ والوں کی ادنیٰ طبقہ کے لوگوں پر۔ خواص کی عوام پر اور امراء کی غریبوں پر ہوتی ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم نے خلافت کی حقیقت کی بحث میں بتایا ہے۔ اسلام میں سرے سے طبقاتی تقسیم کے کوئی معنیٰ ہی نہیں ہیں۔ ہر وہ مسلمان جو فرائض و واجباتِ خلافت کو انجام دینے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ خلافت کیلئے منتخب کیا جا سکتا ہے۔ حضرت حذیفہ کے غلام سالم

[۱] دیکھو سیرت ابن ہشام ص ۴۴۴ ۔ سیرت شامی میں بھی اس طرح کے متعدد واقعات مذکور ہیں۔

کیلئے حضرت عمر فاروق کا یہ فقرہ پہلے گذر چکا ہے کہ اگر سالم آج زندہ ہوتے تو میں انکو والی بناتا۔ اسلام میں شخصی حکومت کی بھی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعد اہل بیت میں سے کسی کی خلافت ونیابت کی وصیت نہیں کی اور یہی عمل خلفائے راشدین کا بھی رہا۔ پھر قرآن مجید میں مسلمان کی تو شان ہی یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ کسی ایک معاملہ میں بھی استبداد کو راہ نہیں دیتے اور باہمی مشورہ سے اپنے معاملات انجام دیتے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ	اور جن لوگوں نے اپنے رب کی دعوت پر لبیک کہا ہے
وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ	نمازیں قائم کی ہیں اور اُن کے معاملات باہمی مشاورت سے
يُنْفِقُوْنَ ۝ (شوریٰ)	طے ہوتے ہیں اور وہ خدا کے بخشے ہوئے رزق سے خرچ کرتے ہیں

عبداللہ یوسف علی صاحب اپنے مشہور انگریزی ترجمہ قرآن مجید میں اس آیت پر اپنے ایک نوٹ میں لکھتے ہیں :۔

"اس آیت میں مشاورت باہمی کا جو اصول بیان کیا گیا ہے اُس پر آں حضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی خانگی اور پبلک دونوں قسم کی زندگی میں پورے طور پر عمل کیا اور آپ کے بعد جو ابتدائی دور کے حکمراں تھے انہوں نے بھی اس کی مکمل پیروی کی۔ موجودہ "نمائندہ حکومت" سیاستی امور میں اسی اصول پر عمل کرنے کی ایک نامکمل سی کوشش ہے" [1]

اس کے علاوہ خاص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے حکم دیا گیا

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ فَاِذَا	اور آپ معاملات میں لوگوں سے مشورہ لیجئے
عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ	لیکن جب عزم کرلیں تو پھر اللہ پر توکل کیجئے۔

ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیغمبر برحق تھے اس لئے آپ کو کسی سے مشورہ کرنے کی ضرورت نہیں ہوسکتی تھی۔ لیکن چونکہ آپ کو ایک نمونہ قائم کرنا اور اسوہ بننا تھا اس لئے قرآن میں آپ کو مشورہ کرنے کا حکم دیا گیا اور آپ برابر اس پر عمل فرماتے رہے یہاں تک کہ عُمّال اور

---

[1] ص ۱۰۳۱۷ مطبوعہ شیخ محمد اشرف لاہور۔

اُمراء کا تقرر بھی آپ مشورہ سے ہی کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن مسعود کی نسبت فرمایا

"لَوْكُنْتُ مُؤَمِّرًا اَحَدًا بِغَيْرِ مَشْوَرَةٍ لَاَمَّرْتُ ابْنَ اُمِّ عَبْدٍ۔ [۱]	اگر میں کسی شخص کو مشورہ کے بغیر امیر بناتا تو ابن ام عبد (عبداللہ بن مسعود) کو بناتا۔

آپؐ کے بعد حضرت ابوبکر کا عمل بھی یہی رہا۔ معمولی سے معمولی کوئی معاملہ بھی جس کا تعلق نظم و نسق اور مسلمانوں کی اجتماعی زندگی سے ہوتا تو مشورہ کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کرتے تھے۔

بحرین میں بزاخہ نام کا ایک مقام ہے یہاں کے لوگ بھی مرتد ہو گئے تھے۔ بعد میں اُن کو پشیمانی ہوئی تو حضرت ابوبکر کی خدمت میں حاضر ہو کر عفو خواہ ہوئے اور اپنے گزشتہ اعمال سے توبہ کی۔ حضرت ابوبکر نے فرمایا "تم اب تو جنگلوں میں جا کر اُونٹ چراؤ۔ میں مہاجرین سے مشورہ کر کے تم کو جواب دوں گا" چنانچہ آپ نے ایک اجتماع طلب فرمایا اور جو کچھ اُن کے اور آپ کے درمیان گفتگو ہوئی تھی وہ پبلک کے سامنے رکھدی۔ [۲]

مشورہ کے بعد مسلمانوں کی شان یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ مشورہ سے جو بات طے پاسے اُسکی پابندی کی جائے۔

طَاعَةٌ وَّقَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ فَاِذَا عَزَمَ الْاَمْرُ فَلَوْ صَدَقُوا اللّٰهَ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ	طاعت اور قول معروف ہے۔ اور جب ایک بات طے ہو جائے تو پھر جو لوگ اللہ سے سچے ہوں گے اُن کے لئے یقیناً بہتر ہوگا۔

اب رہا طرزِ جمہوری حکومت! تو اس میں شبہ نہیں کہ اپنی اصل اسپرٹ اور رُوح کے اعتبار سے اسلامی طرزِ حکومت جمہوری ہی ہے۔ چنانچہ:-

(۱) خلیفہ کا انتخاب رائے عامہ سے ہوتا ہے خلیفہ کی بیعت کی نوعیت بالکل وہی ہے۔ جو آج کل ووٹ کی ہوتی ہے۔

(۲) ہر شخص کو پورا حق حاصل ہے کہ وہ خلیفہ کے کسی عمل یا فعل پر نکتہ چینی کرے۔

---

[۱] سنن ترمذی جلد دوم کتاب المناقب۔ [۲] صحیح بخاری جلد دوم ص ۱۰۷۲ باب من نکث بیعتہ

(۳) خلیفہ اپنے آپ کو لوگوں سے ممتاز یا برتر نہیں جانتا۔ بلکہ اُن کا خادم سمجھتا ہے اور اس وجہ سے اُس تک پہونچنے میں کسی کو دشواری نہیں ہوتی۔[1]

(۴) خلیفہ جب کبھی کوئی اہم کام کرتا ہے تو رائے عامہ ضرور طلب کرلیتا ہے۔ ارباب فکر و نظر سے مشورہ کرتا ہے اور قطعاً استبداد نہیں برتتا۔

(۵) لیکن ہاں اس مشورہ کے بعد وہ اس کا پابند نہیں ہے کہ اکثریت کی رائے پر عمل بھی کرے بلکہ اگر چاہے تو اپنا فیصلہ اُس کے خلاف بھی دے سکتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہی تھا۔ قرآن میں بھی یہی فرمایا گیا ہے :-

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ	اور آپ معاملات میں لوگوں سے مشورہ کیجئے لیکن
فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ	جب ارادہ کرلیں تو پھر اللہ پر توکل کیجئے۔

تم پڑھ آئے ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے فوراً بعد ہی صحابۂ کرام کی عظیم اکثریت اس کے حق میں نہیں تھی کہ حضرت اسامۃ کو عرب و شام کی سرحد پر بھیجا جائے لیکن حضرت ابوبکر نے اُس کو نہیں مانا۔ اسی طرح اکثر صحابہ مانعین زکوٰۃ سے قتال کرنے کے حامی نہیں تھے لیکن حضرت ابوبکر نے اس رائے کی مخالفت کی اور آخر وہی کیا جو خود اُن کے نزدیک حق تھا۔ اس کے بعد شام پر لشکر کشی کا ارادہ ہوا تو تمام صحابہ کو بلا کر مشورہ کیا۔ صحابہ پس و پیش میں تھے۔ لیکن حضرت علی نے حضرت ابوبکر کے موافق رائے دی اور آخر آپ نے اُسی پر عمل کیا۔

لیکن آج کل کی اصطلاح میں جس کو جمہوری نظام حکومت کہتے ہیں اُس میں اور اسلامی جمہوریت

---

[1] اس سلسلہ میں حضرت عمر نے ایک مرتبہ بڑی عمدہ بات کہی۔ ایک مرتبہ آپ نے اپنے مشیران خاص سے پوچھا کہ میں ایک شخص کو امیر بنانا چاہتا ہوں۔ بتاؤ کس کو بناؤں؟ لوگوں نے دریافت کیا "آپ کو کس قسم کا آدمی چاہیے" حضرت عمر نے جواب دیا۔ "رجل اذا كان اميرهم كانه رجل منهم واذا لم يكن اميرهم كانه اميرهم" (مجھ کو ایسا شخص چاہیے کہ جب مسلمانوں کا امیر ہو تو ایسا معلوم ہو کہ گویا انہیں میں کا ایک ہے۔ لیکن جب امیر نہ ہو تو (اپنے کمالات و اوصاف کی وجہ سے) اُن لوگوں کا امیر ہی معلوم ہوتا ہو۔)

(منتخب کنز العمال بر مسند امام احمد بن حنبل ج ۲ ص ۱۴۳)

میں فرق یہ ہے کہ اوّل الذکر میں عددی اکثریت پر ہی تمام فیصلوں کا دارومدار ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر کسی طرف اکاون ووٹ ہوں اور وہ سب کے سب جاہل، خود غرض اور معاملہ نافہم لوگوں کے ہوں اور اس کے برخلاف دوسری طرف ایک ووٹ کم ہو یعنی پچاس ہوں لیکن یہ سب معاملہ فہم اور صائب الرائے لوگوں کے ہوں تو فیصلہ اُسی گروہ کے حق میں ہوگا جس کو ایک ووٹ کی اکثریت حاصل ہے۔ اسلامی جمہوریت میں اس عددی اکثریت کی کوئی اہمیت نہیں ہے جیسا کہ خلیفہ کے انتخاب کے عنوان کے ماتحت گذر چکا ہے۔

علاوہ بریں موجودہ جمہوریت میں جتنے کام ہوتے ہیں پارٹی کی بنیاد پر ہوتے ہیں۔ پارٹی کا ہر فرد مجبور ہوتا ہے کہ ہر معاملہ میں اپنی پارٹی کے حق میں ووٹ دے اور اُس کی حمایت کرے۔ اگر کوئی شخص ایسا نہیں کرتا تو اس کے خلاف تادیبی کارروائی کی جاتی ہے[1]۔ لیکن اسلامی جمہوریت میں اس پارٹی عصبیت کا کہیں وجود نہیں ہے۔ حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں خود صحابہ میں پارٹیاں تھیں۔ ایک مہاجرین کی، دوسری انصار کی اور تیسری بنو ہاشم کی۔ لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ محض پارٹی عصبیت کی بنیاد پر کسی نے کوئی رائے دی ہو۔ جس بات کو جو شخص حق جانتا تھا اُس کی حمایت میں رائے دیتا تھا۔

غرض کہ اسلام کا طرزِ حکومت کچھ اس قسم کا ہے کہ آج کل کے مروجہ طرز ہائے حکومت میں سے ہر طرز میں جتنی خوبی اور عمدگی ہے وہ اسلام نے لے لی ہے اور اُس میں جو حصہ مُضر اور لائقِ مذمت تھا اُس کو ترک کر دیا گیا ہے۔ اس بنا پر ہمارے نزدیک اسلامی طرزِ حکومت کے لئے موزوں تر "شورائی حکومت" کا نام ہوگا۔

---

[1] انہیں وجوہ کی بنا پر ہمارے زمانہ کی جمہوریت بھی درحقیقت ڈکٹیٹرشپ کی ہی ایک قسم ہو کر رہ گئی ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ ڈکٹیٹرشپ میں فردِ واحد کی مطلق العنان حکومت ہوتی ہے اور اس جمہوریت میں ایک پارٹی کی حکومت ہوتی ہے جو پارلیمنٹ یا اسمبلی میں اپنی عددی اکثریت کے بل بوتے پر جو چاہتی ہے آزادی کے ساتھ کرتی ہے۔

حضرت ابوبکر کا دستورِ حکومت اسلامی طرزِ حکومت پر ایک عام اجمالی تبصرہ کرنیکے بعد اب ہم کو بتلانا چاہئے کہ حضرت ابوبکر کا دستور و آئین حکومت کیا تھا؟ چونکہ اسلامی حکومت یا خلافت کی بُنیاد قرآن و حدیث پر ہوتی ہے اس بنا پر حضرت ابوبکر کے سامنے جب کوئی معاملہ پیش آتا تھا تو سب سے پہلے اُس کا حکم قرآن مجید میں تلاش کرتے تھے۔ اگر وہاں نہ ملتا تو حدیث کی طرف رجوع فرماتے اگر اس خاص معاملہ کے متعلق حدیث میں بھی کچھ نہ ملتا تو مسلمانوں کا ایک جلسہ طلب فرماتے اُن میں سے اگر کسی کو کوئی حدیث یاد ہوتی اور وہ پڑھ کر سُنا دیتا تو آپکو بڑی خوشی ہوتی اور خدا کا شکر ادا کرتے کہ سُنتِ رسول کے جاننے والے اُن کی مدد کو موجود ہیں۔ اگر کسی کو کوئی حدیث بھی یاد نہ ہوتی تو پھر اہلِ رائے سے مشورہ لیتے تھے۔

مجلسِ شوریٰ صحابۂ کرام میں جو حضرات معاملہ فہمی اور تدبر و سیاست میں امتیاز رکھتے تھے حضرت ابوبکر نے ان کو اپنا مشیرِ خاص بنا رکھا تھا۔ جب کوئی اہم معاملہ پیش آتا ان حضرات سے مشورہ کرتے تھے۔ ابنِ سعد کا بیان ہے:-

ان ابا بکر الصدیق کان اذا نزل بہ امرٌ یرید فیہ مشاورۃ اھل الرأی واھل الفقہ ودعا رجالاً من المھاجرین والانصار دعا عمر وعثمان وعلیاً وعبدالرحمٰن بن عوف ومعاذ بن جبل وابی بن کعب وزید بن ثابت۔ [1]	ابوبکر صدیق کو جب کوئی معاملہ پیش آتا تھا جس میں اہلِ رائے وفقہ سے مشورہ کی ضرورت ہوتی تھی اور اس مقصد کے لئے وہ مہاجرین اور انصار میں سے کچھ لوگوں کو بلاتے تھے تو حضرت عمر۔ عثمان۔ علی۔ عبدالرحمٰن بن عوف معاذ بن جبل۔ ابی بن کعب اور زید بن ثابت کو بلاتے تھے۔

ملکی نظم و نسق یہ ظاہر ہے کہ حضرت ابوبکر کی مدّتِ خلافت کُل دو برس تین مہینے[2] ہے اور یہ مدت بھی اسلامی مملکت کے اندرونی اور بیرونی استحکام اور فتوحات میں بسر ہوگئی لیکن اسکے باوجود

---

[1] طبقات ابن سعد قسم ثانی جز ثانی ص ۱۰۹ [2] دو برس تین مہینے گیارہ دن ہے

حضرت ابوبکر نظم و نسق سے غافل نہیں تھے اور اسلامی مملکت کا رقبہ جتنا وسیع ہوتا جاتا تھا اسی قدر نظم و نسق کے دائرہ کو وسعت ہوتی جاتی تھی۔ حضرت ابوبکر نے آجکل کی مہذب اور ترقی یافتہ حکومتوں کی طرح پوری مملکت کو مختلف صوبوں اور ضلعوں میں تقسیم کر دیا تھا اور اُن میں سے ہر ایک کیلئے جدا جدا حاکم مقرر کئے تھے جیسا کہ نقشہ ذیل سے اُس کی وضاحت ہوگی۔

مقامِ حکومت	حاکم کا نام	کیفیت
(۱) مکّہ (حجاز)	حضرت عتاب بن اُسید	
(۲) طائف "	حضرت عثمان بن ابی العاص	
(۳) صنعاء (یمن)	مہاجر بن ابی امیہ	
(۴) حضرموت "	زیاد بن لبید انصاری	
(۵) خولان	یعلی بن منیہ	
(۶) زبید و رمع	ابوموسیٰ اشعری	(یمن میں ایک علاقہ کا نام ہے)
(۷) جند	معاذ بن جبل	
(۸) بحرین	علاء بن الحضرمی	
(۹) نجران	جریر بن عبداللہ البجلی	
(۱۰) دومۃ الجندل	عیاض بن الغنم	
(۱۱) عراق	مثنیٰ بن حارثہ	
(۱۲) جرش	عبداللہ بن ثور	
(۱۳) حمص (شام)	ابوعبیدۃ بن الجراح	
(۱۴) اردن "	شرجیل بن حسنہ	
(۱۵) دمشق "	یزید بن ابی سفیان	
(۱۶) فلسطین "	عمرو بن العاص	
(۱۷) مدینہ		(دارالحکومت تھا جہاں براہ راست خلیفہ کے احکام آتے تھے)

عہدہ دارانِ حکومت کا انتخاب ایک حکومت کے بہترین نظم و نسق کا دار و مدار بنیادی طور پر اس بات پر ہے کہ جس عہدہ کیلئے جس شخص کا انتخاب کیا جائے وہ بہمہ وجوہ اُس کیلئے موزوں ہو اس کیلئے سب سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ فرماں روائے وقت میں مردم شناسی کا جوہر ہونا چاہیئے۔ مالک بن نویرہ کے واقعہ میں تم پڑھ آئے ہو کہ حضرت خالد کے متعلق حضرت عمر کو کس قدر شدید اصرار تھا کہ اُن کو معزول کیا جائے لیکن حضرت ابو بکر نے ایک نہ سُنی۔ آخر جب حضرت خالد کے جوہر کھلے تو حضرت عمر کو خود اقرار کرنا پڑا کہ صحابہ میں حضرت ابو بکر کے برابر کوئی مُردُم شناس نہیں تھا۔

انتخاب کے معاملہ میں حضرت ابو بکر کے اصول اس سلسلہ میں حضرت ابو بکر کے دو اصول تھے:۔

(۱) جو شخص جس عہدہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں مقرر تھا حضرت ابو بکر اُس کو اسی عہدہ پر رکھتے تھے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ صحیح انتخاب کس کا ہوسکتا تھا۔ چنانچہ جیش اسامہ کی روانگی کے وقت حضرت اسامہ کی امارت پر سب نے ہی اعتراض کیا مگر آپ نہ مانے۔ حضرت عمر نے جب حضرت خالد کی معزولی کا مطالبہ کیا تو آپنے صاف فرمایا کہ "جس تلوار کو رسول اللہ نے نیام سے باہر کیا ہو میں اُس کو کیوں کر نیام میں رکھ سکتا ہوں"۔ مکہ میں عتاب بن اسید۔ طائف میں عثمان بن ابی العاص۔ صنعا میں مہاجر بن ابی اُمیہ۔ حضرموت پر زیاد بن لبید اور بحرین پر علاء الحضرمی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں عامل تھے تو عہدِ صدیقی میں بھی اسی عہدہ پر رہے[۱]۔

(۲) دوسرا اصول جس کی طرف حافظ ابن حجر نے الاصابہ میں متعدد مواقع پر اشارہ کیا ہے یہ تھا کہ وہ اُس شخص کا انتخاب کرتے تھے جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضانِ تربیت سے زیادہ سے زیادہ بہرہ مند ہونے کا موقع ملا ہو۔ چنانچہ جو لوگ فتح مکہ سے قبل مسلمان ہوئے تھے اُن کو ترجیح دیتے تھے۔

---

[۱] طبری ج ۲ ص ۶۱۷

اقربا نوازی سے اجتناب ایک فرماں روا کیلئے سب سے زیادہ ضروری ہے کہ وہ عہدوں کی تقسیم کے معاملہ میں اقربا نوازی اور جنبہ داری سے اجتناب کرے اور عہدہ اُس شخص کو ہی سپرد کرے جو بہمہ وجوہ اُس کا اہل ہو۔ حضرت ابوبکر کا خود بھی اُس پر بڑی سختی کیساتھ عمل تھا اور اپنے عمال کو بھی اس کی تاکید فرماتے رہتے تھے۔

یزید بن ابی سفیان کو شام کی امارت پر روانہ کیا تو فرمایا:۔

یا یزید ان لك قرابۃ	اے یزید! وہاں تمہارے عزیز قریب ہیں
عسیت ان توثرھم بالامارۃ	ممکن ہے کہ تم اُن کو امارت کے دینے میں ترجیح دو
وذالك اکبر ما اخاف علیك	یہ وہ سب سے بڑی چیز ہے جس کا میں تم سے
فان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	اندیشہ کرتا ہوں۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
قال: من ولی من امر المسلمین	نے فرمایا ہے کہ جو شخص مسلمانوں کے کسی کام کا
شیئاً فامر علیھم احداً محاباۃً	ذمہ دار ہو اور وہ محض رشتہ کی وجہ سے ان پر
فعلیہ لعنۃ اللہ لا یقبل اللہ	کسی شخص کو امیر بنادے تو اس پر اللہ کی لعنت
عنہ صرفاً ولا عدلاً حتی یدخلہ	ہوگی اور اللہ اس کی طرف سے کسی فدیہ اور کفارہ
جھنم۔ [1]	کو قبول نہیں کرے گا یہاں تک کہ اسکو جہنم میں بھیجیگا۔

عمال کے تقرر میں عالی ظرفی ایک طرف اقربا نوازی سے یہ اجتناب اور دوسری جانب عالی ظرفی کا یہ عالم تھا کہ اگر کسی شخص کی نسبت یہ بھی معلوم ہوتا کہ وہ آپ کی ذات کیساتھ رنجش رکھتا ہے۔ لیکن آپ جو عہدہ اس کو دینا چاہتے اُس کے لئے وہ آپکی رائے میں موزوں ہوتا تو اسکی ذاتی رنجش کا خیال اُس کو عہدہ دینے میں مانع نہیں ہوتا تھا۔ شام کی مہم روانہ کرتے وقت خالد بن سعید کو بھی آپ نے ایک عَلَم عنایت فرمایا تو اگرچہ حضرت عمر نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ خالد آپ کی خلافت سے خوش نہیں تھے اور انھوں نے آپ کے برخلاف بنو ہاشم کو بھڑکایا تھا لیکن حضرت ابوبکر نے اس کی ذرا پروا نہیں کی اور تقرر بحال رکھا۔[2]

[1] مسند امام احمد بن حنبل ج ۱ ص ۶ [2] طبری ج ۴ ص ۲۰۸۴۔

عمّالِ حکومت کی دل جوئی اور اُن کا احترام

ایک حکومت کی شائستگی اور اُس کے مہذب ہونیکی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ عمالِ حکومت کا اُن کے مرتبہ و منصب کے لحاظ سے پورا احترام ملحوظ رکھا جائے اور اُن کے ساتھ جبر و تحکم کا برتاؤ نہ کیا جائے حضرت ابوبکر ان دونوں باتوں کا بھی بڑا خیال رکھتے تھے۔ جیشِ اسامہؓ کو روانہ کرنیکے وقت حضرت ابوبکر چاہتے تھے کہ حضرت عمرؓ اس جیش میں نہ جائیں اور مدینہ میں رہ کر اُن کے خصوصی مشیرِ کار کی حیثیت سے کام کریں۔ لیکن چونکہ امیر الجیش حضرت اسامہؓ تھے اس لئے آپ نے حضرت عمرؓ کے متعلق خود کوئی فیصلہ کرنیکے بجائے اسامہؓ سے درخواست کی کہ اگر وہ مناسب سمجھیں تو حضرت عمرؓ کو اُن کے پاس ہی چھوڑ جائیں۔ پھر دلجوئی کا یہ عالم تھا کہ حضرت اسامہؓ کا لشکر روانہ ہوا تو اسامہ سواری پر بیٹھے ہوئے تھے۔ لیکن خلیفہ رسول دُور تک اُن کی مشایعت کو پیدل گیا اور حضرت اسامہؓ کے سخت اصرار کے باوجود نہ خود سواری پر بیٹھے اور اور نہ اسامہؓ کو سواری سے نیچے اُترنے دیا۔ اسی طرح یزید بن ابی سفیانؓ شام کی مہم پر روانہ ہوئے تو آپ نے دُور تک اُن کی پاپیادہ مشایعت کی۔

انتخاب میں احتیاط

عربی کا مشہور مقولہ ہے "سل المجرب ولا تسأل الحکیم" اسکے مطابق جن لوگوں نے کسی وجہ سے اپنا اعتماد کھو دیا تھا۔ حضرت ابوبکر تائب ہو جانیکے بعد بھی اُنکو ذمہ داری کا کام سونپنا پسند نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت خالد کو عراق کی مہم پر روانہ کیا تو اُن کو جہاں اور ہدایات دیں ایک ہدایت یہ بھی کی کہ جو لوگ مرتد ہو گئے تھے اُن کو فوج میں بھرتی نہ کیا جائے۔ ان لوگوں کیساتھ حضرت ابوبکر کا یہ معاملہ اُس وقت تک رہا جب تک کہ اُن کے صدق و خلوص اور ایمان کی پختگی کا آپ کو یقین نہیں ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ عراق کی مہم کے زمانہ میں ان لوگوں پر جو رکاوٹ تھی۔ شام کی مہم کے زمانہ میں باقی نہیں رہی تھی۔

آزمائشی تقرر

آج کل کے عام قاعدہ کے مطابق جب تک کسی شخص کے متعلق اسکی حسن کارگزاری کی وجہ سے یقین نہیں ہو جاتا تھا کہ وہ اُس عہدہ کا اہل ہے اُس کا تقرر عارضی طور پر کرتے تھے۔ مستقل ہونے اور ترقی پانے کی شرط حسنِ کارکردگی ہوتی تھی۔ یزید بن ابی سفیانؓ کو شام کی مہم پر

ایک دستہ فوج کا امیر مقرر کر کے روانہ کیا تو ان کو بہت سی ہدایات دیں جن کا ذکر آگے آرہا ہے ان ہدایات کا آغاز اس طرح کیا تھا۔

انی قد ولیتك لابلوك	میں نے تم کو اس لئے والی بنایا ہے کہ میں تم کو آزماؤں۔
واجربك واخرجك	تمہارا تجربہ کروں اور تم کو ٹریننگ دوں اگر تم نے
فان احسنت رددتك الی	اچھا کام کیا تو میں اس عہدہ پر تم کو برقرار رکھوں گا۔
عملك وزدتك، وان	اور ترقی کر دوں گا۔ اور اگر تم نے برا کام کیا تو میں
اسأت عزلتك۔ [۱]	عہدہ سے الگ کر دوں گا۔

عمال کی معزولی تقرر کے بعد اگر کوئی عہدہ دار نااہل ثابت ہوتا تھا تو حضرت ابوبکر اسکو فوراً معزول بھی کر دیتے تھے اور اس میں تاخیر روا نہیں رکھتے تھے۔ گزر چکا ہے کہ حضرت ابوبکر نے خالد بن سعید کو عرب و شام کی سرحد پر اس کی نگرانی اور دیکھ بھال کیلئے مقرر کیا تھا اور حکم دیا تھا کہ جب تک ان کو اجازت نہ ملے پیش قدمی نہ کریں لیکن خالد بن سعید نے سرحد پر رومی افواج کا اجتماع دیکھا اور ادھر خالد کی مدد کیلئے مدینہ سے تازہ دم فوج پہونچ گئی تو انھوں نے پیش قدمی کی اجازت کا انتظار نہیں کیا اور حملہ کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی فوج پسپا ہو گئی۔ حضرت ابوبکر کو اطلاع ہوئی تو خالد بن سعید کو سخت تہدیدی خط لکھا اور ان کے عہدہ سے ان کو معزول کر دیا خط کے الفاظ یہ ہیں :۔

اقم مکانك۔ فلعمری انك مقدام محجام"	تم اپنی جگہ ہی رکے رہو۔ تم بڑے پیشقدمی کر نیوالے ہو۔
نجاء من الغمرات لاتخوضها الی	لیکن گہرائیوں میں گھسنے سے بھاگتے ہو۔ نہ تم ان میں درست
حق ولا تصبر علیه	طریقہ پر گھستے ہو اور نہ ان پر صبر کرتے ہو۔

پھر جب خالد مدینہ آئے تو ان سے زبانی کہا کہ تم لڑائی کے موقع پر بڑی بزدلی دکھاتے ہو۔ جب خالد چلے گئے تو اس وقت جو لوگ آپ کے پاس تھے ان سے فرمایا کہ عمرؓ اور علیؓ خالد سے اچھی طرح واقف تھے اگر میں ان کی بات مان لیتا تو خالد سے پہلے ہی بچتا۔ یعنی ان کو عامل نہ بناتا۔

[۱] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۷۶ [۲] طبری ج ۲ ص ۵۹۰

گورنروں کے فرائض | آج کل کی اصطلاح میں حضرت ابوبکر کی حکومت کو فوجی حکومت (MILITARY ADMINISTRATION) کہہ سکتے ہیں۔ یعنی جو گورنر یا والی ہوتا تھا وہی فوج کا افسر اعلیٰ ہوتا تھا چنانچہ ایک گورنر کے فرائض حسب ذیل تھے۔

(۱) مسجد میں جماعت کی امامت اور خصوصاً جمعہ کے روز خطبہ دینا۔

(۲) فوج کی نگرانی اور اُن کی تنخواہ وغیرہ کا بندوبست کر کے اسے تقسیم کرنا۔

(۳) تمام محصولات کا جمع کرنا اور درآمد و برآمد اشیاء کی نگرانی کرنا۔

(۴) اپنے علاقہ میں امن وامان کی حفاظت کرنا اور لوگوں کی اخلاقی حالت سدھارنے کی کوشش کرنا۔

(۵) حدود اللہ جاری کر کے مجرموں کو سزا دینا۔

(۶) فتنہ پروروں کے خلاف جنگ کرنا اور اس میں جو مالِ غنیمت ہاتھ آئے اُس کو مسلمان فوجیوں میں تقسیم کرنا اور اس کا خمس مرکز کو بھیجنا۔

(۷) ہر سال حج کیلئے جانیوالے مسافروں کے قافلوں کا بندوبست کرنا اور اُن کو حفاظت کے ساتھ سہولت بہم پہونچانا۔

(۸) ضعیف العمر سپاہیوں کی پنشن اور انکے متعلقین کی معاشی مدد کا انتظام و انصرام کرنا۔

(۹) کسانوں کا خاص طور پر خیال رکھنا اور جہاں تک ممکن ہو علاقہ کی زراعت کو ترقی دینا۔

عہدوں کی تقسیم | لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ایک گورنر ہی تن تنہا سب کام انجام دیتا تھا بلکہ انتظامی امور کو مختلف شعبوں میں تقسیم کر کے ہر شعبہ کو الگ الگ ذمہ دار افسروں کی نگرانی میں دے دیا جاتا تھا۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں یہی دستور تھا۔ اور آپؐ کے بعد حضرت ابوبکر نے بھی اسی پر عمل کیا۔ چنانچہ خلافت صدیقی میں عمالِ و وُلات کے علاوہ اور جن عہدوں کا پتہ چلتا ہے وہ یہ ہیں:-

عہدۂ قضا | عام طور پر مشہور ہے کہ قضا کا محکمہ سب سے پہلے حضرت عمر فاروق نے قائم کیا۔ مولانا شبلی نے الفاروق[1] میں اور پروفیسر ہٹی نے "تاریخ عرب[2]" میں یہی لکھا ہے لیکن حقیقت

[1] مطبوعہ قومی المطابع حصہ دوم ص ۴۸ [2] چوتھا ایڈیشن ص ۱۷۳

یہ ہے کہ یہ عہدہ خود عہدِ نبوت میں قائم ہو چکا تھا۔ کتبِ حدیث میں "کتاب الاقضیہ" کے عنوان سے جو باب ہے اس میں ایسی احادیث وروایات منقول ہیں جن سے صاف معلوم ہوتا ہی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قاضی کے فرائض وواجبات۔ عہدہ کے شرائط وآداب۔ شہادت کے احکام وغیرہا نہایت تفصیل سے بیان فرما دیئے تھے۔ اور اگرچہ معاملاتِ خصومت میں آخری فیصلہ آپ کا ہی نافذ ہوتا تھا۔ لیکن مملکت میں توسیع کے باعث ہر معاملہ اور مقدمہ آپ خود فیصل نہیں کر سکتے تھے اس لئے مختلف علاقوں میں اپنی جانب سے قاضی بھی مقرر فرما دیتے تھے اور اُن کو اس سلسلہ میں خاص خاص ہدایات دی تھیں چنانچہ حضرت علی کو یمن کا قاضی مقرر فرمایا تو حضرت علی نے عرض کیا کہ میں تو کم عمر ہوں اور مجھ کو قضا کا کوئی علم نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا " اللہ تمہارے قلب کو راہ دکھائیگا اور تمہاری زبان کو استواری بخشے گا۔ جب تم دو آدمیوں کا جھگڑا چکانے بیٹھو تو جس طرح تم نے پہلے فریق کی بات سُنی ہے اسی طرح جب تک دُوسرے فریق کی نہ سُن لو۔ کوئی فیصلہ نہ کرو۔ یہی طریقہ ہے جس سے فیصلہ کرنا تمہارے لئے آسان ہوگا [1]

اسی طرح حضرت معاذ بن جبل کو یمن بھیجا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا "جب تمہارے سامنے خصومات آئیں تو تم کیونکر حکم (قضا) کرو گے۔ انھوں نے کہا کہ کتاب اللہ کی روشنی میں پھر دریافت فرمایا۔ لیکن اگر کتاب اللہ میں تم نہ پاؤ تو؟" عرض کیا "سنتِ رسول اللہ کی روشنی میں" اب سوال ہوا" اور اگر سنت رسول اللہ میں بھی تم نہ پاؤ" انھوں نے جواب دیا" ایسی صورت میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور اس میں کوئی کوتاہی نہ ہونے دوں گا" یہ سُن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسرت سے حضرت معاذ کا سینہ تھپتھپایا اور فرمایا "جمیع حمد اُس اللہ کیلئے ہے جس نے رسول اللہ کے رسُول کو اُس کی توفیق دی جو رسول اللہ کا پسندیدہ ہے [2]

حضرت ابوبکر صدیق نے اپنے عہد میں حضرت علی اور حضرت معاذ اور بعض اور صحابہ کو جن کے نام آگے آتے ہیں اس خدمتِ قضا پر مامور رکھا۔ لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ کتبِ تاریخ وسیر

[1] سنن ابی داؤد باب کیف القضاء [2] سنن ابی داؤد باب اجتہاد الرای بالقضاء

میں ان حضرات کو عہدِ صدیقی کے اربابِ افتا کہا گیا ہے اور جیسا کہ علامہ سرخسی نے تصریح کی ہے[1]۔ صدرِ اوّل میں قاضی کو بھی مفتی کہتے تھے۔ یہ حضرات قضا کا کام بھی کرتے تھے۔

لیکن حضرت عمر فاروق قاضی القضاۃ۔ یعنی چیف جسٹس کے عہدہ پر مامور تھے اور اہم معاملات کا فیصلہ آپ ہی کرتے تھے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ تاریخوں میں حضرت عمر کیلئے اِفتاء کا نہیں بلکہ صرف قضا کا لفظ آتا ہے۔

طبری میں ہے کہ جب حضرت ابو بکر خلیفہ ہوئے تو حضرت عمر نے خود فرمایا "انا اکفیک القضاء" میں آپ کیلئے قاضی کا کام کروں گا لیکن چونکہ وہ خیر القرون کا دور تھا اس لئے سال بھر تک باہمی خصومت کا کوئی معاملہ ہی حضرت عمر کے سامنے پیش نہیں ہوا[2]۔

طبری کے علاوہ ابنِ اثیر میں ہے۔

وفیہا استقضی ابو بکر عمر بن الخطاب	اور اس سال ابو بکر نے عمر بن الخطاب کو قاضی بنایا
وکان یقضی بین الناس خلافتہ کلہا[3]	اور خلافتِ صدیقی بھر قضا کا کام کرتے رہے۔

حضرت عمر اپنے اس حقِ قضا کو آزادی کے ساتھ استعمال کرتے تھے اور حضرت ابو بکر کی رائے کی بھی پروا نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ اقرع بن حابس اور عیینۃ بن حصن حضرت ابو بکر کے پاس آئے اور ایک بے کار زمین جو اُن کی طرف پڑی ہوئی تھی اُس کا مطالبہ کیا۔ چونکہ یہ دونوں مولفۃ القلوب میں سے تھے اس لئے حضرت ابو بکر نے اُن کی درخواست منظور کرلی اور اور اس زمین کا پٹہ ان کے نام لکھ دیا اب یہ دونوں حضرت عمر کے پاس آئے تاکہ پروانہ خلافت کی اُن سے توثیق کرالیں لیکن حضرت عمر اُسے دیکھتے ہی سخت غضب ناک ہوئے اور پروانہ اُن کے ہاتھوں سے لیکر چاک کردیا اور فرمایا "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُس زمانہ میں تمہاری دل جوئی کرتے تھے جبکہ اسلام کمزور تھا۔ اب اسلام کافی مضبوط ہے۔ تم سے جو کچھ ہوسکے کر دیکھو" یہ دونوں وہاں سے لوٹ کر سیدھے حضرت ابو بکر کی خدمت میں آئے اور بولے۔ "خلیفہ آپ ہیں یا عمر؟" حضرت ابو بکر نے جواب دیا "خلیفہ تو عمر ہی ہوتے اگر وہ چاہتے" یہ

[1] المبسوط ج ۱۶ ص ۱۰۹ [2] طبری ج ۲ ص ۶۱۰ [3] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۶۰

گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ حضرت عمرؓ بھی غصہ میں بھرے ہوئے آپہونچے اور حضرت ابوبکرؓ سے باز پرس کرنے لگے کہ آپ نے یہ زمین کا ٹکڑا ان دونوں کو کس طرح دیا؟ یہ آپ کی ملکیت ہے یا مسلمانوں کی؟ حضرت ابوبکرؓ بولے "مسلمانوں کی" حضرت عمرؓ نے کہا "تو پھر آپ کو کیا حق تھا کہ ان دو آدمیوں کو بخشدیں" حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا۔ "اس وقت جو لوگ میرے پاس موجود تھے میں نے اُن سے مشورہ کرلیا تھا۔ آخر حضرت ابوبکرؓ نے اپنی رائے سے رجوع کرلیا اور حضرت عمرؓ کے فیصلہ کو بحال رکھا[1] بلکہ ایک روایت میں تو یہاں تک ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کی تحریر چاک کردی تھی اس کے بعد عیینہ حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں آیا اور درخواست کی کہ ایک دُوسری تحریر لکھدیں تو آپ نے فرمایا" لا اجدد شیئاً ردّہ عمرُ " میں اُس کی تجدید نہیں کروں گا جس کو عمرؓ نے رد کردیا ہے۔[2]

ایک نکتہ اس واقعہ سے ایک یہ نکتہ بھی ہاتھ آتا ہے کہ اگرچہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جس طرح صیغۂ عدالت (GUDICIAL) محکمۂ امرِ تنفیذ (EXECATIVE) سے باقاعدہ الگ قائم کردیا گیا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں ایسا نہیں تھا۔ لیکن جہاں تک اصل اسپرٹ اور اس احساس کا تعلق ہے کہ یہ دونوں صیغے الگ الگ ہونے چاہئیں جیسا کہ تہذیب و تمدن کے دورِ ترقی میں ہوتا ہے وہ بہرحال عہدِ صدیقی میں بھی بدرجۂ اتم موجود تھا۔

وزارتِ عظمیٰ اگرچہ اس زمانہ میں وزارت کا عُہدہ باقاعدہ نہیں تھا لیکن جہاں تک وزارت کے فرائض کا تعلق ہے وہ بھی حضرت عمرؓ سے متعلق تھے۔ آپ حضرت ابوبکرؓ کے مشیرِ خصوصی اور امورِ مملکت میں دست راست تھے اور اسی وجہ سے حضرت ابوبکرؓ ان کو اپنے ساتھ مدینہ میں ہی رکھتے تھے۔ کسی مہم پر نہیں بھیجتے تھے" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جیش اسامہؓ میں شرکت کیلئے جن کو نامزد کیا تھا ان میں حضرت عمرؓ بھی تھے۔ لیکن لشکر کی روانگی سے قبل حضرت ابوبکرؓ نے حضرت اسامہؓ سے درخواست کی کہ اگر وہ عمر فاروقؓ کو مدینہ ہی میں چھوڑ جائیں تو بہتر ہے

[1] الاصابہ ج ۳ ص ۵۶ ذکر عیینۃ بن حصن الفزاری۔ [2] کتاب الاموال ابوعبیدہ ص ۲۷۷

تاکہ وہ امورِ خلافت میں اُن کے مشوروں سے فائدہ اٹھا سکیں [1]

وزارتِ خزانہ | بیت المال کا قیام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ہی عمل میں آگیا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس کا اہتمام وانتظام حضرت ابوعبیدہ کے سپرد کیا جو بیت المال کی آمدنی اور خرچ کا پورا حساب رکھتے اور اس کی نگرانی کرتے تھے۔ چنانچہ خلیفۂ اوّل کی وفات کے بعد حضرت عمرؓ نے ابوعبیدہ سے پوچھا کہ شروع سے اُس وقت تک خزانہ میں مال کس قدر آیا ہوگا؟ انھوں نے جواب دیا "دو لاکھ دینار" [2]

عہدۂ کتابت | چونکہ اہم فرامین واحکام کاتب کو ہی لکھنے ہوتے ہیں اس لئے کتابت کا عہدہ بھی بڑا اہم ہے۔ حضرت ابوبکرؓ اس عہدہ کا کام وقتی طور پر اُن لوگوں سے بھی لے لیتے تھے جو ضرورت کے وقت ان کے پاس موجود ہوتے تھے۔ ان کے علاوہ جو حضرات خاص اسی کام پر متعین تھے وہ حضرت زید بن ثابتؓ اور حضرت عثمان بن عفانؓ ہیں۔ [3]

عمال کے نام احکام بھیجنے کا طریقہ | عمال کو حضرت ابوبکرؓ کوئی حکم بھیجتے تھے تو آپ کا طریقہ وہی ہوتا تھا جو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا۔ یعنی "من ابی بکر الی فلان" سے آغاز کرتے تھے۔ یہ طریقہ خلافت راشدہ کے بعد بنوامیہ کے ابتدائی دور تک قائم رہا۔ جب ولید بن عبدالملک خلیفہ ہوا تو اُس نے اس کو بدل دیا اور حکم دیا کہ لوگ ہم کو اس طرح خطاب کریں جس طرح وہ آپس میں ایک دوسرے سے خطاب کرتے ہیں۔ [4]

عہدۂ افتار | افتار یعنی شرعی حکم بتانے کے لئے تقویٰ وطہارت کے علاوہ تفقہ کی ضرورت ہے اور یہ محض ایک وہبی دولت ہے خدا جس کو چاہے بخش دے۔ ہر عالم دین اس سے بہرہ یاب نہیں ہوسکتا۔ حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں جو حضرات فقیہ سمجھے جاتے تھے اور اس بنا پر افتار کا عہدہ ان کے سپرد تھا اُن کے نام یہ ہیں:- حضرت علیؓ۔ معاذ بن جبلؓ۔ اُبَیّ بن کعبؓ۔ زید بن ثابتؓ

[1] تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۱۴۲ [2] طبقات ابن سعد قسم اول جلد دوم ص ۱۵۱ [3] طبری ج ۲ ص ۶۱۷

[4] العقد الفرید باب التوقیعات فصل استفتاح الکتب۔

اور عبداللہ بن مسعود سے[1]

پولیس | روزمرہ کے انتظام کیلئے غالباً مستقل پولیس کی شکل میں کوئی خاص جماعت نہیں تھی۔ اور حق یہ ہے کہ اُس زمانۂ خیر القرون میں اس کی ضرورت ہی کیا تھی؟ تاہم ضرورت پیش آتی تھی تو فوری طور پر چند بہادروں کو اس کام پر مامور کردیا جاتا تھا۔ چنانچہ جیش اسامہ کی مدینہ سے روانگی کے بعد بعض قبائل کیطرف سے مدینہ پر حملہ کا خطرہ ہوا تو حضرت علی اور بعض دوسرے صحابہ سے یہ کام لیا گیا۔

عمال کو ہدایات | حضرت ابوبکر جب کسی شخص کو کوئی ذمہ داری سونپتے یا کسی عہدہ پر اسکو مقرر فرماتے تو اس کے متعلقہ فرائض ایک ایک کرکے بیان کرتے اور اس سے عہد لیتے کہ وہ اس پر عمل کریگا۔ حضرت اسامہ کی قیادت میں آپنے جو لشکر عرب و شام کی سرحد پر روانہ کیا تھا جب وہ چلنے لگا تو آپ نے اُس کو روک کر دس ہدایتیں دیں۔ آپ نے فرمایا۔

ایھا الناس قفوا اوصیکم بعشر فاحفظوھا عنی ولا تخونوا ولا تغلوا ولا تغدروا ولا تمثلوا ولا تقتلوا طفلاً صغیراً ولا شیخاً کبیراً ولا امرأۃً ولا تعقروا نخلاً ولا تحرقوہ ولا تقطعوا شجرۃً مثمرۃً ولا تذبحوا شاۃً ولا بقرۃً ولا بعیراً الا لماکلۃ وسوف تمرون باقوام قد فرغوا انفسھم فی الصوامع فدعوھم وما فرغوا انفسھم لہٗ وسوف تقدمون علی قوم	لوگو! ذرا ٹھہرو میں تم کو دس باتوں کی وصیت کرتا ہوں تم ان کو یاد رکھو دیکھو خیانت نہ کرنا۔ فریب نہ کرنا۔ سرکشی نہ کرنا۔ دشمن کے ہاتھ پاؤں مت کاٹنا۔ چھوٹے بچے کو بوڑھے کو اور عورت کو قتل نہ کرنا۔ کھجور کے درخت کو نہ اکھاڑنا اور نہ اس کو جلانا۔ پھلدار درخت کو مت کاٹنا بکری گائے یا اونٹ کھانے کے سوا ذبح نہ کرنا۔ اور ہاں تم ایسے لوگوں سے دوچار ہوگے جنھوں نے اپنی زندگی عبادت خانوں کیلئے وقف کردی ہے تم ان لوگوں کو کچھ نہ کہنا اور اُن کو ان کے حال

[1] تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۱۵۰

يا توكم بآنية فيها الوان
الطعام فاذا اكلتم منها شيئاً
بعد شيئ فاذكروا اسم الله
عليها. وتلقون اقواماً قد فحصوا
اوساط رؤسهم وتركوا احولها
مثل العصائب فاخفقوهم بالسيف
خفقاً اندفعوا باسم الله . اقناكم الله
بالطعن والطاعون ـ له

پر چھوڑ دینا۔ اور تم کو ایسے لوگ بھی ملیں گے جو
تمہارے پاس الوانِ نعمت لیکر آئیں گے۔ تم
ان کھانوں میں سے یکے بعد دیگرے جب کچھ کھاؤ
تو اُن کھانوں پر اللہ کا نام لو۔ اور تم کو ایسے
لوگ بھی ملیں گے جن کے سر بیچ میں سے منڈے ہونگے۔
تم اُن کو تلوار سے کھٹکھٹانا۔ جاؤ اللہ کا نام
لیکر روانہ ہو۔ اللہ تعالیٰ تم کو دشمن کے نیزوں
سے اور طاعون سے بچائے۔

اسی طرح شام کی طرف لشکر روانہ کئے تو ایک لشکر کے قائد حضرت یزید بن ابی سفیان کو مفصل ہدایات دیں۔ یہ اگرچہ طویل ہیں لیکن آئین و دستور کی دنیا کا شاہکار ہیں اس لئے ہم ذیل میں تمامہا نقل کرتے ہیں۔ ارشاد ہوا۔

عليك بتقوى الله، فانه يرى من باطنك
مثل الذى من ظاهرك وان
اولى الناس بالله اشدهم توليا له
واقرب الناس من الله اشدهم تقربا
اليه بعمله، وقد وليتك عمل
خالد فاياك وعبية الجاهلية
فان الله يبغضها ويبغض اهلها
واذا قدمت على جندك
فاحسن صحبتهم وابدأهم
بالخير وعدهم اياه ـ

تم اللہ سے تقویٰ کو لازم پکڑو۔ کیونکہ وہ تمہارے
باطن کو تمہارے ظاہر کی طرح دیکھتا ہے اور اس
میں شک نہیں کہ اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ
بہتر آدمی وہی ہے جو سب سے زیادہ اللہ سے محبت
رکھتا ہے۔ اور اللہ کا سب سے زیادہ مقرب بندہ وہی
ہے جو اپنے عمل کے ذریعہ سب سے زیادہ اللہ سے
قریب ہے۔ میں نے تم کو خالد کا کام سپرد کیا ہے
اس لئے تم جاہلیت کی باتوں سے بچو۔ کیونکہ اللہ
ان باتوں کو اور ایسے لوگوں کو مبغوض رکھتا ہے
اور تم جب اپنے لشکر کے پاس پہونچو تو خوش خلقی

له طبری ج ۲ ص ۴۶۳

وإذا وعظتهم فأوجز۔ فإن
كثير الكلام ينسي بعضهُ بعضاً
وأصلح نفسك۔ يصلح لك الناس
وصلِّ الصلوات لأوقاتها
بإتمام ركوعها وسجودها
والتخشع فيها۔ وإذا قدم
عليك رسول عدوك فأكرمهم
وأقلل لبثهم۔ حتى يخرجوا
من عسكرك وهم جاهلون
به۔ ولا تريهم فيروا
خللك۔ ويعلموا علمك۔
وأنزلهم في ثروة عسكرك
وامنع من قبلك من محادثتهم وكن
أنت المتولي لكلامهم۔ ولا تجعل
سرّك لعلانيتك۔ فيخلط أمرك۔
وإذا استشرت فاصدق الحديث
تصدق المشورة ولا تخزن عن المشير
خبرك۔ فتؤتى من قبلِ نفسك واسمر
بالليل في أصحابك۔ تأتك الأخبار
وتنكشف عندك الأستار۔ وأكثر
حرسك۔ وبددهم في عسكرك

کے ساتھ پیش آؤ اور بھلائی کے ساتھ اپنے معاملہ کا
آغاز کرو اور اُن سے اس کا وعدہ بھی کرو اور جب تم
اُن کو نصیحت کرو تو اختصار سے کام لو۔ کیونکہ کثرتِ
کلام میں آدمی بھول جاتا ہے کہ اُس نے کیا کہا تھا۔
اپنے نفس کی اصلاح کرو۔ تو لوگ تمہارے لئے ٹھیک
رہیں گے اور نمازیں مع مکمل رکوع و سجود اور خشوع کے
اُن کے اوقات میں ادا کرو۔ جب دشمن کے قاصد تمہارے
پاس آئیں تو ان کا اکرام کرو۔ اور اُن کا قیام مختصر
رکھو تاکہ وہ تمہارے لشکر سے جائیں تو اُس سے باخبر
نہ ہوں اور ان کو اہلِ لشکر مت دکھاؤ ورنہ وہ تمہارا
خلل دیکھ لیں گے۔ اور تمہارے حال سے واقف ہو جائیں گے
ان قاصدوں کو لشکر کی اچھی جگہ میں ٹھہراؤ۔ اور اپنے
لوگوں کو اُن سے بات چیت کرنے سے منع کرو۔ تم خود
ہی اُن سے گفتگو کرو۔ اپنے بھید کسی پر نہ کھولو ورنہ
معاملہ گڑبڑ ہو جائیگا۔ بات سچ کہو تو مشورہ بھی سچ ہوگا
اور اپنی کوئی بات اپنے مشیر سے مت چھپاؤ۔ ورنہ بات
تمہارے ہی سر آپڑے گی۔ اور رات کو اپنے ساتھیوں
کے ساتھ بات چیت کیا کرو۔ تاکہ تم کو خبریں معلوم ہوں
اور پوشیدہ باتوں کا تم کو علم ہو۔ اپنے محافظین کی تعداد
زیادہ رکھو اور اپنے لشکر میں اُن کو پھیلا دو۔ اور بسا اوقات
اُن کی بے خبری میں اچانک اُن کی چوکیوں میں پہنچ جایا کرو۔

واکثر مفاجأتهم فی عمارتهم بغیر علم منهم بك فمن وجدته غفل عن محرسه فاحسن ادبه وعاقبه فی غیر افراط واعقب بینهم باللیل واجعل النوبة الاولی اطول من الآخرة فانها ایسرهما لقربها من النهار، ولا تخف من عقوبة المستحق، ولا تلجن فیها ولا تسرع الیها ولا تعقلها منها ولا تغفل عن اهل عسکرك فتفسده ولا تجسس علیهم فتفضحهم ولا تکشف الناس عن اسرارهم۔ واکتف بعلانیتهم، ولا تجالس العیابین وجالس اهل الصدق والوفاء، واصدق اللقاء ولا تجبن فیجبن الناس، واجتنب الغلول فانه یقرب الفقر، ویدفع النصر، وستجدون اقواما حبسوا انفسهم فی الصوامع - فدعهم وما حبسوا انفسهم له۔ [1]	پھر جس شخص کو تم اپنی چوکی سے غافل پاؤ اس کی اچھی طرح سرزنش کرو۔ اور بغیر زیادتی کے اس کو سزا دو۔ اور رات کو اُن کے درمیان باری مقرر کرو۔ اور پہلی باری کو بہ نسبت دوسری کے زیادہ طویل کرو کیونکہ دن سے قریب ہونے کے باعث یہ زیادہ آسان ہوگی۔ مستحقِ سزا کو سزا دینے میں نہ جھجکنا۔ سزا کے معاملہ میں نہ زیادہ تردد کرو اور نہ جلدی کرو۔ اور نہ اس کو بے اثر کرو اور ہاں اپنے اہلِ لشکر سے غافل مت بیٹھو۔ ورنہ تم اُس کو خراب کردو گے۔ اور زیادہ اُن کی کھوج کرید بھی نہ کرو ورنہ تم اُن کو رسوا کردو گے۔ لوگوں کے بھید معلوم کرنے کی کوشش نہ کرو۔ اور جو اُن کے ظاہر احوال ہوں اُن پر بس کرو۔ بے کار آدمیوں کے پاس نہ بیٹھو اہلِ صدق و وفا اور راست باز لوگوں کے ساتھ اٹھو بیٹھو اور جم کر لڑو اور بزدلی نہ دکھاؤ ورنہ لوگ بزدلی دکھائیں گے۔ خیانت سے بچو۔ کیوں کر خیانت فقر کا باعث ہوتی ہے اور مدد کو دور کردیتی ہے اور تم کو ایسے لوگ ملیں گے جو عبادت گاہوں میں گوشہ نشیں ہو کر بیٹھ گئے ہیں۔ تم اُن کو اُن کے حال پر چھوڑ دو۔

تقویٰ وطہارت کی عام تاکید یہ ہدایات وہ ہیں جو ہر شخص کو الگ الگ اُس کے عہدہ اور منصب کے اعتبار سے دی جاتی تھیں ان کے علاوہ تقویٰ وطہارت۔ خوفِ خدا۔ فرائض کی انجام دہی میں امانت ودیانت ان چیزوں کی تاکید وہدایت تو آپ ہر خطبہ میں، ہر فرمان اور خط میں، ہر مجلس

[1] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۰۰

اور محفل میں کرتے رہتے تھے۔

مثلاً عمرو بن العاص اور ولید بن عقبہ کو قبیلۂ بنو قضاعہ پر عاملِ صدقات مقرر کر کے روانہ کیا تو ان کی مشایعت کیلئے کچھ دور تک خود تشریف لائے اور رخصت ہوتے وقت ہر ایک کو یہ ہدایت کی۔

اتق اللہ فی السر والعلانیۃ	باطن وظاہر میں اللہ سے ڈرو۔ کیونکہ جو شخص اللہ سے
فانہ من یتق اللہ یجعل لہ	ڈرتا ہے۔ اللہ اُس کیلئے سہولتیں پیدا کر دیتا ہے اور
مخرجا ویرزقہ من حیث لا	جہاں سے اُس کا گمان بھی نہیں ہوتا وہاں سے اُس
یحتسب ومن یتق اللہ یکفر عنہ	کو رزق دیتا ہے۔ جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اس
سیاٰتہ ویعظم لہ اجراً	کے گناہ معاف کر دیتا ہے اور اُس کا اجر بڑھاتا ہے۔
فان تقوی اللہ خیر ما تواصی بہ	بے شبہ اللہ سے تقوی بندگانِ خدا کی آپس میں بہترین
عباد اللہ۔ انک فی سبیل من سبل اللہ	نصیحت ہے تم اللہ کے ایسے راستہ میں ہو جس میں افراط
لا یسعک فیہ الادھان والتفریط	وتفریط اور مداہنت کی گنجائش نہیں ہے جس میں دین
والغفلۃ عما فیہ قوام دینکم وعصمۃ	کا استحکام اور خلافت کی حفاظت کا راز مضمر ہے۔
امرکم، فلا تن ولا تفتر۔ [1]	پس تم سستی اور کاہلی مت اختیار کرو۔

یزید بن ابی سفیان کو ہدایات دیتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالہ سے لکھا۔

ومن اعطی احد احمی اللہ فقد	اور جو شخص کسی کو اللہ کی چراگاہ عطا کرے (کوئی عہدہ دے)
انتھک فی حمی اللہ شیئاً بغیر حقہ	اور وہ بغیر کسی حق کے اُس چراگاہ میں ارتکاب محرمات کرے
فعلیہ لعنۃ اللہ۔ [2]	(عہدہ میں خیانت کرے) تو اُس پر اللہ کی لعنت ہوگی۔

عمال و امراء سے احتساب | مفصل ہدایات اور احکام دینے کے بعد کوئی عہدہ دار خواہ کتنی ہی دور اور نظروں سے اوجھل ہوتا حضرت ابوبکر بہرحال اس کی ایک ایک حرکت پر کڑی نگاہ رکھتے تھے

[1] طبری ج ۲ ص ۵۸۸ [2] مسند امام احمد ج ۱ ص ۶

اور جہاں اور جب کوئی نقص نظر آتا فوراً اس پر متنبہ فرماتے یا باز پرس کرتے تھے۔ چنانچہ مہاجر بن ابی امیہ کی نسبت معلوم ہوا کہ انھوں نے ایک عورت جو مسلمانوں پر سب و شتم کرتی تھی اُس کے دانت اُکھڑوا دئے ہیں۔ تو فوراً اُن کو سخت سرزنش کا خط لکھا جس میں دلائل سے یہ ثابت کیا تھا کہ اُن کا یہ عمل صریح ظلم اور ناجائز ہے اور آخر میں تحریر کیا کہ چونکہ یہ تمہارا پہلا جرم ہے اس لئے معاف کرتا ہوں۔ ورنہ سزا دیتا۔ [۱]

حضرت ابوبکر حضرت خالد کے کس درجہ قدرداں اور مداح تھے؟ یہ صفحاتِ گزشتہ سے معلوم ہو چکا ہے۔ بایں ہمہ جنگِ یمامہ کے فوراً بعد ہی انھوں نے مجاعۃ کی لڑکی سے نکاح کر لیا تو حضرت ابوبکر نے اُن کو سخت تہدیدی خط لکھا کہ

لعمری یا ابن ام خالد انک	بے شبہ اے خالد کی ماں کے بیٹے! تیرا
لفارغ تنکح النساء وبفناء بیتک	دل بڑا بے رحم ہے تو عورتوں سے نکاح اُس
دم الف ومائتے رجل من المسلمین	وقت کر رہا ہے جب کہ تیرے گھر کے صحن میں بارہ سو
لم یجفف بعد [۲]	مسلمانوں کا خون ابھی تک خشک نہیں ہوا ہے۔

طبری کا بیان ہے یہ خط اس درجہ غضب آلود تھا کہ گویا اس سے خون ٹپک رہا تھا۔

اس کے بعد عراق میں جنگِ فراض کے ختم ہوتے ہی حضرت خالد حضرت ابوبکر کی اجازت کے بغیر چھپ چھپا کر حج کر آئے تھے۔ حضرت ابوبکر کو اطلاع ہوئی تو سخت عتاب کا خط لکھا۔ طبری کا بیان ہے کہ حضرت ابوبکر نے حضرت خالد کو شام کی مہم پر جو روانہ کیا تھا وہ حضرت خالد کے اسی جرم کی پاداش میں تھا اور ساتھ ہی تاکید کی کہ آئندہ وہ اس کا ارتکاب نہ کریں۔ [۳]

معمولی غلطیوں سے اغماض | ایک فرماں روا کیلئے جہاں یہ ضروری ہے کہ عمال و کارکنانِ حکومت کی ایک ایک حرکت پر نظر رکھے اور جب اُن سے کوئی غلطی ہو تو احتساب کرے۔ ساتھ ہی اُس میں اس درجہ تحمل ہونا چاہیئے کہ معمولی بھول چوک سے چشم پوشی کرے اور اگر ضرورت

---

[۱] طبری ج ۲ ص ۵۵۰ [۲] طبری ج ۲ ص ۵۱۹ [۳] ایضاً ص ۵۰۴

ہو تو تھوڑی بہت تنبیہ کر دے۔ معمولی معمولی باتوں پر سرزنش کرنا اصول حکمرانی کیخلاف ہے
حضرت ابوبکر میں احتساب کی قوت کے ساتھ یہ وصف بھی بدرجۂ اتم تھا۔ طبری میں ہے۔

وکان ابوبکر لا یقید من عمالہ ولا وزعتہ [1] | ابوبکر اپنے عمال اور کارپردازان حکومت پر زیادہ داروگیر اور خردہ گیری نہیں کرتے تھے۔

عمال کی تنخواہ | عمال وکارپردازان حکومت کی تنخواہ کا رواج آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے ہی شروع ہوگیا تھا۔ تنخواہ کی مقدار کی تعیین میں عہدہ کی حیثیت اور اس کے ضروری اخراجات ولوازم کی رعایت بھی ہوتی تھی مثلاً گھوڑا۔ ہتھیار۔ خادم وغیرہ۔ حضرت علی فرمایا کرتے تھے: "ہم میں سے جو کوئی شخص بھی والی ہو" اگر اس کے بیوی نہ ہو تو بیوی کرے۔ نوکر نہ ہو تو نوکر رکھے۔ گھر نہ ہو تو گھر بنائے یا کرایہ پر لے۔ سواری کا جانور نہ ہو تو وہ لے۔ اس سے زیادہ جو لے گا وہ یا خائن ہے یا چور [2]

گورنر یا کوئی اور عہدہ دار تو الگ رہا۔ خود خلیفہ کے متعلق حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت ہے کہ اللہ کے مال میں سے خلیفہ کیلئے صرف دو پیالے لینا جائز ہیں۔ ایک پیالہ اہل وعیال کیلئے اور دوسرا لوگوں کی خاطر مدارات کیلئے۔ [3]

عتاب بن اسید جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں مکہ کے عامل تھے اور عہد صدیقی میں بھی اسی عہدہ پر فائز رہے۔ اُن کو تیس درہم ماہانہ تنخواہ ملتی تھی [4] ظاہر ہے یہ قلیل تنخواہ ناگزیر ضروریات زندگی کی ہی کفیل ہو سکتی تھی اُس میں اتنی گنجائش کہاں تھی کہ وہ پس انداز کر سکیں چنانچہ اس منصب سے سبکدوش ہونے کے بعد اس زمانہ کی کمائی کی یادگار جو چیز اُن کے پاس بچی تھی وہ صرف دو کپڑے تھے جو انھوں نے اپنے غلام کیسان کو پہنا دیئے تھے۔ [5]

---

[1] طبری ج ۲ ص ۵۰۳ [2] کنز العمال برحاشیۂ مسند امام احمد بن حنبل ج ۲ ص ۱۴۲۔
[3] کنز العمال برحاشیہ مسند احمد ج ۲ ص ۱۴۲ [4] التراتیب الاداریہ للکتانی ج ۱ ص ۲۶۴۔
[5] الاصابہ ج ۲ ص ۴۴۴ تذکرۂ عتاب بن اسید۔

حضرت ابو بکرؓ کے عہد میں بہ نسبت عہدِ نبویؐ کے ریاستی آمدنی بڑھ گئی تھی۔ اس بنا پر تنخواہوں کی مقدار میں بھی اضافہ ہوا ہوگا۔ بہرحال حضرت ابو بکرؓ کا اصول یہ تھا کہ تنخواہیں (اصل ضروریاتِ زندگی کے لحاظ سے) سب کی برابر رکھتے تھے۔ مؤرخ یعقوبی کا بیان ہے۔

وقسم ابو بکر بین الناس بالسویة	اور ابو بکر لوگوں میں برابر سرابر تقسیم کرتے تھے کسی کو
لم یفضل احداً علی احد[۱]	کسی پر ترجیح نہیں دیتے تھے۔

ایک مرتبہ مال آیا اور آپ نے اس کو حسب معمول برابر برابر تقسیم کر دیا اور فرمایا۔ مجھ کو یہ پسند ہے کہ میں بقدرِ ضرورت لینے پر اکتفا کروں۔ اور میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو جہاد کیا ہے وہ خالص اللہ کے لئے رہے۔[۲]

حضرت ابو بکرؓ کی تنخواہ حضرت ابو بکرؓ شروع میں تو کوئی تنخواہ لیتے ہی نہیں تھے۔ شروع میں جو تجارت اُن کا ذریعۂ معاش تھی اسی پر گذر بسر کرتے تھے۔ لیکن جب امورِ خلافت میں انہماک بڑھا تو اب چونکہ تجارت میں مشغولیت فرائضِ خلافت کی بجا آوری میں رخنہ انداز ہو سکتی تھی اس لئے حضرت عمرؓ اور دوسرے صحابہ کے کہنے پر آپ نے بقدرِ ضرورت اپنی تنخواہ بھی مقرر کرلی لیکن اس تنخواہ کی مقدار کیا تھی؟ اس میں مختلف روایات ہیں۔

یعقوبی کا بیان ہے کہ آپ تین درہم یومیہ لیتے تھے۔[۳] بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ چھ ہزار درہم سالانہ لیتے تھے اور ایک روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے کل مدتِ خلافت میں بیت المال سے اپنے گھر کے خرچ کے لئے صرف چھ ہزار درہم لئے تھے لیکن وفات کے وقت اپنی بیٹی حضرت عائشہؓ کو وصیت کی کہ یہ رقم بھی اُن کی جائیداد کو فروخت کر کے بیت المال میں جمع کر دی جائے۔[۴]

---

[۱] الاصابہ ج ۲ ص ۱۵۴
[۲] کتاب الاموال ص ۲۶۲
[۳] یعقوبی ج ۲ ص ۱۵۴
[۴] کتاب الاموال ص ۲۶۷

اس بنا پر ہمارا خیال ہے کہ شروع میں حضرت ابوبکرؓ نے صحابہ کے کہنے ۔سننے سے اپنا وظیفہ مقرر ضرور کر لیا تھا لیکن اُس کی پابندی نہیں کرتے تھے ۔ زندگی بہ ن سادہ اور گھر کی ضرورتیں مختصر تھیں ۔ اس لئے صرف بقدر ضرورت لیتے تھے او ر کبھی گنجائش دیکھی اور کوئی غیر معمولی ضرورت اچانک پیش آگئی تو مقررہ رقم ز ا ئ بھی لے لیتے تھے اور یہ جو کچھ کرتے تھے اہلِ شوریٰ کے مشورہ اور اُن کی اجازت سے کرتے تھے ۔

غور کرو! کیا اس سے بڑھ کر جمہوری سوشلسٹ گورنمنٹ دنیا کی تاریخ میں کوئی اور بھی ہوئی ہے ۔

مالی نظام

ریاست کے ذرائع آمدنی اور مصارف

حضرت ابو بکرؓ کا مختصر عہدِ خلافت جو کچھ بھی تھا تمام تر جزیرۃ العرب کے اندرونی استحکام۔ قومی وحدت اور بیرونی حملوں سے اُس کی حفاظت کے کاموں میں مصروف رہا اس لئے آپکو اتنی فرصت نہیں ملی کہ حضرت عمر فاروقؓ کی طرح حکومت کے مختلف کاموں کو مختلف شعبوں میں تقسیم کر کے ہر ایک شعبہ کیلئے جدا جدا محکمہ قائم کرتے ہر محکمہ کے الگ الگ عہدہ دار مقرر فرماتے اور اُس کیلئے آئین وضابطہ کی حدبندی کرتے۔ اس بنا پر عہدِ صدیقی کے نظم ونسق اور معاملات ومسائلِ حکومت وریاست میں وہی سادگی پائی جاتی ہے جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں پائی جاتی تھی۔ اس بنا پر حضرت ابو بکرؓ کے مالی انتظامات کو سمجھنے کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ خود عہدِ نبوت میں مالی نظام کیسا تھا۔

عہدِ نبوت میں نظامِ مالی دوسرے احکام کی طرح انفاقِ مال سے متعلق احکام بھی دفعۃً نازل نہیں ہوئے۔ بلکہ تدریجی طور پر حسب موقع وضرورت نازل ہوئے یا زبانِ حق ترجمان نبوت سے ادا ہوتے رہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلی منزل تو ترغیب ودعوت کی تھی یعنی اس وقت تک زکوٰۃ فرض نہیں ہوئی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکّہ میں قیام رکھتے تھے اور مختلف ضرورتوں کیلئے روپیہ درکار تھا۔ چنانچہ آپ نے فرمایا " اپنے آپ کو دوزخ سے بچانے کیلئے تم کو خرچ کرنا چاہیئے خواہ وہ کھجور کا ایک ٹکڑا ہی ہو" [۱] اس کے علاوہ قرآن میں بھی بہت سی ترغیبات ہیں۔

[۱] سیرت ابن ہشام ص ۳۴۰

اس کے بعد جب آپ نے ہجرت کی اور صحابۂ کرام اپنا گھر بار چھوڑ چھوڑ کر مدینہ آنے لگے تو اب سب سے بڑا مسئلہ ان مہاجرین کی آبادکاری کا تھا اور ظاہر ہے روپیہ کے بغیر یہ حل ہو نہیں سکتا تھا۔ آپ نے اس پیچیدہ ترین گتھی کو اس خوبی کیساتھ حل کیا کہ تاریخ میں اسکی نظیر مشکل سے ہی مل سکتی ہے۔ آپ نے انصار اور مہاجرین میں مواخات کرادی۔ اس مواخات میں یہ شرط تھی کہ مہاجر اور انصاری دونوں ایک ساتھ مل کر کام کرینگے۔ کسب معاش کریں گے۔ اور وراثت تک میں ایک دوسرے کے شریک رہیں گے۔ اس طرح مہاجرین کی آبادکاری کا مسئلہ تو حل ہو گیا لیکن دوسرے کاموں کیلئے روپیہ کی بھی ضرورت تھی اس لئے اب صدقات وخیرات کے کارِ خیر ہونے کا اعلان ہوا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا نظم قائم کیا کہ تمام صدقات وخیرات خود وصول فرماتے اور اربابِ حوائج پر تقسیم کر دیتے تھے لیکن یہ خیر خیرات خود آپ کے اور آپ کے خاندان بنو ہاشم کیلئے حرام تھی۔ اس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام بدعنوانیوں کا خاتمہ کر دیا جو عام طور پر پبلک فنڈ جمع کرنیوالوں سے صادر ہوتی ہیں۔ بلکہ دنیا کی عظیم الشان بادشاہتوں کا تو تخیل ہی یہ رہا ہے کہ پبلک کا جو روپیہ خزانہ شاہی میں آتا ہے وہ بادشاہ کی ملک ہے اور اسکو حق ہے کہ اس روپیہ کو اپنی ذات اور اپنے متعلقین پر جس طرح چاہے خرچ کرے۔ "ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا"

اس سلسلہ میں سب سے پہلے ۲ھ میں صدقۃ الفطر واجب ہوا۔ اس کے بعد صدقہ وخیرات کا عام حکم نازل ہوا۔ لوگوں نے پوچھا حضور! ہم کیا خرچ کریں؟" ارشاد ہوا ضروریاتِ زندگی پوری کرنے سے جو کچھ بچ رہے" یَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ ۝ قُلِ الْعَفْوَ۔ پھر جب مسلمانوں کو فتوحات نصیب ہوئیں زمینیں اور جاگیریں ہاتھ آئیں اور تجارتی کاروبار کو فروغ ہوا تو اب حکم ہوا۔

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا کَسَبْتُمْ وَمِمَّاۤ اَخْرَجْنَا لَکُمْ مِّنَ الْاَرْضِ۔ (بقرہ)

اے ایمان والو! جو اچھی چیزیں کہ تم کماؤ اور جن کو ہم نے تمہارے لئے زمین سے پیدا کیا ہو اُس میں سے خرچ کرو۔

لیکن اس وقت تک چونکہ تمام عرب مطیع نہیں ہوا تھا۔ اسلام صرف ایک تحریک کی صورت میں تھا اور باقاعدہ کوئی ریاست (STATE) قائم نہیں ہوئی تھی اس لئے انفاق مال اور اُسکے جمع وخرچ کا کوئی باقاعدہ

نظم قائم نہیں ہوا۔ ۸ھ میں مکہ کی فتح کے بعد آخر اس کا بھی وقت آگیا اور اس کا پورا انتظام قائم کردیا گیا۔ اس سلسلہ میں پہلے یہ آیت نازل ہوئی۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً — اے محمد! آپ اُن لوگوں کے مالوں میں سے صدقہ (زکوٰۃ)

تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا۔ — وصول کیجئے تاکہ انکو آپ اس ذریعہ سے پاک وصاف بنادیں

اس کے بعد ۹ھ کے آخر میں سورۂ توبہ کی وہ آیات نازل ہوئیں جن میں زکوٰۃ کے احکام۔ اُس کی اہمیت وضرورت۔ اور اُس کے مصارف اور ساتھ ہی جزیہ کا حکم۔ یہ سب کچھ نازل ہوا۔ انکی روشنی میں ۹ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے باقاعدہ عمال وتحصیلین کا تقرر فرمایا زکوٰۃ کے احکام وقوانین مرتب فرمائے اوران احکام کیساتھ عمال کو زکوٰۃ وصول کرنیکی غرض سے مختلف علاقوں اور قبیلوں میں روانہ کیا۔ یہ وہ وقت ہے جب کہ زکوٰۃ کی حیثیت ایک ریاستی ٹیکس (STATE DUTY) کی ہو جاتی ہے چنانچہ اس سلسلہ میں بیت المال کا قیام بھی عمل میں آیا۔

زکوٰۃ کی شرح | دولت کے سرچشمے دراصل تین ہی ہیں۔ سونا چاندی۔ جانور اور زمین کی پیداوار۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں سے ہر ایک کی شرحیں الگ الگ مقرر فرمائیں۔ سونے چاندی میں ۱/۴۰ حصہ۔ جانوروں کی زکوٰۃ کی شرح انکی مختلف صنفوں کے لحاظ سے جدا جدا متعین ہوئی اور بڑی تفصیل کیساتھ مثلاً اونٹ کیلئے نصاب زکوٰۃ پانچ مقرر کیا گیا۔ اس سے کم پر زکوٰۃ نہیں ہے۔ پانچ اونٹ ہوں تو ایک بکری تو اونٹوں تک دس سے چودہ تک دو بکری۔ پندرہ سے اُنیس تک تین بکریاں بیس سے چوبیس تک چار بکریاں پچیس سے پینتیس تک اُونٹ کا ایک سال کا بچہ چھتیس سے پینتالیس تک دو سال کا بچہ۔ چھیالیس سے ساٹھ تک تین سال کا اکسٹھ سے پچھتر تک چار سال کا اُونٹ۔ چھہتر سے نوّے تک دو برس کے دو بچے۔ اکیانوے سے ایک سو بیس تک تین سال کے دو بچے۔ ایک سو بیس کے بعد ہر چالیس پر دو سال کا بچہ اور پھر ہر پچاس پر تین برس کا بچہ۔ اسی طرح کے مفصل احکام بکری گائے اور بھینس وغیرہ کے بھی متعلق ہیں۔

یہ تمام شرحیں وہ ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک فرمانِ خصوصی میں درج فرمادی تھیں

لیکن ابھی اُن کو عمال کے ہاتھ روانہ نہیں کیا گیا تھا کہ دنیا سے تشریف لے گئے۔ آپ کے بعد حضرت ابوبکر نے اس پر عمل فرمایا اور اس کی نقول عمالِ صدقات کے پاس روانہ کیں۔ عبداللہ بن انس سے روایت ہے کہ حضرت ابوبکر نے اُن کے والد انس کو عاملِ صدقہ (مصدق) بنا کر روانہ کیا تو انہیں ایک تحریر عنایت فرمائی جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مہر لگی ہوئی تھی حضرت انس نے اُسے کھول کر دیکھا تو اس میں جانوروں کی زکوٰۃ کے متعلق مفصل احکام و ہدایات تھے[۱]

زمین پر محصول | زمین اگر مسلمان کی ملوکہ ہے تو وہ دو قسم کی ہو سکتی ہے۔ ایک وہ جس کے جوتنے اور بونے میں نہر و نکے ذریع آبپاشی یا موسمی خصوصیات کے باعث کاشتکار کو محنت نسبتہً کم کرنی ہوتی ہو اور دوسری وہ جسکی آبیاری کے لئے کاشتکار کو کنوئیں سے پانی نکالنا ہوتا ہے اور اس لئے اسکو مشقت زیادہ اٹھانی پڑتی ہے۔ پہلی قسم کی زمین پر عُشر یعنی پیداوار کا $\frac{1}{10}$ حصہ دینا ہوگا خواہ وہ رُوپیہ کی شکل میں ہو یا جنس کی صورت میں، دوسری قسم کی زمین کا محصول عُشر کا آدھا یعنی $\frac{1}{20}$ ہے۔

لگان اجارہ | حکومت کی آمدنی کا ایک اور ذریعہ لگان اجارہ یا ٹھیکہ بھی تھا۔ اس کی صورت یہ تھی کہ زمین کا کوئی ٹکڑہ کسی کاروبار کیلئے ایک شخص کو دیدیا جاتا تھا اور شرط یہ ہوتی تھی کہ وہ اس کاروبار کے منافع میں سے ایک متعین رقم بیت المال میں داخل کریگا۔ چنانچہ بنو متعان کا ایک شخص جس کا نام ہلال تھا اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ ایک وادی جس کا نام سلبہ تھا اسکے لئے مخصوص کر دیجائے تاکہ وہ اُس میں شہد کی مکھیوں کی پرورش کر سکے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شرط پر کہ وہ شہد جو کچھ پیدا ہوگا اُس کا عشر بیت المال میں جمع کریگا اُس کی درخواست منظور فرمائی۔ حضرت عمر کے دورِ خلافت میں طائف کے گورنر سفیان بن وہب نے خلیفۂ دوم سے ایک مرتبہ اسکی بابت دریافت کیا تو آپ نے فرمایا "اگر یہ شخص شہد کا عشر اب بھی اسی طرح ادا کرے جس طرح وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ادا کرتا تھا تو یہ وادی اُس کیلئے مخصوص رہنے دو۔ ورنہ اس وادی کی مکھیاں جنگل کی دوسری مکھیوں کی طرح ہیں جو شخص چاہے اُن کا شہد کھا سکتا ہے[۲]۔

خراج | آمدنی کا ایک بڑا ذریعہ جو اسلامی فتوحات کے نتیجہ میں پیدا ہوا خراج بھی تھا۔ خراج مال یا زمین

[۱] سنن ابی داؤد مطبوعۂ مصر کتاب الزکوٰۃ ج ۱ ص ۲۴۵ [۲] ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ ص ۲۵۳-

کی پیداوار کی اُس مقدار معین کو کہتے ہیں جو مفتوحین کی زمین پر بطور محصول مقرر کر دی گئی ہو۔ چنانچہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر فتح کیا تو ان لوگوں نے کہا کہ ہم ان زمینوں کے مالک ہیں اور اُن کو جوتنا اور بونا ہم تم سے زیادہ جانتے ہیں اس لئے ہمارے ساتھ بٹائی پر معاملہ کرلو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی یہ درخواست منظور کرلی اور نصفا نصفی پر معاملہ ہو گیا فدک کے لوگوں کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے بھی ایسا ہی معاملہ کرنا چاہا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی درخواست بھی قبول کرلی۔[1]

حضرت ابوبکر نے بھی اپنے دورِ خلافت میں ان لوگوں کے ساتھ یہی معاملہ مقاسمت یعنی بٹائی کا رکھا۔[2] لیکن حضرت ابوبکر کے عہد میں عراق اور شام کے جو حصے فتح ہوئے تھے۔ آپ نے ان پر سرسری طور پر کچھ رقم متعین کر دی تھی اس سے یہ ثابت ہوا کہ امام کو اختیارِ کلی ہے وہ اگر چاہے تو مفتوحہ زمین پر بٹائی کا معاملہ کر سکتا ہے اور اگر چاہے تو ایک خاص رقم مقرر کردے۔ بہرحال یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ حکم اُسی وقت ہے جبکہ زمین بزور شمشیر فتح کی گئی ہو اور امام نے اس کو مسلمانوں کے درمیان تقسیم نہ کیا ہو۔

جزیہ یہ ٹیکس بھی غیر مسلموں سے وصول کیا جاتا تھا لیکن اس میں اور خراج میں فرق یہ ہے کہ خراج کیلئے کوئی قرآنی نص نہیں ہے بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور آپ کے عمل سے ثابت ہے۔ اس کے برخلاف جزیہ کا ذکر خود قرآن میں ہے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ خراج زمین کا ٹیکس ہے۔ بعد میں اگر مالک زمین مسلمان بھی ہو جائے تو زمین خراجی ہی رہتی ہے لیکن جزیہ فرد کا ٹیکس ہے اور اس حیثیت سے وہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ مسلمان پر زکوٰۃ۔ اگر یہ شخص مسلمان ہو جائے تو جزیہ اُس سے ساقط ہو جائے گا۔

اگرچہ حضرت عمر نے اپنے عہدِ خلافت میں جزیہ کی شرح متعین کر دی تھی۔ لیکن عہد نبوی اور اُس کے بعد عہد صدیقی میں اس کی کوئی شرح مقرر نہیں تھی۔ بلکہ سہولت کے ساتھ جو شخص جتنا

---

[1] کتاب الخراج قاضی ابو یوسف ص ۵۰ و ۵۱ [2] کتاب الخراج ص ۵۰

دے سکتا تھا اس سے اتنا ہی لیا جاتا تھا۔ چنانچہ حضرت عبد اللہ بن عباس سے منقول ہے۔

لیس فی اموال اھل الذمۃ الا العفو[1]
اہل ذمّہ کے مالوں میں سے اتنا ہی لیا جائیگا جو ان کی ضرورتوں سے زائد ہو۔

اہل یمن تجارت پیشہ ہونیکے باعث مالدار اور خوش حال تھے اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر فی کس ایک دینار جزیہ مقرر کیا تھا۔[2] نجران اور بحرین کے لوگوں کو آپ نے جو مکتوبِ گرامی ارسال فرمایا تھا اس میں بھی اس کی تصریح تھی کہ اگر اسلام قبول نہیں کیا تو انھیں جزیہ دینا ہوگا۔ حضرت ابوبکر صدیق کے عہد میں حیرہ صلحاً فتح ہوا تھا اس لئے خراج کا تو سوال ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ البتہ حضرت خالد نے ان لوگوں سے فی کس دس درہم کے حساب سے جزیہ وصول کیا اور اس کو مدینہ روانہ کیا۔[3]

فے اور غنیمت آمدنی کا ایک ذریعہ فے اور غنیمت بھی تھا۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ فے اس مال کو کہتے تھے جو فریق محارب سے بغیر جدال و قتال کے حاصل ہوتا تھا۔ اور بحالتِ جنگ جو مال ملتا تھا وہ غنیمت کہلاتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں اس کی تقسیم اس طرح ہوتی تھی کہ اس کو پانچ حصوں پر تقسیم کیا جاتا تھا۔ چار حصے مجاہدین پر تقسیم ہو جاتے تھے اور ایک حصہ کو پھر پانچ حصوں پر تقسیم کر کے اس طرح بانٹ دیا جاتا تھا کہ ایک حصہ اللہ اور اس کے رسول کا۔ دوسرا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذوی القربیٰ کا تیسرا یتیموں۔ چوتھا مسکینوں اور پانچواں مسافروں کا عہدِ نبوی میں اسی پر عمل ہوتا تھا۔

جاگیر بخشی عہدِ نبوت میں جاگیر بخشی کا رواج تھا اُس کی صورت یہ ہوتی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی شخص کو زمین کا ایک ٹکڑہ اس شرط پر عطا فرما دیتے تھے کہ وہ اُس کو جوت بو کر آباد کرے گا اور اُس کی آمدنی کا ایک حصہ بیت المال میں داخل کرے گا۔[4] ایک مرتبہ آپ نے قبیلہ مزینہ

---

[1] کتاب الخراج قاضی ابو یوسف ص ۱۲۳ [2] کتاب الاموال ابو عبیدہ ص ۲۷ [3] کتاب الاموال ص ۲۷
[4] کتاب الاموال ابو عبیدہ ص ۲۷۲ -

کے چند لوگوں کو ایک زمین عطا فرمائی۔ لیکن ان لوگوں نے اس کو جوتنے بونے کی زحمت گوارا نہ کی۔ کچھ دوسرے لوگوں نے اس میں کاشتکاری کر لی۔ اب مزینہ والوں نے اس زمین کو پھر واپس لینا چاہا۔ معاملہ حضرت عمر فاروق کے سامنے پیش ہوا۔ آپ نے فیصلہ دیا کہ جو شخص تین برس تک زمین کو یونہی ڈالے رکھے اور پھر کوئی دوسرا شخص اُس کو آباد کر دے تو یہ دُوسرا ہی زمین کا زیادہ حقدار ہوگا[1]

حضرت ابو بکر نے بھی اس طریقہ کو اسی طرح قائم رکھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یمامہ کے مجاعہ نامی ایک شخص کو اس کی درخواست پر اپنے ایک فرمانِ خصوصی کیساتھ یمامہ کی کچھ زمینیں عطا فرمائی تھیں اور فرمان میں یہ بھی لکھا تھا کہ "اگر تم سے کوئی شخص جھگڑا کرے تو میرے پاس آنا" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مجاعہ بن مرارہ حضرت ابو بکر کی خدمت میں حاضر ہوا اور مزید ایک زمین کی درخواست کی تو حضرت ابو بکر نے ایک زمین جسکا نام خضرامہ تھا اس کو عطا فرما دی[2]

ایک مرتبہ آپ نے طلحہ بن عبداللہ کو ایک جاگیر عطا فرما دی اور اُس کیلئے ایک تحریر بھی لکھدی طلحہ یہ تحریر لیکر حضرت عمر کے پاس آئے اور کہا کہ آپ اس پر مہر لگا دیجئے۔ حضرت عمر نے انکار کیا اور بولے کہ "کیا اور لوگوں کو چھوڑ کر یہ ساری زمین تم کو ہی ملے گی ؟" طلحہ کو یہ سنکر غصہ آگیا۔ اسی حالت میں حضرت ابو بکر کے پاس واپس لوٹے اور کہا بخدا میں نہیں جانتا کہ خلیفہ آپ ہیں یا عمر؟ حضرت ابو بکر نے فرمایا "نہیں عمر ہی خلیفہ ہیں، لیکن انھوں نے اس کو قبول نہیں کیا"[3]

لیکن اس موقع پر یہ بات خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ عہدِ نبوت میں اور اُس کے بعد عہدِ خلفاء میں بھی جو زمین یا جاگیریں کسی کو دیجاتی تھیں وہ اُس کی اپنی ذاتی ملکیت نہیں ہوتی تھیں بلکہ مقصد صرف یہ ہوتا تھا کہ اُن زمینوں کو جوت بو کر کارآمد بنایا جائے اور اُن سے وہ شخص اور اسکے متعلقین فائدہ اُٹھائیں اور دُوسروں کو بھی فائدہ پہونچے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص اُن زمینوں کو بیکار

---

[1] الخطط جلد ۱ ص ۸۲، اس کے علاوہ الاحکام السلطانیہ للماوردی میں از صفحہ ۱۸۱ تا صفحہ ۱۸۵ ایسی زمینوں کا ذکر تفصیل کیساتھ مذکور ہے۔ [2] کتاب الاموال ابو عبید ص ۲۸۱ [3] کتاب الاموال ابو عبید ص ۲۷۶

چھوڑ دیتا تھا تو وہ اُس سے واپس لے لی جاتی تھیں اور کسی اور کو دیدی جاتی تھیں، جاگیر اور زمین چونکہ کسی کی ملکیت نہیں ہوتی تھی اس بنا پر ہر خلیفہ کے عہد میں پٹہ کی تجدید کی ضرورت بھی ہوتی تھی چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تمیم بن اوس الداری کو جیرون اور بیت عینون نام کے دو قریے عنایت فرمائے تھے اور ایک فرمان کے ذریعہ اس کا اعلان بھی کر دیا تھا۔ جب آپ کی وفات ہو گئی تو حضرت ابوبکر کے عہد میں پھر اس کی تجدید ہوئی اور آپ نے بھی قریب قریب اُسی مضمون کا ایک فرمان صادر کیا" [1]

معادن پر ٹیکس | عہدِ نبوت میں یہ تو ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معادن بعض لوگوں کو دیئے ہیں مثلاً بلال بن المزنی کو قبلیہ (ساحل سمندر پر مدینہ سے پانچ دن کی مسافت پر ایک علاقہ کا نام ہے) کے معادن عنایت فرمائے۔ اسی طرح صحیح حدیث میں حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ رکاز (مدفون خزانہ یا معدن) پر ایک خمس واجب ہے لیکن یہ ٹیکس خود آپؐ نے وصول کیا ہو اس کا پتہ نہیں چلتا۔ البتہ ابن سعد کا بیان ہے کہ بنو سلیم کی معدن حضرت ابوبکر کے عہد میں فتح ہوئی تو اُس کی آمدنی بیت المال میں داخل کی گئی۔ اسی طرح حضرت ابوبکر کے پاس قبلیہ اور جھینہ کی معدنوں سے بھی کثیر مال آتا تھا۔ [2]

بعض اور آمدنیاں | مذکورۂ بالا ذرائع کے علاوہ آمدنی کے دوسرے ذرائع اور بھی تھے مثلاً کوئی شخص اگر لاوارث ہوتا تھا یا اس کا وارث تو ہوتا تھا لیکن غلامی یا وجوبِ قتل وغیرہ کوئی چیز اس کے لئے مانعِ وراثت ہوتی تھی تو متوفی کی پوری املاک وجائیداد حکومت کے قبضہ میں چلی جاتی تھی۔ اسکے علاوہ تجارتی اموال وبضائع پر بھی ٹیکس لگتا تھا اور اُس سے حکومت کو آمدنی ہوتی تھی۔

حضرت عمر فاروق کے عہدِ خلافت میں آمدنی کے بعض نئے ذرائع پیدا ہوئے جو عہدِ نبوت اور عہدِ صدیقی میں نہیں تھے۔ مثلاً اسلامی مملکت میں باہر کے ملکوں کا جو مال آتا تھا اُس پر محصولِ درآمد [3] (IMPORT DUTY) کی وصول یابی عہدِ فاروقی کا کارنامہ ہے لیکن حق یہ ہے کہ رحمتِ عالمؐ کی

---

[1] کتاب الاموال ابوعبید حاشیہ ص ۲۷۵ [2] طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۱۵۱ [3] فقہا کی اصطلاح میں اس کو عشور کہتے ہیں۔

شان اسی کی مقتضی تھی کہ بین المملکتی تجارت کو آزاد رکھا جائے اور اُس پر کوئی پابندی عائد نہ کی جائے اور چونکہ عہدِ صدیقی درحقیقت عہدِ نبوت کا ہی آئینہ تھا اس لئے جو چیز آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار نہیں کی حضرت ابوبکرؓ اسے کیوں کر مروج کر سکتے تھے۔ اور حضرت عمرؓ نے اپنے یہاں اس کو رائج کیا بھی تو اس مجبوری سے کہ دُوسرے ممالک کی حکومتیں مسلمان تاجروں سے یہ ٹیکس وصول کرتی تھیں۔

البتہ ہاں سمندروں سے جو منافع حاصل ہوتا تھا حضرت عمرؓ نے اس پر بھی ٹیکس لگایا لیکن عہدِ نبوت اور عہدِ صدیقی میں اس کا پتہ نہیں چلتا اس کی وجہ یہ ہے کہ اُس وقت تک مسلمانوں کا قبضہ سمندروں پر نہیں ہوا تھا۔

یہ وہ ریاستی آمدنی کے ذرائع تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے عہد میں پائے جاتے تھے حضرت ابوبکرؓ نے ان کو جُوں کا تُوں باقی رکھا اور اس میں جہاں کہیں کوئی رخنہ پڑتا نظر آیا اس کو پُوری قوت کے ساتھ روکا اور بند کیا۔

زکوٰۃ کی حیثیت اسٹیٹ ڈیوٹی کی ہے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد منکرینِ زکوٰۃ کا جو فتنہ اُٹھا تھا اور حضرت ابوبکرؓ نے اس کا جس طرح قلع قمع کیا اُس کا ذکر گزر چکا ہے۔ اس سلسلہ میں یہاں یہ جان لینا ضروری ہے کہ مانعینِ زکوٰۃ دراصل دو قسم کے لوگ تھے ایک وہ جو سرے سے زکوٰۃ کی فرضیت کے ہی قائل نہیں رہے تھے۔ اور دُوسرے وہ لوگ تھے جو زکوٰۃ کو فرض تو مانتے تھے لیکن اس بات کے لئے آمادہ نہیں تھے کہ اُن کی زکوٰۃ مدینہ بھیجی جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ فرمایا تھا "تُؤْخَذُ مِنْ اَغْنِیَاءِ ھِمْ وَتُرَدُّ اِلٰی فُقَرَاءِھِمْ" دوسرا گروہ اس ارشادِ نبویؐ سے استدلال کرتا تھا کہ زکوٰۃ جس قبیلہ کے امیروں سے وصول کی جائیگی اسی قبیلہ کے غریبوں پر خرچ ہونی چاہئے۔ اس کے علاوہ ان لوگوں کا خیال یہ بھی تھا کہ چوں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مرکزی حیثیت حاصل تھی اس بنا پر آپ کو تو بیشک اس بات کا حق تھا کہ سب قبائل کی زکوٰۃ وصول کریں لیکن آپؐ کے بعد یہ حق کسی اور کو نہیں پہونچتا اسلئے

اُن پر ضروری نہیں ہے کہ وہ اپنی زکوٰۃ مدینہ بھیجیں۔ زکوٰۃ کو مدینہ بھیجنا اُن کے نزدیک ایک طرح کا ڈانڈ یا تاوان تھا۔ جیسا کہ قرۃ بن ہبیرہ اور حضرت عمرو بن العاص کی گفتگو سے ظاہر ہے جس میں قرۃ نے زکوٰۃ کیلئے "آتاوہ" کا لفظ استعمال کیا ہے[1]

حضرت ابوبکر کا جہاد ان دونوں گروہوں کیخلاف تھا۔ آپ نے فرمایا کہ جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زکوٰۃ لیتے تھے اسی طرح میں بھی لوں گا۔ اور اگر انہوں نے اُونٹ کی ایک رسّی جس کو وہ عہدِ نبوی میں دیتے ہوں گے۔ مجھ کو اس کے دینے سے بھی انکار کیا (ولو منعونی عقالاً) تو میں اُن سے جہاد و قتال کروں گا۔ حضرت ابوبکر کا یہ ارشاد فقہی اعتبار سے نہایت اہم ہے جس کی طرف کم لوگوں کی نگاہ گئی ہے آپ نے یہ فرما کر جہاں پہلے گروہ کی خام خیالی کا رد کر کے یہ حقیقت واضح کردی کہ زکوٰۃ بھی اسیطرح فرض اور عبادت ہے جس طرح کہ نماز ہے دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ساتھ ہی دُوسرے گروہ کی تردید کر کے صاف بتا دیا کہ زکوٰۃ دراصل ایک اسٹیٹ ڈیوٹی یعنی اسلامی حکومت اگر قائم ہو تو یہ اسکا ٹیکس ہے اسلئے جبتک آنحضرت رہے آپ وصول فرماتے رہے۔ اب صدرِ ریاست میں ہوں تو میں وصول کرونگا۔ پس زکوٰۃ کی ادائیگی کی صورت یہی ہے۔ کسی شخص یا کسی قبیلہ کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنے طور پر زکوٰۃ نکالدے اور حکومت کے خزانہ میں اُس کو جمع نہ کرے۔ حضرت ابوبکر کا یہ فیصلہ چونکہ نہایت اہم تھا اور دقیق و غامض بھی اسی لئے حضرت عمر جیسے نکتہ شناسِ شریعت نے اسکی داد دی اور صاف طور پر فرمایا۔

فعرفت انہ الحق[2] پھر مجھ کو معلوم ہو گیا کہ واقعی حضرت ابوبکر کی رائے ہی درست تھی۔

حکومت کے مصارف مذکورۂ بالا ذرائع سے جو آمدنی ہوتی تھی وہ خلیفہ کے اختیار اور اسکی رائے سے حکومت کے تمام شعبوں پر خرچ کی جاتی تھی۔ عُمّال صدقات کا روزینہ تو انہیں کے جمع کیے ہوئے صدقہ سے دیا جاتا تھا اُس کے علاوہ باقی تمام کارپردازانِ حکومت کی تنخواہیں۔ خلیفہ کی تنخواہ جسکا ذکر

---

[1] طبری ج ۲ ص ۴۸۸ [2] ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ - یہ نہ بھولنا چاہئے کہ یہ حکم اسی وقت تک کے لئے ہے جبکہ مسلمانوں کی اپنی کوئی حکومت اور اجتماعی نظام قائم ہو۔ اور حکومت کی جانب سے زکوٰۃ وصول کرنیکے لئے عمال و مصدقین مقرر ہوں۔ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کے عہد خلافت تک یہی نظام قائم رہا اور اس کی ضرورت بھی تھی۔ لیکن حضرت عثمان کے زمانہ میں جب حکومت بہت متمول ہوگئی اور روپیہ کی ریل پیل بڑھ گئی تو زکوٰۃ کو انفرادی طور پر ادا کر دینے کی اجازت دے دی گئی

آچکا ہے۔ فوج کے لیئے سامان رسد۔ آلاتِ حرب کی فراہمی اُن کی دیگر ضروریات۔ سماجی اور معاشرتی کام۔ دینی اور مذہبی امور۔ رفاہِ عام ان سب کی تکمیل بیت المال سے ہوتی تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وعدوں کی تکمیل چونکہ حضرت ابوبکر کے عہد میں جو علاقے فتح ہوئے اُن میں سے بعض وہ تھے جن کی فتح کی پیشگوئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کر چکے تھے اسلیئے اس خیال سے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ حضور کا کسی سے وعدہ بغیر تکمیل کے رہ جائے آپ نے اعلان عام کرادیا تھا کہ جس کسی شخص سے آپؐ نے کوئی وعدہ کیا ہو وہ میرے پاس آئے۔ چنانچہ ایک مرتبہ بحرین کا مال آیا تو ایک شخص ابن ابی نجیح نے حضرت ابوبکر کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ مجھ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وعدہ کیا تھا کہ اگر بحرین کا مال آیا تو (دونوں ہاتھوں سے اشارہ کر کے) میں تم کو اتنا اور اتنا دوں گا حضرت ابوبکر نے کہا " اچھا تو اپنے دونوں ہاتھوں سے اٹھا لو" اس شخص نے اٹھایا اور گنا تو پانچسو درہم تھے۔ چونکہ اس شخص نے ہاتھوں سے دو مرتبہ اشارہ کیا تھا اور ایک مرتبہ کی مٹھی بھرنے میں پانچسو درہم آئے تھے اس لیئے اس رقم کو دُگنا کر کے حضرت ابوبکر نے اسکو ایک ہزار درہم عطا فرما دیئے[1]

تقسیم میں مساوات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وعدوں کی اس طرح تکمیل کرنے کے بعد باقی جو رقم بچتی تھی حضرت ابوبکر اُس کو عورت مرد۔ چھوٹا بڑا۔ غلام اور آزاد سب پر برابر تقسیم کر دیتے تھے کیونکہ یہی دستور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی تھا ایک مرتبہ بحرین سے مال آیا آپ نے اُس کو علی السویہ تقسیم کیا تو فی کس سوا سات درہم آکر پڑا۔ دوسرے سال مال زیادہ آیا اور حسبِ سابق برابر تقسیم کیا گیا تو فی کس بیس درہم حصہ میں آئے بعض لوگوں نے ازراہ نکتہ چینی کہا کہ اے خلیفۂ رسول آپ نے مال برابر تقسیم کر دیا حالانکہ لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جن کو دوسروں پر تقدم اور تفوق حاصل ہے اگر آپ اُن کے سبقت الی الاسلام اور فضیلت کی رعایت رکھتے تو بہتر ہوتا آپ نے جواب دیا تم نے جن فضائل وسوابق کا ذکر کیا ہے انکو مجھ سے زیادہ اور کون جان سکتا ہے؟ لیکن یہ چیزیں وہ ہیں جن کا ثواب اللہ کے ذمہ ہے۔ یہ بہر حال معاش کا معاملہ ہے اس میں برابری کا معاملہ کرنا ترجیح دینے سے

[1] کتاب الخراج قاضی ابو یوسف ص ۴۲ -

بہت بہتر ہے[1]

خمس مالِ غنیمت کی تقسیم پہلے گزر چکا ہے کہ عہدِ نبوت میں جو مالِ غنیمت آتا تھا اُس کا خمس پانچ حصوں پر تقسیم کر لیا جاتا تھا اور اُس میں سے ایک حصہ اللہ اور اس کے رسول کا اور دوسرا حصہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذوی القربیٰ کا ہوتا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے بھی خمس کی تقسیم کے اسی قاعدہ کو باقی رکھا اور اس میں ذرا کمی بیشی یا قطع برید نہیں کی۔ عہدِ نبوت میں حضرت علیؓ پورا خمس خود لے لیتے تھے اور پھر اس کو ذوی القربیٰ پر حسب مراتب و مدارج تقسیم کر دیتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس میں بھی کوئی تبدیلی نہیں کی۔ چنانچہ خود حضرت علیؓ کا بیان ہے کہ میں خمس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں تقسیم کرتا تھا۔ اس لئے ابوبکرؓ نے بھی مجھ کو اس کا متولی بنا دیا تھا اور اُن کی زندگی میں بھی خمس میں ہی تقسیم کرتا تھا۔[2] ابو عبید نے ابن شہاب الزہری کا ایک قول نقل کیا ہے اُس سے بھی اسی کی تصدیق و تائید ہوتی ہے۔ انھوں نے فرمایا۔

وکان ابوبکر یقسم من الخمس نحو قسم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم[3]	ابوبکر خمس کو اسی طرح تقسیم کرتے تھے جس طرح کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کرتے تھے۔

ایک غلط روایت اس موقع پر یہ جتا دینا بھی ضروری ہے کہ قاضی ابو یوسف نے ایک روایت نقل کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے خمس میں سے رسولؐ اور ذوی القربیٰ کا حصہ ساقط کر دیا تھا۔ اور صرف تین حصے باقی رکھے تھے[4] لیکن یہ روایت بالکل لغو اور غلط ہے۔ کیونکہ اس کا راوی محمد بن السائب الکلبی ہے اور وہ محدثین کے نزدیک

---

[1] کتاب الخراج قاضی ابو یوسف ص ۴۲ اصل کتاب میں " الاسوۃ " چھپا ہوا ہے لیکن یہ غلط ہے۔ صحیح السّویۃ ہے اور اصل فقرہ یوں ہے: " السویۃ خیرٌ من الاثرۃ " [2] کتاب الخراج قاضی ابو یوسف ص ۲۰۔ [3] کتاب الاموال ص ۳۳۱ باب سھم ذی القربیٰ من الخمس۔

[4] کتاب الخراج ص ۱۹ باب قسمۃ الغنائم

مجروح اور ناقابلِ اعتبار ہے حضرت سفیان الثوری کہا کرتے تھے۔

اتقوا الکلبی	کلبی سے بچو۔

لوگوں نے کہا: "تو پھر آپ اُس سے کیوں روایت کرتے ہیں؟" فرمایا "میں اُس کے جھوٹ سچ کی پرکھ رکھتا ہوں" یزید بن زریع جو مشہور امام حدیث ہیں انھوں نے ایک مرتبہ کلبی سے کوئی روایت نقل کی تو ساتھ ہی فرمایا کہ کلبی سبائی تھا حضرت اعمش نے یہ سنکر کہا کہ سبائیوں سے بچنا چاہیے میں ان لوگوں کو اچھی طرح جانتا ہوں"۔ لوگ انکو کذّاب کہتے ہیں۔"

کلبی کا یہ حال تو عام ہے پھر روایت زیرِ بحث کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی اسناد ہے عن ابی صالح عن ابن عباس اور محمد بن السائب الکلبی کی اس خاص اسناد کے متعلق ائمہ حدیث کا اتفاق ہے کہ اس اسناد سے جو روایت ہوگی وہ جھوٹی ہوگی۔ چنانچہ خود حضرت سفیان جنھوں نے کلبی سے روایت کی ہے فرماتے ہیں کہ مجھ سے ایک مرتبہ کلبی نے کہا تھا کہ میں ابو صالح سے جو روایت بھی کروں گا وہ جھوٹی ہوگی۔ ابن عدی کا قول ہے۔

واما فی الحدیث فعند کا	حدیث کے سلسلہ میں کلبی سے بہت سی منکر
مناکیر وخاصةً اذا روی عن ابی صالح	احادیث مروی ہیں اور خاص طور پر وہ روایت جو
عن ابن عباس۔	ابن عباس سے بواسطہ ابو صالح مروی ہو۔

حدیث کے علاوہ اس شخص کا تفسیر میں بھی یہی حال تھا۔ کسی نے امام احمد بن حنبل سے پوچھا کیا محمد بن السائب الکلبی کی تفسیر کو دیکھنا جائز ہے؟ فرمایا "نہیں"۔[1]

غیر مسلموں کا سماجی تحفظ | غیر مسلم جب جزیہ دینے کی ہامی بھر کر اسلامی حکومت کی اطاعت قبول

---

[1] کلبی کے متعلق یہ تمام معلومات میزان الاعتدال فی نقد الرجال حافظ ذہبی ج ۳ ص ۶۱، ۶۲ حرف المیم سے ماخوذ ہیں۔

کر لیتا ہے تو وہ ذمّی کہلاتا ہے اور اس کیلئے اسلام کا صاف حکم یہ ہے کہ لھم ما للمسلمین وعلیھم ما علی المسلمین "ان کے حقوق وہی ہوں گے جو مسلمانوں کے ہوں گے اور ان پر وہ سب کچھ واجب ہو گا جو مسلمانوں پر ہوتا ہے۔ اس مساوات حقوق کی بنا پر جس طرح مسلمان محتاجوں اور اپاہجوں کی خبر گیری اور ان کا معاشی تکفل اسلامی بیت المال کا فرض ہے ٹھیک اسی طرح ازکار رفتہ غیر مسلموں کی حفاظت اور ان کے روزینہ کا انتظام بیت المال کے ذمہ ہے۔ چنانچہ حیرہ کی فتح کے موقع پر خالد بن الولید نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی طرف سے اہل حیرہ کے نام جو عہدنامہ لکھا تھا اور جو دنیا کی تاریخ جنگ و صلح میں اپنی نظیر نہیں رکھتا اس میں اور چیزوں کے ساتھ ایک اہم دفعہ یہ بھی تھی۔

ایما شیخ ضعف عن العمل	جو کوئی (غیر مسلم) بوڑھا ازکار رفتہ ہو جائے یا جس کسی
او اصابتہ آفۃ من الآفات او کان	غیر مسلم کو کوئی آفت پہونچے یا وہ مالدار ہو اور پھر فقیر ہو جائے
غنیاً فافتقر وصار اھل دینہ	اور اس کے اہل مذہب اس کو خیر خیرات دینے لگیں تو اس
یتصدقون علیہ طرحت جزیتہ	کا جزیہ معاف ہو جائیگا اور مسلمانوں کے بیت المال میں
وعیل من بیت مال المسلمین	سے اس کا اور اس کے متعلقین کا اس وقت تک برابر
وعیالہ ما اقام بدار الھجرۃ	تکفل کیا جائیگا جب تک یہ لوگ مدینہ اور اسلامی ملک
و دار الاسلام	میں رہیں گے۔

عہدنامہ کے آخر میں یہ بھی تحریر تھا جو بوڑھے جوان۔ غریب اور امیر۔ تندرست اور بیمار سب غیر مسلموں کیلئے عام تھا۔

فان طلبوا عوناً من المسلمین	یہ لوگ مسلمانوں سے اگر کوئی مدد طلب کریں گے تو ان کو مدد
اعینوا بہ ومؤنۃ العون من	دی جائیگی اور اس مدد کے سلسلہ میں جو اخراجات ہوں گے
بیت مال المسلمین۔ [1]	وہ بیت المال کے ذمہ ہوں گے۔

[1] کتاب الخراج قاضی ابو یوسف ص ۱۴۴۔

جن چیزوں پر ٹیکس نہیں ہے۔ | اس موقع پر یہ یاد رکھنا چاہئے کہ بہت سی چیزیں ایسی بھی ہیں جن کو "عطیۂ فطرت" سمجھا گیا ہے۔ یعنی یہ چیزیں خود پیدا ہوتی ہیں اور انسانی محنت کو اس میں دخل نہیں [1] ابن خلدون نے ان کو "الفلاحۃ" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے [2] مثلاً گھاس۔ بانس۔ لکڑی۔ نمک۔ پانی۔ جنگلی جانور۔ جنگل وغیرہ۔ اگرچہ ہمارے زمانہ کی مہذب حکومتوں تک نے اُن پر ٹیکس لگایا ہے لیکن اسلام نے ان چیزوں کو ٹیکس سے بالکل آزاد رکھا ہے اور ہر شخص کو خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم پوری آزادی ہے کہ وہ حسب ضرورت اُن سے استفادہ کرے۔ اس سے کسی قسم کا کوئی محصول نہیں لیا جائیگا۔ کتاب الخراج قاضی ابو یوسف اور کتاب الاموال ابو عبیدہ میں اس کی پوری تفصیل موجود ہے۔ عہدِ نبوت اور اُس کے بعد عہدِ صدیقی میں اسی پر عمل ہوتا تھا۔

---

[1] مشکوۃ مجتبائی پریس ص ۲۵۹ مالم تعمل ید الک۔

[2] مقدمۂ ابن خلدون ص ۳۲۱ - ۳۲۲

فوجی نظام

یوں تو عرب پیدائشی جنگجو تھے. لیکن اُن کا باقاعدہ کوئی فوجی نظام نہیں تھا، وہ گریز پا جنگ جس کو آج کل کی اصطلاح میں گوریلا دار کہتے ہیں اس کے عادی تھے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے شعبوں کی طرح اس شعبۂ زندگی کی بھی تنظیم کی، اسی تنظیم کا نتیجہ تھا کہ ان لوگوں نے حضرت ابوبکر صدیق کے عہد میں اُس زمانہ کی سب سے زیادہ مہذب، متمدن اور طاقتور حکومتوں، ایران اور روم کی فوجوں کو اپنی قلتِ تعداد اور سامان کی کمی کے باوجود شکست پر شکستیں دیں. ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ یونہی بخت و اتفاق کا نتیجہ نہیں ہو سکتا تھا۔[1]

ہم نے عربوں کے جس طریقۂ جنگ کو گریز پا جنگ کہا ہے، علامہ ابن خلدون نے اُسکو کر و فر کے لفظوں سے تعبیر کیا ہے. اس طریقہ کے برخلاف عجم میں صف بستہ ہو کر لڑنے کا (جس کو عربی میں زحف کہتے ہیں اور قرآن مجید میں بھی یہ لفظ اسی معنی میں آیا ہے.) طریقہ رائج تھا. آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حسب موقع و محل دونوں طریقے اختیار کئے۔ لیکن

---

[1] میجر جنرل محمد اکبر خاں صاحب نے حال ہی میں ایک بڑی قابلِ قدر کتاب، حدیث دفاع کے نام سے لکھی ہے جو بڑی تقطیع کی ۳۳۶ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اور فیروز سنز لاہور نے اُسکو شائع کیا ہے. جدید فنِ حرب کے ماہر کی حیثیت سے میجر صاحب نے اس کتاب میں ثابت کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خالص فنی نقطۂ نظر سے بھی دنیا کے سب سے بڑے فاتح جنرل اور اصولِ حرب و ضرب کے ماہر تھے، آپ نے جنگ کے جو اصول و ضوابط متعین کئے، صحابہ کو جنگ کرنے کی جس طرح تربیت دی اور پھر خود جس طرح فوج کی قیادت کی اور اس کیلئے جو طریقے اختیار کئے، ہو وہ سوا برس سے زیادہ گذرنے کے باوجود علوم و فنون کے اس دور ترقی میں بھی ادھر ایک حرف کا اضافہ نہیں ہو سکا ہے. اس میں شک نہیں کہ یہ کتاب اپنے موضوع کے اعتبار سے بالکل انوکھی اور لائق مطالعہ ہے۔

جہاں دشمن کی فوجیں صف بستہ ہوتی تھیں وہاں زحف کا طریقہ بھی اختیار کرتے تھے قرآن مجید نے اسی کو کَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ [1] "گویا وہ لوگ ایک مضبوط بنیاد ہیں" کہا ہے،

لشکر کے مختلف حصے | عربی میں لشکر کو خمیس بھی کہتے ہیں جو خمس (یا پنج) سے مشتق ہے، یہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ لشکر پانچ حصوں میں تقسیم ہوتا تھا، ایک دستہ فوج جس میں امیرِ لشکر ہوتا تھا قلب کہلاتا تھا۔ امیرِ لشکر کے دائیں جانب والے حصہ کو میمنہ اور بائیں جانب والے کو میسرہ کہتے تھے۔ لشکر کا پچھلا حصہ ساقہ اور اگلا حصہ مقدمۃ الجیش یا طلیعہ کہلاتا تھا۔ لشکر کی ترتیب دو قسم کی ہوتی تھی، ایک ترتیب قریب جس میں لشکر کے سب حصے پاس پاس ہوتے تھے اس کو تعبیہ کہتے تھے، اور دوسری ترتیب بعید جس میں لشکر کے مختلف حصے ایک دوسرے سے فاصلہ پر ہوتے تھے اس وقت لشکر کے ہر حصہ کو کردوس کہتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں تعبیہ کا رواج تھا لیکن حضرت ابوبکر کے عہدِ خلافت میں حضرت خالد نے شام پہونچکر جب دیکھا کہ دشمن کی تعداد دو لاکھ چالیس ہزار ہے اور اس کے مقابلہ میں مسلمانوں کی تعداد صرف چھتیس ہزار ہے تو آپ نے اسلامی فوج کو ۳۶ سے ۴۰ تک دستوں (کردیس) میں بانٹ دیا، اس طرح گویا ہر دستہ میں ایک ایک ہزار مجاہد تھے اور ہر دستہ کا الگ الگ ایک امیر مقرر کر دیا۔ قلب کے جو دستے تھے اُن کے امیر ابو عبیدہ بن الجراح۔ میمنہ کے دستوں کے امیر عمرو بن العاص اور شرجیل بن حسنہ۔ میسرہ کے دستوں کے امیر یزید بن ابی سفیان تھے اور پھر ہر ہر دستہ کا الگ الگ بھی ایک امیر تھا جو شجاعت اور بہادری میں نامور تھا مثلاً قعقاع بن عمرو۔ عبداللہ بن مسعود۔ قباث بن اشیم [2] دشمن کی کثرتِ تعداد کو دیکھ کر کسی نے کہا کہ ہائے! رومیوں کی تعداد کس قدر زیادہ ہے اور اوس کے

[1] مقدمۂ ابن خلدون باب القسم السابع فی الحروب۔ [2] تاریخ ابن اثیر ج ۲ ص ۲۰۲۔

مقابلہ میں مسلمان کس درجہ کم ہیں، حضرت خالد نے فرمایا، نہیں بلکہ مسلمان کس قدر زیادہ ہیں اور رومی کتنے تھوڑے ہیں۔" اس کے بعد کہا کہ کثرت و قلت کا دارومدار کامیابی اور ناکامیابی پر ہے، یعنی ان کو یقین تھا کہ نتیجۂ جنگ انہیں کے حق میں ہوگا۔[1]

لشکر میں وعظ گو حضرت ابوبکر کے عہد میں اس کا بھی اہتمام ہوتا تھا کہ چند ایسے حضرات لشکر کے ساتھ بھیجے جاتے تھے جو اپنے دلولہ انگیز خطبوں اور قرآن مجید کی آیاتِ جہاد کی تلاوت سے مجاہدین میں جوش پیدا کر دیتے تھے، چنانچہ شام کی جنگ کے موقع پر یہ خدمت ابوسفیان بن حرب کے سپرد تھی، ان کے علاوہ قرآن مجید کی تلاوت کرنے والے مقداد تھے۔ طبری نے روایت کی ہے کہ غزوۂ بدر کے بعد سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ دستور ہو گیا تھا کہ دشمن کے بالمقابل صف آرا ہونے کے بعد آپ سورۂ انفال کی آیات تلاوت فرماتے تھے، آپ کے بعد بھی یہ دستور باقی رہا۔[2]

جنگ کے ہتھیار لشکر میں شہسوار اور پاپیادہ دونوں قسم کے لوگ ہوتے تھے اور جنگ میں یہ لوگ جو ہتھیار استعمال کرتے تھے ان کے نام یہ ہیں۔ زرہ۔ تلوار۔ رمح یعنی بڑا نیزہ۔ حربہ (چھوٹا نیزہ) الخط البحرین کا ایک ساحلی علاقہ ہے، یہاں نیزے بہت عمدہ بنتے تھے اور الرمح الخطی کہلاتے تھے۔ اسی طرح ہند میں تلواریں بہت عمدہ بنتی تھیں، اور السیف الهندی کہلاتی تھیں، یہ اسلحہ تو وہ ہیں جو عام طور پر معروف ہیں ان کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جن اور دوسرے اسلحہ کا استعمال مروی ہے، ان کے نام یہ ہیں۔

منجنیق، اس کی شکل توپ یا کمان کی سی ہوتی تھی اور اس کے ذریعہ دشمن پر پتھر پھینکے جاتے تھے جو گولہ کا کام کرتے تھے۔ ابن ہشام کی روایت ہے کہ اسلام میں منجنیق کا استعمال سب سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہے۔[3]

---

[1] تاریخ ابن اثیر ج ۲ ص ۲۸۲ [2] طبری ج ۲ ص ۵۹۴ [3] سیرت النبی ج ۳ ص ۳۰۳۔

دبابہ:۔ اس کا ایک بڑا خول ہوتا تھا، فوجیوں کی ایک تعداد اس کے اندر بیٹھ جاتی تھی اور اس کو دھکیلتے ہوئے دشمن کے قلعہ کی دیوار تک لے جاتے تھے، اس کا فائدہ یہ ہوتا تھا کہ ان فوجیوں پر دشمن کے قلعہ کے اوپر سے اگر تیر بھی برستے تھے تو ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا اور اس طرح محفوظ طریقہ پر قلعہ کی دیوار تک پہونچ جانے کے بعد وہ قلعہ پر حملہ کر سکتے تھے۔

الضبور:۔ یہ بھی دبابہ کی طرح ہوتا تھا اور ایسی لکڑی سے تیار ہوتا تھا جس پر کھال چڑھی ہوتی تھی۔ اس کا فائدہ بھی یہی تھا کہ حملہ آور سپاہی اس کے خول میں چھپ کر بیٹھ جاتے تھے اور حفاظت سے دشمن کے قلعہ تک پہونچکر حملہ کر دیتے تھے، یہ دونوں ہتھیار خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے استعمال کئے ہیں[1]

فوجی لباس جہاں تک لباس کا تعلق ہے، اگرچہ اس کا پتہ نہیں چلتا کہ خاص جنگ کے وقت کا کوئی لباس ملٹری یونیفارم کی طرح ہوتا تھا یا نہیں تاہم حفاظت کیلئے زرہ اور خود پہننے کا عام رواج تھا اور سپر بھی رکھنے کا دستور تھا۔ البتہ ڈاکٹر محمد حسن ابراہیم نے نقل کیا ہے کہ پاپیادہ سپاہی چھوٹی قبائیں جو گھٹنوں تک دراز ہوتی تھیں پہنتے تھے اور تہمد کے بجائے پاجامے اور جوتے جو ہمارے زمانہ میں اہل افغان کا شعار ہے پہنتے تھے[2]

عورتیں بھی ساتھ ہوتی تھیں فوج کے ساتھ عورتیں بھی ہوتی تھیں جن کا کام زخمیوں کا مرہم پٹی کرنا اور پانی پلانا وغیرہ ہوتا تھا۔ دف اور طبلِ جنگ بھی بجاتی تھیں تاکہ فوج میں جوش

---

[1] عربوں کے جنگی ہتھیاروں کی مفصل معلومات کے لئے دیکھو ابن قتیبہ کی عیون الاخبار ج ۱ ص ۱۲۸ تا ۱۳۲

[2] تاریخ الاسلام السیاسی ج ۱ ص ۳۰۴۔ حضرت خالد بن ولید نے حضرت ابوبکر کی طرف سے اہل حیرہ کیلئے جو عہد نامہ لکھا تھا اسی میں ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ ذمی جو لباس پہنتے ہیں وہ پہنیں اور سپر کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔ البتہ وہ مسلمانوں کا سا جنگی لباس (زی الحرب) نہیں پہنیں گے (دیکھو کتاب الخراج قاضی ابویوسف ص ۱۴۴) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگ کا لباس ضرور کوئی تھا جسمیں پہننے والا جست اور چلتی وچو بند رہتا تھا۔

پیدا ہو۔ اگر کوئی نازک موقع آتا تھا تو جنگ میں بھی حصہ لیتی تھیں۔ چنانچہ عہدِ نبوت میں اور پھر عہدِ صدیقی میں اس قسم کے بعض مواقع پیش آئے تھے[۱]

فوج کا معائنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ جس کو آپ نے غزوۂ بدر کے موقع پر خاص طور سے برتا تھا، یہ تھا کہ جنگ شروع ہونے سے قبل اسلامی لشکر کو قطاروں میں تقسیم کر کے باقاعدہ صف بندی کرتے اور ان کا معائنہ کرتے تھے اور جہاں کوئی... آدمی آگے پیچھے نظر آتا تھا، چھڑی کے اشارے سے اس کو درست کر دیتے تھے، اس کے ساتھ ہی آپ فوج کے مختلف حصوں پر افسر تعینات کرتے اور ان کے الگ الگ علمبردار بھی مقرر فرماتے تھے۔ اس کے بعد فوج کو ہدایات دیتے کہ جب تک اجازت نہ ملے صف بندی ہرگز نہ توڑیں، خود اپنی طرف سے لڑائی کے شروع کرنے میں پہل نہ کریں۔ دشمن اگر فاصلہ پر ہو تو تیر چلا کر اس کو ضائع نہ کریں، زد پر آئے تو تیر چلائیں، قریب ہو تو منجنیق استعمال کریں اور زیادہ نزدیک آئے تو نیزوں سے روکیں، اور سب سے آخر میں تلوار نکالیں۔ لڑائی میں شور و غل عام بات ہے لیکن آپ نے منع فرما دیا تھا کہ منہ سے آواز تک نہ نکلے[۲]

کمانڈر انچیف کا عہدہ عہدِ نبوت میں چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غزوات میں خود شریک رہتے تھے اس لئے فوج کی اعلیٰ قیادت۔ اس کا معائنہ اور اس کو ہدایات دینا یہ سب کام آپ ہی کرتے تھے، لیکن عہد خلافت میں حضرت ابو بکر خود جنگوں میں شرکت نہیں کر سکتے تھے اس لئے آپ کی حیثیت جنگ کے معاملہ میں وزیر جنگ کی سی تھی اور خاص محاذِ جنگ کے لئے آپ نے یہ انتظام کیا کہ ایک کمانڈر انچیف کا عہدہ قائم کیا جو پورے میدانِ جنگ کا سب سے بڑا افسر ہوتا تھا اور تمام فوج کی نقل و حرکت

---

[۱] فتوح الشام للواقدی ذکر عہدِ صدیقی۔

[۲] صحیح مسلم کتاب الجہاد والسیر۔

اس کے زیر حکم وقیادت ہوتی تھی، چنانچہ جیسا کہ گذر چکا ہے۔ محاذِ شام پر، حضرت ابوبکر نے ہر دستۂ فوج کا الگ الگ ایک امیر مقرر کیا تھا لیکن ان سب کے امیر حضرت خالد بن الولید مقرر کئے گئے تھے[1]

حضرت ابوبکر کو حضرت خالد پر کس قدر اعتماد تھا جو بالکل حق بجانب ثابت ہوا۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ جب محاذِ شام پر مسلمانوں کی اور رومیوں کی فوجیں بہت دنوں تک آمنے سامنے پڑی رہیں اور کسی طرف سے کوئی اقدام نہیں ہوا تو حضرت ابوبکر نے فرمایا

واللہ لَاُنْسِيَنَّ الرُّومَ وساوس الشيطان بخالد[2]

خدا کی قسم! رومیوں کے دلوں میں جو وسوسے ہیں وہ سب میں خالد کو (عراق سے شام) بھیج کر بھلوا دوں گا۔

فوج کے لئے انتخاب میں احتیاط عہد نبوت اور عہد صدیقی میں فوج کا کوئی مستقل اور الگ صیغہ نہیں تھا اور نہ فوجی تعلیم و تربیت کا کوئی انتظام تھا۔ بلکہ پوری قوم ہی ایک فوج تھی ضرورت پڑنے پر اعلان کر دیا جاتا تھا اور جو لوگ رضاکارانہ طور پر اپنی خدمات پیش کرتے تھے ان کو لے لیا جاتا تھا۔ البتہ حضرت ابوبکر صدیق انتخاب کرتے وقت اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ مشتبہ لوگوں کو شریکِ فوج نہ ہونے دیں، چنانچہ شام کی مہم کو سر کرنے کے لئے آپ نے جو فوج ترتیب دی اُس میں ابتداءً ان لوگوں کو شرکت کی اجازت نہ تھی جن کے دامانِ اطاعت و فرمانبرداری پر ارتداد کا داغ لگ چکا تھا، خالد بن سعید بن العاص کو روانہ کرتے وقت حکم دیا۔

وان يدعو من حوله من العرب الا من ارتد[3]

کہ تمہارے ادھر ادھر جو عرب ہوں انکو جنگ میں شرکت کی دعوت دینا مگر جو لوگ مرتد ہو گئے تھے ان کو نہیں۔

مجاہدین اسلام کی قدر اندازی اگرچہ مسلمانوں کی فوجی تعلیم و تربیت کا اس وقت کا باقاعدہ انتظام نہیں ہوا تھا، لیکن درحقیقت اس کی ضرورت بھی نہیں تھی، کیونکہ عرب فطرتاً جنگجو ہوتے تھے اور شمشیر زنی اور تیر اندازی ان کا خاص فن تھا چنانچہ عراق میں انبار کی جنگ کے موقع پر ایرانیوں کا لشکر جو ایک نہایت تجربہ کار اور آزمودہ جنرل شیرزاد کے ماتحت تھا بڑی شان و شوکت

---

[1] طبری ج ۲ ص ۲۰۱ [2] طبری ج ۲ ص ۶۰۲ [3] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۷۶ ۔

اور طمطراق کے ساتھ تھا اور اس کو اپنی طاقت کا بڑا گھمنڈ تھا، لیکن جب جنگ شروع ہوئی تو حضرت خالد بن الولید نے خندق کا چکر لگایا، اتنے میں گھمسان کا رن پڑنے لگا تو آپ تیر اندازوں کے دستہ کے پاس پہونچے اور ان سے کہا کہ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ یہ لوگ (دشمن) طریقۂ جنگ سے ناواقف ہیں، تم ان لوگوں کی آنکھوں کو نشانہ بنا کر تیر چلاؤ، قدر اندازوں نے اس حکم کی اس طرح تعمیل کی کہ دشمن کی فوج کے ایک ہزار سپاہیوں کی آنکھوں کو تیروں سے چھید دیا دشمن نے یہ منظر دیکھا تو چیخ اٹھا اور خبر اڑ گئی کہ اہل انبار سب کے سب اندھے ہوگئے۔ اسی خصوصیت کی وجہ سے اس جنگ کو "ذات العیون" آنکھوں والی جنگ بھی کہتے ہیں، شیرزاد نے گھبرا کر صلح کی پیش کش کی[1]

سامانِ جنگ کی فراہمی | اسلحہ اور سامانِ جنگ کا حال یہ تھا کہ لوگ اپنے اپنے اسلحے لے کر آتے تھے، اور جو خود ان کا انتظام نہیں کر سکتے تھے ان کا انتظام چندہ کے ذریعہ کر دیا جاتا تھا۔ تاہم حضرت ابو بکر نے اس میں اتنا اضافہ کیا کہ مختلف ذرائع سے جو آمدنی ہوتی تھی اسکا ایک حصہ اسلحہ اور دوسرے سامانِ جنگ کی خریداری کے لئے وقف کر دیتے تھے، قرآن نے مالِ غنیمت میں اللہ اور اسکے رسول کا جو حصہ مقرر کیا تھا اسکو بھی اسی کام میں لاتے تھے[2]۔

مدینہ میں ایک مشہور جگہ نقیع تھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی چراگاہ کو جنگی گھوڑوں کے لئے مخصوص کر دیا تھا[3]۔ حضرت ابو بکر نے بھی اس کو اسی طرح باقی رکھا، بعد میں البتہ حضرت عمر نے ربذہ کی چراگاہ کو بھی صدقہ اور زکوۃ کے اونٹوں اور گھوڑوں کے لئے اس غرض سے مخصوص کر دیا تھا۔ اگرچہ اتنا کام حضرت ابو بکر بھی کرتے تھے کہ صدقہ اور زکوۃ کے جو اونٹ دبلے پتلے ہوتے تھے ان کو ربذہ اور اس کے قرب وجوار میں بھیجدیتے تھے[4]

---

[1] طبری ج ۲ ص ۵۰۵۔ [2] کتاب الخراج قاضی ابو یوسف ص ۲۱ [3] کتاب الاموال ابو عبیدہ ص ۲۹۸ [4] کنز العمال ج ۵ ص ۳۵۹ رقم ۲۳۰۶۔

امرائے فوج کو ہدایات | لیکن یہ سب فوج کے ظاہری اور مادی انتظامات تھے، اصل چیز جس پر فوج کی کامیابی کا انحصار ہے وہ ہے اعلیٰ نصب العین زندگی اور بلند اخلاقی کردار اور کیرکٹر۔ حضرت ابوبکر کو اس چیز کا خاص اہتمام رہتا تھا، اور جب فوج روانہ ہوتی تھی تو آپ پاپیادہ اس کو رخصت کرنے کے لئے مدینہ سے باہر دور تک تشریف لاتے تھے امرائے فوج کے سخت اصرار کے باوجود ان کو سواری سے اترنے نہیں دیتے تھے اور خود سواری پر بیٹھتے نہیں تھے، اور جب فوج روانہ ہوتی تھی تو آپ اس کو مفصل احکام و ہدایات دیتے تھے جن میں جہاد کا مقصد، اس کی اہمیت و ضرورت خلوص، وللہیت اجرِ خداوندی و ثوابِ اخروی دنیا اور اس کی زندگی کی بے حقیقتی وغیرہ جیسی چیزوں پر بڑے موثر انداز میں روشنی ڈالتے تھے اور ساتھ ہی ایسے جنگی احکام دیتے تھے جن سے آپ کی مہارت فنِ حرب، حُسنِ تدبیر، بیدار مغزی اور دشمن اور اس کے ملک سے کمال واقفیت کا ثبوت ملتا تھا۔

حضرت اسامہ اور یزید بن ابی سفیان کو آپ نے جو ہدایات دی تھیں ان کا ذکر گذر چکا ہے حضرت خالد خود ایک نامور جنرل تھے لیکن جب ان کو ذوالقصہ کی طرف مرتدین سے جنگ کرنے کے لئے روانہ کیا ہے تو انکو بھی ہدایات دیں اور فرمایا:۔

"تمہارے اِدھر اُدھر قبیلۂ طے پڑے گا، اگرچہ تمہارا رخ بزاخہ ہی کی طرف ہوگا لیکن تم ابتدا طے ہی سے کرنا۔ بزاخہ سے فارغ ہو کر بطاح جاؤ، بطاح کا معرکہ سر کرلو تو اس وقت تک وہاں سے نہ ہٹو جب تک میں تم کو کمک نہ بھیج دوں"

حضرت ابوبکر نے ایک طرف تو حضرت خالد کو یہ ہدایت دے کر روانہ کیا، دوسری طرف تدبیر یہ کی کہ مشہور کر دیا کہ وہ خود خیبر جا رہے ہیں اور وہاں سے پلٹ کر وہ اکناف سلمی میں خالد بن الولید کے لشکر سے آملیں گے۔ اس خبر کے اڑنے سے دشمنوں پر دہشت بیٹھ گئی اور قبیلۂ طے کے سرکش لوگ رام ہونے لگے[1]

---

[1] طبری ج ۲ ص ۴۸۳۔

عراق کی مہم پر حضرت خالد اور عیاض بن غنم کو روانہ کیا تو حضرت خالد کو حکم دیا کہ وہ عراق کے حصۂ زیرین سے جائیں اور عیاض کو ہدایت دی کہ وہ بالائی علاقہ سے سفر کریں، اور پھر فرمایا کہ تم دونوں میں سے جو شخص بھی حیرہ پہلے پہنچ جائیگا وہی حیرہ کی مہم کا امیر ہوگا۔ اس کے بعد آپ نے کہا کہ حیرہ پہونچنے پہو پنچے تو تم لوگ عرب اور ایران کے درمیان جو فوجی چھاؤنیاں ہیں اُن کو برباد کر ہی چکے ہو گے اور اب تم کو اس بات کا اطمینان ہو چکا ہو گا کہ مسلمانوں پر پشت کی جانب سے حملہ نہیں ہو سکتا اس بنا پر حیرہ پہونچنے کے بعد تم دونوں میں سے ایک شخص حیرہ میں ہی قیام کرے اور دوسرا آگے بڑھ کر دشمن سے جنگ آزما ہو۔

یہ ہدایات تو خالص جنگی ہدایات تھیں۔ ان کے بعد ارشاد ہوا کہ :۔

"اور ہاں! اللہ سے مدد مانگنا۔ اُس سے ڈرنا۔ آخرت کو دنیا پر مقدم رکھنا۔ تم ایسا کرو گے تو دنیا اور آخرت تم کو دونوں چیزیں ملیں گی۔ اور دنیا کو آخرت پر ترجیح نہ دینا، ورنہ دونوں کا خسارہ ہوگا۔ اور خدا نے تم کو جن چیزوں سے بچنے کا حکم کیا ہے ان سے بچے رہنا، معاصی سے الگ رہنا۔ اگر کوئی معصیت ہو جائے تو فوراً توبہ کرنا اور کبھی کسی گناہ پر اصرار مت کرنا[1]"

حضرت ابوبکر کی بیدار مغزی اور واقفیت کا یہ عالم تھا کہ اگرچہ خود مدینہ میں ہوتے تھے لیکن سینکڑوں میل دور کا میدانِ جنگ نگاہ میں رہتا تھا۔ اور حسب موقع و مصلحت اس کے لئے احکام بھیجتے رہتے تھے۔ خالد بن سعید کو تیمار روانہ کیا تو تاکید کر دی کہ جب تک اُن کا حکم نہ پہونچے اقدام نہ کریں۔ لیکن خالد بن سعید اس کی پابندی نہ کر سکے تو ہزیمت سے دوچار ہونا پڑا[2] حضرت خالد بن ولید حضرت ابوبکر کی ان معاملات میں اصابتِ رائے سے واقف تھے۔ اس لئے حضرت ابوبکر کا کوئی حکم انکی طبیعت کے

---

[1] طبری ج ۲ ص ۵۷۳۔۵۷۴۔ [2] فتوح البلدان بلاذری ص ۱۱۴۔

خلاف بھی ہوتا تھا تو بھی اس کی پابندی کرتے تھے، چنانچہ حیرہ کی فتح کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے حکم بھیجا کہ اب پیشقدمی نہ کریں۔ حضرت خالدؓ اس حکم کی تعمیل میں سال بھر تک معطل پڑے رہے، اور اس سے اس قدر اکتا گئے تھے کہ اس سال کو وہ خود عورتوں کا سال کہتے تھے، لیکن ان کی مجال نہ تھی کہ بارگاہِ خلافت کے حکم کیخلاف عمل کر سکیں ایک اور موقع پر بھی ایسا ہی ہوا اور اس کی وجہ سے بعض لوگوں میں کچھ چہ می گوئی ہوئی تو حضرت خالدؓ نے ان لوگوں سے کہا کہ خلیفہ کی رائے یہی ہے اور ان کی رائے پوری قوم کی رائے کے برابر ہے[1]

اسیطرح شام کی طرف آپ نے متعدد لشکر بیک وقت روانہ کئے تو.... چونکہ آپ کو معلوم تھا کہ رومیوں کی جنگی چالیں کیا ہیں اور انہوں نے کہاں کہاں محاذ بنایا ہے، اس لئے امرائے عساکرِ اسلام کو ہدایت کی کہ کون کس راستہ سے جائے اس سلسلہ میں طبری کا بیان ہے کہ وسمی لھم امصار الشام: ان لوگوں کے لئے شام کے شہر تک متعین کر دئے، اور اس کے بعد فرمایا:۔

ان الروم ستشغلھم فاجب ان یصعد المصوب ویصوب المصعد لئلا یتواکلوا[2]	رومی تم کو ایک محاذ پر جمع کر کے تم سے مڈبھیڑ کرنا چاہیں گے، اس لئے میں چاہتا ہوں کہ تم میں سے نشیبی علاقہ سے جانیوالا بالائی راستے سے جائے اور بالائی راستہ سے جانیوالا نشیبی راستہ جائے (یعنی راستے بدل بدل کر جاؤ) تاکہ رومی دستوں کو مجتمع ہونے کا موقع نہ ملے۔

---

[1] طبری ج ۲ ص ۴، ۵۰۔ [2] طبری ج ۲ ص ۵۸۹۔ اسی طرح حضرت خالدؓ جب عراق پہونچگئے تو ان کو حکم لکھا کہ وہ اپنی کارروائی ہند اور سندھ کی سرحد یعنی ابلہ سے شروع کریں اور طرفہ یہ کہ اس کارروائی کو شروع کرنے کیلئے دن تک کا تعین بھی خود ہی کر دیا تھا۔ (طبری ج ۲ ص ۵۵۴)

حضرت عروہ جو اس روایت کے راوی ہیں ان کا بیان ہے کہ حضرت ابو بکر نے جو کچھ فرمایا تھا حرف بحرف صحیح ثابت ہوا۔

فوجی مراکز کا معائنہ حضرت ابو بکر صدیق فوج کو صرف ہدایات بھیجدینے پر قناعت نہیں کرتے تھے، بلکہ وقتاً فوقتاً خود بھی چھاؤنیوں اور فوجی مرکزوں کا معائنہ کرتے تھے اور جہاں کہیں کوئی خرابی نظر آتی تھی اس کا فوراً تدارک کرتے تھے، ایک مرتبہ ایک مہم کے سلسلہ میں مقام جرف میں فوجیں اکٹھی تھیں آپ معائنہ کے لئے پہونچ گئے بنو فزارہ کے کیمپ میں پہونچے تو یہ لوگ سروقد کھڑے ہو کر تعظیم بجالائے حضرت ابو بکر نے ان کو خیر مقدم کہا، اس کے بعد ان لوگوں نے کہا۔ یا خلیفۃ رسول اللہ! ہم لوگ گھوڑے کی سواری بہت عمدہ جانتے ہیں اس لئے گھوڑے بھی ساتھ لائے ہیں۔ آپ بڑا جھنڈا ہمارے ساتھ کر دیجئے۔ ارشاد ہوا، خدا تم کو اور ہمت اور برکت عطا فرمائے، لیکن بڑا جھنڈا تم کو نہیں ملسکتا، وہ بنو عبس کے حصہ میں آچکا ہے۔ ایک فزاری کھڑا ہو کر بولا، ہم لوگ بنو عبس سے بہتر ہیں۔ حضرت ابو بکر نے خفا ہو کر کہا، چپ بدتمیز تجھ سے ہر عبسی بہتر ہے! ایک عبسی شخص بھی کچھ بولنا چاہتا تھا لیکن حضرت ابو بکر نے اس کو بھی جھڑک کر خاموش کر دیا اور فرمایا فقد کفیت یعنی میں تمہاری طرف سے کہہ چکا ہوں [۱]

حضرت ابو بکر کے احکام و ہدایات کا اثر حضرت ابو بکر کی اس بیدار مغزی، روشن ضمیری، احکام و ہدایات اور غلطیوں پر بر وقت تنبیہ کا نتیجہ یہ تھا کہ پوری فوج اور اس کے امرا ہر وقت ہوشیار رہتے تھے، اُن میں ڈسپلن قائم رہتا تھا، بلند تر نصب العین زندگی نظر کے سامنے رہتا تھا اور ان میں کبھی اخلاقی پست ماندگی پیدا نہیں ہوتی تھی، اور حقیقت یہی ہے کہ مادی اسباب و آلات سے قطع نظر یہی چیزیں ایک فوج کی

---

[۱] کنز العمال ج ۵ ص ۳۶۱ رقم ۲۳۱۰۔

کامیابی کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں، چنانچہ

مغربی مصنفین کی رائے | مغربی مصنفین نے بھی اسکا اعتراف کیا ہے۔ پروفیسر ہٹی لکھتے ہیں:۔

"مسلمان عرب فوجوں کی طاقت کا اصل راز نہ تو اُن کی اسلحہ جنگ کی برتری میں ہے، اور نہ اُن کی اعلیٰ درجہ کی تنظیم میں ہے۔ بلکہ درحقیقت اس اعلیٰ کیرکٹر اور اخلاقی کردار میں ہے جس کے پیدا کرنے میں بے شبہ اُن کے مذہب کا بہت بڑا حصہ تھا اور اس صبر و تحمل کی طاقت میں ہے جس کو ریگستانی زندگی سے بڑا سہارا ملا تھا[1]"

مشہور ولندیزی مستشرق دخوئی (DR-GUEGE) اقرار کرتا ہے کہ حضرت ابو بکر نے فوجوں کو جو ہدایات دی تھیں ان میں اعتدال اور معقولیت کی جو روح کارفرما ہے اُس کے باعث ان کی بجا طور سے داد دینی پڑتی ہے[2] یہ ہی مستشرق اپنی کتاب فتوحات شام میں (از صفحہ ۱۰۴ تا صفحہ ۱۰۶) لکھتا ہے کہ:۔

"درحقیقت شام میں لوگ عربوں کی جانب بہت مائل ہو گئے تھے۔ اور ایسا ہونا بھی چاہیئے تھا، کیونکہ عربوں نے مفتوحین سے جو برتاؤ کیا اگر اسکا مقابلہ وہاں کے سابق مالکوں کے بے اصول ظلم سے کیا جائے تو بڑا ہی سخت فرق نظر آتا ہے۔ شام کے جو عیسائی فیصلۂ کالسی ڈون ...... (CHALCEDON) کو نہیں مانتے تھے، قیصرِ روم کے حکم سے اُنکے ناک کان کاٹے جاتے اور ان کے گھر ڈہائے جاتے تھے۔ اس کے برخلاف عرب مسلمان جو حضرت ابو بکر کی ہدایتوں پر عمل کرتے تھے وہ مقامی باشندوں کا دل موہ لینے لگے اور سب سے زیادہ اپنی بات کا پاس کرتے رہے،

---

[1] ھسٹری آف دی اربس چوتھا اڈیشن ص ۱۷۴ [2] بحوالہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی زندگی از ڈاکٹر حمید اللہ ص ۲۸۱۔

ان فتوحات کے پندرہ سال بعد ایک نسطوری پادری لکھتا ہے کہ یہ عرب جنکو خدا نے آج کل حکومت عطا کی ہے ہمارے بھی مالک بن گئے ہیں۔ مگر وہ عیسائی مذہب سے بالکل برسرِ پیکار نہیں، اس کے برخلاف وہ ہمارے دین کی حفاظت کرتے ہیں، ہمارے پادریوں اور قدیسوں کا احترام کرتے ہیں، اور ہمارے گرجاؤں اور عبادت خانوں کو جاگیریں (DONS) عطا کرتے ہیں[۱]

مشہور پادری کارالیفس (C. KARALEVSKI) فرانسیسی انسائیکلوپیڈیا میں شہر انطاکیہ کے حالات لکھتے ہوئے رقمطراز ہوتا ہے:۔

"مسلمان عربوں کو یعقوبی عیسائیوں (JACOBITES) نے بھی اپنے نجات دہندوں کی حیثیت سے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ مسلمانوں کی سب سے بڑی جدت جس کا یعقوبی عیسائیوں نے دلی خوشی سے استقبال کیا۔ یہ بھی کہ ہر مذہب کے پیرؤوں کو ایک خود مختار وحدت قرار دیا جائے اور اسی مذہب کے روحانی سرداروں کو ایک بڑی تعداد میں دینوی عدالتی اقتدار عطا کیا جائے"[۲]

کسانوں کا خاص خیال ہدایات میں حضرت ابوبکر کی جہاں یہ تاکید ہوتی تھی کہ مذہبی پیشواؤں اور عبادت گزاروں سے تعرض نہ کیا جائے، بوڑھوں، عورتوں، اور بچوں پر تلوار نہ اٹھائی جائے، درخت نہ کاٹے جائیں، نخلستان برباد نہ کئے جائیں ساتھ ہی جس ملک میں جنگ ہوتی تھی اس کے کسانوں اور ارباب زراعت کی نسبت اس بات کی سخت تاکید ہوتی تھی، ان لوگوں کو ذرا ہاتھ نہ لگایا جائے۔ چنانچہ غزدۂ ذات السلاسل کے ذکر میں طبری لکھتے ہیں:۔

---

[۱] بحوالہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی زندگی از ڈاکٹر حمید اللہ ص ۲۸۲ [۲] ایضاً ص ۲۸۳۔

ولم یحرك خالدٌ وامراؤہٗ الفلاحین فی شئ من فتوحهم. لتقدم ابی بکر الیه فیهم[1]	اور خالد اور ان کے امرا نے اپنی فتوحات کے دوران میں کسانوں کو ذرا نہیں چھیڑا کیونکہ ابوبکر ان لوگوں کے بارہ میں پہلے ہی حکم بھیج چکے تھے۔

اہلِ دیہات کے ساتھ معاملہ | قاعدہ ہے کہ جب کسی ملک پر حملہ ہوتا ہے تو شہری آبادی کی بہ نسبت اہلِ دیہات پر اس کا زیادہ برا اثر ہوتا ہے، کیونکہ وہاں حفاظت اور بچاؤ کے سامان ایسے نہیں ہوتے جیسے کہ شہروں میں ہوتے ہیں، لیکن حضرت ابوبکر اس بات کا برابر خیال رکھتے تھے کہ دونوں کے ساتھ یکساں معاملہ ہو۔ چنانچہ حضرت عیاض بن غنم نے جب حران کو صلحاً فتح کیا تو اس شہر کے دیہات والوں نے کہا نحن اسوۃ اھل مدینتنا و رُوسائنا " ہم سے وہی معاملہ کیجئے جو آپ نے اہل شہر اور ہمارے رؤساسے کیا ہے " حضرت عیاض بن غنم نے اس کا کیا جواب دیا، قاضی ابو یوسف نے اس سے لاعلمی ظاہر کی ہے، لیکن اسکے بعد ہی لکھا ہے کہ:۔

فلما من ولی من خلفاء المسلمین بعد فتحها فانهم قد جعلوا اهل الرساتیق اسوۃ اهل المدائن[2]	مسلمانوں کے جو خلفا اس کی فتح کے بعد اس کے والی ہوئے انہوں نے گاؤں والوں کے ساتھ وہی معاملہ کیا جو اہلِ شہر کے ساتھ کیا تھا۔

اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ حضرت عیاض بن غنم کا جواب کیا ہوتا۔

فریقِ محارب سے برتاؤ | ایک قوم کی اخلاقی بلندی اور اس کے کردار کی عظمت کا اندازہ زیادہ صحیح طور پر اس سے ہوتا ہے کہ فریقِ محارب کے ساتھ جنگ میں اس کا برتاؤ کیا ہوتا ہے، اس پر اس کو بزورِ شمشیر فتح حاصل ہوتی ہے تو اس وقت وہ اس کے ساتھ کیا سلوک کرتی ہے اور اگر فریقِ محارب مغلوب ہو کر صلح کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے

[1] طبری ج ۲ ص ۵۵۷۔ [2] کتاب الخراج ص ۴۰۔

تو اس کی طرف سے صلح کی شرائط کی نوعیت کیا ہوتی ہے اور وہ اُن شرائط کی پابندی کس حد تک کرتی ہے، قدیم زمانہ میں ایران اور روم کی حکومتیں دشمنوں کے ساتھ جنگ میں کیا معاملہ کرتی تھیں، اس کو دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے، یہ دیکھو کہ اس دورِ تہذیب و تمدن میں بھی گذشتہ دو عالمگیر جنگوں میں دُوَلِ متحدہ نے جرمنی کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ اٹلی اور جاپان کے ساتھ کیا برتاؤ کیا گیا؟ اور جب ان سے صلح کی گئی تو اُس کے شرائط کیا تھے؛ ان مفتوح اقوام کی شہری آزادی کس حد تک باقی رکھی گئی، اُن کی قومی انفرادیت کہاں تک آزاد رہی؟ اور ان کے انسانی حقوق کا احترام کس درجہ تک ملحوظ رکھا گیا۔

حضرت خالد کی شجاعت و دلیری، اُن کی حربی قابلیت اور جنگی قیادت کی اعلےٰ صلاحیت کا حال تم پڑھ چکے ہو، اب یہ بھی سنو کہ یہی شیر بیشۂ شجاعت بحالت جنگ یا بحالت صلح دشمنوں کے ساتھ کس طرح پیش آتا تھا، سواد (عراق) کے دیہات بانقیا باروسما اور الیس کا سردار ابن صلوبا تھا۔ حضرت خالد سے وہ صلح کرنے پر مجبور ہوا تو حضرت خالد نے جو صلحنامہ لکھا اس کا مضمون یہ تھا۔

انک آمن بامان اللہ اذحقن دمک باعطاء الجزیۃ وقد اعطیت عن نفسک وعن اھل خرجک وجزیرتک ومن کان فی قریتک بانقیا وبارو سما الف درھم فقبلتھا منک ورضی من معی من المسلمین علی ذالک ولک ذمۃ اللہ وذمۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلم وذمۃ المسلمین علی ذلک[1]

تو اللہ کی پناہ میں ہے، جزیہ ادا کرنے کے بعد تیری جان محفوظ ہو گئی اور تو نے اپنی طرف سے اپنی رعایا، اپنے جزیرہ اور بانقیا اور باروسما کے لوگوں کی طرف سے ایک ہزار درہم جو دیئے وہ میں نے قبول کئے اور میرے ساتھ جو مسلمان ہیں وہ بھی اس پر رضامند ہیں۔ اور اب تو، اللہ اس کے رسول اور مسلمانوں کی ذمہ داری میں آگیا ہے۔

[1] طبری ج ۲ ص ۵۵۱۔

صلحنامہ حیرہ | اہلِ حیرہ کے نام جو عہدنامہ حضرت ابو بکر کے حکم سے لکھا گیا تھا وہ کافی طویل تھا، اُس کے اہم دفعات یہ تھے۔

(۱) ان لوگوں کا گرجا یا عبادت گاہ یا کوئی قصر جس میں یہ لوگ جنگ میں قلعہ بند ہوتے تھے، منہدم نہیں کیا جائے گا۔

(۲) ناقوس بجانے سے اُن کو نہیں روکا جائے گا۔

(۳) تیوہار کے موقع پر صلیب کا جلوس نکالنے سے انکو منع نہیں کیا جائیگا۔

(۴) یہ لوگ جزیہ ادا کرتے رہے تو ان کے ساتھ معاہد کا سا معاملہ کیا جائیگا اور ان کی حفاظت ہمارا فرض ہوگا۔

(۵) ان لوگوں کے مذہبی پیشوا اور عابد و زاہد جزیہ ادا کرنے سے مستثنیٰ ہونگے۔

(۶) ان میں جو بڈھے، ناکارہ اور اپاہج ہوں گے ان کا خرچ بیت المال کے ذمہ ہوگا۔

(۷) ان کو مسلمانوں کے فوجی لباس کے علاوہ اپنا ہر قسم کا لباس پہننے کی آزادی ہوگی۔

(۸) ان کا کوئی غلام اگر مسلمان ہو جائیگا تو بازار میں اس کی زیادہ سے زیادہ جو قیمت ہوسکتی ہے اُس قیمت میں بغیر عجلت کے اور بغیر کسی گھاٹے کے۔ اس کو فروخت کیا جائیگا اور وہ قیمت اس کے مالک کے حوالہ کردیجائے گی۔

(۹) یہ لوگ اگر مسلمانوں سے کسی قسم کی امداد طلب کریں گے تو اُن کو وہ مدد بیت المال سے دیجائیگی۔

ان دفعات و شرائطِ صلح کے ساتھ یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ یہ سب کچھ کتنی رقم کے بدلہ میں ہوا تھا؟ ان لوگوں کی اصل تعداد سات ہزار تھی! ایک ہزار ان میں وہ تھے جو اپاہج۔ معذور یا مذہبی پیشوا تھے ان کو خارج کرکے اب صرف

چھ ہزار بچے ان پر جو جزیہ لگایا گیا وہ ساٹھ ہزار درہم سالانہ تھا۔ یعنی دس درہم فی کس۔[1]
غور کرو، رواداری اور دشمن کے ساتھ حسنِ معاملہ کی اس سے بہتر کوئی اور بھی مثال ہو سکتی ہے؟

اس موقع پر یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ صلح یا امان بخشی کا یہ معاملہ خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی۔ دونوں حالتوں میں یکساں ہوتا تھا۔

اسلامی فوج کے اس فیاضانہ سلوک کا اثر یہ تھا کہ جنگ کے ختم ہوتے ہی اصل شہری زندگی پورے امن و اطمینان کے ساتھ لوٹ آتی تھی، کھیتی باڑی، باغات و نخلستان کسی کو کوئی نقصان نہیں پہونچتا تھا، مقامی باشندے آزادی کیساتھ اپنے اپنے کاروبار میں مصروف ہو جاتے تھے، اور ان کو مسلمانوں کی طرف سے کسی قسم کا خوف و ہراس یا بے اطمینانی نہیں ہوتی تھی۔

تعزیرات و حدود

تعزیرات و حدود (سزائیں) کا اصل مقصد انسدادِ جرائم ہے، لیکن مجرم مجرم میں فرق ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے جرم کی نوعیت بدل جاتی ہے، بعض اوقات ایک شریف اور نیک نفس انسان سے بحالتِ اضطراب کسی جرم کا ارتکاب ہو جاتا ہے ایسی حالت میں عدالت و انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ اگر مجرم خود اپنے جرم پر نادم اور پشیمان ہے اور سچے دل سے وہ اس سے توبہ کر رہا ہے تو حاکم کو چاہیئے کہ اس سے اغماض کرے اور سزا دے کر اس کو ارتکابِ جرم پر مزید جری نہ کرے گویا ایسے مجرم کو سزا نہ دینا ہی تعزیرات و حدود کے مقصد کو پورا کر دیتا ہے در اس کے برعکس

[1] کتاب الخراج قاضی ابو یوسف ص ۱۴۳، ۱۴۰۔

سزا دینے سے اوس کا مقصد فوت ہو جاتا ہے، لیکن یہ اسیوقت ہو سکتا ہے جب کہ بات ڈھکی چھپی ہو، اگر وہ جرم فاش ہو جائے تو پھر سزا دینا ناگزیر ہو جاتا ہے۔

چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہی تھا۔ جیسا کہ آپ نے ماعز بن مالک اور بعض دوسرے اشخاص کے بارے میں کیا، اسکے علاوہ خود آپکا ارشاد یہی ہے کہ:

تعافوا الحدود فیما بینکم فما بلغنی من حد فقد وجب۔ — تم حدود کو آپس میں ہی نمٹا دیا کرو لیکن جب بات مجھ تک پہونچے گی تو حد واجب ہو جائیگی۔

مجرم سے اغماض | اس ارشاد نبوی کے مطابق حضرت ابوبکرؓ کا دستور تھا کہ جب تک جرم فاش نہیں ہوتا تھا وہ کوشش کرتے تھے کہ مجرم سزا سے بچ جائے، خود ان کا بیان ہے کہ ماعز بن مالک نے جب تیسری مرتبہ بھی اعترافِ جرم کر لیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بھی رد کر دیا تو اب خود حضرت ابوبکر نے ماعز سے کہا کہ اگر تم نے چوتھی مرتبہ بھی اعترافِ جرم کر لیا تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم کو رجم کر دیں گے[۲] اس کہنے کا بالواسطہ منشا یہی تھا کہ ماعز چوتھی مرتبہ اقرار نہ کریں تاکہ سنگسار ہونے سے بچ جائیں، لیکن ان پر خوفِ خدا غالب تھا وہ نہ مانے اور آخر رجم ہونا پڑا۔

مرتدین کے احوال میں تم پڑھ چکے ہو کہ اشعث بن قیس جب گرفتار ہو کر آیا اور اُسنے صدقِ دل سے توبہ کر لی تو حضرت ابوبکر نے نہ صرف یہ کہ اس کی جان بخشی کی بلکہ اس کی درخواست پر اپنی بہن حضرت ام فروہ کا اس سے نکاح بھی کر دیا۔

عبرت ناک سزا | لیکن اگر جرم کی نوعیت شدید ہوتی اور بجائے ذاتی ہونے کے قومی جرم ہوتا تھا تو پھر حضرت ابوبکر اس کو معاف نہیں کرتے تھے بلکہ بے حد سخت سزا دیتے تھے تاکہ دوسروں کو عبرت ہو، ایاس السلمی جس نے ارتداد سے توبہ

---

[۱] ابوداؤد ج ۲ ص ۲۴۰ مصری [۲] مسند امام احمد بن حنبل ج ۱ ص ۸۔

کرنے کے بعد بدعہدی کی اور مسلمانوں کو قتل کرنا اور لوٹنا شروع کر دیا تھا، اس کے متعلق حضرت ابو بکر نے نہایت سخت حکم بھیجا کہ اس کو گرفتار کر کے آگ میں زندہ جلا دیا جائے۔[1]

حد شرب خمر | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں شارب خمر کے لئے کوئی خاص سزا متعین نہیں تھی، بلکہ حسب موقع و مصلحت کبھی اسکو پٹوا دیتے تھے تاکہ وہ نادم ہو کر آئندہ کے لئے توبہ کر لے اور کبھی کوڑے لگواتے تھے ان کوڑوں کی تعداد چالیس تھی، حضرت ابو بکر نے بھی بعینہ اسی کو جاری رکھا اور اس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں کیا، لیکن جب حضرت عمر فاروق کے عہد میں اس طرح کے واقعات زیادہ ہونے لگے تو آپ نے کوڑوں کی تعداد دوگنی یعنی چالیس سے اسی کر دی۔

صحیح بخاری میں ایک روایت ہے:

عن السائب بن يزيد قال كنا نؤتى بالشارب على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم وإمرة أبي بكر وصدرا من خلافة عمر فنقوم إليه بأيدينا ونعالنا وأرديتنا حتى كان آخر إمرة عمر فجلد أربعين

سائب بن یزید سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں اور ابو بکر کے عہد خلافت اور خلافت فاروقی کے آغاز میں کوئی شارب خمر ہمارے پاس لایا جاتا تو ہم اپنے ہاتھوں جوتوں اور چادروں کو ساتھ اس کی طرف کھڑے ہو جاتے تھے لیکن

[1] طبری ج ۲ ص ۴۹۳۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ حضرت ابو بکر نے بمقتضائے سیاست و مصلحت اس وقت تو اس کو یہ سزا دلوا دی، لیکن چونکہ کسی انسان کو آگ میں زندہ جلانا خواہ وہ کتنا ہی بڑا مجرم ہو۔ اسلام میں پسندیدہ نہیں ہے اسلئے حضرت ابو بکر کو اسکا برابر ملال رہا اور وفات کے وقت آپنے یہ تمنا ظاہر کی تھی کہ اے کاش آپ نے ایسا نہ کیا ہوتا، اسکا مفصل ذکر آگے اپنے موقع پر آئے گا۔

حتی اذا عتوا و فسقوا جلد ثمانین[۱] آخر عہد فاروقی میں حضرت عمر اسکو چالیس کوڑے مارنے لگے تھے اسکے بعد جب ان لوگوں میں سرکشی اور فحش بڑھ گیا تو پھر اسی کوڑے مارنے لگے۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ چالیس کوڑوں کی سزا حضرت عمر نے ایجاد کی تھی، حالانکہ یہ سزا خود عہدِ نبوت اور عہدِ صدیقی میں بھی دیجاتی تھی، چنانچہ عثمان بن عفان کی خلافت کے زمانہ کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ ولید بن عقبہ گرفتار ہوکر آیا اور دو شخصوں کی گواہی سے اس کا شراب نوشی کا جرم ثابت ہوگیا تو حضرت عثمان نے حضرت علی سے کہا کہ آپ اسپر حد جاری کیجئے، حضرت علی نے عبداللہ بن جعفر کو حکم دیا، انہوں نے ولید کے کوڑے مارنے شروع کئے، حضرت علی انہیں شمار کرتے جاتے تھے۔ جب پورے چالیس ہو گئے تو حضرت علی نے فرمایا۔ بس ختم کرد۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چالیس ہی کوڑ۔ مارے ہیں اور میں نے ان کو شمار کیا ہے۔ اور اس کے بعد ابوبکر کے عہد میں بھی چالیس ہی کوڑے مارے گئے ہیں، البتہ عمر نے اسّی کوڑوں کی سزا دی ہے۔ لیکن مجکو یہ اور اسکے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری سنتیں زیادہ محبوب ہیں[۲] اور یہی روایت زیادہ قرین قیاس ہے، کیونکہ لوگوں کا ہاتھوں یا جوتوں سے پیٹنا ایک ہنگامی تعزیر ہو سکتی۔ ہے اُس کو حد نہیں کہا جا سکتا اس کی علاوہ اگر کوڑوں کی سزا عہدِ نبوی میں بالکل نہ ہوتی تو حضرت ابوبکر اپنے مذاقِ طبعی کے مطابق خود یہ بدعت ایجاد نہیں کر سکتے تھے۔

حد سرقہ | سرقہ کی حد قرآن میں منصوص ہے اس لئے اس کی نسبت اختلاف نہیں ہو سکتا، البتہ حاکم کو اس بات کا اختیار ہے کہ اگر وہ یہ سمجھے کہ سارق نے بحالتِ اضطرار سرقہ کیا ہے تو اس کو معاف کر سکتا ہے، چنانچہ حضرت عمر فاروق کے عہد میں اسطرح

---

[۱] بخاری ج ۲ ص ۱۰۰۲ [۲] ابوداؤد باب الحد فی الخمر ج ۲ ص ۲۴۱۔

کے متعدد واقعات پیش آتے تھے جن میں سارق پر حد سرقہ جاری نہیں کی گئی تھی، حضرت ابوبکر کا بھی معمول یہ تھا کہ نابالغ چور پر حد جاری نہیں کرتے تھے[1]

حد زنا | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک غیر شادی شدہ شخص کو جس سے زنا صادر ہو گیا تھا کوڑے لگانے اور اس کے بعد جلا وطنی کی سزا دی تھی۔ حضرت ابوبکر نے بھی اسی پر عمل کیا۔ اور ان کے عہد میں ایسا ہی ایک واقعہ پیش آیا تو بھی سزا دی[2]

ذاتی معاملہ میں مسامحت | اگرچہ حضرت ابوبکر قومی و اجتماعی جرم کے باب میں کسی قسم کی نرمی اور ملاطفت کو روا نہیں رکھتے تھے۔ لیکن اگر کوئی جرم خود ان کی ذات یا شخصیت سے متعلق ہوتا تھا تو اس میں چشم پوشی یا اغماض سے کام لیتے تھے، ایک مرتبہ ایک شخص نے کوئی ناگوار حرکت کی تو حضرت ابوبکر اس پر سخت غضب ناک ہوئے ایک شخص نے کہا، اے خلیفۂ رسول! حکم کیجئے کہ میں اس کی گردن اڑا دوں' یہ سنتے ہی حضرت ابوبکر کا غصہ بالکل فرو ہو گیا اور اس شخص سے تعجب سے کہا کہ اگر میں تم کو حکم کرتا تو کیا واقعی تم اس کی گردن اڑا دیتے" اس کے بعد فرمایا" یاد رکھو! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد یہ کسی کے لئے جائز نہیں ہے[3]

---

[1] کتاب الخراج قاضی ابو یوسف ص ۱۰۵۔ [2] ازالۃ الخفا مقصد دوم ص ۳۸ بحوالہ البغوی۔ [3] مسند امام احمد بن حنبل ج ۱ ص ۹۔

دینی خدمات

اصلاحِ عقائد | اگرچہ حضرت ابوبکر کا مختصر عہدِ خلافت اندرونی اور بیرونی استحکام کی مہمات میں مصروف رہا اور یہ جو کچھ بھی تھا دین کے لئے ہی تھا، تاہم عام اصطلاح میں جسکو دینی خدمات کہا جاتا ہے، آپ اس سے بھی غافل نہیں رہے، اس سلسلہ میں آپکی بڑی کوشش یہ تھی کہ مسلمانوں میں اسلام اپنی اصل شکل وصورت میں قائم رہے اور اس کے رخِ روشن پر غلط افکار وتوہمات اور بدعات کی گرد نہ پڑنے پائے چنانچہ وفاتِ نبوی کے وقت آپ نے جو خطبہ دیا اس نے یہ حقیقت ثبت کردی کہ پیغمبر صاحبِ شریعت ہوتا ہے، اس پر وحی نازل ہوتی ہے اور اس حیثیت سے اس کا ہر عمل اسوہ اور اس کا ہر قول واجب الاتباع ہوتا ہے۔ لیکن بہرحال وہ ہوتا ہے بشر ہی اور اس لئے بشری حوائج وضروریات کا جہاں تک تعلق ہے اس میں اور دوسرے انسانوں میں کوئی فرق نہیں ہے اس لئے اگر حضور دنیا سے تشریف لے گئے تو یہ کوئی ایسی انوکھی بات نہیں ہے جو خلاف توقع ہو۔

پھر خلیفہ منتخب ہونے کے بعد آپ نے جو خطبہ ارشاد فرمایا اس میں صاف صاف یہ بتادیا کہ خلیفہ بھول چوک اور غلطی سے مبّرا نہیں ہوتا۔ کیونکہ پیغمبر کیطرح اس کے پاس وحی نہیں آتی۔ اس بناپر اگر خلیفہ سے غلطی ہوجائے تو اسلامی جماعت کا فرض ہے کہ وہ اسپر خاموش نہ رہے اور خلیفہ کی اصلاح کرے۔

آپ نے صاف فرمایا۔ وان زغت فقوّمونی ؛ بتاؤ اس آزادیِ ضمیر وقول کی مثال کسی جمہوریت میں مل سکتی ہے ؟ کسی نے آپ کو خلیفۃ اللہ کہہ کر پکارا تو اسکی بھی اصلاح کردی کہ نہیں میں اللہ کا نہیں بلکہ رسول اللہ کا خلیفہ ہوں۔

تعینِ زکوٰۃ کے خلاف آپ نے جو جہاد کیا وہ اس بات کی دلیل تھا کہ فرض فرض سب برابر ہیں، شریعت میں قطع و برید نہیں ہو سکتا۔ جو اس کو قبول کریگا، کُل کو قبول کرے گا اور ایک جز کا انکار کرنا کل کے انکار کے مرادف ہوگا۔

امر بالمعروف | قرآن مجید میں ایک آیت ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ	اے ایمان والو تم اپنی خبر لو۔ اگر کوئی گمراہ ہوتا
أَنفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا	ہے تو وہ تم کو کوئی نقصان نہیں پہونچا سکتا،
اهْتَدَيْتُمْ۔	بشرطیکہ تم ہدایت یافتہ ہو۔

اس آیت سے غلط فہمی ہو سکتی تھی کہ جب معاملہ اپنی اپنی ہی فکر کرنے کا ہے تو پھر اب امر بالمعروف۔ نہی عن المنکر اور تبلیغ و دعوت الی الحق کی ضرورت ہی نہیں ہے، حضرت ابوبکرؓ نے ایک مرتبہ خطبہ دیتے ہوئے یہ آیت پڑھی اور اس کے بعد فرمایا "تم لوگ یہ آیت پڑھتے ہو اور اس کی مراد صحیح نہیں سمجھتے، میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ اگر لوگ اپنے درمیان منکرات و فواحش ہوتے دیکھیں اور اسپر اپنی طرف سے ناراضگی کا اظہار نہ کریں تو بعید نہیں کہ ان گناہوں کی پاداش میں مرتکب اور غیر مرتکب دونوں ہی شامل کر لئے جائیں[1]

بدعات پر تنبیہ | ایک مذہب کے لئے سب سے بڑا فتنہ بدعات ہیں، حضرت ابوبکر کو اس کا بڑا خیال رہتا تھا اور جب ان کے علم میں کوئی بدعت آتی تھی تو فوراً اسپر تنبیہ فرماتے تھے، ایک مرتبہ حج کے موقع پر آپ کو معلوم ہوا کہ قبیلۂ احمس کی ایک عورت جس کا نام زینب تھا حج کر رہی ہے اور اس دوران میں کسی سے بات نہیں کر رہی ہے، آپ فوراً اس کے پاس تشریف لے گئے اور اس کو بتایا کہ حج کے اثنا میں گفتگو نہ کرنا اور خاموش رہنا جاہلیت کا طریقہ ہے[2]

---

[1] مسند امام احمد بن حنبل ج ۱ ص ۹ [2] صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۴۱ باب ایام الجاہلیۃ۔

تبلیغ و اشاعت اسلام | حضرت ابو بکرؓ جو فوج یا دستہ کہیں بھیجتے تھے اسکو یہ تاکید ہوتی تھی کہ محض اعلاء کلمۃ اللہ اور اشاعتِ اسلام اُن کا مقصد ہونا چاہیئے چنانچہ حضرت عدی بن حاتمؓ کی کوشش سے بنو طے خود بخود ارتداد سے تائب ہو کر مسلمان ہو گئے مثنیٰ بن حارثہ کی دعوت پر بنو وائل کے بہت سے بت پرست اور عیسائی حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے، حضرت خالدؓ کی مساعی سے عراقِ عرب اور حدودِ شام کے اکثر قبایل نے اسلام قبول کیا۔ طلیحہ جو خود مدعیِ نبوت تھا شام میں پناہ گزیں ہو کر مسلمان ہو گیا اور بطور معذرت یہ شعر لکھ کر بھیجے ؎

فھل یقبل الصدیق انی مراجع	کیا ابو بکر صدیق اس کو قبول کرینگے کہ میں واپس
ومعط بما احدثت من حدث یدی	آجاؤں، اور جو کچھ میں نے گناہ کئے ہیں اُن
وانی من بعد الضلالۃ شاھد	کی تلافی کردوں۔ اور گمراہی کے بعد میں بھی
شہادۃ حق لست فیھا بملحد[1]	گواہی دیتا ہوں جس سے میں ہٹنے والا نہیں ہوں

اس کے علاوہ حیرہ کے متعدد عیسائی راہبوں نے خود بخود اسلام قبول کیا۔

جمع قرآن

اس سلسلہ میں آپ کا سب سے زیادہ اہم اور بنیادی کام قرآن مجید کا جمع کرنا ہے اس کی تقریب اس طرح پیدا ہوئی کہ جنگِ یمامہ میں ایک ہزار دو سو مسلمان شہید ہوئے تھے جن میں انتالیس (۳۹) کبارِ صحابہ اور حفاظِ قرآن شامل تھے، یہ صرف ایک جنگ کا حال تھا۔ اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اور دوسری جنگوں میں جو نقصان ہوا اگر اس کو بھی ملا لیا جائے تو تعداد کہاں تک پہونچتی ہے اس کا احساس یقیناً

---

[1] یعقوبی ج ۲ ص ۱۴۵ -

حضرت ابوبکر کو ہوگا لیکن وہ اپنے مذاقِ طبعی کی بنا پر کسی ایسے کام کو کرنے کے لئے آمادہ نہیں تھے جو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ کیا ہو۔ حضرت عمر نے جرأت کی اور خدمتِ صدیقی میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ یمامہ کی جنگ میں قراء و حفاظ قرآن کا شدید نقصان ہوا ہے، اس لئے اگر آپ نے قرآن کو جمع کرنے کا بندوبست نہیں کیا تو اندیشہ ہے کہ قرآن کا بڑا حصہ ضائع ہو جائے گا۔ حضرت ابوبکر کا جواب وہی تھا کہ جس کام کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا میں اسے کیسے کر سکتا ہوں۔ حضرت عمر نے کہا کہ یہ کام تو خیر ہے، انہوں نے بار بار یہی بات کہی تو حضرت ابوبکر کو اطمینان اور شرحِ صدر ہوا۔ اب انہوں نے حضرت زید بن ثابت کو بلایا اور ان سے کہا "تم جوان آدمی ہو سمجھدار ہو ہم تم کو متہم نہیں کر سکتے،، تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتبِ وحی تھے، اس لئے قرآن کا تتبع (ادھر ادھر سے فراہم) کرو اور اس کو یکجا کر دو" زید بن ثابت کا بیان ہے کہ اگر حضرت ابوبکر مجھ کو کسی ایک پہاڑ کو اس کی جگہ سے ہٹا دینے کا حکم کرتے تو وہ اس حکم سے زیادہ گراں نہ ہوتا۔ اس کے بعد انہوں نے بھی وہی اشکال ظاہر کیا جو شروع میں حضرت ابوبکر نے کیا تھا۔ لیکن ان کے جواب میں حضرت ابوبکر نے وہی بات کہی جو حضرت عمر نے خود آپ سے کہی تھی یعنی یہ کام تو خیر ہی ہے، آخر کچھ رد و کد کے بعد زید بن ثابت کو بھی اطمینان ہو گیا اور انہوں نے قرآن مجید کے مختلف اجزا جو کپڑوں کے ٹکڑوں، درخت کی چھالوں اور کھجور کے پتوں پر لکھے ہوئے، یا سینوں میں محفوظ تھے ان سب کو بکمال احتیاط یکجا کر دیا، یہاں تک کہ خود زید بن ثابت کہتے ہیں کہ سورۂ توبہ کی دو آیتیں "لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ" اور "فَإِن تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ" الآیۃ حضرت خزیمہ انصاری کے پاس ہی محفوظ تھیں وہ بھی ان سے لے لیں[1]

[1] اسکے علاوہ سورہ احزاب کی ایک اور آیت تھی جس کو زید بن ثابت آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم سے سن چکے تھے، جب مصحف کی تدوین ہو چکی تو دیکھا کہ اس میں وہ آیت نہیں ہے آخر وہ بھی حضرت خزیمہ کے پاس ملی، دو آدمیوں کی شہادت لے کر اسکو بھی قرآن میں شامل کر دیا گیا، یہ تمام صحیفے جن میں قرآن یکجا کیا گیا تھا، حضرت ابوبکر کے پاس محفوظ تھے، آپ کے بعد حضرت عمر نے ان کی حفاظت کی، جب آپ کی بھی وفات ہو گئی تو یہ امانت حضرت حفصہ کے حصہ میں آئی[1]

ایک غلط روایت ایک روایت یہ ہے کہ سب سے پہلے جمع قرآن کا کام حضرت عمر بن خطاب نے کیا ہے[2] لیکن جیسا کہ ابھی معلوم ہوا یہ روایت صحیح نہیں ہے، اس میں شک نہیں ہے کہ جمعِ قرآن کی سب سے پہلے تحریک کرنے والے حضرت عمر ہی ہیں، لیکن اس کی تکمیل خلافتِ صدیقی کا کارنامہ ہے، راوی نے غلطی سے تحریک جمعِ قرآن کو خود جمع قرآن سمجھ لیا ہے؛ چنانچہ خود حضرت علی سے منقول ہے، ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ ابوبکر پر اللہ کی رحمتیں نازل ہوں۔ جمع مصاحف کے باب میں ان کا اجر سب سے زیادہ ہے، کیونکہ پہل انہوں نے ہی کی تھی۔ اس کے علاوہ اور بھی متعدد صحابہ کی شہادتیں اسی مضمون کی ہیں جو حدِ تواتر کو پہونچتی ہیں[3]

جمع قرآن کی اصل حقیقت اور ایک غلط فہمی کا ازالہ قرآن مجید کی جمع و ترتیب کے متعلق عام طور پر خیال یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک قرآن کی آیات منتشر تھیں، وہ ایک دوسرے سے مربوط نہ تھیں اور نہ سورتوں میں کسی قسم کی ترتیب تھی اور نہ ان سورتوں کے نام متعین ہوئے تھے، اس لئے عہدِ صدیقی میں جو کام ہوا وہ انہیں آیات و سُوَر کی ترتیب تھی، اس خیال کو بعض مستشرقین اور خصوصاً

---

[1] صحیح بخاری ج ۲ ص ۷۴۶ و ۷۴۵

[2] کتاب المصاحف لابن ابی داؤد - طبع اول المطبعۃ الرحمانیہ بمصر ص ۱۰

[3] کتاب المصاحف ابن ابی داؤد - ص ۵ -

سر ولیم میور اور آرتھر جیفرے جس نے کتاب المصاحف لابن ابی داؤد کو بڑی محنت سے اڈٹ کر کے مصر سے شائع کیا ہے ۔ بہت زیادہ پھیلا کر یہ دعوے کیا ہے کہ موجودہ قرآن اُس قرآن سے مختلف ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں تھا ۔

اس قسم کا خیال کرنا صرف علمی گمراہی نہیں بلکہ علمی بد دیانتی بھی ہے ، کیونکہ توی دلائل و براہین سے یہ بات ثابت ہے کہ قرآن کی آیات و سُوَر کی ترتیب خود عہدِ نبوت میں ہو چکی تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم اور آپ کے ارشاد کے مطابق ہی ہوتی تھی زید بن ثابت کا بیان ہے کہ میں نے پورا قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پڑھا ہے ۔ بخاری اور مسلم میں حضرت انس بن مالک سے روایت ہے کہ چار شخصوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں قرآن جمع کیا تھا اور یہ چاروں انصار تھے ، ان کے نام یہ ہیں ۔ ابی بن کعب ، معاذ بن جبل ۔ زید بن ثابت ۔ اور ابو زید[1] محمد بن اسحاق نے الفہرست میں سات صحابہ کے نام لکھے ہیں جنہوں نے عہدِ نبوت میں قرآن جمع کیا تھا ۔ دراصل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ تھا کہ آپ کے خاص خاص کاتب تھے جن پر آپ کو پورا اعتماد تھا ۔ جب کوئی آیت نازل ہوتی تھی تو آپ ان کاتبینِ وحی سے فرما دیتے تھے کہ اس آیت کو فلاں سورۃ میں شامل کر لو مذکورہ بالا روایت میں جن چار انصار کا ذکر آیا ہے ان کا کام درحقیقت قرآن کی کتابت کر کے ان کو اپنے پاس محفوظ کرنا تھا ، اسی حقیقت کو جمع کے لفظ سے تعبیر کر دیا گیا ہے ، اس موقع پر یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ حضرت انسؓ نے چار شخصوں کی جو تخصیص کی ہے تو اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ ان کے علاوہ عہدِ نبوت میں کوئی جامع قرآن تھا ہی نہیں کیونکہ بدلائل ثابت ہے کہ حضرت عثمانؓ ۔ حضرت علیؓ اور عبداللہ بن عمرو بن العاص بھی اس شرف کے حامل تھے ، اس بنا بر حضرت انس کی روایت کے معنی یہی ہو سکتے

[1] بخاری ج ۲ ص ۴۸ ۷ ۔

ہیں کہ انصار میں بھی چار کاتب تھے، غیر انصار دوسرے بھی تھے۔

اس کے علاوہ روایات متواترہ سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سال میں ایک مرتبہ قرآن مجید حضرت جبرئیل کو سنایا کرتے تھے اور جس سال آپ کی وفات ہوئی ہے اس سال آپ نے دو مرتبہ قرآن سنایا[1]

سطور بالا سے یہ صاف ظاہر ہے کہ قرآن مجید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں منتشر اور پراگندہ نہیں تھا بلکہ مرتب تھا، چنانچہ خود قرآن بھی اپنے متعلق یہی کہتا ہے۔ قرآن کو جگہ جگہ الکتاب کہا گیا ہے جس کے معنی مرتب اور نوشتہ کے ہیں۔ سورۃ المزمل میں فرمایا گیا۔

وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا — اور آپ قرآن کو ترتیل کے ساتھ تلاوت کیجئے۔

ظاہر ہے اگر قرآن مرتب ہی نہیں تھا تو پھر ترتیل کس چیز کی ہوگی۔

ترتیبِ سُوَر عہدِ نبوت میں

اب رہی یہ بات کہ سورتوں کے نام بھی عہدِ نبوت میں متعین ہوگئے تھے، تو اس کے ثبوت میں ایک دو نہیں متعدد روایات صحیحہ پیش کی جاسکتی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں، میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دہانِ مبارک سے ستر سورتیں پڑھی تھیں[2]

حضرت عمر فاروق کے اسلام لانے کے واقعہ میں مذکور ہے کہ جب وہ اپنی بہن اور بہنوئی کے گھر پہونچے تو دیکھا کہ ان کے ہاتھ میں ایک صحیفہ ہے اور اس میں سورۃ طٰہٰ لکھی ہوئی ہے۔

بعض اوقات کئی کئی آیات اک ساتھ نازل ہوتی تھیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو تلاوت فرمانے کے بعد کاتبینِ وحی کو حکم دیتے تھے کہ فلاں آیت فلاں سورت میں لکھی جائے۔

---

[1] بخاری ج ۲ ص ۷۴۸۔ [2] بخاری ج ۲ ص ۷۴۸۔

اس کے علاوہ متعدد احادیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں اور نماز کے علاوہ یوں بھی مکمل سورتیں پڑھتے تھے، مثلاً البقرہ۔ آل عمران۔ النساء وغیرہا پھر متعدد احادیث میں بعض خاص خاص سورتوں مثلاً سورۃ البقرۃ۔ الکہف، سورۃ الرحمٰن اور سورۂ یٰسین۔ کے فضائل بیان کئے گئے ہیں ان کے علاوہ بعض خاص خاص سورتوں کا ذکر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو خاص خاص نمازوں میں پڑھتے تھے۔ مثلاً صحیح بخاری میں ہے کہ آپ نے مغرب میں اعراف پڑھی، سورۃ اخلاص پڑھی، اور دوسری نمازوں میں آل عمران اور نساء تلاوت کی۔ یہ روایات اس کثرت سے منقول ہیں کہ حدیث کی کوئی کتاب مشکل سے ہی ان کے ذکر سے خالی ہوگی۔[1]

اوپر جو کچھ ہم نے لکھا ہے اس سے امور ذیل صاف طور پر ثابت ہو گئے۔

(۱) قرآن کی کتابت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میمنت مہد میں ہوئی تھی اور اس شد و مد کے ساتھ کہ آپ نے فرمایا تھا۔

لاتکتبوا عنی غیر القرآن۔ قرآن کے علاوہ مجھ سے تم کچھ اور نہ لکھو۔

(۲) ایک سورۃ میں آیات کی ترتیب بھی عہدِ نبوت میں، اور آپ کے حکم سے ہو گئی تھی۔

(۳) سورتوں کے نام کی تعیین بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہو گئی تھی،

صدیقی کارنامہ کی نوعیت

اب دیکھنا چاہیئے کہ جب یہ سب کچھ عہدِ نبوت میں ہی ہو چکا تھا تو پھر حضرت ابو بکر کے عہد میں جو جمع قرآن ہوا اُس کی کیا حقیقت ہے۔

اصل یہ ہے کہ اگرچہ عہدِ نبوت میں نفسِ قرآن مرتب تھا، لیکن اس کے اجزا منتشر تھے۔ کسی کے پاس کوئی جز تھا اور کسی کے پاس کوئی اور جز۔ کسی کے پاس سورت کامل تھی اور کسی کے پاس ناقص اور اس کی وجہ یہ تھی کہ جب وحی نازل ہوتی

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے صحیح بخاری ج ۲ ص ۳۹، ۵۰۰، ورسالہ فضائل القرآن ابن کثیر۔

تھی تواس وقت تمام کاتبینِ وحی توموجود ہوتے نہیں تھے، جو پاس ہوا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی اس کو لکھادی۔ پھر کتنے ہی لوگ تھے جو قرآن کی آیات کو براہِ راست آپ سے نہیں سن سکتے تھے، اس لئے ان تک وہ سُوَریا آیات بالواسطہ پہونچتی تھیں اور وہ بھی کبھی پوری اور کبھی آدھی۔ غرض کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک قرآن ایک مصحف کی شکل میں بین الدفتین موجود نہ تھا، وہ خود مرتب تھا، لیکن اس کے اجزا ایکجا نہیں تھے۔ متفرق حفاظ وقرا کے پاس متفرق اجزا تھے۔ اسی وجہ سے یمامہ کی جنگ میں حافظ اور قاری کثرت سے شہید ہوئے تو حضرت عمر کو اندیشہ ہوا کہ کہیں قرآن ضائع نہ ہوجائے، یعنی یہ ممکن تھا کہ جو حضرات شہید ہوجائیں قرآن کے بعض اجزا صرف انہیں کے پاس ہوں اور کسی دوسرے کے پاس نہ ہوں اگر ایسا ہوا تو ان حضرات کی شہادت کے بعد وہ اجزا پھر کہیں اور ملیں گے ہی نہیں اور دنیا ہمیشہ کے لئے اُن سے محروم ہوجائے گی۔

یہاں ایک یہ نکتہ یاد رکھنے کے لائق ہے کہ حضرت زید بن ثابت کو حضرت خزیمہ کے پاس سورۂ التوبہ کی دو آیتیں یا سورۂ احزاب کی جو ایک آیت ملی تو آخر انہوں نے یہ کسطرح پہچانا کہ یہ آیات توبہ اور احزاب کی سورتوں کی تھیں! اس سے معلوم ہوا کہ یہ سورتوں کی ترتیب اور اُن کے ناموں کی تعیین خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں ہی ہو گئی تھی[1]

بہرحال عہدِ صدیقی میں جو کام انجام پایا وہ یہی تھا کہ قرآن مجید کے متفرق اجزا کو

---

[1] یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ حضرت زید بن ثابت نے دو آدمیوں کی گواہی لے کر ان آیتوں کو جو مصحف میں داخل کردیا تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ بس یہ دو گواہ تھے، یقیناً اور بھی بہت سے لوگ اسکے شاہد ہونگے اور خود حضرت زید کو ان کے قرآنی آیات ہونیکا پورا علم تھا، اسی وجہ سے تو وہ انکی تلاش کررہے تھے لیکن چونکہ قانون کا منشا دو آدمیوں کی گواہی سے پورا ہوجاتا ہے اسلئے صرف دو کی گواہی پر اکتفا کرلیا گیا۔

ایک مصحف کی شکل میں یکجا کر دیا گیا، چنانچہ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں۔

قد اعلم اللہ تعالیٰ فی القرآن بانہ مجموع فی الصحف فی قولہ یتلو صحفا مطہرۃ الآیۃ وکان القرآن مکتوبا فی الصحف لکن کانت متفرقۃ فجمعہا ابوبکر فی مکان واحد[1]

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں یہ پہلے ہی بتا دیا تھا کہ وہ صحیفوں میں جمع ہے، چنانچہ اس نے فرمایا یتلو صحفاً مطہرۃ۔ اور قرآن صحیفوں میں لکھا ہوا تھا، لیکن وہ صحیفے (مختلف اجزا جو الگ الگ لکھے ہوئے تھے) منتشر تھے پس ابوبکر نے انکو ایک جگہ جمع کر دیا۔

حضرت ابوبکر کے تأمل کی وجہ

غور کرو حافظ صاحب نے کیا عجیب نکتہ پیدا کیا ہے، یہ خیال ہو سکتا تھا کہ جب جمع قرآن کی حقیقت اتنی ہی تھی تو پھر آخر حضرت ابوبکر کو اس میں پس و پیش کیوں ہوا؟ اور انہوں نے یہ کیسے فرمایا کہ جس کام کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا، میں اس کو کیونکر کر سکتا ہوں؟ حافظ صاحب کی تقریر بالا سے واضح ہو گیا کہ حضرت ابوبکر کے تأمل کی وجہ یہ تھی کہ قرآن نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت یہ بیان کی ہے کہ آپ لوگوں کے سامنے صحف (نہ کہ مصحف) کی تلاوت کرتے ہیں، اور قرآن آپ کی وفات تک رہا بھی صحف کی ہی شکل میں نہ کہ مصحف کی صورت میں اب حضرت ابوبکر اس کو مصحف کی شکل میں جمع کرائیں گے تو وہ کہیں بدعت اور اسوۂ رسول سے تجاوز تو نہیں ہو جائیگا! پس یہ خیال تھا جس کے باعث حضرت ابوبکر کو تامل ہوا لیکن بعد میں حضرت عمر کے بار بار کہنے سے آپ کو اطمینان ہو گیا۔

حضرت ابوبکر اور حضرت عثمان کے جمعِ قرآن میں فرق

اگرچہ جمع قرآن دراصل حضرت ابوبکر کا کارنامہ ہے لیکن اس سلسلہ میں سب سے زیادہ شہرت حضرت

---

[1] فتح الباری ج ۹ ص ۱۰

عثمان خلیفۂ سوم کی ہے اور عام طور پر اُن کو ہی جامعِ قرآن سمجھا جاتا ہے. لیکن دونوں کے کارناموں میں بڑا فرق ہے۔

حضرت عثمان کے جمع قرآن کی حقیقت یہ ہے کہ شام اور عراق کی فتح کے بعد جب اسلامی مملکت کے حدود وسیع ہو گئے تو مختلف مصاحف جو مختلف صحابہ کے پاس محفوظ تھے وہ تمام مملکت میں پھیل گئے، اور ہر شہر کے لوگوں نے اپنے اپنے مقامی حفاظِ قرآن کی قرأت کے مطابق اس کو پڑھنا شروع کر دیا، چنانچہ اہل کوفہ عبداللہ بن مسعود کے نسخہ مصحف کے مطابق قرأت کرتے تھے اہلِ بصرہ ابوموسی اشعری۔ اہل دمشق مقداد بن الاسود، اور اہلِ شام ابی بن کعب کے نسخوں کے مطابق قرأت کرتے تھے، یہ اختلاف اگرچہ قرأت کا تھا لفظ اور عبارت کا نہیں تھا. لیکن قرأت کا یہ وسیع اختلاف لفظوں کے الٹ پھیر تک بھی وسیع ہو سکتا تھا۔ اور ضرورت تھی کہ اس کی حد بندی کی جائے اور اس سلسلہ میں حکومت کی طرف سے کوئی قدم اٹھایا جائے، اسی اثنا میں ایک یہ واقعہ پیش آیا کہ آرمینہ اور آذربائیجان کی سرحد پر جنگ ہو رہی تھی، وہاں حضرت حذیفہ بن الیمان نے دیکھا کہ اہلِ عراق اور اہلِ شام کی قرأت میں بڑا شدید اختلاف ہے. یہ دیکھ کر اُن کو بڑی تشویش ہوئی. حضرت عثمان کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ اے امیر المومنین قبل اس کے کہ یہ امت گمراہ ہو اور وہ اپنی کتاب (قرآن) میں ایسے ہی باہم گر... مختلف ہوں جیسے کہ یہود و نصاریٰ ہیں، آپ اس کا سدِ باب کیجئے. حضرت عثمان نے حضرت حفصہ بنت عمر کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ کے پاس (حضرت ابوبکر کا جمع کردہ) جو مصحف ہے اس کو بھیج دیجئے۔ ہم اس کے متعدد نسخے تیار کرا لیں گے اور پھر آپ کے پاس آپ کا نسخہ واپس بھیج دیں گے. حضرت حفصہ نے تعمیل کی اب حضرت عثمان نے مصحفِ ابی بکر کی نقل پر حضرت زید بن ثابت سعید بن العاص

عبدالرحمن بن الحارث اور عبداللہ بن زبیر کو مقرر فرمادیا اور ان حضرات میں تین جو
قریشی تھے ان کو حکم دیا کہ جس قرأت کے متعلق تم میں اور زید بن ثابت میں
اختلاف ہو اس میں قریش کی زبان کی پیروی کرو۔ کیونکہ قرآن قریش کی
زبان میں نازل ہوا ہے۔ جب یہ سب نسخے تیار ہو گئے تو خلیفۂ ثالث نے ایک
ایک نسخہ ایک ایک صوبہ میں بھیجدیا۔ ان کے علاوہ جتنے نسخے اور تھے ان کو سپرد
آتش کرنے کا حکم دیا۔[1]

اس تقریر سے معلوم ہوا ہوگا کہ حضرت ابوبکر نے قرآن مجید کے مختلف
اجزا کو جو پراگندہ اور بکھرے ہوئے تھے اُن کو ایک جگہ بین اللوحین میں جمع کیا تھا
اور اختلافِ قرأت سے تعرض نہیں کیا تھا۔ اس کے برخلاف حضرت عثمان
نے اسی مصحف ابی بکر پر اعتماد کر کے اور اس کو بنیاد قرار دے کر قرائتیں متعین
کردی تھیں جو سبعہ قرأت کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کے علاوہ باقی قرأتوں
کو غیر مستند قرار دیا گیا اور ان قرأتوں کے حامل جو نسخے تھے ان کو جلا دیا گیا۔

چنانچہ علامہ جلال الدین السیوطی نے قاضی ابوبکر سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا،

لم يقصد عثمان قصد ابي بكر في جمع نفس القرآن بين اللوحين وانما قصد جمعهم على القرأت الثابتة المعروفة عن النبي صلى الله عليه وسلم والغاء ماليس كذالك[2]	ابوبکر نے نفس قرآن کو لوحین کے درمیان جمع کرنے کا جو کام کیا تھا، عثمان نے اس کا ارادہ نہیں کیا بلکہ ان کا منشا صرف یہ تھا کہ جو قرأتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت اور معروف ہیں اُن پر مسلمانوں کو جمع کردیں اور ان کے علاوہ جو دوسری قرأتیں ہیں ان کو ضائع کردیں۔

[1] صحیح بخاری ج ۲ ص ۷۴۶، باب جمع القرآن۔ [2] الاتقان فی علوم القرآن ج ۱ ص ۱۰۳۔

صدیقی کارنامہ کی اہمیت | حضرت ابوبکر کے اس عظیم الشان کارنامہ کی اہمیت اور عظمت اس سے زیادہ اور کیا ہوسکتی ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ الدہلوی لکھتے ہیں:۔

یہی جمع قرآن در مصاحف ہے جس پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ منطبق ہوتا ہے اور جس کی بشارت۔ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ" میں موجود ہے[1]

جب تک دنیا میں قرآن اور ایک کلمہ گو بھی موجود ہے حضرت ابوبکر کے احسان سے امتِ مسلمہ عہدہ برآ نہیں ہوسکتی۔

عہدِ صدیقی میں تمدنی حالت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ہی اگرچہ عربوں کی تمدنی زندگی پر بداوت کی جگہ حضارت کا رنگ چڑھنا شروع ہوگیا تھا۔ چنانچہ زمانۂ قبل اسلام میں گھروں کے اندر بیت الخلاء کا رواج نہیں تھا، مدینہ کی ہجرت کے بعد اس کا رواج ہوا اور اس میں اس بات کا خیال رکھا گیا کہ بیت الخلا گھر کے اندر تو نہ ہوں مگر ان سے متصل ہوں[2] اس کے علاوہ لباس میں وضع قطع میں، نشست و برخاست میں تہذیب و شائستگی پیدا ہوئی، تاہم سادگی برابر قائم رہی۔ اور تکلفات کا کبھی کوئی دخل نہیں ہوا، سادگی کا یہ انداز عہدِ صدیقی میں بھی رہا تاہم عراق اور شام میں اس زمانہ کی دو مہذب اور ترقی یافتہ قوموں۔ ایرانیوں اور رومیوں کے ساتھ اختلاط کے باعث کچھ کچھ تکلفات کا عمل دخل ہونا شروع ہوگیا تھا چنانچہ حضرت ابوبکر اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کے درمیان اول الذکر کے مرضِ وفات میں جو مکالمہ ہوا ہے اس میں حضرت ابوبکر نے استخلافِ حضرت عمر کے سلسلہ میں بہ طور طنز و تعریض فرمایا ہے کہ "تم لوگ دیبا کے گدے بچھونے اور

[1] ازالۃ الخفا حصۂ دوم ص ۵۔ [2] صحیح بخاری ج ۲ حدیث الافک۔

رشیمین پردے استعمال کرنے لگے ہو اور آذر بائیجانی اون کے بنے ہوئے کپڑوں سے تم کو تکلیف ہوتی ہے[۵۱]

عرب زمانۂ قبل اسلام سے ہی ایک درمیانی منزل تھے جس کے ذریعہ چین۔ انڈونیشیا۔ ہندوستان اور ایران کے مصنوعات اور پیداوار چیزیں مصر اور مغربی ممالک میں آتی جاتی تھیں۔ اس تقریب سے عربی شاعری میں ہندی تلواروں، ہندی مسالون، عود، صندل، کافور اور زنجبیل وغیرہ کا ذکر ملتا ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ چیزیں عرب میں مستعمل تھیں۔

لباس عربوں کا لباس شروع میں عموماً ایک رداء اور ایک ازار پر مشتمل ہوتا تھا لیکن بعد میں جب تمدن نے ترقی کی تو درع (کرتہ) قمیص۔ پاجامہ (سروال) اور بنیان وغیرہ بھی مستعمل ہونے لگا۔ جس پر عربی زبان کے الفاظ شعار اور دثار دلالت کرتے ہیں اسکے علاوہ مرد باہر نکلتے تھے تو سر پر عمامہ باندھتے اور جبہ پہنتے تھے، اور عورتیں سر پر رومال باندھتی تھیں یا اوڑھنی اوڑھتی تھیں جس کو خمار یا معجر کہتے ہیں، زیورات میں بازوبند کڑے۔ بالی۔ اور انگوٹھی اور چھلّے کا استعمال کرتی تھیں۔ ہار، لونگ کا بھی استعمال ہوتا تھا جسے سخاب کہتے ہیں، غزوۂ بنی مصطلق کے سفر میں حضرت عائشہ کا جو ہار گم ہو گیا تھا جزع یمانی کا تھا۔[۵۲] سرمہ اور مہندی کا استعمال بھی ہوتا تھا۔ ورس ایک قسم کی سرخ گھاس ہے جو کہ بطور غازہ چہرہ پر ملتی تھیں، خوشبو میں مشک عنبر اور زعفران کا استعمال ہوتا تھا۔

غذا غذا عام طور پر سادہ ہوتی تھی۔ دودھ۔ کھجور اور گوشت عربوں کی محبوب غذا تھی گوشت مختلف ترکیبوں سے پکایا جاتا تھا جس کا ثبوت ان کثیر التعداد الفاظ سے ہوتا ہے جو عربی میں گوشت کے لئے اس زمانہ میں مروج تھے، اور جن کی فہرست ثعالبی کی کتاب فقہ اللغۃ میں یکجا مل سکتی ہے۔ اسیطرح کھجور اور دودھ کو بھی متعدد طریقوں پر استعمال کیا جاتا تھا

---

۵۱ الکامل للمبرد ج ا س ۵۔ ۵۲ سنن ابوداؤد باب التیمم۔

مکھن اور پنیر کا بھی رواج تھا حریرہ بھی مستعمل تھا ترکاریوں میں کدو چقندر کا ذکر احادیث میں بھی ہے، کدو حضور کو بہت مرغوب تھا، باقلا کا بھی ذکر آیا ہے، سرکہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بہترین سالن فرمایا ہے، مزید تفصیلات بخاری کے باب کتاب الاطعمہ اور زاد المعاد ابن قیم سے معلوم ہو سکتی ہیں ۔

ذرائع معاش | یورپین مصنفین کا عام خیال ہے کہ اسلام کے مسلمانوں کی معاش کا سب سے بڑا ذریعہ مالِ غنیمت تھا، یہ بالکل غلط خیال ہے، کیونکہ مالِ غنیمت میں حصہ دار صرف وہی لوگ ہو سکتے تھے جو جہاد میں شریک ہوتے تھے اور ظاہر ہے ان کی تعداد عام آبادی کی تعداد کے مقابلہ میں بہت تھوڑی ہوتی تھی۔ عہدِ نبوی میں اور اس کے بعد عہدِ صدیقی میں بھی اصل اسلامی معاشرہ کے عناصر ترکیبی مہاجرین اور انصار یہ ہی دو گروہ تھے اور ان میں سے ہر ایک کا طبقاتی ذریعہ معاش الگ الگ تھا، مہاجرین تجارت کرتے تھے اور انصار کھیتی باڑی کا کام کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہ پر جب کثرتِ روایت کی وجہ سے بعض لوگوں نے نکتہ چینی کی تو آپ نے فرمایا، میرے مہاجرین بھائی تجارتی کاروبار میں مصروف رہتے تھے اور میرے انصار بھائی کھیتی باڑی کرتے تھے اور میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ہر وقت موجود رہتا تھا[1] مہاجرین میں جو حضرات تجارت میں نامور تھے ان میں حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت عبد الرحمٰن بن عوف، حضرت سعد بن ابی وقاص خاص طور پر مشہور ہیں۔ مہاجرین کا اصل پیشہ اگرچہ تجارت تھا لیکن مدینہ میں انصار کے ساتھ مواخات کے باعث ان میں سے بعض کھیتی باڑی کرنے لگے تھے۔

آزاد تجارت | اسلام سے پہلے عرب کے مشہور بازار عکاظ، ذوالمجنہ اور ذوالمجاز تھے جہاں مختلف قبائل کے لوگ اپنا اپنا تجارتی مال لے کر آتے تھے اور بیچتے تھے، لیکن ان کی یہ تجارت آزاد نہیں تھی، ان سے محصول لیا جاتا تھا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

---

[1] صحیح بخاری کتاب البیوع۔

مدینہ میں ایک اور بازار قائم کیا تھا اور اس کی خصوصیت یہ تھی کہ یہاں کوئی ٹیکس نہیں دینا پڑتا تھا۔ آپ نے جب اس کو قائم کیا تو فرمایا۔

ھذا سوقکم لاخراج علیکم فیہ[۱]۔ یہ تمہارا بازار ہے اسمیں کاروبار کرنے پر کوئی ٹیکس نہیں ہے۔

گھریلو دستکاری اور آزاد پیشے

تجارت اور فلاحت کے علاوہ صحابۂ کرام کا ذریعہ معاش گھریلو دستکاری اور دوسری قسم کے محنت مزدوری کے کام بھی تھے اسلامی تعلیمات کے زیر اثر کسبِ حلال کا ادنیٰ سے ادنیٰ ذریعہ اختیار کرنے میں بھی ان کو ذرا جھجک نہیں ہوتی تھی اور اس میں ان کو عار نہیں آتی تھی، چنانچہ حضرت سلمان فارسی چٹائی بُنتے تھے[۲]، حضرت سعد الانصاری پتھر پر پھاوڑا چلاتے تھے[۳] بعض صحابہ شہد کی مکھیوں کی پرورش اور ان کی نگہداشت کا کام کرتے تھے[۴] حضرت سودہ طائف کے چمڑہ کا کاروبار کرتی تھیں جس کی وجہ سے ان کی مالی حالت تمام ازواجِ مطہرات سے بہتر تھی، کچھ صحابہ حدادی اور نجاری کا پیشہ کرتے تھے بعض نے معادن کا ٹھیکہ لیا تھا جس کا ذکر قاضی ابو یوسف کی کتاب الخراج میں ہے۔

عہد صدیقی میں وظائف نہ ہونے کی وجہ

حضرت عمر فاروق نے اپنے عہدِ خلافت میں سب لوگوں کے حسبِ مراتب وظیفے مقرر کر دیئے تھے۔ لیکن چونکہ حضرت ابو بکر اس نکتے سے واقف تھے کہ وظائف کی وجہ سے لوگوں میں تن آسانی پیدا ہو جاتی ہے اور محنت و جفاکشی کی عادت باقی نہیں رہتی، اس لئے آپ نے کسی تندرست آدمی کا وظیفہ مقرر نہیں کیا، جو کچھ آیا اُس کو اسی وقت تقسیم کر کے برابر کر دیا۔ چنانچہ جب حضرت عمر نے سب مسلمانوں کے وظائف مقرر کرنے کا ارادہ کیا تو اس پر حضرت ابو سفیان بن حرب نے یہ اعتراض کیا تھا کہ

---

[۱] فتوح البلدان بلاذری ص ۲۱ [۲] استیعاب تذکرہ حضرت سلمان فارسی [۳] اسد الغابہ تذکرہ سعد الانصاری۔ [۴] سنن ابی داؤد باب زکوٰۃ العسل

ان فرضت الناس اتکلوا علی الدیوان و ترکوا التجارۃ[1] — آپ نے اگر سب کا وظیفہ مقرر کر دیا تو لوگ اسی پر بھروسہ کر کے بیٹھ جائیں گے اور کاروبار کرنا چھوڑ دینگے۔

عام سماجی حالت | اسلامی معاشرہ بہترین معاشرہ تھا، جس میں عورتوں کو پورے حقوق حاصل تھے، غلاموں اور باندیوں کے ساتھ نہایت شریفانہ اور فیاضانہ معاملہ کیا جاتا تھا، ملک میں مکمل امن و امان تھا، حضرت عمر عہدِ صدیقی میں چیف جسٹس تھے لیکن دو برس تک ان کے پاس کوئی مقدمہ ہی نہیں آیا۔ خلیفہ عمّالِ حکومت اور عام مسلمان ان کے طرزِ رہائش میں کوئی فرق ہی نہیں تھا ایک معمولی حیثیت کا مسلمان بھی بلا تردد خلیفۂ وقت کے کسی فعل پر برسرِ عام نکتہ چینی اور خردہ گیری کرسکتا تھا، غیر مسلموں کو مکمل طور پر مذہبی آزادی حاصل تھی اور مسلمانوں کے اور ان کے باہمی تعلقات نہایت خوشگوار اور ہمدردانہ تھے، اور ان کو ترقی کرنے علم حاصل کرنے کے پورے مواقع حاصل تھے۔

اجتہاد و قیاس

قیاس عہدِ نبوت میں | قرآن و سنت میں اگرچہ اصول و کلیات کے علاوہ سینکڑوں جزئی مسائل بھی بیان کئے گئے ہیں لیکن یہ ظاہر ہے کہ تمدن اور اجتماع کی ترقی کے ساتھ ساتھ سینکڑوں ہزاروں ایسے مسائل پیش آتے رہتے ہیں جن کا ذکر قرآن و حدیث میں نہیں ہے، ایسے مسائل کو حل کرنے کا طریقہ اس کے سوا کوئی اور نہیں ہوسکتا کہ اجتہاد اور قیاس سے کام لیا جائے، چونکہ شریعت کی جامعیت اور عالمگیری کے ساتھ اس چیز کا بہت گہرا تعلق ہے، اس لئے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں اس کو صاف طور پر بتا دیا گیا تھا چنانچہ تم پہلے پڑھ آئے ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] فتوح البلدان بلاذری ص ۴۶۳۔

نے حضرت معاذ بن جبل کو جب قاضی بنا کر یمن بھیجا تھا تو آپ نے ان سے پوچھا کہ تم لوگوں کے درمیان کس طرح فیصلا کروگے؟ متعدد سوال و جواب کے آخر میں انہوں نے کہا کہ اگر میں کسی حکم کو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ میں نہیں پاؤں گا تو اجتہاد کا اس میں اپنی رائے استعمال کروں گا۔[1] ظاہر ہے اس اجتہاد بالرائے کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ جو معاملہ پیش آئیگا اس کی شبیہ و نظیر کا حکم قرآن و سنت میں تلاش کرونگا اور معاملۂ زیر بحث کو اسپر قیاس کرکے اس کا حکم اسپر لگا دونگا، اور یہی تعریف قیاس شرعی کی ہے جو استنباطِ احکام کے اصولِ اربعہ میں سے ایک اصل ہے۔ ورنہ کتاب و سنت سے قطع نظر محض رائے زنی کوئی دلیل شرعی نہیں ہو سکتی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ بن جبل کا یہ جواب سنکر ان کو آفریں کہی اور خوشی سے انکے سینہ پر دستِ مبارک رکھا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ قیاس کا وجود خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں پایا جاتا تھا اور اس کے دلیلِ شرعی ہونے کی توثیق خود آپ نے کردی تھی۔[2]

استنباط احکام کے اصولِ ثلاثہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکر کا معمول تھا کہ جب کوئی مسئلہ ان کے سامنے آتا تھا تو کتاب اللہ کی طرف رجوع کرتے تھے، اگر اس میں مل گیا تو اس پر عمل کرتے تھے ورنہ سنتِ رسول سے مراجعت کرتے تھے، اگر اس میں بھی کامیابی نہ ہوتی تو پھر مسلمانوں کو جمع کرکے دریافت کرتے کہ کیا تم میں سے کسی کو اس کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی عمل معلوم ہے۔ اگر ایسا کوئی شخص ملجاتا تو اسپر اللہ کا شکر ادا کرتے اور اگر اس میں بھی ناکامی ہوتی تو منتخب اور اعاظم صحابہ کو جمع کرکے ان سے مشورہ لیتے اور جس پر سب متفق ہو جاتے اسکا حکم دیدیتے تھے۔[3]

---

[1] مسند امام احمد بن حنبل ج ۵ ص ۲۳۰ [2] لیکن افسوس ہے مولانا شبلی محض اس شوق میں کہ قیاس کی ایجاد اور اسکو حجتِ شرعیہ بنانے کا سہرا حضرت عمر فاروق کے سر باندھیں اس کو تسلیم نہیں کرتے اور ساتھ ہی اسکے منکر ہیں کہ حضرت ابوبکر کے عہد میں قیاس کا وجود پایا جاتا تھا (دیکھو الفاروق نامی پریس حصہ دوم ص ۱۹۴)

[3] سنن الدارمی مطبوعہ دمشق ج ۱ ص ۵۸ بروایت میمون بن مہران۔

چنانچہ ایک مرتبہ دادی کی وراثت کا مسئلہ پیش آیا، قرآن مجید میں اس کے متعلق کوئی حکم تھا نہیں اس لئے آپ نے سنت کیطرف رجوع کیا۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ نے بتایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جدہ (دادی) کو ایک سدس یعنی ⅙ حصہ دلاتے تھے حضرت ابو بکر نے اس پر شہادت طلب کی۔ حضرت محمد بن مسلمہ نے حضرت مغیرہ کی تصدیق کی اور آپ نے یہی حکم نافذ کر دیا[۱]

اصل رابع یعنی قیاس | ان روایتوں سے استنباطِ احکام کے اصولِ ثلاثہ یعنی قرآن، سنت اور اجماع کا عہد صدیقی میں معمول بہا ہونا ثابت ہوتا ہے، رہی اصلِ رابع یعنی قیاس تو حضرت ابو بکر اجماع نہ ہونے کی صورت میں قیاس سے کام لیتے تھے اور جو بات حق معلوم ہوتی تھی اس کا اعلان کر دیتے تھے، چنانچہ کلالہ کے متعلق آپ سے پوچھا گیا تو چونکہ قرآن و سنت میں اس کا مفہوم واضح نہیں تھا اس لئے آپ نے فرمایا کہ "میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا؛ اگر صواب ہوا تو اللہ کی طرف سے ہوگا ورنہ شیطان کی طرف سے[۲]" پھر تعینِ زکوٰۃ کے معاملہ میں ایسا ہی ہوا۔ حضرت عمر فاروق تک کی رائے خلاف تھی لیکن حضرت ابو بکر نے زکوٰۃ کو نماز پر قیاس کیا، کیونکہ فرضیت و اہمیت کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں تھا اور پھر جس طرح نماز کا منکر مرتد ہے اسی طرح مانعینِ زکوٰۃ کو مرتد قرار دے کر ان سے قتال کو واجب قرار دیا۔ غور کرو کیا یہ صورت بعینہٖ قیاس کی نہیں ہے؟ شاہ ولی اللہ حضرت ابو بکر کے اس طرزِ استدلال کے متعلق فرماتے ہیں۔

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ جب لوگ لاالہ الا اللہ کہدیں گے تو ان کی جانیں اور مال محفوظ ہو جائیں گے۔ الا بحقہا۔ مگر ہاں اس وقت نہیں جب کہ وہ کسی ایسی چیز کا ارتکاب کریں جس کی وجہ سے ان سے قتال

---

[۱] سنن ابی داؤد کتاب الفرائض باب فی الجدۃ۔ [۲] سنن الدارمی ج ۲ ص ۳۶۵ مطبوعہ دمشق۔

کرنا ضروری ہو جائے۔ اس حدیث کو حضرت عمر جو مانعینِ زکوٰۃ کے ساتھ
قتال کرنے کے حق میں نہیں تھے اپنے استدلال میں پیش کرتے تھے
لیکن اسی روایت سے حضرت ابو بکر اپنی رائے پر استدلال کرتے تھے
اور اُن کے استدلال کی تقریر یہ تھی کہ نماز کا الا بحقہا کے ماتحت شامل
ہونا مسلم ہے، اور چونکہ زکوٰۃ بھی نماز کی ہی طرح ایک اہم فرض اور
دین کی بُنیاد ہے اس لئے زکوٰۃ کے منع کرنے والوں کا حکم بھی وہی
ہوگا۔ شاہ صاحب کے آخر الفاظ یہ ہیں۔

• وزکوٰۃ مقیس است بروے بقیاسِ جلی [1]

اسی طرح حضرت ابو بکر سے ایک مرتبہ جد (دادا) کی وراثت کا حکم جو قرآن میں
مذکور نہیں ہے اور جس کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی عمل بھی معلوم
نہیں تھا۔ پوچھا گیا تو آپ نے اس کو اب (باپ) پر قیاس کرکے فرمایا کہ میراث
کے معاملہ میں دادا کا حکم وہی ہے جو باپ کا ہے [2] اس کی مزید تشریح آگے آتی ہے۔
مالک بن نویرۃ کے واقعہ میں حضرت ابو بکر نے حضرت خالد کی طرف سے جو خونبہا
ادا کیا تھا وہ بھی بر بنائے قیاس تھا، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود
حضرتِ خالد کے اسیطرح کے ایک واقعہ میں ایسا کیا تھا۔

خیبر و فدک کا مسئلہ اسی ذیل میں خیبر و فدک کا مسئلہ آتا ہے، یہ مسئلہ ایک مدت
تک مسلمانوں میں بحث و تکرار کا موضوع بنا رہا ہے، اس سلسلہ میں حضرت علی
اور حضرت عباس کو جو اصرار رہا اور جو ناگواری پیش آئی اُس نے واقعہ کی اہمیت
بڑھا دی ہے، اسلئے ہم اس پر تفصیل سے کلام کرتے ہیں۔

اصل واقعہ اصل واقعہ یہ ہے کہ خیبر کی فتح کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] ازالۃ الخفا حصہ دوم ص ۲۰ [2] صحیح بخاری ج ۲ ص ۹۹۰۔

نے اس کو ۳۶ حصوں پر تقسیم کیا، ان میں سے ۱۸ حصے اپنے لئے مخصوص کیے اور باقی حصص دوسرے لوگوں پر تقسیم کر دیئے۔ اس سے فراغت کے بعد جب آپ واپس ہوئے تو محیصہ بن مسعود الانصاری کو دعوتِ اسلام کی غرض سے اہلِ فدک کے پاس بھیجا۔ یوشع بن نون ان کا سردار تھا اہلِ فدک نے صلح کی درخواست کی اور نصف زمین معاہدہ میں دینی منظور کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو قبول فرمالیا اوس وقت سے یہ زمین آپ کے لئے مخصوص ہوگئی[۱]۔ آپ کی وفات کے بعد حضرت فاطمہ اور حضرت عباس، حضرت ابوبکر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور خیبر و فدک کی زمینوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جو حصہ تھا اوس کا بحیثیت وارث مطالبہ کیا، اس کے جواب میں حضرت ابوبکر نے کہا "میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ہمارا کوئی وارث نہیں ہوگا۔ جو کچھ ہم چھوڑ جائیں گے وہ صدقہ ہوگا اور آلِ محمد اُس مال میں سے کھائیں گے۔ اس کے بعد حضرت ابوبکر نے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس کام کو جس طرح کرتے تھے میں اس کو اسیطرح کروں گا۔ حضرت فاطمہ یہ سنکر کبیدۂ خاطر واپس چلی گئیں اور جب تک زندہ رہیں حضرت ابوبکر سے کلام نہیں کیا[۲]۔

اصل واقعہ اسی قدر ہے، لیکن طبری اور بلاذری نے اس سلسلہ میں جو اور چند روایات نقل کی ہیں ایک فن کا نکتہ شناس پہچان سکتا ہے، کہ وہ وقت کی رنگ آمیزی سے خالی نہیں بہرحال ہم کو اس وقت اُن کی تنقید مقصود نہیں ہے، صرف اسپر بحث کرنا ہے کہ اس مسئلہ میں حضرت ابوبکر نے جو فیصلہ کیا وہ کہاں تک حق بجانب تھا اور کیوں تھا؟۔

[۱] فتوح البلدان بلاذری ص ۳۳ و ۳۶ [۲] صحیح بخاری ج ۲ ص ۹۹۶ کتاب الفرائض یہی روایت بخاری میں تھوڑے بہت الفاظ کی کمی بیشی کیساتھ باب الخمس اور باب المغازی میں بھی ہے

حضرت ابوبکر کے فیصلہ کے وجوہ

اس میں شک نہیں کہ خیبر اور فدک میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جو حصہ تھا وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مخصوص تھا چنانچہ حضرت عمرؓ کے سامنے جب یہ معاملہ آیا تو آپ نے آیتِ ذیل پڑھی۔

وَمَآ اَفَآءَ اللّٰہُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مِنْھُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَیْہِ مِنْ خَیْلٍ وَّلَا رِکَابٍ وَّلٰکِنَّ اللّٰہَ یُسَلِّطُ رُسُلَہٗ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔	اور اللہ نے اپنے رسول کو جو چیز بہ طور فئے کے دی ہے تو تم نے اس پر اپنے گھوڑے یا سواریاں نہیں دوڑائی تھیں۔ لیکن اللہ جس پر چاہتا ہے اپنے رسولوں کو مسلط کر دیتا ہے اور اللہ ہر شے پر پوری قدرت رکھنے والا ہے۔

خالصۂ رسول ہونے کا مطلب

اور اس آیت میں جس فئے کا ذکر ہے اس سے خیبر اور فدک مراد لیا اور ساتھ ہی فرمایا۔ فکانت ھذہ خالصۃ لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم[1] لیکن ایک پیغمبر۔ ایک بادشاہ اور ایک صدر ریاست کے لئے کسی چیز کے خاص ہونے کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں، ایک یہ کہ وہ چیز اس کی ملکیتِ ذاتی ہو، اور دوسری یہ کہ صدر ریاست ہونے کی حیثیت سے وہ اس کے اخراجات کے لئے وقف ہو۔ پہلی صورت میں صدر ریاست کے انتقال کے بعد وہ شے اس کے ورثہ میں تقسیم ہو جاتی ہے لیکن دوسری صورت میں چونکہ وہ ذاتی نہیں ہوتی اس لئے وارثوں میں تقسیم نہیں ہوتی، بلکہ اس کے بعد جو شخص صدرِ ریاست ہوتا ہے اس کی طرف منتقل ہو جاتی ہے، حضرت ابوبکر (اور حضرت عمر بھی) خیبر اور فدک کو بے شبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے خاص مانتے تھے، لیکن پہلی صورت کا خاص ہونا نہیں جس میں وراثت چلتی ہو بلکہ دوسری صورت کا جس کو لازمی طور پر خلیفۂ رسول کی طرف منتقل ہونا چاہیئے۔ مسند امام احمد بن حنبل میں بسند صحیح مروی ہے کہ حضرت فاطمہ نے حضرت

---

[1] صحیح بخاری ج ۱ باب الخمس۔

ابوبکرؓ کے پاس پیغام بھیجا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وارث آپ ہیں یا اُن کی اولاد تو حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا، میں نہیں بلکہ آپ کے متعلقین (اھل)! اب حضرت فاطمہؓ نے کہلایا کہ اچھا! تو پھر رسول اللہ کا حصہ کہاں ہے؟ اس کا جواب حضرت ابوبکرؓ نے یہ دیا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ "اللہ تعالےٰ اپنے نبی کو کھلاتا ہے۔ لیکن جب وہ اس کو دنیا سے اٹھا لیتا ہے تو جو اس نبی کا حصہ ہوتا ہے وہ اس شخص کی تحویل میں چلا جاتا ہے جو اس کا قائم مقام ہوتا ہے"[1]

اس کے علاوہ حضرت عروۃ بن الزبیر سے بھی ایک روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ازواجِ مطہرات حضرت عائشہؓ کے پاس آئیں اور خیبر و فدک میں سے اپنے حصہ کا مطالبہ کیا۔ حضرت عائشہؓ نے جواب دیا "کیا تم کو خوفِ خدا نہیں ہے؟ کیا تم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں سنا کہ "ہمارا کوئی وارث نہیں ہوگا۔ ہم جو کچھ چھوڑ جائیں گے وہ صدقہ ہوگا۔ جب میں دنیا میں رہوں تو میرا حصہ اس شخص کے لئے ہوگا جو میرا خلیفہ ہو۔ حضرت عائشہؓ کی یہ تقریر سن کر ازواجِ مطہرات نے اپنا مطالبہ واپس لے لیا"[2]

حضرت ابوبکرؓ کے بعد جب یہ معاملہ حضرت عمرؓ کے سامنے آیا تو آپ نے بھی یہی فرمایا۔

هما صدقة رسول الله صلى الله عليه وسلم كانتا لحقوقه التي تعروه ونوائبه وأمرهما الى من ولي الأمر قال وهما على ذالك اليوم ۔[3]

خیبر اور فدک دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقہ (وقف) تھے اور آپ کے ذمہ جو حقوق تھے انکے لئے اور آپکی ضرورتوں کیلئے تھے اور انکا معاملہ اس شخص کے سپرد ہے جو خلیفہ ہو اور یہ دونوں آج تک اسی حالت اور حیثیت میں ہیں۔

خیبر و فدک کے مصارف | خیبر و فدک کی اس حیثیت کے متعین ہو جانے کے بعد حضرت

[1] ج ۱ ص ۴۔ [2] فتوح البلدان بلاذری ص ۳۰، [3] مسند امام احمد بن حنبل ج ۱ ص ۶۔

ابوبکر کو حق تھا کہ صدرِ ریاست اور خلیفۂ رسول کی حیثیت سے خیبر و فدک کی آمدنی کو اپنی ذات اور اپنے بال بچوں کے اخراجات کے لئے مخصوص کریں۔ لیکن ادب و احترام نبوی اور اہلبیتِ اطہار کے ساتھ آپ کو جو محبت اور عقیدت تھی اس کا تقاضا تھا کہ آپ نے ان دونوں کی آمدنی کے مصارف بعینہٖ وہی قائم رکھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں تھے، اور اس کا ایک حبہ بھی اپنے لئے یا اپنی اولاد کے لئے روا نہیں رکھا عہدِ نبوی میں خیبر و فدک کا مصرف یہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے متعلقین کا سال بھر کا خرچ اسی میں سے پورا کرتے تھے اور اس کے علاوہ مسلمانوں کی ضرورتوں پر خرچ کرتے تھے[۱]

حضرت ابوبکر کا بھی یہی معمول رہا، جہاں تک اہلبیت کا تعلق ہے آپ نے فرمایا۔

والذی نفسی بیدہٖ لقرابۃ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم احب الی من ان اصل من قرابتی[۲]

جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اسکی قسم! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ دار مجھکو اس سے زیادہ عزیز ہیں کہ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کروں۔

مزید ارشاد ہوا۔

سمعت ان النبی لا یورث ولکنی اعول من کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یعول وانفق علی من کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ینفق[۳]

میں نے سنا ہے کہ نبی کا کوئی وارث نہیں ہوتا لیکن اس کے باوجود میں ان سب کی سرپرستی کرونگا جن کی سرپرستی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کرتے تھے اور ان سب پر خرچ کرونگا جن پر آپ خرچ کرتے تھے۔

غور کرو فرض اور محبت کے درمیان حسنِ توازن و تناسب کی مثال کیا کوئی اس سے

---

[۱] صحیح بخاری ج ۲ کتاب الفرائض [۲] و [۳] مسند امام احمد ابن حنبل ج ۱ ص ۱۰۔

بہتر بھی ہو سکتی ہے؟

حضرت شاہ ولی اللہ الدہلوی لکھتے ہیں:۔

"مشکل آنکہ اگر میراث دہند مخالف قاعدہ شرع باشد واگر ندہند ملالِ خاطر اہلبیت لازم آید۔ حضرت صدیق دریں باب حدیثے روایت کرد کہ میراث بردن را از پیغامبر صلی اللہ علیہ وسلم وبودن ایں قری مملوکِ وے صلی اللہ علیہ وسلم ہر دو مقدمہ را منع نمود و باحضرت فاطمہ و سائر اہل بیت آنقدر ملاطفت فرمود کہ جبرِ نقصان آں آزردگیہا شد"[1]

حضرت فاطمہ زہرا کا طرزِ عمل اب سوال یہ ہے کہ کیا حضرت ابوبکر کے اس سب کچھ کرنے کرانے کے بعد بھی سیدۃ النسا حضرت فاطمہ زہرا کا دل ان کی طرف سے صاف ہوا؟ اگرچہ متعدد روایات میں مذکور ہے کہ حضرت فاطمہ نے آخیر عمر تک حضرت ابوبکر سے کلام نہیں کیا، لیکن اول تو جن راویوں نے یہ نقل کیا ہے صرف ان کا ایک اندازہ اور قیاس ہے پھر ان روایات کے جو راوی ہیں ان میں بعض وہ بھی ہیں جن میں تشیع پایا جاتا تھا، حافظ عماد الدین ابن کثیر لکھتے ہیں:۔

ولعلہ راوی بمعنی ما فہمہ بعض الرواۃ وفیہم من فیہ تشیع فلیعلم ذالک۔[2]	اور شاید بعض راویوں نے جیسا سمجھا اس کو ہی بالمعنی روایت کر دیا اور یہ بھی معلوم رہنا چاہیئے کہ ان راویوں میں بعض وہ بھی ہیں۔ جن میں تشیع تھا۔

جن راویوں نے حضرت فاطمہ کی تا وقت وفات ناراضگی بیان کی ہے وہ حضرت فاطمہ کا کوئی فقرہ ایسا نقل نہیں کرتے جو انہوں نے حضرت ابوبکر سے گفتگو کے بعد کہا ہو اور جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ حدیثِ نبوی سننے کے بعد بھی ان کا ملالِ خاطر

[1] ازالۃ الخفاء حصہ دوم ص ۲۹ [2] البدایۃ والنہایۃ ج ۵ ص ۲۸۹۔

دور نہیں ہوا۔ اس بنا پر قیاس یہی ہو سکتا ہے کہ یہ محض راوی کا اپنا احساس ہے لیکن اس کے مقابلہ میں ایک اور روایت ہے جس میں صاف طور پر مذکور ہے کہ حضرت ابو بکر کی زبان سے حدیثِ نبوی سننے کے بعد حضرت فاطمہ نے فرمایا۔

فانت وما سمعت من رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اعلم[1]	تو پھر آپ نے رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم سے جو سنا ہے۔ آپ اسکو زیادہ جانتے ہیں۔

اِس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت فاطمہ کو کوئی ملال نہیں رہا تھا اور قرینِ قیاس و مقتضائے روایت بھی یہی ہے، حضرت ابو بکر کی زبان سے ارشادِ نبوی سننے کے بعد حضرت فاطمہ کے سامنے صرف دو ہی صورتیں تھیں یا تو وہ اس حدیث کا انکار کرتیں اور یا اس کو صحیح تسلیم کرتیں، پہلی صورت ناممکن تھی اس لئے کہ اول تو خود حضرت ابو بکر کا کسی حدیث کو بیان کرنا اس کی صحت کی سب سے بڑی دلیل تھا اور پھر یہاں تو حضرت صدیق تنہا نہیں تھے، بلکہ ازواجِ مطہرات۔ حضرت علی، عباس۔ عثمان، عمر فاروق۔ عبدالرحمٰن بن عوف۔ طلحہ بن عبداللّٰہ۔ زبیر بن عوام سعد بن ابی وقاص۔ ابو ہریرہ اور حضرت عائشہ یہ سب حدیث کی صحت کے گواہ تھے۔ جیسا کہ بخاری کتاب الفرائض کی روایت سے ظاہر ہے، اس بنا پر حضرت فاطمہ کے لئے حدیث کی عدمِ صحت کا تصور کرنا بھی ناممکن تھا۔ اب لامحالہ دوسری صورت باقی رہتی ہے تو کیا ایک لمحہ کے لئے بھی حضرت فاطمہ کی نسبت باور کیا جا سکتا ہے کہ حدیث کی صحت تسلیم کرنے کے باوجود ان کا تکدرِ طبع دور نہیں ہوا اور انہوں نے اپنا مطالبہ بخوشی واپس نہیں لے لیا، صاف و صریح ارشادِ نبوی سننے کے بعد اپنے مطالبہ پر اصرار ایک ادنیٰ درجہ کے مسلمان سے متوقع نہیں ہو سکتا چہ جائیکہ سیدۃ النساء حضرت زہرا بتول سے جو معدنِ الفقر فخری کا گوہرِ تابندہ اور فلکِ درویشی و بےنفسی کا

---

[1] مسند امام احمد ج ۱ ص ۴۔

ماہِ درخشندہ تھیں۔ سرورِ عالم کی جس لختِ جگر نے چکی پیس پیس کر اپنے ہاتھوں پر گٹے ڈال لیئے ہوں اور کبھی اُف نہ کی، کبھی دولت و ثروت کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا ہو کہ یہی استغنا اور یہی شانِ فقر اس خانوادۂ قدس کا طغرائے امتیاز تھا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ وہ چند قرصہائے سیم و زر کی وراثتی ملکیت کے داغ اپنے دامانِ فقر و استغنا پر گوارا کر سکتی تھی؟ فھل من مدکر:۔ [1]

حضرت ابو بکر کی مجتہدانہ بالغ نظری پھر بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ وقتی طور پر ایک معاملہ پیش آیا اور حضرت ابو بکر نے اس کا جواب دیدیا، بلکہ درحقیقت حضرت ابو بکر کا یہ فیصلہ جو فرمودۂ نبوت کی روشنی میں تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ عظمت و شان کو قائم رکھنے کا ضامن تھا۔ حیاتِ انبیا کا جو عقیدہ ہے اس کی رسمی توضیح و تشریح سے قطع نظر یہ مسلم ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر وہ تمام احکام جاری نہیں ہوئے جو عام لوگوں کی موت پر طاری ہوتے ہیں۔ چنانچہ آپ کی ازواجِ مطہرات عدت میں نہیں بیٹھیں اور آپ کے بعد اُن سے کسی اور کا نکاح کرنا جائز نہیں تھا اس بنا پر حضرت ابو بکر کو اس بات کا یقین تھا کہ وراثت بھی جو عام اہلِ دنیا کے عوائدِ رسمیہ میں سے ہے ایک پیغمبر آخرالزماں کی شایانِ شان نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان تو یہ تھی کہ جو کچھ آپ کے

---

[1] اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جسکو حافظ عماد الدین ابن کثیر نے حافظ ابو بکر البیہقی کے حوالہ سے نقل کیا ہے، اس روایت کا حاصل یہ ہے کہ حضرت ابو بکر حضرت فاطمہ کی علالت کے دنوں میں عیادت کیلئے تشریف لیگئے تو حضرت فاطمہ نے آپکو گھر میں بلا لیا، دونوں میں گفتگو ہوئی اور آخر حضرت فاطمہ حضرت ابو بکر سے خوش ہو گئیں۔ ابن کثیر نے اس روایت کی سند کو جید قوی کہا ہے (البدایہ ج ۵ ص ۲۸۹) اسپر کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ بہر حال اس روایت سے بھی یہ تو ثابت ہو ہی گیا کہ حضرت فاطمہ ناراض تھیں اگرچہ بعد میں انکا دل صاف ہو گیا، اسکا جواب یہ ہے کہ حضرت فاطمہ کو کچھ ناگواری ہوئی یا نہیں اس سے قطع نظر حضرت ابو بکر کو اسکا خیال ضرور ہو گا کہ جگر گوشۂ رسول نے ایک مطالبہ کیا اور وہ اسکی تعمیل نہ کر سکے بس صرف یہی خلش تھی جسکی وجہ سے وہ حضرت فاطمہ کے پاس معذرت خواہی کے لئے گئے تھے۔

پاس تھا اس کو آپ نے صرف اپنی ذات اور اپنی صُلبی اولاد کے لئے کبھی مخصوص نہیں رکھا، بلکہ اس پر سب مسلمانوں کا حق تھا۔ چنانچہ آپ نے فرمایا۔

انا اولی بالمؤمنین من انفسھم فمن مات وعلیہ دین ولم یترک وفاءً فعلینا قضاءہ ومن ترک مالاً فلورثتہ [۱]

میرے اوپر مسلمانوں کا حق اتنا ہے کہ خود ان پر بھی ان کا نہیں ہے، اس لئے جو مسلمان مقروض مر جائے اور کافی ترکہ نہ چھوڑے تو اس قرض کو ادا کرنا ہمارے ذمہ ہے، اور جو شخص کچھ مال چھوڑے تو وہ اس کے وارثوں کے لئے ہوگا۔

اسی بنا پر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے فدک کے متعلق ایک مرتبہ ایک جماعت کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ۔

• فدک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تھا، آپ اس میں سے خرچ کرتے تھے اور اسی میں سے بنوہاشم کے فقرا پر خرچ کرتے تھے انکی بن بیاہی لڑکیوں کا نکاح کرتے تھے۔ حضرت فاطمہ نے ایک مرتبہ درخواست کی کہ آپ فدک ان کے نام ہبہ کر دیں تو آپ نے انکار فرما دیا۔ [۲]

پس غور کرو جس رحمت عالم کی یہ شان ہو اور جس نے زکوٰۃ اور صدقہ وخیرات کو اپنے خاندان کے لئے ناجائز قرار دیدیا ہو۔ کیونکر ممکن تھا کہ اس کے دنیا سے

---

[۱] صحیح بخاری ج ۲ ص ۹۹۰ [۲] سنن ابی داؤد کتاب الفرائض باب فی صفایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عمر نے حضرت علی وعباس وغیرہما کے سامنے آیت وما افاء اللہ علی رسولہ الآیۃ پڑھی اور اس سے استدلال کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جو کچھ تھا اسمیں ایک مسلمان بھی ایسا نہیں تھا جسکا حق نہ ہو، نیز یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی خیبر فدک کی آمدنی سے مسلمانوں کیلئے اسلحہ اور گھوڑے وغیرہ خریدتے تھے اور اپنا اور اپنے متعلقین کا سال بھر کا خرچ پورا کرنیکے بعد قومی وملی مصارف میں خرچ کرتے تھے۔ اصل الفاظ جو بخاری میں بھی ہیں وہ یہ ہیں فیجعل مجعل مال اللہ بخاری ج ۱ ص ۴۳۶ وسنن ابی داؤد کتاب الفرائض۔

روپوش ہو لتے ہی اس کے ترکہ کے حصے بخرے کر لئے جاتے اور چند افراد خاندان میں اسکو محدود کر کے عام مسلمانوں کو اس کے انتفاع سے محروم کر دیا جاتا، آپ کا ارشاد وما ترکنا صدقۃ۔ جو کچھ ہم چھوڑ جائیں گے وہ سب مسلمانوں کے لئے وقف ہوگا۔ اسی نکتہ کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کی گرہ کشائی خلیفۂ رسول کے ناخن اجتہاد نے کی۔

حضرت علی اور حضرت عباس کا اصرار

جہاں تک اس واقعہ کے ساتھ حضرت ابو بکر کی ذات کا تعلق ہے مسئلہ بالکل صاف ہو جاتا ہے لیکن آخر میں بحث کو مکمل کرنے کی غرض سے مختصراً اس قدر اور لکھ دینا ضروری ہے کہ اب ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اچھا مانا! حضرت فاطمہ کو حضرت ابو بکر کی زبان سے ارشادِ نبوی سننے کے بعد اطمینان ہو گیا لیکن اس کی کیا وجہ ہے کہ حضرت علی اور حضرت عباس کو پھر بھی اصرار رہا اور انکی تشفی نہیں ہوئی، اس کا جواب یہ ہے کہ جہاں تک وراثت کا معاملہ تھا اس کے متعلق ان دونوں حضرات کو بھی اطمینان اور اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ خیبر و فدک وقف ہیں! لیکن وہ اس چیز کو ضروری نہیں سمجھتے تھے کہ خلیفۂ وقت ہی اس کا متولی ہو۔ اُن کا ذاتی خیال تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اہلِ قرابت کو اس کا متولی ہونا چاہیئے، اس کے علاوہ ان حضرات کا خیال یہ بھی تھا کہ یہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقربا کے لئے وقف ہیں نہ کہ تمام مسلمانوں کے لئے، حضرت عمر فاروق اور حضرت علی و عباس میں جو طویل مکالمہ اکابرِ صحابہ کی موجودگی میں ہوا ہے اور جو صحیح بخاری میں متعدد ابواب کے ماتحت مذکور ہے اس کو دیکھو تو صاف نظر آئیگا کہ مکالمہ کا موضوع وراثت نہیں بلکہ در اصل یہی دو چیزیں ہیں ان میں سے پہلی چیز یعنی وقف کا متولی ہونا تو چونکہ خلیفہ کا حق تھی اور ایک صاحبِ حق اگر چاہے تو وہ کسی دوسرے کے حق میں اس سے دست بردار ہو سکتا ہے اس بنا پر اہلبیتِ اطہار کی دلجوئی کی خاطر حضرت عمر نے خیبر و فدک کی تولیت اور اس کا انتظام و انصرام حضرت علی اور حضرت عباس کی طرف منتقل کر دیا تھا۔ لیکن

دوسری چیز یعنی مصارفِ وقفِ فدک تو چونکہ ما ترکنا صدقۃ کے ارشاد نبوی کے ماتحت منصوص تھی اس لئے حضرت عمرؓ یا کسی اور شخص کو اس میں تغیر و تبدل کرنے کا حق نہیں تھا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے مذکورۂ بالا دونوں حضرات کو جب فدک کی ولایت سپرد کی تو ان سے صاف لفظوں میں اس بات کا عہد کرا لیا کہ وہ اس کی آمدنی ان تمام مصارف کے لئے کھلی رکھیں گے جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کو صرف کرتے تھے، اس کے بعد بتاکید فرمایا۔

فان عجزتما فادفعاها الی فانی اکفیکماها۔	اگر تم دونوں اس شرط کو پورا نہ کر سکو تو تم مجھے واپس کر دو۔ تمہاری طرف سے میں اس کا انتظام کر دوں گا۔

ابوداؤد نے روایت کی ہے کہ حضرت علیؓ کے عہد میں بھی فدک مسلمانوں کے لئے صدقہ ہی تھا۔[۱]

کلالہ کی بحث حضرت ابوبکر صدیقؓ کے مجتہدات و قیاسات میں ایک مشہور مسئلہ دادا کی وراثت کا بھی ہے، اس کی تفصیل یہ ہے، قرآن مجید میں ایک آیت ہے۔

یَسْتَفْتُونَكَ ۔ قُلِ اللّٰهُ یُفْتِیْكُمْ فِی الْكَلٰلَةِ اِنِ امْرُؤٌ هَلَكَ لَیْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّ لَهٗۤ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ وَهُوَ یَرِثُهَاۤ اِنْ لَّمْ یَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ (نساء)	اے محمد! لوگ آپ سے دریافت کرتے ہیں، آپ ان سے کہد یجئے کہ اللہ کلالہ کے بارہ میں تم کو یہ حکم دیتا ہے کہ اگر کوئی مرد لاولد مرے اور اس کی بہن ہو تو اسکو ترکہ میں سے آدھا ملیگا اور اگر بہن مرجائے اور اسکی اولاد نہ ہو تو یہ بھائی اُسکا وارث ہوگا۔

اس آیت میں جو لفظ کلالہ آیا ہے اس میں اختلاف ہے کہ اس سے کیا مراد ہے؟ اس پر

---

[۱] صحیح بخاری ج اول ص ۴۳۵ و ج ۲ ص ۹۹۶ بعض محدثین کا خیال ہے کہ حضرت عمر نے حضرت علی اور عباس کو جس کا متولی بنایا تھا وہ خیبر و فدک نہیں بلکہ مدینہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جو خالصہ تھا وہ تھا، لیکن بخاری کی روایات سے ایسی کوئی تخصیص ظاہر نہیں ہوتی۔

سب کا اتفاق ہے کہ کلالہ اس شخص کو کہتے ہیں جس کی وفات پر نہ اس کے باپ ہو اور نہ بیٹا۔ لیکن آگے چلکر اختلاف اس میں ہوگیا کہ کلالہ کے مفہوم میں دادا کا نہ ہونا بھی داخل ہے یا نہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عبداللہ بن زبیر اور حضرت عبداللہ بن عباس کی رائے یہی تھی کہ داخل ہے، یعنی دادا کا حکم وہی ہے جو باپ کا ہے حضرت ابوبکر کے عہد میں توکسی نے اس کی مخالفت نہیں کی[1] لیکن بعد میں متعدد صحابہ کی رائے اس کے خلاف ہوگئی۔

اس اختلاف کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ فرض کرو ایک شخص کا انتقال ہوا اور اس نے اپنے بعد ایک دادا اور بہن بھائی چھوڑے تو اب سوال یہ ہے کہ دادا کے ہوتے ہوئے بہن بھائی کو ورثہ ملیگا یا نہیں۔ حضرت ابوبکر کی رائے کے مطابق جواب نفی میں ہے کیونکہ دادا کا حکم وہی ہے جو باپ کا ہے۔ پس جس طرح باپ کی موجودگی سے بہن بھائی محجوب الارث ہوجاتے اسیطرح دادا کی موجودگی سے بھی ہوجائیں گے۔

اس مسئلہ میں حضرت ابوبکر کا استدلال یہ تھا کہ

(۱) قرآن مجید میں ایک اور آیت ہے جس میں کلالہ کا لفظ آیا ہے۔

وَإِنْ كَانَ رَجُلٌ يُورَثُ كَلَالَةً	اگر ایک مرد کلالہ ہونے کی حالت میں مرجائے یا کوئی
أَوِ امْرَأَةٌ وَلَهُ أَخٌ أَوْ أُخْتٌ فَلِكُلِّ	عورت اور اس کے ماں شریک بہن بھائی ہوں
وَاحِدٍ مِنْهُمَا السُّدُسُ۔	تو ان میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا۔
(النساء)	

اس آیت میں کلالہ سے مراد سب کے نزدیک وہ شخص ہے جس کے نہ باپ ہو اور نہ دادا، چنانچہ کہتے ہیں کہ اگر دادا ہوگا تو پھر علاتی بہن بھائی محجوب الارث ہوجائینگے اس بنا پر کوئی وجہ نہیں ہے کہ جب یہاں کلالہ کے معنی میں دادا کو باپ کے برابر کہا گیا

---

[1] بخاری ج ۲ کتاب الفرائض۔

ہے تو یہی تشریح پہلی آیت میں ملحوظ نہ رکھی جائے۔

(۲) جہاں تک حاجب ہونے کا تعلق ہے ابن الابن یعنی پوتے کا وہی حکم ہے جو ابن کا ہے۔ پس جب فروع میں یہ حال ہے تو کیا وجہ ہے کہ اب الاب یعنی دادا کا حکم باپ کا سا اصول میں نہ ہو۔

(۳) اجد باپ کی طرح اصل نسب ہے اس لئے جو حکم باپ کا ہوگا وہی دادا کا ہونا چاہیئے۔[1]

غرض کہ حضرت ابو بکر صدیق اسلام میں پہلے شخص ہیں جنہوں نے اجتہاد کے لئے قاعدے اور ضابطے مقرر کئے۔ آج تک مسلمانوں کا عمل انہیں ضوابط پر ہے۔ شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں:۔

"اہم مہمات نزدیک حضرت صدیق آن بود کہ برائے امت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قاعدہ مرتب فرماید تا در مسائلِ اجتہادیہ بکدام راہ سلوک نمائند و ترتیب ادلۂ شرعیہ بچہ اسلوب عمل آرند الی یومنا ہذا۔ ہمہ مجتہدین برہمیں قاعدہ عمل می کنند و وے رضی اللہ عنہ شیخ و استاد جمیع مجتہدین شد۔"[2]

بچہ کس کو دیا جائے

کسی بچہ کے ماں باپ میں اگر جدائی ہو جائے تو بچہ کس کے سپرد کیا جائے گا؟ اس بارہ میں حضرت ابو بکر کا فیصلہ یہ تھا کہ ماں کے سپرد کیا جائے، چنانچہ حضرت عمر نے ایک انصاریہ عورت سے شادی کی تھی اور اس کے بطن سے ایک بچہ جس کا نام عاصم تھا پیدا بھی ہو چکا تھا۔ بعد میں حضرت عمر نے بیوی کو طلاق دے دی اسکے بعد ایک دن حضرت عمر قبا تشریف لے گئے تو دیکھا کہ عاصم مسجد کے صحن میں کھیل رہے ہیں۔ شفقتِ پدری نے جوش مارا۔ حضرت عمر نے بچہ کا بازو پکڑ کر اپنے پاس سواری پر بٹھالیا۔ اتنے میں بچہ کی نانی آگئی اور اب دونوں میں کشمکش ہونے لگی۔ آخر

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے احکام القرآن ابو بکر جصاص از صفحہ ۹۴ تا صفحہ ۱۰۰۔ [2] ازالۃ الخفا مقصد دوم ص ۳۱۔

اسی حالت میں دونوں حضرت ابوبکر کی خدمت میں پہونچے اور ہر ایک نے کہا کہ بچہ میرا بیٹا ہے۔ حضرت ابوبکر نے حضرت عمر کو حکم دیا کہ بچہ نانی کے حوالہ کردیں، حضرت عمر نے اس فیصلہ کے سامنے سر تسلیم خم کردیا اور پلٹ کر کوئی بات نہیں کہی۔ امام مالک اس روایت کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں، اس مسئلہ میں اس روایت کی وجہ سے میرا فتویٰ بھی یہی ہے[1]

فراستِ ایمانی کسی معاملہ یا قضیہ کا صحیح فیصلہ کرنے کے لئے بیرونی شہادتوں کے علاوہ خود قاضی کی اپنی ذہانت اور فراست کی بھی بڑی ضرورت ہوتی ہے، حدیث میں عام مومنین کی فراست کے متعلق کہا گیا ہے کہ تم اُس سے بچو۔ کیونکہ مومن اللہ کے نور سے دیکھتا ہے چونکہ حضرت ابوبکر صدیق سب سے زیادہ قوی الایمان تھے اس لئے ان کے نورِ فراست کا یہ عالم تھا کہ مرضِ وفات میں حضرت عائشہ سے فرمایا کہ بیٹی! میں نے تم کو جو جائداد دی ہے، میرے بعد تم کتاب اللہ کے قانون کے مطابق اُس کو بھائیوں اور بہنوں میں تقسیم کر لینا تو حضرت عائشہ بولیں، ابا جان! میری بہن تو ایک ہی یعنی اسماء ہیں۔ پھر آپ نے "بہنوں" کیسے فرمادیا؟ اس وقت صدیق اکبر کی بیوی حبیبہ بنت خارجہ حمل سے تھیں۔ حضرت ابوبکر نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا کہ اُس اهلجارية میرا خیال ہے کہ بچی پیدا ہوگی[2] چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

علمی مفاخر و کمالات[3]

اسلام سے پہلے عرب میں اگرچہ روحانیت کا فقدان تھا لیکن ان کا اپنا ایک ضابطۂ

---

[1] موطا امام مالک کتاب الاقضیہ باب من احق بالولد۔ [2] موطا امام مالک باب مالایجوز من النحل [3] کتاب میں حتی المقدور کوشش کی ہے کہ واقعات کی تکرار نہ ہونے پائے۔ لیکن اس باب میں بعض واقعات جو ضمنی طور پر پہلے گذر چکے ہیں مکرر آگئے ہیں اور ایسا ہونا ناگزیر تھا کیونکہ جس واقعہ کا جس عنوان سے خاص تعلق ہے اگر اس کے ماتحت اس کو صرف اس بنا پر ذکر نہ کیا جاتا کہ اس کا ذکر اجمالی طور پر پہلے آچکا ہے تو یہ عنوان پر بڑا ظلم ہوتا۔

اخلاق تھا جو المروۃ کہلاتا تھا، جو لوگ اس ضابطۂ اخلاق میں اعلیٰ درجہ کا کمال رکھتے تھے وہ نہایت عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، اس کے علاوہ شاعری اور قوتِ تقریر و خطابت اور اعلیٰ نسبی میں جو لوگ ممتاز ہوتے تھے وہ قوم کے سردار مانے جاتے تھے، حضرت ابو بکر ان تمام اوصاف و کمالات کے جامع تھے۔

علم الانساب میں مہارت | علم الانساب حضرت ابو بکر کا خاص فن تھا حضرت علی فرماتے ہیں

وکان ابو بکرٍ مقدماً فی کل خیرٍ — ابو بکر ہر اچھے کام میں آگے آگے رہتے تھے اور

کان رجلاً نسابۃً۔[1] — علم الانساب میں بڑے ماہر تھے۔

اس سلسلہ میں حضرت علی ہی اپنا ایک چشم دید دلچسپ واقعہ سناتے ہیں کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا کہ قبائل میں جا کر اسلام کی تبلیغ کریں تو ایک دن آپ، ابو بکر اور میں ہم تینوں عربوں کے ایک اجتماع میں پہونچے۔ حضرت ابو بکر نے ان سے پوچھا "آپ لوگ کس قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں؟" وہ بولے "ربیعہ" سے۔ اس کے بعد حسب ذیل گفتگو ہوئی۔

ابو بکر:۔ ربیعہ کے اونچے طبقہ سے یا ادنیٰ طبقہ سے؟

اہلِ قبائل:۔ اونچے طبقہ سے۔

ابو بکر:۔ اونچا طبقہ کونسا؟ ذہل الاکبر یا ذہل الاصغر؟

اہلِ قبائل:۔ ذہل الاکبر۔

اس کے بعد حضرت ابو بکر نے چند نامورانِ عرب کے الگ الگ نام لے کر پوچھا کہ کیا یہ شخص تمہارے ہی قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا؟ یہ لوگ ہر ایک کا جواب نفی میں دیتے رہے، آخر حضرت ابو بکر نے کہا "تو پھر تم لوگ ذہل الاکبر سے نہیں۔ بلکہ ذہل الاصغر سے تعلق رکھتے ہو"

[1] العقد الفرید ج ۳ ص ۲۰۴۔

ان لوگوں میں ایک سبزہ آغاز نوجوان تھا، اب وہ آگے بڑھا اور بولا، آپ نے تو ہم سے سوالات کر لئے۔ لیکن اب ہم کو اجازت دیجئے کہ ہم بھی آپ سے کچھ پوچھیں۔ حضرت ابوبکر نے کہا شوق سے۔ لیکن اب اس نوجوان نے سوالات کا جو سلسلہ شروع کیا وہ کہیں جا کر رکتا ہی نہیں تھا۔ آخر حضرت ابوبکر تنگ آ کر اونٹنی پر بیٹھ چل دیئے، اس پر نوجوان نے ایک شعر پڑھا جس کا ماحصل یہ تھا کہ کبھی چت اور کبھی پٹ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دیکھ کر بے اختیار ہنسی آ گئی۔[۱]

جُبَیر بن مُطعِم نسب دانی میں تمام عرب میں ممتاز تھے مگر وہ بھی کہتے تھے کہ میں نے یہ فن حضرت ابوبکر سے سیکھا ہے۔[۲]

حضرت ابوبکر کی یہ نسب دانی اسلام کے بھی کام آئی۔ مشرکین قریش میں سے بعض لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو میں اشعار کہتے تھے۔ دربار نبوت کے خاص شاعر حضرت حسان بن ثابت نے اجازت چاہی کہ وہ بھی قریش کی ہجو کریں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا، جب میں خود قریش میں سے ہوں تو تم ان کی ہجو کیسے کرو گے۔ حسان بولے، "میں آپ کو ان سے اس طرح الگ کروں گا جیسے بال کو آٹے میں سے نکال لیتے ہیں۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مشورہ دیا کہ حضرت ابوبکر کے پاس جائیں کیونکہ وہ اُن (حسان) سے زیادہ قریش کے انساب سے واقف ہیں۔ چنانچہ حسان حضرت ابوبکر کی خدمت میں حاضر ہو کر باقاعدہ درس لیتے تھے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ قریش حضرت حسان کے اشعار سنتے تھے تو فوراً پہچان جاتے تھے کہ ان کی تصنیف ہیں۔ حضرت ابوبکر کا مشورہ شامل ہے۔[۳]

ایام العرب | علم الانساب کی طرح ایام العرب یعنی عربوں کی خانہ جنگی کی تاریخ کے بھی بہت

۱؎ العقد الفرید ج ۳ ص ۲۰۵۔ ۲؎ سیرت ابن ہشام باب سیاقۃ النسب من ولد اسماعیل،
۳؎ استیعاب ابن عبدالبر باب حسان۔

بڑے عالم تھے، حضرت عائشہ جو اپنے زمانہ میں اعلم بحدیث العرب والنسب سمجھی جاتی تھیں اُن کا یہ علم و فضل بھی درحقیقت حضرت ابوبکر کا ہی فیضانِ تعلیم و تربیت تھا، چنانچہ حضرت ہشام بن عروہ روایت کرتے ہیں۔

کان عروۃ یقول لعائشۃ یا امتاہ لا اعجب من فھمك، اقول زوجۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وبنت ابی بکر، ولا اعجب من علمك بالشعر وایام الناس اقول ابنۃ ابی بکر وکان اعلم الناس ولکن اعجب من علمك بالطب کیف ھو ومن این ھو؟ قال فضربت علی منکبہ وقالت ای عروۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یسقم عند آخر عمرہ فکانت تقدم علیہ وفود العرب من کل وجہ فتنعت لہ الانعات فکنت اعالجھا لہ فمن ثم۔[1]

عروۃ حضرت عائشہ سے پوچھا کرتے تھے کہ اماں! مجکو آپکی سمجھ پر تو حیرت نہیں ہوتی، کیونکہ میں کہتا ہوں کہ رسول اللہ کی بیوی اور ابوبکر کی بیٹی ہیں، اور نہ مجکو آپکے علم شعر و تاریخ پر تعجب ہوتا ہے، میں کہتا ہوں کہ آپ ابوبکر کی بیٹی ہیں جو ان چیزوں کے سب سے بڑے عالم تھے، مگر ہاں مجکو آپکے علم طب پر بڑی حیرت ہے کہ یہ علم آپ کو کیونکر حاصل ہوا؟ راوی کا بیان ہے کہ یہ سنکر حضرت عائشہ نے حضرت عروہ کے کاندھے پر ہاتھ مارا اور فرمایا کہ سنو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخر عمر میں بیمار تھے اور آپکے پاس عرب کے وفد آیا کرتے تھے وہ طرح طرح کی دوائیں اور انکے اوصاف بیان کرتے تھے اور میں ان دواؤں کو تیار کرتی تھی بس میرا علم طب اسی وجہ سے ہے۔

ذوقِ شعر و سخن شعر و شاعری کا ذوق عرب کے بچہ بچہ کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا جو ان کے لطافت جودتِ طبع کی دلیل تھا، حضرت ابوبکر بھی اس سے بہرۂ وافر رکھتے تھے۔ خود بھی شعر کہتے تھے چنانچہ ابن سعد نے آپ کے وہ اشعار نقل کئے ہیں جو آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر کہے تھے۔ ابن رشیق نے پندرہ اشعار کی ایک نظم نقل کی ہے[2] جو آپکی طرف منسوب ہے،

---

[1] مسند امام احمد بن حنبل ج ۶ ص ۶۷۔ [2] کتاب العمدہ ج ۱ ص ۱۹۔

لیکن اصل یہ ہے کہ عہدِ جاہلیت میں شعر کہتے ہوں گے، اسلام قبول کرنے کے بعد آپ نے کوئی شعر نہیں کہا اور حق یہ ہے کہ جس رسولِ برحق کے لئے قرآن میں وما علمناہ الشعر وما ینبغی لہٗ ۔ ہمنے اس پیغمبر کو شعر نہیں سکھایا اور یہ اُنکے لئے موزوں بھی نہیں کہا گیا ہو اس کے خلیفۂ اولین کی شان سے یہ بعید بھی تھا، چنانچہ حضرت عائشہ فرماتی ہیں

ان ابابکر ما قال بیت شعر فی الاسلام حتی مات[1] — بے شبہ ابوبکر نے اسلام کے زمانہ میں اپنی وفات تک کبھی ایک شعر بھی نہیں کہا۔

ابن رشیق نے جو اشعار نقل کئے ہیں ان کے متعلق ابنِ ہشام[2] اور سہیلی[3] دونوں نے بیان کیا ہے کہ اکثر اہلِ علم حضرت ابوبکر کی طرف اُنکا انتساب صحیح نہیں مانتے۔ البتہ کبھی کبھی شعر پڑھنا ثابت ہے۔ چنانچہ آپ اکثر یہ شعر پڑھتے تھے جو خود آپ کے حسبِ حال تھا۔

اذا اردت شریف الناس کلھم — فانظر الی ملکٍ فی زی مسکین[4]

اگر تم لوگوں میں سب سے شریف انسان کو دیکھنا چاہو تو اس بادشاہ کو دیکھو جو فقیر کی گدڑی میں ہو۔

تقریر و خطابت شاعری کی طرح تقریر و خطابت کا فن بھی عربوں کا خاص فن تھا جس میں وہ دوسری قوموں سے ممتاز تھے، قرآن نے ایک خاص اسلوبِ بیان، ایک نیا اندازِ فکر، ایک وسیع مگر ٹھوس نقطۂ نظر دیا تھا اس لئے اسلام کے بعد عربوں کے اس فن کو غیر معمولی ترقی ہوئی اور ان کی فطری صلاحیتِ خطابت اسلام کی فسان پر جلا پاکر شمشیر دودم بن گئی، تاہم شاعری کی طرح تقریر و خطابت کا فن بھی کسبی سے زیادہ وہبی اور ایک ملکۂ خداداد ہے جو فطری استعداد و مناسبت سے

---

[1] استیعاب حرف العین۔ [2] سیرۃ ابن ہشام ج ۲ ص ۳ [3] الروض الانف ج ۲ ص ۵۵
[4] کنز العمال برحاشیہ مسند امام احمد ج ۲ ص ۱۴۳۔

بغیر محض مشق و تمرین سے حاصل نہیں ہوتا اور اس میں امتیاز کمال پیدا نہیں ہو سکتا
حضرت ابوبکر صدیق میں بھی یہ ملکہ خداداد تھا، اس سلسلہ میں عہد جاہلیت کا تو کوئی ایسا واقعہ
نظر سے نہیں گذرا جس میں انہوں نے اپنی اس قابلیت کا مظاہرہ کیا ہو۔ البتہ زندگی
کے اسلامی دور میں انہوں نے جو تقریریں کیں اور خطبے دیئے وہ اس بات کا
بیّن ثبوت ہیں کہ وہ اپنے زمانہ کے بلند پایہ اور نہایت ممتاز خطیب تھے۔

ایک تقریر یا خطابت کا سب سے بڑا معیار کامیابی یہ ہے کہ مقرر کی زبان سے جو لفظ نکلے
سامعین کے دلوں میں گھر کرتا چلا جائے اور بڑے سے بڑا مخالف بھی اس کو سننے
کے بعد محسوس کرے کہ مقرر نے جو کچھ کہا ہے وہ گویا خود اس کے اپنے دل کی بات
تھی، چنانچہ قرآن مجید میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا گیا۔

وَقُلْ لَّهُمْ فِي أَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيْغًا — اے پیغمبر! آپ ان لوگوں کے دل میں اتر کر ان سے بلیغ کلام
میں خطاب کیجئے۔

اسی مضمون کو غالب نے اس طرح ادا کیا ہے۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا — میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

ایک تقریر میں یہ بات اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جبکہ حسب ذیل چیزیں پائی جائیں

(۱) مقرر جو کچھ کہے اس کو خود پہلے اس کا کمال یقین اور اذعان ہو اور اس کے
متعلق وہ کسی شک و شبہ میں مبتلا نہ ہو۔

(۲) سامعین کی نفسیات سے پوری طرح واقف ہو کر ان کو کونسی چیز زیادہ اپیل
کر سکتی ہے۔

(۳) تقریر فصیح و بلیغ ہو، یعنی کلام مقتضائے حال کے مطابق اور الفاظ بھی عام
فہم۔ دلنشین اور موثر ہوں۔

(۴) آواز میں عزم و اعتماد اور ذمہ داری کا پورا احساس پایا جائے۔

حضرت ابوبکر کی خطابت میں یہ تمام اوصاف تمام وکمال پائے جاتے تھے اور اس کا اثر یہ ہوتا تھا کہ اُس کو سننے کے بعد کوئی شخص ان کی مخالفت نہیں کر سکتا تھا۔ سامعین کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ گویا اب تک ان کی فہم و بصیرت پر پردے پڑے ہوئے تھے۔ تقریر سنکر وہ سب پردے اٹھ گئے ہیں۔

صحابۂ کرام کے لئے وفاتِ نبوی سے بڑھکر اور کوئی حادثہ ہو سکتا تھا، حضرت عمر فاروق جیسے شیر دل انسان کے ہوش وحواس بجا نہیں رہے تھے، اس عالم میں بے ربط باتیں عموماً زبان سے نکل جاتی ہیں اور شدتِ غم کا ایسا غلبہ ہوتا ہے کہ اچھی سے اچھی تقریر کا اثر نہیں ہوتا۔ لیکن صدیق اکبر کی تقریر سنتے ہی بادل چھٹ گئے اور مطلع یک قلم صاف ہو گیا جس کا اعتراف خود حضرت عمر نے کیا ہے، سقیفہ بنو ساعدہ کا معرکہ کس قدر سخت تھا، حضرت عمر اُس کے لئے پہلے سے تقریر سوچکر اور اس کو دماغ میں جما کر گئے تھے۔ لیکن حضرت ابوبکر نے فی البدیہ جو تقریر کی وہ اس درجہ مؤثر اور دلنشین تھی کہ حضرت عمر کو محسوس ہوا کہ جو باتیں وہ سوچ کر آئے تھے حضرت ابوبکر نے وہ سب نہایت خوبی اور بلاغت سے ادا کر دی ہیں۔

حضرت ابوبکر کے بعض خطبوں کے ٹکڑے اپنے مواقع پر ہم پہلے نقل کر آئے ہیں، ذیل میں چند خطبوں کے اقتباسات اور نقل کرتے ہیں ان سے زورِ کلام، فصاحت وبلاغت۔ اور حکیمانہ اسلوبِ بیان کا اندازہ ہوگا۔ ایک موقع پر آپنے خطبہ دیا اور فرمایا۔

اوصیکم بتقوی اللّٰہ وان تثنوا علیہ	میں تم لوگوں کو وصیت کرتا ہوں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے
بما ھو اھلہ وان تخلطوا الرغبة	رہنے کی اور اس بات کی کہ تمہیں اسکی شایانِ شان
بالرھبة وتجمعوا الالحاف بالمسألة	تعریف کرنی چاہئے اور اسکی طرف رغبت کے ساتھ

فان الله اثنی علی زکریا و علی اهل بیته
فقال: انهم کانوا یسارعون فی الخیرات
ویدعوننا رغباً ورهباً وکانوا لنا
خاشعین۔ ثم اعلموا عباد الله
ان الله قد ارتهن بحقه انفسکم
واخذ علی ذالك مواثیقکم وعوض
بالقلیل الفانی الکثیر الباقی۔ وهذا
کتاب الله فیکم لا تفنی عجائبه ولا
یطفأ نوره فثقوا بقوله وانتصحوا
بکتابه فانه خلقکم لعبادته ووکل
بکم الکرام الکاتبین یعلمون ما تفعلون
ثم اعلموا عباد الله انکم تغدون
وتروحون فی اجل قد غیب عنکم
علمه۔ فان استطعتم ان تنقضی الآجال
وانتم فی عمل الله ولن تستطیعوا ذالك
الا بالله۔ فسابقوا فی مهل باعمالکم
فان اقواماً جعلوا آجالهم لغیرهم
فانهاکم ان تکونوا امثالهم فالوحا
الوحا ثم النجا النجاء فان وراءکم
طالباً حثیثاً امره سریعاً سیره۔[1]

تمہارے دلوں میں اسکا ڈر بھی موجود ہے۔ اور اس سے
سوال کرنے میں خوب الحاح وزاری کیا کرو۔ اسلئے
کہ اللہ تعالیٰ حضرت زکریا اور انکے اہلِ بیت کی تعریف
میں فرماتا ہے۔ یہ لوگ نیکیوں میں ایک دوسرے سے
آگے نکلنا چاہتے تھے اور ہم سے اپنی حاجت چاہتے
تھے گڑگڑا کر اور عجز وانکسار سے اور یہ لوگ ہمارے
حضور میں فروتنی کرنیوالے تھے"۔

بندگانِ خدا! تمہیں یہ بھی جاننا چاہیئے کہ اللہ
تعالیٰ نے اپنے حق کے عوض تمہاری جانیں
گروی رکھی ہیں، اور اس معاملہ کا تم سے پختہ
عہد لیا ہے اور کمتر فانی چیز کا عوض کثیر باقی سے
دیا ہے، اور یہ کتاب اللہ تمہارے درمیان ہے جسکے
عجائب ختم ہونے والے نہیں، اور جسکی روشنی
ماند نہیں پڑے گی۔ پس اللہ کے فرمان پر ایمان رکھو
اور اسکی کتاب سے فائدہ اٹھاتے رہو۔ اسنے
اپنی بندگی کیلئے پیدا کیا ہے۔ اور تم پر محاسب فرشتوں
کو مقرر کر دیا ہے جو تمہارے افعال کو جانتے ہیں، خدا
کے بندو تم یقین مانو کہ تمہاری صبح اور شام اس
مقررہ وقت میں ہوتی رہیگی جسکی حد تمہیں معلوم
نہیں پس اگر تم سے یہ ہو سکے کہ اللہ کی اطاعت

[1] العقد الفرید ج ۳ ص ۱۳۶۔

میں رہتے ہوئے تمہارا وقت پورا ہو جائے۔ (اور ایسا ہونا
توفیق الٰہی کے بغیر ممکن نہیں) تو زندگی کی فرصت
میں عمل میں پیش قدمی کرو اس لئے کہ
بہت سی قومیں فرصت کے لمحات دوسروں
کی نذر کر چکی ہیں ۔ تمہیں ان کی مانند
نہ ہونا چاہیئے پس تمہاری رفتار تیز ہونی چاہیئے بہت ہی تیز
اسلئے کہ تمہارا پیچھا کرنیوالا بڑا ہی تیز رفتار ہے۔

ایک مرتبہ خطبہ دیا تو حمد و صلوٰۃ کے بعد فرمایا۔

انی اوصیکم بتقوی اللہ العظیم فی
کل امر وعلی کل حال ولزوم الحق فیما
احببتم وکرھتم فانہ لیس فیما دون
الصدق من الحدیث خیر من یکذب یفجر
ومن یفجر یھلک - وایاکم والفخر
وما فخر من خلق من تراب والی
التراب یعود، ھو الیوم حی وغداً
میت - فاعملوا وعدوا انفسکم فی
الموتیٰ - وما اشکل علیکم فردوا علمہ
الی اللہ وقدموا لانفسکم خیراً تجدوہ
محضراً۔ فانہ قال عزوجل "یوم
تجد کل نفس ما عملت من خیر محضراً
وما عملت من سوء تود لو ان بینھا

میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ اللہ بزرگ و برتر کا تقویٰ ہر کام
میں اور ہر حال میں تمہارے پیش نظر رہے اور اپنی پسند
یا ناپسندیدگی کے بارہ میں حق کا التزام ہے۔ سچائی سے
ہٹکر خیر (کی سبیل) نہیں۔ دروغ گو حق سے انحراف کرتا ہے
اور حق سے انحراف کرنیوالا (انجام کار) ہلاک ہو جاتا ہے
خبردار! اپنی بڑائی نہ کرنا، خاکی مخلوق جو پھر خاک میں
ملجائیگی اسے بڑائی کب زیب دیتی ہے؟ جو آج زندہ
ہے اور کل مردہ۔ عمل جاری رکھو اور اپنا شمار مرجانے
والوں میں کرتے رہو، جو بات تمہاری سمجھ میں نہ آئے
اسے اللہ کے حوالہ کر دو۔ اپنے فائدہ کے لئے اچھے
اعمال پہلے سے کر رکھو کل یہی ذخیرہ تمہارے پاس
ہوگا، خدائے برتر فرماتا ہے۔ "جس دن ہر شخص اپنے
اچھے اعمال کو سامنے پائیگا اور اپنے برُے اعمال

وَبَيْنَهُ أَمَدًا بَعِيدًا[1]

کا سامنا کرتے ہی چاہیگا کہ کاش اسکی بدی اس سے کوسوں دور ہوتی۔

حضرت ابوبکر چونکہ فطرۃً خطیب تھے اس لئے آپ کی معمولی گفتگو بھی فصاحت و بلاغت کی جان ہوتی اور خطبہ سے کم نہیں ہوتی تھی۔ عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں ایک دن حضرت ابوبکر کے مرضِ وفات میں عیادت کے لئے حاضر ہوا اور کہا! اے خلیفۂ رسول اللہ اب تو آپ بہتر معلوم ہوتے ہیں:۔ تو فرمایا

انی علی ذالك لشدید الوجع
ولما لقیت منکم یا معشر المهاجرین
اشد علی من وجعی انی ولیت خیرکم
فی نفسی فکلکم ورم انفه ان یکون له
الامر من دونه والله لتتخذن
نضائد الدیباج وستور الحریر
ولتالمن النوم علی الصوف الاذربی
کما یالم احدکم علی حسك السعدان
والذی نفسی بیده لان یقدم احدکم
فتضرب عنقه فی غیر حد خیر له
من ان یخوض غمرات الدنیا یا هادی
الطریق جُرتَ انما هو والله الفجر
او البحر[2]

سنو! میں اس کے باوجود شدید درد میں مبتلا ہوں اور جو کچھ اے گروہ مہاجرین میں نے تمہارا برتاؤ دیکھا ہے وہ میرے درد سے زیادہ میرے لئے وجہ تکلیف ہے۔ میں نے اپنے نزدیک جو تم میں سب سے زیادہ بہتر ہے (حضرت عمر) اسکو تمہارا ولی بنایا لیکن تم میں سے ہر ایک کی ناک پھول گئی کہ خلافت اُسکے علاوہ کسی اور کو کیوں ملے۔ بخدا تم لوگ دیبا کے گدے اور ریشمین پردے پسند کروگے اور آذربائجانی اون سے تم کو تکلیف ہوگی جیسے کسی کو چراگاہ سعدان کے کانٹوں سے ہوتی ہے جس کے قبضہ میں میری جان ہے اسکی قسم! تم میں سے کسی شخص کی گردن بغیر کسی جرم کے اڑا دی جائے یہ اس کیلئے اس سے بہتر ہے کہ وہ دنیا کی گہرائیوں میں گھسے۔ اے رہنما! تو نے حد سے تجاوز کیا ہے۔ بس اب صورتیں صرف دو ہی ہیں یا تو صبح کے وقت روشنی میں چلو یا اندھیرے میں چل کر مصیبت میں پڑو۔

[1] العقد الفرید ج ۴ ص ۱۴۶ [2] الکامل المبرد ج ۱ ص ۵۔

تحریر و کتابت جو رنگ تقریر و خطابت کا تھا وہی تحریر و کتابت کا تھا۔ حضرت خالد عراق کی مہم سے فارغ ہو کر حضرت ابو بکر کی اجازت کے بغیر چپ چپاتے حج کر آئے تھے۔ حضرت ابو بکر کو اطلاع ہوئی تو حضرت خالد کے نام ایک عتاب نامہ لکھا۔

سر حتی تاتی جموع المسلمین	تم چل پڑو یہاں تک کہ یرموک میں مسلمانوں کے
بالیرموک فانهم قد شجوا و اشجوا ایاک	لشکروں سے ملجاؤ کیونکہ وہ پریشان ہیں، غمزدہ ہیں
ان تعود لمثل ما فعلت فانه لم یشج	اور مشکلات میں پھنس گئے ہیں اور خبردار پھر آیندہ
الجموع من الناس بعون الله شجاک	ایسی حرکت نہ کرنا دیر موک جانیکا حکم اسلئے دیا جاتا
ولم ینزع الشجی من الناس نزعک	ہے) کہ دشمن کی فوجوں کو تم زیادہ زک پہونچا سکتے
فلیهنئک ابا سلیمان النیة والحظوة	ہو (اگر اللہ کی مدد شامل رہی) اور لوگوں کی
فاتمم یتمم الله لک ولا یدخلنک	مشکلات کا ازالہ تم سے بہتر کسی اور سے ممکن نہیں
عجب فتخسر و تخذل و ایاک ان تدل	پس اے ابو سلیمان تمہاری نیت اور منزلت باعث
بعمل فان الله عز و جل له المن و هو	برکت ہو۔ تم پوری خدمت انجام دو، اللہ تمہیں پوری
ولی الجزاء	جزا دیگا۔ تمہارے دلمیں پندار نہ پیدا ہو ورنہ گھاٹے میں
	رہو گے اور تائید الہی سے محروم ہو جاؤ گے۔ اور اپنے
	کسی کارنامہ پر خبردار نہ اترانا اس لئے کہ احسان جتانا
	صرف اللہ تعالیٰ کو شایاں ہے اور وہی بدلہ دینے والا
	بھی ہے۔

حضرت عمر بن الخطاب کو اپنا جانشین نامزد کیا تو پروانۂ نیابت کی عبارت یہ تھی۔

هذا ما عهد به ابو بکر خلیفة	یہ وہ پروانہ ہے جو ابو بکر، محمد رسول اللہ صلی اللہ
محمد رسول الله صلی الله علیه وسلم عند	علیہ وسلم کا خلیفہ اس وقت لکھ رہا ہے جب کہ دنیا
آخر عهده بالدنیا و اول عهده بالآخرة	کے ساتھ اوس کے تعلق کی آخری گھڑی اور آخرت کے

فی الحال التی یومن فیها الکافر ویتقی الفاجر انی استعملت علیکم عمر بن الخطاب فان برّ وعدل فذالک علمی به ورائی فیه۔ وان جار وبدل فلا علم لی بالغیب والخیر اردت۔ ولکل امرئ ما اکتسب وَسَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ۔

ساتھ اسکے تعلق کی پہلی گھڑی شروع ہو رہی ہے اور یہ تحریر ایسے عالم میں لکھائی جا رہی ہے جبکہ کافر بھی مومن ہو جاتا ہے اور گنہگار فاجر بھی ڈرنے لگتا ہے۔ میں نے عمر کو تم پر حاکم بنایا ہے۔ اگر انہوں نے نیکی کی راہ اختیار کی اور عدل کیا تو یہ وہی بات ہوگی جو میں انکے متعلق جانتا ہوں اور جو میری رائے انکے بارہ میں ہے۔ لیکن اگر انہوں نے ظلم کیا اور وہ بدل گئے تو مجکو غیب کا علم نہیں ہے اور میں نے تو خیر کا ہی ارادہ کیا ہے۔ بہر حال ہر انسان جیسا کریگا ویسا پائیگا۔ اور جو لوگ کہ ظالم ہیں انکو جلد پتہ چل جائیگا کہ وہ کیسی پلٹی کھاتے ہیں۔

اہلِ ارتداد و بغاوت کے نام جنگ شروع کرنے سے قبل جو ایک طویل تحریر بھیجی تھی جس کی حیثیت چیلنج کی تھی اس میں ایک مقام پر فرماتے ہیں۔

وانی اوصیکم بتقوی اللہ۔ وحظکم ونصیبکم من اللہ وماجاء به نبیکم۔ وان تهتدوا بهدیه وان تعتصموا بدین اللہ عزوجل فانه من لم یهد اللہ ضل۔ وکل من لم یعافه مبتلی۔ وکل من لم ینصره مخذول۔ فمن هداه اللہ کان مهدیا۔ ومن اضله اللہ کان ضالا۔ ولم یقبل منه

میں تم لوگوں کو سمجھاتا ہوں کہ اللہ سے ڈرو۔ اور اللہ کی طرف سے جو تمہارا حصہ مقرر ہوا ہے اور تمہارے نبی تمہارے پاس جو چیز لائے ہیں اسکو قبول کرو۔ اور نبی کے بتائے ہوئے راستہ پر چلو اور اللہ کے دین کی رسی کو مضبوط پکڑو۔ کیونکہ جس شخص کو اللہ ہدایت نہیں دیتا وہ گمراہ ہو جاتا ہے۔ اور ہر وہ آدمی جسکو اللہ تندرست نہیں رکھتا وہ بیمار ہو جاتا ہے۔ اور جس کی مدد اللہ نہیں کرتا وہ رسوا ہو جاتا ہے جسکو اللہ ہدایت دیتا ہے وہ ہدایت یافتہ ہوتا ہے اور جسکو اللہ گمراہ کر دیتا ہے وہ گمراہ ہو جاتا ہے اور (پھر)

فی الدنیا عملہ حتی یقربہ ۔ فلم یقبل لہ فی الآخرۃ صرف ولا عدل ...... فمن امن فھو خیر لہ ، ومن ترکہ فلن یعجز اللہ ۔

دنیا میں اسکا کوئی عمل مقبول نہیں ہوتا جو اس کو خدا سے قریب کردے اور آخرت میں اسکی طرف سے کوئی فدیہ یا بدلہ نہیں لیا جاتا ـــــــ پس جو شخص ایمان لائیگا وہ اسکے لئے بہتر ہوگا اور جو اسکو چھوڑ دیگا تو اسکو معلوم رہنا چاہئے کہ وہ اللہ کو عاجز نہیں کر سکتا۔

فن کتابت | اسلام سے پہلے عرب میں چند ہی لوگ تھے جو لکھنا جانتے تھے اور اس وجہ سے وہ سب میں ممتاز تھے، انہیں چند لوگوں میں سے حضرت ابوبکر صدیق بھی تھے، چنانچہ آپکا شمار خود کاتبین وحی کے زمرہ میں بھی ہے[۱]

علم القرآن | اب تک جن کمالات کا ذکر ہوا وہ تھے جن کی استعداد حضرت ابوبکر میں فطری اور طبعی طور پر تھی۔ اب ہم ان علوم اور کمالات کا ذکر کرتے ہیں جو آپ میں اسلام کے بعد پیدا ہوئے۔

حضرت ابوبکر چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت و معیت میں آغازِ بعثت سے لے کر آخری لمحہ حیات تک جلوت میں اور خلوت میں، سفر حضر میں، رزم اور بزم میں ہر جگہ اور ہر موقع پر برابر ساتھ رہے تھے، اس بنا پر آپ کا سینہ درحقیقت علوم و کمالاتِ نبویہ کا گنجینہ بن گیا تھا۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ صلح حدیبیہ کا واقعہ بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

"ازینجا دانستہ شد کہ حضرت صدیق را با پیغامبر چہ نسبت بود علوم پیغامبر در نفس وے رضی اللہ عنہ چگونہ منطبع می شد"[۲]

اسی خصوصیت کے باعث صحابہ عام طور پر کہا کرتے تھے کہ ھو (ابوبکر الصدیق) اعلمنا برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم[۳] ظاہر ہے کہ ان علوم و کمالات میں سب سے اول نمبر علوم قرآنی کا ہے۔ حضرت ابوبکر ایک آیت کو سننے کے بعد اس کی اصل روح اور اسپرٹ کو معلوم کرتے تھے اور اس سلسلہ میں اُن کا ذہن ان نکات و رموز تک پہنچ

---

[۱] استیعاب ابن عبدالبر تذکرہ حضرت ابوبکر [۲] ازالۃ الخفا مقصد دوم ص۱ [۳] ازالۃ الخفا مقصد دوم ص ۲۰۔

جاتا تھا جہاں تک دوسروں کی رسائی نہیں ہوتی تھی، حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ کے لوگوں نے ہجرت پر مجبور کر دیا تو حضرت ابو بکر صدیق نے کہا انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان لوگوں نے اپنے نبی کو ترکِ وطن پر مجبور کیا ہے یہ ضرور ہلاک ہونگے، اسپر یہ آیت اتری۔

اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرٌ	جو لوگ قتال کرنا چاہتے ہیں اسلئے کہ وہ مظلوم ہیں انکو اس کی اجازت دیجاتی ہے۔ اور اللہ ان کی مدد کرنے پر پوری طرح قادر ہے۔

حضرت ابو بکر اس کو سننے کے بعد ہی سمجھ گئے کہ جہاد کا حکم نازل ہوگا۔[۱]

وفاتِ نبوی کے وقت ایک کہرام برپا تھا۔ بعض کی سمجھ میں تو آہی نہیں رہا تھا کہ پیغمبر کی بھی وفات ہو سکتی ہے لیکن جونہی حضرت ابو بکر نے قرآن کی آیت اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ پڑھی سب کی آنکھیں کھل گئیں اور حضرت عمر تک کو یہ محسوس ہوا کہ گویا انہوں نے یہ آیت اس سے پہلے سنی ہی نہیں تھی۔[۲]

ہر وقت کی معیت کی وجہ سے حضرت ابو بکر کو یہ موقع تھا کہ جس آیت کے متعلق ان کو کچھ پوچھنا ہوتا تھا بے تکلف پوچھ لیتے تھے، ایک مرتبہ دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! اس آیت کے بعد اب کیا چارہ ہے کیا ہم کو ہر برے کام کا بدلہ دیا جائے گا؟۔

لَیْسَ بِاَمَانِیِّکُمْ وَلَآ اَمَانِیِّ اَھْلِ الْکِتٰبِ مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا یُّجْزَ بِہٖ	(نجات) نہ تمہاری آرزوؤں پر موقوف ہے اور نہ اہل کتاب کی آرزوؤں پر جو شخص برا کام کرے گا اس کو اس کا بدلہ ملیگا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اے ابو بکر! خدا تمہاری مغفرت کرے۔ کیا

---

[۱] ازالۃ الخفا مقصد دوم ص ۲۰ [۲] حضرت عبداللہ بن عمر کے الفاظ یہ ہیں فوالذی نفسی بیدہ لکانما کانت علی وجوھنا اغطیۃ فکشفت یہ روایت طبری کے حوالے سے پہلے گزر چکی ہے۔

تم بیمار نہیں ہوتے؟ کیا تم کو کوئی رنج اور صدمہ نہیں ہوتا؟ کیا تم کو کوئی مصیبت پیش نہیں آتی؟ یہ سب انہیں اعمالِ بد کا نتیجہ اور بدلہ ہے [۵۱]

ایک مرتبہ کسی چیز کی قسم کھا کر اس کو توڑ دینا بزدلی اور غیر مستقل مزاجی کی دلیل ہے، اس وجہ سے حضرت ابو بکرؓ بھی قسم کھا کر توڑتے نہیں تھے۔ لیکن جب قرآن میں کفارۂ یمین کی آیت نازل ہو گئی تو وہ فوراً سمجھ گئے کہ اس آیت کا مقصد یہ ہے کہ جس چیز کی قسم کھائی گئی ہے اس سے بہتر کوئی دوسری چیز ہو تو قسم توڑ دی جائے۔ محض بات کی پچ کی وجہ سے اپنی قسم پر قایم رہنا کوئی چیز نہیں ہے چنانچہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں:۔

ان ابابکر لم یکن یحنث فی یمین	ابو بکر ایکر تہ قسم کہا کر اسکو توڑتے نہیں تھے لیکن
قط حتی انزل اللہ کفارۃ الیمین	جب کفارۂ قسم کا حکم نازل ہوا تو کہا کہ اب
فما أیت غیرها خیراً منها الا اتیت	میں قسم کھانیکے بعد اس سے بہتر کوئی چیز
الذی ھو خیر و کفرت عن یمینی [۵۲]	پاؤنگا تو میں اس کو اختیار کرونگا اور قسم
	کا کفارہ ادا کردوں گا۔

حضرت ابو بکرؓ کے اس ارشاد سے فقہا نے استدلال کیا ہے کہ صورتِ مذکورہ میں حنث بذاتِ خود کوئی گناہ نہیں ہے، اگرچہ کفارہ ادا کرنا بہرحال ضروری ہے۔

اس سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ ہے جس کا ذکر کرنا بے محل نہیں ہوگا۔ حضرت ابو بکرؓ کے صاحبزادہ حضرت عبد الرحمٰنؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہمارے گھر چند مہمان آئے ہوئے تھے۔ رات ہوئی تو میرے والد ابو بکر صدیقؓ نے مجھ سے کہا کہ میں تو اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جا رہا ہوں واپسی میں دیر ہو جائے گی تم مہمانوں کو کھانا کھلا دینا۔ عبد الرحمٰنؓ کہتے ہیں میں نے اس حکم کی تعمیل میں مہمانوں سے

---

۵۱ مسند امام احمد بن حنبل ج ۱ ص ۱۱ ۵۲ صحیح بخاری ج ۲ ص ۹۸۰۔

درخواست کی کہ کھانا کھالیں لیکن انہوں نے کہا کہ جب تک صاحبِ خانہ نہیں آجائینگے ہم کھانا نہیں کھائیں گے۔ اس میں رات زیادہ ہوگئی، اب حضرت ابو بکر گھر آئے اور معلوم ہوا کہ مہمانوں نے اب تک کھانا نہیں کھایا ہے تو سخت برہم ہوئے اور اسی برہمی میں قسم کھالی کہ اب اس رات کھانا ہی نہیں کھائیں گے۔ یہ دیکھ کر مہمانوں نے بھی قسم کھالی کہ جب تک آپ کھانا نہیں کھائیں گے ہم بھی نہیں کھائیں گے۔ حضرت ابو بکر کو اب اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ فوراً کھانا طلب کیا اور قسم توڑ کر پہلے خود دو چار نوالے تناول فرمائے اور پھر مہمانوں کو شریک کیا[۱]۔

قرآن فہمی میں حضرت ابو بکر کو جو مقام رفیع حاصل تھا اس کی وجہ سے حضرت ابو بکر اگر قرآن کے کسی ایک لفظ کی مراد متعین کر دیتے تھے تو پھر اکابر صحابہ تک کو اسکی مخالفت کی جرأت نہیں ہوتی تھی، چنانچہ کلالہ کے لفظ کی مراد اور اسکے صحیح مفہوم و معنی کا مسئلہ نہایت پیچیدہ تھا۔ لیکن حضرت ابو بکر نے اپنی رائے سے جب اسکے ایک معنی متعین کر دیئے اور اس کے بعد حضرت عمر فاروق سے ان کے عہد خلافت میں اسکے متعلق استفسار کیا گیا تو فرمایا:۔

انی لا ستحیی اللہ ان اردشیأ	مجکو اللہ سے اس بات میں شرم آتی ہے
قالہٗ ابو بکر[۲]	کہ جو ابو بکر نے کہا ہے میں اسکو رد کروں۔

صحیح بخاری کے حوالہ سے پہلے گذر چکا ہے کہ حضرت ابو بکر کے عہد میں کلالہ کی تفسیر کے بارہ میں کسی نے حضرت ابو بکر کی مخالفت نہیں کی۔

حدیث: علوم نبوت میں قرآن کے بعد حدیث کا مرتبہ ہے۔ ظاہر ہے نبوت کی صبح و شام کے تمام جلوے حضرت ابو بکر کی نگاہ میں بسے ہوئے تھے اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال و اقوال کا جو خزانہ ان کے سینہ میں محفوظ ہوگا کوئی دوسرا مشکل سے

[۱] صحیح بخاری ج ۲ ص ۹۰۶۔ [۲] سنن الدارمی ج ۲ ص ۳۶۶۔

ہی اس میں ان کا حریف ہو سکتا تھا۔ لیکن اس باب میں وہ حد درجہ محتاط تھے۔

علامہ ذہبی نے نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیق نے لوگوں کو جمع کیا اور فرمایا کہ "تم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے احادیث روایت کرتے ہو اور پھر ان میں اختلاف کرتے ہو، جب تمہارا یہ حال ہے تو تمہارے بعد جو لوگ آئیں گے وہ تم سے بھی زیادہ اختلاف کریں گے۔ اس لئے تم رسول اللہ سے کوئی چیز نقل مت کرو۔ مگر ہاں جب تم سے لوگ کچھ دریافت کریں اس وقت بیشک تم کچھ ضرور کہو، اور دیکھو تمہارے درمیان اللہ کی کتاب ہے، پس جو چیز کتاب اللہ میں حلال ہے اسکو حلال سمجھو۔ اور جو چیز اس میں حرام ہے اسکو حرام سمجھو"[1]

غور کرو خلیفۂ رسول نے اس ارشاد میں کس بلاغت کے ساتھ حدیث کا مرتبہ اور اس کے نقد کا معیار بیان کر دیا ہے۔ مراد یہ ہے کہ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی وقت کسی ضرورت سے کوئی حکم دیا ہے اور کسی وقت کسی ضرورت سے کوئی اور پھر سننے والے اعرابی اور غیر اعرابی، ذہین اور غیر ذہین، قریب التعلق اور بعید التعلق ہر قسم کے لوگ تھے، کسی نے کوئی بات پوری سنی اور کسی نے ادھوری، کسی نے کسی جملہ کا کوئی مطلب لیا اور کسی نے کچھ اور، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ بعینہٖ کس کو یاد رہے ہوں گے اس لئے جو روایت ہوگی وہ عموماً روایت بالمعنی ہوگی اور اس میں ایک دو لفظوں کا ادھر ادھر ہو جانا مستبعد نہیں ہے۔ لیکن ان دو ایک لفظوں کے الٹ پھیر سے معنی کچھ سے کچھ ہو سکتے ہیں، ان وجوہ کی بنا پر حضرت ابوبکر یہ سمجھتے تھے اور بالکل صحیح سمجھتے تھے کہ اگر روایات کی کثرت شروع ہو گئی اور جس کسی شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تھوڑا بہت جو کچھ بھی سنا ہی

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳۔

اس کو وہ بغیر حزم و احتیاط کے نقل کرنے لگا تو اس سے طرح طرح کے اختلافات پیدا ہوں گے اور ان کا اثر اصل دین اور شریعت کے استحکام پر پڑے گا، اس صورتِ حال کا انسداد کرنے کی غرض سے ہی آپ نے ایک طرف تو اسکی تاکید کی کہ وقت ضرورت ہی روایت کریں اور دوسری جانب اس کی تصریح فرمادی کہ کسی حدیث کے صحت وسقم کو پرکھنے کی اصل کسوٹی قرآن مجید ہے، جو روایت قرآن کی نصِ صریح کے خلاف ہوگی مقبول نہیں ہوگی۔

حافظ ذہبی نے حضرت عائشہ کی ایک اور روایت نقل کی ہے کہ حضرت ابوبکر نے پانچسو احادیث جمع کی تھیں۔ لیکن ایک شب دیکھا کہ وہ بہت مضطرب اور بے چین ہیں۔ آخر صبح ہوتے ہوتے اس ذخیرہ کو نذر آتش کردیا۔ ان سے وجہ پوچھی گئی تو فرمایا "مجکو اس کا اندیشہ تھا کہ میں مرجاؤں اور اس ذخیرہ کو اس حالت میں چھوڑ جاؤں کہ اس میں کچھ ایسی احادیث بھی ہوں جن کو میں نے ایک ایسے شخص سے لیا ہو جس کو میں ایماندار اور معتبر سمجھتا تھا، لیکن درحقیقت وہ بات ایسی نہیں تھی جیسی کہ اس نے مجھ سے بیان کی تھی، تو اب ایسی صورت میں اس روایت کو بیان کرنے کی ذمہ داری درحقیقت میرے سر ہوگی۔[۱]

اگرچہ حافظ صاحب نے اس روایت کو غیر صحیح کہا ہے لیکن حضرت ابوبکر کا جو مزاج اور نقطۂ نظر تھا اس کے پیش نظر اس میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جو درایت کے خلاف ہو، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن جو کہ اصل واساس شریعت ہے اس کو معرض سقط و اوہام بننے اور التباس مع الغیر سے بچانے کے لئے ایک مرتبہ حکم دیا تھا کہ لا تکتبوا عنی غیر القرآن " قرآن کے علاوہ تم مجھسے کوئی روایت مت لکھو، حق یہ ہے کہ حدیث کی روایت کے بارہ میں حضرت ابوبکر کی یہ غایت

---

[۱] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳۔

حزم واحتیاط اُسی ارشادِ نبوی کی اصل روح اور اسپرٹ کی آئینہ دار تھی اور بس ورنہ ان کا منشا ہرگز یہ نہیں تھا کہ روایت حدیث کا باب ہی سرے سے بند کر دیا جائے بلکہ مقصد یہ تھا کہ جس طرح بے ضرورت روایتِ حدیث سے اجتناب کرنا چاہیئے اسی طرح عند الضرورت خاموش بھی نہیں رہنا چاہیئے۔

چنانچہ خود حضرت ابو بکر کا اپنا عمل بھی یہی تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اُن سے جو مرفوع احادیث مروی ہیں وہ تعداد میں زیادہ نہیں ہیں[1] کیونکہ بلا ضرورت وہ روایت بیان ہی نہیں کرتے تھے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی واقعہ ہے کہ ضرورت پڑتی تھی تو پھر خاموش بھی نہیں رہتے تھے اور فوراً حدیث بیان کرتے تھے تم پڑھ آئے ہو کہ سقیفۂ بنو ساعدہ میں جب انصار و مہاجرین کے درمیان ہنگامہ برپا ہوا تو آپ نے حدیث الائمۃ من قریش سنا کر اس پر قابو پایا، وفاتِ نبوی کے وقت اس پر گفتگو ہوئی کہ جسدِ اطہر کو دفن کہاں کیا جائے تو آپ نے ہی ارشادِ نبوی سنا کر اس کا قطعی فیصلہ کیا۔ حضرت فاطمہ اور حضرت علی و عباس کی جانب سے فدک و خیبر کا مطالبہ ہوا تو آپ نے حدیث نبوی پر ہی اپنے جواب کی بنیاد رکھی، عُمّال و محصلینِ صدقات کے نام نصاب و مقدارِ زکوۃ کے متعلق مفصل ہدایات روانہ کیں تو اُن کی اساس احادیث نبویہ ہی تھیں۔

[1] شاہ ولی اللہ صاحب نے ازالۃ الخفا میں حضرت ابو بکر کی قلتِ روایت کے وجوہ یہ لکھے ہیں کہ (۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بہت کم زندہ رہے (۲) وہ مختصر مدت بھی مہمات امور کے انصرام و انجام میں گذر گئی (۳) اُنکے ہمعصر سب صحابہ تھے اور وہ خود حاملینِ روایات تھے اسلئے صدیق اکبر کو استغنا تھا ہمکو اس سے انکار نہیں کہ حضرت ابو بکر کی قلتِ روایت میں ان ہر سہ امور کا دخل ہے لیکن اسکا اصل سبب وہی ہے جو ہم نے بیان کیا اور درحقیقت یہ چیز حضرتِ ابو بکر کی غایت ژرف نگاہی اور دقیقہ شناسی شریعت کی دلیل ہے بعد میں مسلمانوں میں جو فتنے کھڑے ہوئے طرح طرح کے فرقے پیدا ہوئے اور انمیں تحزب و تشتت عام ہوا غور کرو تو اسکی تہ میں یہی کثرت و بے احتیاطیِ روایت نظر آئیگی۔

خبرِ واحد کے متعلق اصول اس سلسلہ میں حضرت ابوبکر کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے خبرِ واحد کے متعلق ایک یہ قاعدہ مقرر کر دیا کہ ایسی روایت اُس وقت تک قابلِ قبول نہیں ہوگی جب تک کہ اُس راوی کیلئے کوئی دوسرا شخص گواہ نہ ہو۔ یعنی اُس روایت کی تائید کسی اور طریق سے نہ ہوتی ہو۔ چنانچہ تم پڑھ آئے ہو کہ میراثِ جدہ کے بارہ میں حضرت ابوبکر نے حضرت مغیرہ بن شعبہ کی روایت سُننے کے بعد ان سے گواہ طلب کیا اور جب انھوں نے محمد بن مسلمہ کو بطور گواہ پیش کر دیا تو وہ روایت قبول کی اسی طرح جمع قرآن کے سلسلہ میں کوئی آیت اگر کسی ایک صحابی کے پاس ملتی تھی تو آپ بغیر شہادت کے اسے قبول نہیں کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ابھی گزر چکا ہے کہ خبرِ واحد سے قرآن پر زیادتی یا اُس میں کمی کرنے کو وہ جائز نہیں سمجھتے تھے۔[1]

حضرت ابوبکر کی روایات کی تعداد علامہ جلال الدین سیوطی نے تاریخ الخلفاء میں ایک سو بیالیس[۱۴۲] روایتیں یک جا جمع کی ہیں جو حضرت ابوبکر صدیق سے مروی ہیں۔ مسند امام احمد بن حنبل میں پہلی ہی روایات حضرت ابوبکر صدیق کی روایت کردہ ہیں۔ حافظ ابن حجر نے الاصابہ میں صحابہ میں حضرت عمر، عثمان علی۔ عبداللہ بن مسعود۔ عبدالرحمٰن بن عوف۔ ابن عمر۔ ابن عمرو۔ عبداللہ بن عباس۔ زید بن ثابت حذیفہ۔ معقل بن یسار۔ عقبہ بن عامر۔ انس۔ ابوہریرہ۔ ابوامامہ۔ ابوبرزہ۔ ابوموسیٰ اور آپکی دونوں صاحبزادیاں حضرت عائشہ۔ اور اسماء اور کبار تابعین میں الصنابحی۔ مرۃ بن شراحیل۔ واسط البجلی۔ قیس بن ابی حازم اور سوید بن غفلہ کے اسمائے گرامی لکھے ہیں جنھوں نے حضرت ابوبکر صدیق سے حدیث کی روایت کی ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ اصل رُواۃ کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے۔ یہ صرف کبارِ صحابہ و تابعین کے نام ہیں۔

فقہ استنباطِ احکام فقہیہ کے اصول چار ہیں۔ کتاب اللہ۔ سنتِ رسول اللہ۔ اجماع اور قیاس

---

[1] استنباطِ احکام کے اصولِ اربعہ کی طرح خبرِ واحد کے قبول سے متعلق اس قاعدہ کی تاسیس و ایجاد بھی مولانا شبلی نے الفاروق میں حضرت عمر فاروق کی ہی طرف منسوب کی ہے۔ حالانکہ حدیث اور فقہ کے باب میں قواعد و ضوابط کی تعیین کا جہاں تک تعلق ہے وہ سب حضرت عمر نے حضرت ابوبکر سے لئے ہیں۔ اور اس معاملہ میں وہ انہیں کے نقشِ قدم پر چلے ہیں۔ ہاں البتہ حضرت عمر نے اُن کی توسیع اس طرح ضرور کی ہے کہ بعد میں وہی چیزیں فن کی بنیاد ہو گئیں۔

ان چاروں اصولوں کی تشخیص وتعیین سب سے پہلے حضرت ابوبکرؓ نے کی اور آج تک مسلمانوں کا اسی پر عمل ہے۔ چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ اصولِ اربعہ کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں :۔

وکانت هذه الاصول مستخرجة عن صنيع الاوائل ونص تصريحاتهم[1]	اور یہ اصول اوائل صحابہ کے عمل اور ان کی تصریحات سے مستنبط ہیں۔

یہ اوائل کا عمل اور ان کی تصریحات کیا ہیں؟ اس سلسلہ میں شاہ صاحبؒ نے سب سے پہلے حضرت ابوبکرؓ کے تعامل کے متعلق میمون بن مہران کی وہ روایت نقل کی ہے جو ہم اجتہاد وقیاس کے باب میں سنن الدارمی کے حوالہ سے نقل کر آئے ہیں۔ حضرت عمر فاروقؓ نے اس بارہ میں جو کچھ کیا اور ولاۃ وقضاۃ کو جو ہدایات بھیجیں وہ سب درحقیقت اُسی متن کی شرح تھیں جو حضرت ابوبکرؓ نے تیار کیا تھا۔ وکفیٰ به فخراً۔

فقیہ کیلئے سب سے ضروری وصف تفقہ ہے جو محض ایک وصف خداداد ہے۔ حضرت ابوبکرؓ میں یہ وصف کس کمال درجہ کا تھا کتاب میں جگہ جگہ عموماً اور اجتہاد وقیاس کے زیرِ عنوان خصوصاً اُس کی مثالیں گزر چکی ہیں۔ یہاں اُن کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

تعبیر رویا علومِ نبوت میں ایک علم تعبیر رویا بھی ہے۔ خود رویائے صالحہ کو صحیح حدیث میں نبوت کا چھیالیسواں اور بعض میں سترواں جزء کہا گیا ہے۔ تعبیر رویا میں یوسفؑ کو جو کمال حاصل تھا اسکا ذکر قرآن مجید میں ہے۔ چونکہ اس فن کا تعلق عالم مادیات کے بجائے عالم روحانیت سے زیادہ ہے اس لئے جس شخص میں روحانی لطافت ونظافت زیادہ ہوگی اسی قدر اس کو اس فن میں دستگاہ ہوگی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو اس میں بھی کمال حاصل تھا۔ فنِ تعبیر کے امام ابنِ سیرینؒ کا قول ہے۔

كان ابوبكر اعبر هذه الامة بعد النبي صلى الله عليه وسلم۔	ابوبکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تعبیر رویا کے فن کے سب سے بڑے عالم تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب کبھی کوئی اہم خواب دیکھتے تھے تو حضرت ابوبکرؓ سے اس کا تذکرہ کرتے تھے اور حضرت ابوبکرؓ اُس خواب کی جو تعبیر بیان کرتے تھے آپؐ اُسکی توثیق وتصدیق فرماتے تھے

[1] حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۱۹ باب الفرق بین اہل الحدیث واصحاب الرائے۔

چنانچہ غزوۂ طائف کے موقع پر جبکہ صحابۂ کرام شہر کا محاصرہ کیے پڑے تھے آپؐ نے ایک خواب دیکھا کہ آپکو ایک بھرا ہوا پیالہ ہدیہ کیا گیا ہے لیکن ایک مرغ نے اُس میں ٹھونگ ماردی اور اسکی وجہ سے پیالہ میں جو کچھ تھا گر پڑا۔ حضرت ابو بکر نے سنتے ہی عرض کیا "یا رسول اللہ! میں نہیں سمجھتا کہ اس موقع پر آپ کو کامیابی ہوگی" ارشاد ہوا۔ "ہاں میرا خیال بھی یہی ہے" [1]

ایک مرتبہ حضرت عائشہ نے خواب میں دیکھا کہ اُن کے حجرہ میں تین چاند گر پڑے ہیں۔ حضرت ابو بکر سے اس کا ذکر آیا اور پھر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی اور حضرت عائشہ کے حجرہ میں آپؐ دفن ہوئے تو حضرت ابو بکر نے فرمایا "بیٹی! ایک چاند تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں جو تمہارے حجرہ میں مصروف استراحت ہیں" [2]

شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اور بھی اسی طرح کے متعدد واقعات لکھے ہیں جن حضرات کو اس کا ذوق ہو وہ مراجعت کر سکتے ہیں اس سلسلہ میں شاہ صاحب کا یہ فقرہ بہت اہم ہے لکھتے ہیں :-

"تعبیر وے (صدیق اکبر) خوابہائے مردم را واصابت عجیبہ در آن تا آنحد کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خواب ہائے خود را بر صدیق اکبر عرض می فرمود و در خواست تعبیر می نمود!" [3]

تصوف دین کے دو پہلو ہیں ایک صوری اور دوسرا معنوی، صوری پہلو کا نام شریعت ہے جسکا تعلق احکام ظاہری کے اتباع و امتثال سے ہے اور معنوی پہلو کا نام طریقت یا تصوف ہے جس کا تعلق قلبی سوز و گداز، روحانی لطافت و طہارت سے ہے اور جس کا مقصد یہ ہے کہ تذکیۂ نفس اور تصفیۂ باطن کے ذریعہ ایک انسان اپنے جذبات اور امیال و عواطف کو مرضیات خداوندی کے اس طرح تابع کردے کہ احکام الٰہی خود اس کا جذبہ اور داعیۂ نفس بن جائیں اور وہ سراپا عبدیت و بندگی ہو جائے شریعت اور طریقت دونوں میں جسم اور روح کا تعلق ہے اور ایک کا وجود دوسرے کے بغیر، جہاں تک کہ دین کی اصل روح کا تعلق ہے بے معنی ہے اگر صرف ظاہری اور رسمی طریقہ پر نماز، روزہ اور زکوٰۃ و حج ہو لیکن دل حُبّ الٰہی

---

[1] طبری ج ۲ ص ۳۵۵ [2] ازالۃ الخفا ج ۲ ص ۳۰ بحوالہ موطا امام مالک دوسرے اور تیسرے چاند حضرت ابو بکر اور حضرت عمر ہیں جو اسی حجرہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں مدفون ہیں [3] ازالۃ الخفا ج ۲ ص ۲۰

اور عشقِ ربانی کی نعمت سے محروم ہو تو وہ اُس پھول کی مانند ہے جو خوش رنگ اور موزوں ہونے کے باوجود بغیر خوشبو کے ہو اور اگر محض حُبِ الٰہی ہو تو اُس کی مثال اُس نغمہ کی ہے جو بے آہنگ اور بے سُرا ہو۔
اس بنا پر دینی نقطۂ نظر سے جب کبھی اسلام کی کسی بڑی شخصیت کا جائزہ لینا ہو تو لازمی طور پر یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ تصوف اور طریقت کے اعتبار سے اس کا کیا مقام اور مرتبہ تھا ورنہ اس کی اصل شخصیت کا مرقع مکمل نہیں ہو سکتا۔

حضرت شاہ ولی اللہ نے تصوفِ صدیقی پر ایک طویل بحث کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ کمالِ طریقت کیلئے جن اوصاف و ملکاتِ نفسانی کی ضرورت ہے مثلاً توکل۔ ورع، احتیاط، کفِ لسان، تواضع شفقت بر خلقِ خدا۔ رضا۔ نفیِ ارادہ۔ زہد، خشیت۔ عبرت۔ عجز و انکسار۔ رقتِ قلب۔ تحمل فقر و درویشی یہ سب حضرت ابوبکر صدیق میں بتمام و کمال پائے جاتے تھے اور اس بنا پر آپ طائفۂ اصفیا و اہلِ طریقت کے سرِ خیل و امام تھے۔ علامہ ہجویری صاحبِ کشف المحجوب لکھتے ہیں کہ تصوف کی جڑ اور بنیاد صفا ہے اس صفت کی ایک اصل ہے اور ایک فرع۔ اصل انقطاع عن الاغیار ہے اور فرع دنیا سے دل کا خالی ہونا ہے اور چونکہ صفا صدیقیت کی صفت لازمہ ہے اس بنا پر حضرت ابوبکر صدیق "امام اہل این طریقہ" ہیں۔[1]

حضرت ابوالعباس بن عطار جو اکابر و مشائخ صوفیہ میں سے ہیں اُن سے کسی نے پوچھا کہ "کونوا ربانیین" کا کیا مطلب ہے؟ فرمایا "اس سے مراد یہ ہے کہ ابوبکر صدیق کی طرح ہو جاؤ۔ ایک ربانی درحقیقت وہی شخص ہے کہ دونوں جہان زیر و زبر ہو جائیں لیکن اُس میں کوئی تشویش اور اضطراب پیدا نہ ہو۔ حضرت ابوبکر صدیق کی شان یہی تھی۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت تمام صحابہ ہی مضطرب اور پریشان تھے لیکن صدیقِ اکبر میں کوئی اضطراب پیدا نہیں ہوا۔ انھوں نے نہایت جرأت اور دلیری سے فرمایا "لوگو! تم میں سے جو شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پوجا کرتا تھا اسکو معلوم ہونا چاہیئے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہو گیا ہے لیکن ہاں البتہ جو شخص اللہ کی پوجا کرتا ہے تو اُسے باور کرنا چاہیئے کہ اللہ حی ہے اور اس کو کبھی موت نہیں آئے گی"۔[2]

[1] بحوالہ ازالۃ الخفا ج ۲ ص ۲۱ [2] کتاب اللمع فی التصوف مطبوعہ لیدن ص ۱۲۱

غزوۂ تبوک کے موقع پر حضرت ابوبکرؓ نے اپنا تمام اثاثہ سرورِ عالم کے قدموں پر لاکر ڈال دیا تھا۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ ابوبکر! تم نے اپنے بال بچوں کیلئے کیا چھوڑا ہے؟ تو بولے "اللہ اور اسکے رسول کو چھوڑا ہے" حضرت ابوبکر الواسطی فرماتے ہیں کہ صدیقِ اکبر کا یہ فقرہ طریقت و معرفت کی دنیا میں وہ پہلا فقرہ ہے جس سے صوفیائے کرام نے بڑے اہم لطائف و رموزِ تصوف کا استخراج کیا ہے[1]

حضرت بکر بن عبداللہ المزنی سے روایت ہے کہ "ابوبکر صدیق جو تمام صحابۂ کرام سے افضل تھے تو نماز روزہ کی وجہ سے نہیں تھے بلکہ اس ایک چیز کی وجہ سے تھے جو اُن کے قلب میں تھی اور وہ تھی اللہ کی محبت اور اس کیلئے جینا اور مرنا[2] حضرت جنید بغدادی فرماتے تھے کہ توحید سے متعلق سب سے زیادہ بلند وہ مقولہ ہے جو حضرت ابوبکر صدیق کی زبان سے ادا ہوتا تھا اور وہ یہ ہے۔

سبحان من لم یجعل للخلق طریقاً	پاک ہے وہ ذات جس نے مخلوق کیلئے اپنی پہچان کا راستہ اس کے
الی معرفتہ الا العجز عن معرفتہ[3]	سوا اور کچھ بتایا ہی نہیں کہ لوگ اس کی معرفت سے عاجز ہیں۔

معرفت و طریقت میں حضرت ابوبکر صدیق کا یہی وہ مرتبہ و مقامِ اعلیٰ ہے جس کی وجہ سے وہ ارباب تصوف کے امام و پیشوا ہیں اور صوفیا کے اکثر بڑے بڑے سلسلوں مثلاً چشتیہ اور نقش بندیہ وغیرہ کی انتہا خلفائے راشدین میں حضرت ابوبکر اور حضرت علی انہیں دو پر ہوتی ہے۔

عشقِ نبوی | بایں ہمہ اوصاف و کمالات حضرت ابوبکر صدیق کا اصل سرمایۂ فخر و نازش وہ عشق تھا جو آپکو محبوبِ رب العٰلمین کی ذاتِ ستودہ صفات کیساتھ تھا اور جو درد بنکر رگ رگ میں جان کے عوض ہر وقت ساری رہتا تھا۔ یہ عشق ہی درحقیقت وہ سرچشمہ تھا جس سے دوسرے کمالات پیدا ہوئے تھے، جب تک رسالت و نبوت کا آفتابِ جہان تاب اس عالمِ ناسوت میں ضوفگن رہا اس سے ایک دن کے لئے بھی جدا نہیں ہوئے۔ وفات کے بعد حالت یہ ہوگئی تھی کہ زبان پر نام مبارک آیا اور آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ حضرت عروہ بیان کرتے ہیں کہ وفاتِ نبوی کے دوسرے برس حضرت ابوبکر ایک مرتبہ

---

[1] کتاب اللمع فی التصوف مطبوعہ لیدن ص ۱۲۱ [2] کتاب اللمع فی التصوف ص ۱۲۳
[3] کتاب اللمع فی التصوف ص ۱۲۴ دیکھو اسی مضمون کو اکبر الہ آبادی نے کس بلاغت سے ادا کیا ہے۔ شعر۔

تو دل میں تو آتا ہے سمجھ میں نہیں آتا ۔۔۔ بس جان گیا میں تری پہچان یہی ہے

خطبہ دینے کھڑے ہوئے تو ابھی اتنا ہی کہا تھا۔

قام فینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عام الاوّل — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہلے سال جب خطبہ دینے کھڑے ہوئے

کہ حضورؐ کی وفات کا سانحہ یاد آگیا اور بلک بلک کر رونے لگے۔ سنبھل کر پھر خطبہ شروع کیا۔ لیکن پھر ہچکی بندھ گئی۔ آخر تیسری بار ضبط سے کام لیکر خطبہ تمام کیا۔[1]

حضرت ام ایمن نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو گود کھلایا تھا۔ اس رشتے سے آپ ان کے گھر آتے جاتے تھے۔ آپ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے بھی یہ وضع قائم رکھی۔ چنانچہ ایک دن وہ اور حضرت عمرؓ وہاں پہنچے تو ام ایمن ان کو دیکھتے ہی رونے لگیں، یہ دونوں بولے۔ "روتی کیوں ہو؟ اللہ کے رسول کے لئے بہتر یہی تھا کہ اللہ سے تقرب ہو جائے۔" حضرت ام ایمن نے کہا "یہ تو میں بھی جانتی ہوں لیکن صدمہ اس بات کا ہے کہ اب وحی کا آنا بند ہو گیا" یہ سن کر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ دونوں پر یہ اثر ہوا کہ بے ساختہ رونے لگے۔[2]

طبری اور ابن اثیر میں ایک روایت ہے کہ دراصل حضرت ابوبکرؓ کی وفات کا باعث ہی یہ ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جدائی کا غم برداشت نہ ہو سکا۔ وہ سوزِ دروں سے اندر ہی اندر پگھلتے رہے اور آخر اپنے محبوب سے جا ملے۔

ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کاشانۂ قدس میں داخل ہو رہے تھے کہ حضرت عائشہؓ کو دیکھا بلند آواز سے بول رہی ہیں۔ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے رفعِ صوت خلافِ ادب تھا اس لئے غصہ آگیا اور حضرت عائشہؓ کو مارنے کے لئے طمانچہ اٹھایا۔[3]

واقعۂ افک میں حضرت ابوبکرؓ کو اپنی بیٹی کی بے گناہی کا یقین تھا۔ بایں ہمہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکرؓ کے مکان پر تشریف لائے اور حضرت عائشہؓ کو خطاب کر کے فرمایا کہ "اگر تم اس تہمت سے بری ہو تو اللہ تعالیٰ تمہاری برات کا اعلان کر دے گا اور

---

[1] مسند امام احمد بن حنبل ج ۱ ص ۸ [2] البدایۃ والنہایۃ ج ۵ ص ۲۷۵
[3] ازالۃ الخفا مقصد دوم ص ۱۵

اگر تم سے کوئی لغزش ہوگئی ہے تو تم اللہ سے استغفار کرو اور توبہ کرو۔ کیونکہ بندہ جب توبہ کر لیتا ہے تو اس کے سارے گناہ دھل جاتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تقریر سننے کے بعد حضرت عائشہ نے اپنے پدر بزرگوار سے درخواست کی کہ میری طرف سے رسول اللہ کو جواب دیجئے۔ لیکن فرطِ ادب واحترام کے باعث حضرت ابوبکر کی زبان نہ کھلی اور بولے "میں نہیں جانتا کہ کیا کہوں"[۱]؟

واقعۂ ایلاء میں ازواجِ مطہرات نے نان نفقہ کا مطالبہ کیا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ناراض ہو کر ایلاء کر لیا تھا اس سے تمام صحابہ سخت پریشان تھے۔ خاص طور پر حضرت ابوبکر اور حضرت عمر جن کی صاحبزادیاں ازواجِ مطہرات میں شامل تھیں زیادہ پریشان تھے۔ آخر دونوں بزرگ درِ دولت پر حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ آپ فرمائیں تو ان دونوں (عائشہ وحفصہ) کی گردن اڑا دیں[۲]۔

حضرت حفصہ بنت عمر پہلے شوہر سے بیوہ ہوگئیں تو حضرت عمر نے حضرت ابوبکر کو پیش کش کی کہ وہ اُن سے نکاح کر لیں حضرت ابوبکر سُن کر خاموش رہے حضرت عمر کو اس پر ناگواری ہوئی تو جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حفصہ سے نکاح کر لیا۔ ایک مرتبہ حضرت ابوبکر نے حضرت عمر سے فرمایا کہ تم نے مجھ کو حفصہ کی جو پیش کش کی تھی میں نے اُسے صرف اس لئے قبول نہ کیا تھا کہ آنحضرت کی ایک گفتگو سے مجھ کو یہ محسوس ہوا تھا کہ حضور خود اُن کے ساتھ نکاح کرنا چاہتے تھے اس وقت میں نہیں چاہتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھید ظاہر کر دوں[۳]۔

ایک مرتبہ عید کے دن حضرت ابوبکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر تشریف لے گئے تو دیکھا کہ حضرت عائشہ کے پاس دو لڑکیاں بیٹھی ہیں جو گانا نہیں جانتی تھیں لیکن بشُم بشُم ایک گیت گا رہی تھیں، حضرت ابوبکر سے چُپ نہ رہا گیا بولے "ارے رسول اللہ کے گھر میں یہ گانے! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم منہ پھیرے لیٹے تھے حضرت ابوبکر کو یہ کہتے سُنا تو فرمایا: اے ابوبکر! ہر قوم کی عید ہوتی ہے۔ آج یہ ہماری عید ہے[۴]۔ بعض مصنفین نے اس واقعہ کو حضرت ابوبکر کے تقویٰ کے واقعات کے ماتحت درج کیا ہے لیکن حق یہ ہے کہ اگر تقویٰ کی بات ہوتی تو

---

[۱] صحیح بخاری ج ۲ ص ۵۹۶ [۲] صحیح مسلم کتاب الایلاء [۳] بخاری ج ۲ ص ۵۸۱
[۴] بخاری ج ۱ ص ۱۳۰

تو اسکا خیال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کسی اور کو نہیں ہو سکتا تھا۔ اصل یہ ہے کہ حضرت ابوبکر اس چیز کو ادب و احترام نبوی کے خلاف سمجھتے تھے اور اسی لئے انھوں نے اس پر سخت الفاظ میں اپنی ناگواری خاطر کا اظہار کیا تھا۔

ناموس نبوی کی حفاظت و رعایت اس غایت تعلق کی بنا پر آپ کے علم میں اگر کوئی ایسا واقعہ آتا جس کا اثر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت و ناموس پر پڑتا تو سخت غضب ناک ہو جاتے تھے قتیلہ بنت قیس بن معدیکرب ایک خاتون تھیں جو اشعث بن قیس کی بہن تھیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مرض وفات میں یا اس سے دو ماہ پہلے (علی اختلاف الروایات) نکاح کیا تھا لیکن ابھی باقاعدہ حرم نبوی میں داخل نہیں ہوئی تھیں کہ حضور دنیا سے رخصت ہو گئے اس کے بعد انھوں نے عکرمہ بن ابی جہل سے نکاح کر لیا۔ حضرت ابوبکر کو اس کا علم ہوا تو غصہ سے برہم ہو گئے اور ارادہ کیا کہ دونوں کو نذر آتش کر دیں لیکن حضرت عمر مزاحم ہوئے انھوں نے کہا کہ قتیلہ امہات المومنین میں داخل نہیں ہیں، وہ حرم نبوی میں شامل نہیں ہوئیں اور نہ ان کیلئے حجاب کا حکم ہوا[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے قرض کی ادائیگی حضرت ابوبکر خلیفۂ رسول بھی تھے اور عاشق رسول بھی اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اعلان کرا دیا تھا کہ جس شخص سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی وعدہ کیا ہو یا جس کسی کا آپ کے ذمہ کوئی قرض ہو وہ میرے پاس آئے[2]

اہل بیت کے ساتھ محبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات قدسی صفات کیساتھ غیر معمولی عشق و محبت کا نتیجہ یہ تھا کہ آپ کو اہل بیت اطہار کیساتھ بھی بڑی محبت تھی اور اُن کا خود اپنے متعلقین سے زیادہ خیال رکھتے تھے، فدک و خیبر کی بحث میں اُن کا یہ قول گزر چکا ہے کہ قسم ہے اُس ذات کی جسکے قبضہ میں میری جان ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اہل قرابت مجھکو اپنے اہل قرابت سے زیادہ محبوب ہیں کہ میں اپنے اہل قرابت کے ساتھ صلہ رحمی کا معاملہ کروں خلیفہ ہونیکے بعد جب حضرت ابوبکر حضرت فاطمہ کے گھر تشریف لے گئے اور وہاں علی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنا تعلق بیان کرنا شروع کیا تو حال یہ تھا کہ حضرت علی (اور بعض روایات کے مطابق حضرت فاطمہ) ایک ایک بات کرتے جاتے تھے اور ادھر حضرت ابوبکر اُسے سُن سُن کر روتے جاتے تھے[3]

وفات نبوی کے چند ہی روز بعد کا ذکر ہے کہ حضرت ابوبکر نماز عصر سے فارغ ہو کر مسجد سے نکل رہے تھے کہ

[1] الاستیعاب ابن عبد البر باب القاف [2] بخاری ج ۱ ص ۳۰۴ و ج ۲ ص ۶۲۹ [3] طبری ج ۲ ص ۹۴۴

حضرت حسن بن علی نظر آگئے، جو محلہ کے بچوں کیساتھ کھیل رہے تھے حضرت ابو بکر نے جگر گوشہ بتول کو دوش پر اٹھا لیا[1]

فتوحات عراق کے سلسلہ میں ایک مرتبہ حضرت خالد نے جو مالِ غنیمت مدینہ بھیجا اسکے ساتھ ایک قیمتی طیلسان بھی تھا جو حضرت ابو بکر کے پاس بطور تحفہ بھیجا گیا تھا حضرت ابو بکر نے وہ طیلسان امام حسین بن علی کے نذر کر دیا[2]

حضرت ابو بکر اہلِ بیت اطہار کیساتھ لطف و مدارات کا معاملہ خود تنہا نہیں کرتے تھے۔ بلکہ مسلمانوں کو بھی عام طور پر اسکی تاکید کرتے تھے کہ ، ، کا خاص طور پر خیال رکھیں، اُن کے اصل الفاظ یہ ہیں:

ارقبوا محمداً صلی اللہ علیہ وسلم فی اہلِ بیتہ[3]

عام روایت ہے کہ حضرت فاطمہ کی وفات ہوئی تو حضرت علی نے راتوں رات اُنکی تجہیز و تکفین کی نماز جنازہ پڑھی اور انکو دفن کر دیا لیکن جعفر بن محمد نے اپنے والد سے روایت کی ہے کہ جب حضرت فاطمہ کی وفات ہوئی تو حضرت ابو بکر و عمر مکان پر حاضر ہوئے جنازہ تیار ہو کر آگیا تو صدیق اکبر نے حضرت علی سے کہا "چلئے نماز پڑھائیے" انھوں نے انکار کیا اور فرمایا۔ "آپ رسول للہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ ہیں آپ آگے بڑھیے اور نماز پڑھائیے" چنانچہ ایسا ہی ہوا اور حضرت ابو بکر نے امامت کی"[4]

یہی روایت قرینِ قیاس اور مقتضائے درایت ہے ہم صفحاتِ گزشتہ میں ثابت کر چکے ہیں کہ حضرت علی نے حضرت ابو بکر سے بیعتِ عامہ کے دن ہی بیعت کی تھی اور حضرت علی برابر حضرت ابو بکر کے رفیق اور ان کے معاون بنے رہے۔ حضرت فاطمہ بھی ناراض نہیں رہی تھیں اور خلیفۂ رسول کے تعلقات خاندانِ نبوت سے ہرگز کشیدہ نہیں تھے بلکہ خوشگوار تھے، ان سب امور کے پیشِ نظر یہ کیونکر باور کیا جا سکتا ہے کہ جگر پارۂ رسول کی وفات ہو جائے اور جانشینِ رسول کو اُسکی خبر بھی نہ ہو اور وہ اُن کے جنازہ تک میں شریک نہ ہوں، اصل یہ ہے کہ بنو امیہ میں کچھ لوگ ایسے ضرور تھے جن کا آئینۂ قلب گردِ کدورت سے صاف نہیں تھا جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے وہ لگائی بجھائی کی باتیں کرتے رہتے تھے عام مجلسوں میں اُس کا تذکرہ ہوتا ہوگا اور اُس سے بدگمانیاں پھیلتی ہونگی، یہی وہ بدگمانیاں ہیں جنکا اثر روایات میں ظاہر ہے۔ ایک نکتہ شناسِ نفسیات معلوم کر سکتا ہے کہ ان روایات میں کتنی بات واقعی ہے

[1] بخاری ج ۱ ص ۵۳۰ والبدایۃ ج ۵ ص ۲۸۶ [2] فتوح البلدان بلاذری ص ۲۵۴ [3] بخاری ج ۱ ص ۵۳۰ [4] کنز العمال بر مسند امام احمد ج ۴ ص ۳۵۵

اور کتنی وہ ہے جو اس طرح کی عام بدگمانیوں کے زیرِ اثر راوی کا اپنا اضافہ اور خود اُس کے اپنے احساس یا قیاس کا نتیجہ ہے۔

مکارم اخلاق

اسلام کا اصل مقصد تزکیۂ نفس اور تطہیر باطن کے ذریعہ اعلیٰ اخلاق و صفات سے متصف کرنا ہے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی غرضِ بعثت ہی مکارمِ اخلاق کی تکمیل و تتمیم بیان فرمائی ہے:-

بعثت لاتمم مکارم الاخلاق۔

حضرت ابو بکر کی فطرت چونکہ سعید تھی اسلئے آپ عہدِ جاہلیت میں بھی اخلاقِ حمیدہ سے متصف تھے، اس زمانہ میں بھی کبھی آپ نے ام الخبائث کو مُنہ نہیں لگایا۔ قمار کی مجلس میں کبھی شریک نہیں ہوئے۔ کسی بُت کے آگے سر کبھی خمیدہ نہیں ہوا حالانکہ یہ تینوں چیزیں عربوں کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھیں، اسکے علاوہ غریبوں کی خبر گیری، بے کسوں اور اپاہجوں کی مدد۔ مسافر نوازی اور مہمان داری آپ کے خاص اوصاف تھے۔ پھر شرف اسلام سے مشرف ہوئے تو ان اوصاف پر اور جلا ہوئی اور آپ مکارم و محامدِ اخلاق کے پیکرِ اتم بن گئے۔

تقویٰ و طہارت آپ کے صحیفۂ اخلاق میں سر فہرست تقویٰ و طہارت کا وصف تھا جس طرح ایک تندرست معدہ مکھی یا اسی طرح کی کوئی اور نجس چیز کو برداشت نہیں کر سکتا۔ حضرت ابو بکر کا معدہ کسی ایسی چیز کو برداشت ہی نہیں کر سکتا تھا جو معنوی نجاست و گندگی رکھتی ہو۔ چنانچہ حضرت ابو بکر کا ایک غلام تھا اُس نے ایک مرتبہ کوئی چیز لا کر دی۔ حضرت ابو بکر نے جب اُس کو کھالیا تو غلام بولا۔ "آپ جانتے بھی ہیں وہ کیا چیز تھی؟" پوچھا "کیا تھی؟" اس نے جواب دیا کہ میں عہدِ جاہلیت میں جھوٹ موٹ کہانت کا کام کرتا تھا یہ چیز اُسی کا معاوضہ تھی۔ حضرت ابو بکر نے یہ سنتے ہی قے کر دی اور جو کچھ پیٹ میں تھا خارج کر دیا۔[1]

ایک دفعہ حضرت ابو بکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے حضرات کیساتھ سفر کر رہے تھے، درمیان میں ایک جگہ پڑاؤ ہوا۔ سب حضرات مختلف لوگوں کے ہاں ٹھہر گئے۔ حضرت ابو بکر، ابو سعید الخدری وغیرہ کے

[1] صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۴۳

ساتھ ایک اعرابی کے گھر میں فروکش ہوئے۔ ان کے ساتھ ایک اعرابی اور تھا میزبان کی بیوی حاملہ تھی۔ اس اعرابی نے میزبان کی بیوی سے شرط کرلی کہ اگر وہ ان سب کو بکری کھلائیگی تو اس کے لڑکا پیدا ہوگا۔ عورت نے یہ شرط منظور کرلی اور بکری ذبح کردی جس پر اعرابی نے الٹم سٹم کچھ مسجع جملے پڑھ دیئے بکری کا گوشت کھانیکے بعد جب حضرت ابوبکر کو پورا قصہ معلوم ہوا تو ان سے برداشت نہ ہوسکا فوراً قے کردی[۱]

غایتِ تقویٰ وطہارت کے باعث جس طرح صدیقِ اکبر کا معدہ کسی نامشروع چیز کو گوارا نہیں کرسکتا تھا اسی طرح اُن کے قدم اُس راہ میں بھی نہیں اُٹھ سکتے تھے جس میں فساق وفجار رہتے ہوں' ایک مرتبہ ایک شخص آپکو ایک راستہ سے اپنے گھر لے جارہا تھا۔ حضرت ابوبکر اس سے واقف نہیں تھے پوچھا "یہ کونسا راستہ ہے؟ اس شخص نے کہا" اس راستہ میں ایسے لوگ رہتے ہیں جن کے پاس سے گزرتے ہوئے بھی ہم کو شرم آتی ہے۔ حضرت ابوبکر نے فرمایا" کیا خوب! گزرتے ہوئے شرم بھی آتی ہے اور پھر بھی اسی راہ سے جارہے ہو۔ تم جاؤ میں نہیں جاؤں گا۔[۲]

حضرت ابوبکر کے تقوے کا یہ اثر تھا کہ اُن کے گھر کی مستورات تک اسی رنگ میں رنگ گئی تھیں، آپ کی صاحبزادی حضرت اسماءؓ کی ماں نے اسلام نہیں قبول کیا تھا اور اس لئے حضرت ابوبکر نے انکو طلاق دیدی تھی، ایک مرتبہ ماں کی مامتا نے جوش مارا تو بیٹی کیلئے کھانے کی چیزیں بطور تحفہ لائیں چونکہ اسلام قبول نہ کرنیکے باعث ماں کا تحفہ مشکوک تھا اسلئے حضرت اسماءؓ نے اُن کے قبول کرنے سے انکار کیا لیکن بعد میں جب حضرت عائشہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مسئلہ دریافت کیا تو آپؐ نے قبول کرنیکی اجازت دے دی[۳]

خوفِ خدا الحکمۃ راس الحکمۃ مخافۃ اللہ تقویٰ وطہارت اور تمام دوسری نیکیوں کی جڑ خوفِ خدا ہے حضرت ابوبکر پر خوفِ خدا کا اس درجہ غلبہ تھا کہ ایک مرتبہ ایک چڑیا کو درخت پر بیٹھے ہوئے دیکھا تو اسکو خطاب کرکے کہنے لگے۔ "واہ واہ! اے چڑیا تو کتنی خوش نصیب ہے، اے کاش میں بھی تیرا جیسا ہوتا تو درخت پر بیٹھتی ہے پھل کھاتی ہے اور پھر اُڑجاتی ہے تجھسے نہ کوئی حساب ہے، اور نہ کتاب۔ آہ اے کاش میں ایک سرِ رہگذر درخت ہوتا۔ اونٹ وہاں سے گزرتا۔ مجھ کو پکڑتا۔ اپنا مُنہ مجھ میں مارتا۔ مجھ کو چباتا اور اس طرح میری تحقیر کرتا اور پھر مینگنی کی شکل

[۱] مسند امام احمد بن حنبل ج ۳ ص ۵۱ [۲] کنز العمال بر مسند احمد ج ۴ ص ۳۴۴
[۳] طبقات ابن سعد تذکرہ حضرت اسماءؓ۔

میں مجھ کو خارج کر دیتا۔ یہ سب کچھ ہوتا مگر میں بشر نہ ہوتا۔[1]

ندامت اور پشیمانی | اس خوفِ خدا کا یہ اثر تھا کہ اگر کبھی کوئی معمولی بھول چوک بھی ہو جاتی تھی تو بعد میں سخت ندامت اور پشیمانی ہوتی تھی اور جب تک وہ اُسکی تلافی نہیں کر لیتے تھے انھیں چین نہیں آتا تھا، ایک مرتبہ حضرت ابوبکر اور ربیعہ بن کعب اسلمی میں زمین کے ایک ٹکڑہ کے بارے میں کچھ جھگڑا ہو گیا۔ حضرت ابوبکر نے غصہ میں کوئی سخت بات کہدی، بعد میں اُن کو خود احساس ہوا تو ربیعہ سے بولے "تم بھی مجھ کو ایسی ہی سخت بات کہکر مجھ سے بدلہ لے لو" لیکن ربیعہ نے انکار کیا۔ آخر حضرت ابوبکر بولے "اگر تم مجھ سے اپنا بدلا نہیں لوگے تو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جاکر تمہاری شکایت کروں گا"۔ ربیعہ نے کہا "میں ہرگز ایسا نہیں کر سکتا اور مزید برآں یہ کیا کہ زمین جو بس کی گانٹھ تھی اُس سے ہی دست برداری دیدی۔ حضرت ابوبکر نہ مانے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونیکے لئے چل پڑے آگے آگے خود تھے پیچھے ربیعہ آرہے تھے ربیعہ کے قبیلہ والوں نے یہ دیکھا تو وہ بھی ربیعہ کی حمایت کیلئے اکٹھے ہو گئے اور کہنے لگے "کیا خوب! ایک تو ابوبکر نے تم کو ایسی نامزا بات کہدی اور پھر اُلٹے وہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کرنے جا رہے ہیں۔ ربیعہ نے کہا "چُپ رہو، تم جانتے نہیں یہ کون ہیں۔ یہ ابوبکر، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رفیق غارِ ثور ہیں۔ انھوں نے پلٹ کر تم کو دیکھ لیا تو غضب ناک ہو جائیں گے۔ اُنکے غضب کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو غصہ آئیگا، اور ان دونوں کے غصہ کی وجہ سے اللہ غضب ناک ہو جائیگا اور نتیجہ یہ ہوگا کہ ربیعہ تباہ و برباد ہو جائیگا چنانچہ یہ سب لوگ واپس ہو گئے۔ اب حضرت ابوبکر نے خدمتِ اقدس میں حاضر ہو کر پورا ماجرا سُنایا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت ربیعہ کا بیان بھی سُن لیا تو فرمایا "ربیعہ! تم نے اچھا کیا کہ ابوبکر کو وہی بات پلٹ کر نہیں کہی جو انھوں نے تم سے کہی تھی لیکن ہاں اب یہ کہو کہ اے ابوبکر! اللہ آپکی غلطی معاف کرے" حضرت ربیعہ نے تعمیلِ ارشاد کی تو حضرت ابوبکر رو پڑے اور اسی حالت میں واپس ہو گئے۔[2]

اسی طرح ایک مرتبہ حضرت عمر کیساتھ کسی بات میں تیز کلامی ہو گئی اور انھیں سخت سُست کہہ گزرے بعد میں اس کا احساس ہوا تو سخت ندامت ہوئی حضرت عمر سے بولے "تم مجھ کو معاف کر دو" حضرت عمر نے انکار کیا تو

[1] منتخب کنز العمال بر مسند امام احمد ج ۴ ص ۳۶۱ [2] مسند امام احمد ج ۴ ص ۵۹

تہمد کا ایک کونہ پکڑے ہوئے جس سے آپ کے گھٹنے ظاہر ہو رہے تھے خدمتِ نبوی میں حاضر ہوئے اور پوری روئیداد کہہ سنائی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دفعہ فرمایا "ابوبکر! خدا تمہاری خطا معاف فرمائے" اب حضرت عمرؓ کو بھی افسوس ہوا۔ دوڑے ہوئے حضرت ابوبکرؓ کے مکان پر آئے دیکھا تو وہ وہاں تھے نہیں سیدھے خدمتِ نبوی میں پہنچے، حضرت عمرؓ کو دیکھتے ہی سرورِ عالمؐ کے چہرۂ مبارک کے تیور بگڑنے لگے۔ حضرت ابوبکرؓ کو اندیشہ ہوا کہ کہیں حضرت عمرؓ پر عتاب نہ ہو۔ اس لئے فوراً دوزانو ہو کر بیٹھ گئے اور بڑی لجاجت سے عرض کیا "اے رسول اللہ! خدا کی قسم! ظلم تو میں نے کیا تھا۔"[1]

ایک مرتبہ کسی اپنے غلام سے کسی بات پر خفا ہو کر اُس کو لعن طعن کر دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُس وقت موجود تھے دو یا تین بار فرمایا "اے ابوبکر صدیقین اور لعانین دونوں ہرگز ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے" حضرت ابوبکرؓ نے یہ سنتے ہی بطور کفارہ چند غلام آزاد کر دیئے اور عرض کیا "اب میں کبھی ایسا نہیں کروں گا۔"[2]

چونکہ حضرت ابوبکرؓ سے برنبائے بشریت زبان سے کبھی کبھی اس طرح کی لغزش ہو جاتی تو آپ اس پر نادم ہوتے تھے چنانچہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ آپ کے پاس آئے تو دیکھا کہ اپنی زبان پکڑ کر کھینچ رہے ہیں بولے "خدا آپ کو معاف کرے ایسا نہ کیجئے۔" حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا "اسی زبان نے تو مجھ کو تباہ کیا ہے۔"[3]

زہد و ورع | خوفِ خدا اور تقویٰ و طہارت کی وجہ سے انسان کے دل پر دُنیا کی بے ثباتی کا نقش جم جاتا ہے اور لازمی طور پر زہد و ورع کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں ہی دنیا نے اپنا سر مسلمانوں کے قدموں پر جھکا دینا شروع کر دیا تھا لیکن آپ کے زہد و ورع کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ آپ نے پینے کیلئے پانی مانگا۔ لوگوں نے پانی اور شہد ملا کر پیش کیا۔ آپ نے پیالہ مُنہ سے لگا کر ہٹا لیا اور رونے لگے۔ جو لوگ پاس بیٹھے تھے اُن پر ایسی رقت طاری ہوئی کہ وہ بھی رونے لگے۔ آپ تھوڑی دیر کیلئے چُپ ہو گئے پھر رونا شروع کیا لوگوں نے وجہ دریافت کی تو فرمایا "میں ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا۔ میں نے دیکھا کہ آپ کسی کو دُور دُور کہہ رہے ہیں" میں نے پوچھا یا رسول اللہ! آپ کس چیز کو دُور دور کہہ رہے ہیں میں تو یہاں کوئی چیز دیکھتا نہیں ہوں، ارشاد ہوا "دنیا میرے سامنے مجسم ہو کر آئی تھی میں نے اُس سے کہا کہ میرے سامنے سے ہٹ جا وہ ہٹ گئی مگر پھر دوبارہ آئی اور کہا کہ آپ مجھ سے بچ کر نکل جائیں تو نکل جائیں

[1] صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۱۶ [2] الادب المفرد باب من لعن عبدہ فاعتقہ [3] موطا امام مالک باب ما جاء فیما یخاف من اللسان

لیکن آپکے بعد جو لوگ آئیں گے وہ بچکر نہیں جا سکتے، یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد حضرت ابوبکر نے فرمایا کہ اس وقت مجھ کو بھی یہ بات یاد آگئی اور مجھ کو خوف ہوا کہ کہیں مجھ سے چمٹ نہ جائے۔[۱]

حضرت رافع بن ابی رافع سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ میں حضرت ابوبکر کیساتھ سفر کر رہا تھا اُن کے پاس ایک فدکی چادر تھا میں اور وہ جب کبھی پڑاؤ ڈالتے تھے تو ہم دونوں اُس کو ہی استعمال کرتے تھے۔[۲]

ایک مرتبہ حضرت خالد بن الولید کو نصیحت فرمائی۔

فرعن الشرف یتبعك الشرف واحرص	بُرائی سے بھاگو تو بُرائی تمہارے پیچھے آئیگی اور موت کی
علی الموت توهب لك الحياة[۳]	آرزو کرو تو تم کو زندگی بخشی جائیگی۔

تواضع اور سادگی | حضرت ابوبکر اگرچہ نہایت جلیل القدر خلیفہ تھے لیکن غریبوں اور ضرورتمند لوگوں کا معمولی سے معمولی کام کرنے میں بھی انکو دریغ نہیں ہوتا تھا اور نہایت خاموشی سے وہ ایسے کام کرنے میں بڑی مسرت محسوس کرتے تھے، مدینہ میں ایک نابینا عورت تھی جس کا کام کاج حضرت عمر آکر کر دیتے تھے لیکن چند روز کے بعد انہیں معلوم ہوا کہ اُن سے پہلے کوئی اور شخص آکر اُس عورت کے تمام کام کر جاتا ہے، اُن کو اب یہ معلوم کرنیکا شوق ہوا کہ یہ کون شخص ہے، ایک شب وہ اُس کی گھات میں کہیں چھپے بیٹھے رہے تو یہ دیکھ کر اُن کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ یہ شخص حضرت ابوبکر تھے جو خلیفہ ہونیکے باوجود پوشیدہ طور پر نابینا عورت کے گھر آتے تھے اور اسکے تمام گھریلو کام کر جاتے تھے۔[۴]

مسندِ خلافت پر جلوہ فروز ہونے سے پہلے محلّہ کی لڑکیوں کی بکریوں کا دُودھ دوہ دیتے تھے۔ خلیفہ ہونیکے بعد سب سے زیادہ ایک بھولی بھالی لڑکی کو فکر ہوئی کہ اب ہماری بکریوں کا کیا ہوگا؟ حضرت ابوبکر نے سُنا تو فرمایا خدا کی قسم! میں اب بھی بکریاں دوہوں گا، خلافت مجھ کو خدمتِ خلق سے باز نہ رکھ سکے گی۔[۵]

خلافت سے قبل آپ کا ذریعۂ معاش تجارت تھا۔ انتخاب کے کچھ دنوں بعد تک بھی اسکو قائم رکھا، ایک دن حسب معمول کندھے پر کپڑوں کے تھان رکھے ہوئے بازار جا رہے تھے کہ راہ میں حضرت عمر اور حضرت

---

[۱] اسد الغابہ ج ۳ ص ۲۱۷ [۲] ازالۃ الخفا ج ۲ ص ۲۲ بحوالہ مسند ابن ابی شیبہ [۳] مختصر العقد الفرید ص ۳

[۴] ابن اثیر جلد ۲ ص ۲۹۰ [۵] طبقات ابن سعد تذکرۂ حضرت ابوبکر و ابن اثیر ج ۲ ص ۲۹۱

ابوعبیدہ مل گئے، انھوں نے کہا "اے خلیفۂ رسول! آپ کہاں جارہے ہیں؟" بولے "بازار" انھوں نے کہا "اب آپ مسلمانوں کے والی ہیں۔ چلئے! ہم آپ کیلئے وظیفہ مقرر کردیں گے"[1] لیکن ایک روایت ہے کہ حضرت ابوبکر نے کچھ روز تو تجارت کا مشغلہ جاری رکھا لیکن جب آپکو یہ محسوس ہوا کہ اس سے فرائض خلافت کی انجام دہی میں یکسوئی باقی نہیں رہتی اور اس میں خلل پڑتا ہی تو آپ نے خود صحابۂ کرام کے مشورہ سے بقدر ضرورت اپنا وظیفہ مقرر کرلیا۔[2]

انکسار و تواضع اور فروتنی کی انتہا یہ تھی کہ لوگ خلیفۂ رسول کی حیثیت سے تعظیم و تکریم کے آداب بجالاتے تھے تو دل میں شرمساری محسوس کرتے تھے اور فرماتے تھے "تم لوگوں نے مجھکو بہت بڑھا چڑھا دیا ہے۔" اگر کسی سے مدح و ستائش کے الفاظ سن لیتے تو دل ہی دل میں کہتے کہ "اے خدا تو مجھ کو ان لوگوں کے حسن ظن کے مطابق بنا۔ میرے گناہوں کو معاف کردے اور لوگوں کی بیجا تعریف پر میری پکڑ نہ کر"[3]

غیر طبعی طور پر اگر تکبر کی کوئی علامت آپ میں پائی جاتی تھی تو پریشان ہوجاتے تھے، ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو شخص اپنے کپڑے از راہ تکبر گھسیٹتے ہوئے چلتا ہے اللہ قیامت کے دن اس کی طرف نظر نہیں کریگا۔ صدیق اکبر نے عرض کیا "یا رسول اللہ! میرے کپڑوں کا ایک پہلو کبھی کبھی لٹک جاتا ہی اور مجھ کو اس کا خیال نہیں رہتا۔ ارشاد ہوا "تم تو از راہ تکبر ایسا نہیں کرتے۔"[4]

خودداری اگرچہ دوسروں کا معمولی سے معمولی کام کرنے میں بھی آپ کو عار نہیں آتی تھی لیکن خودداری کی وجہ سے دوسروں سے اپنا ذرا سا کام لینا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ ابن ابی ملیکہ کا بیان ہے کہ بسا اوقات چلتے چلتے حضرت ابوبکر کے ہاتھ سے اونٹ کی نکیل چھوٹ کر گرپڑتی تھی تو اونٹ کو بٹھا کر خود اٹھاتے تھے، ایک مرتبہ لوگوں نے عرض کیا آپ اتنی زحمت کیوں اٹھاتے ہیں۔ ہم کو حکم کیا کیجئے ہم اٹھا دینگے" فرمایا میرے حبیب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو حکم دیا ہی کہ میں لوگوں سے کسی چیز کا سوال نہ کروں۔[5]

فقر و درویشی حضرت ابوبکر بیت المال سے اپنے لئے وظیفہ لیتے تھے لیکن اسکی تعداد کتنی تھی اسکا اندازہ اس سے ہوسکتا ہی کہ ایک مرتبہ ان کی بیوی کا جی چاہا کہ حلوہ کھائیں، شوہر سے فرمائش کی تو انھوں نے جواب دیا کہ گنجائش نہیں ہی، بیوی نے کہا "اچھا! آپ روزمرہ کے خرچ کیلئے مجھ کو جو دیتے ہیں اب میں اسی میں سے پس انداز

[1] طبقات ابن سعد تذکرہ حضرت ابوبکر [2] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۱۱ [3] اسد الغابہ ج ۳ ص ۲۲۱ [4] صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۱۷ [5] مسند امام احمد بن حنبل ج ۱ ص ۱۱

کرونگی یہانتک کہ وہ حلوہ کی قیمت کے برابر ہوجائے۔ حضرت ابوبکر نے کہا "اچھا کرو" چند روز میں اتنے پیسے جمع ہوگئے کہ حلوہ خریدا جاسکے، اب خلیفۂ رسول کو اسکا علم ہوا تو فرمایا کہ "معلوم ہوا کہ روزمرہ کا خرچ ان چند پیسوں کو کم کردینے کے بعد بھی پورا ہوسکتا ہے جو تم روزانہ پس انداز کرتی تھیں، اس لئے اب آئندہ تم کو گھر کا خرچ اُسی قدر کم کرکے دیا جائیگا" اور جو رقم حلوہ کے نام سے پس انداز ہوئی تھی وہ بیت المال میں داخل کردی [۱]

انفاق فی سبیل اللہ | پہلے گزر چکا ہے اسلام قبول کرنیکے وقت آپکے پاس چالیس ہزار درہم تھے، مدینہ پہنچے پہنچتے کل پانچ ہزار رہ گئے وہ بھی سب اللہ کی راہ میں خرچ کردیئے یہاں حضرت خارجہ کی شرکت میں تجارت پھر شروع کی، اس سے بھی جو کچھ آمدنی ہوئی غزوۂ تبوک میں سب حضورؐ کے قدموں پر لاکر رکھدی، اور بال بچوں کے لئے صرف اللہ اور اس کے رسول کو چھوڑ دیا۔ یہ واقعات تو خلافت سے پہلے کے تھے، خلیفہ ہوئے تو تجارت ترک کردی اور بہت معمولی طور پر گزر بسر کرنے لگے مرض وفات میں حضرت عائشہؓ سے فرماتے ہیں "جب میں خلیفہ ہوا ہوں میں نے مسلمانوں کا کوئی درہم کھایا ہے نہ دینار، موٹا جھوٹا جو وہ کھاتے اور پہنتے ہیں وہی میں نے کھایا اور پہنا ہے اور اب اس وقت لے دے کے میرا جو کچھ اثاثہ ہے وہ یہ ایک اونٹ، ایک غلام اور یہ ایک چادر ہے" [۲] خود تنگی ترشی سے گزر بسر کرتے تھے لیکن غریبوں اور محتاجوں کا اتنا خیال تھا کہ موسم سرما میں انکو کپڑے تقسیم کرتے تھے [۳]

شجاعت | شجاعت ایک ایسا وصف ہے جو عجز و مسکنت اور تواضع و بےنفسی کیساتھ بہت کم جمع ہوتا ہے لیکن اصلاح جو تزکیۂ نفس کے ذریعہ اخلاق و ملکات کے اعتدال کا نام ہے اُس کی تعلیمات اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص فیض تربیت کا یہ اثر تھا کہ صحابۂ کرام اشداء علی الکفار رحماء بینھم کی تصویر تھے۔ شبنم کی لطافت کیساتھ سورج کی حرارت اور شیشہ کی نزاکت کیساتھ پتھر کی سختی رکھتے تھے۔ حضرت ابوبکر اس وصف خاص میں بھی سب سے نمایاں تھے۔ محمد بن عقیل کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علی بن ابی طالب نے خطبہ دیتے دیتے پوچھا کہ بتاؤ "دنیا کا سب سے زیادہ بہادر کون ہے؟" ہم نے کہا "آپ" فرمایا "نہیں! اس کے بعد ارشاد ہوا "اشجع الناس حضرت ابوبکر تھے غزوۂ بدر کے موقع پر ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے ایک کیمپ بنادیا تھا جس میں آپ قیام فرمائیں۔ پھر

[۱] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۹۱ [۲] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۹۰ [۳] ایضاً

ہم نے پوچھا کہ اس کیمپ میں حضورؐ کی چوکیداری کی خدمت کون انجام دیگا تو کسی نے پیش قدمی نہیں کی
البتہ حضرت ابوبکر نے سبقت فرمائی اور شمشیر بدست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اسی
مستعدی اور آمادگی کیساتھ پہرہ دیتے رہے کہ جہاں کسی نابکار نے ادھر کا رُخ کیا اور ابوبکر اس پر جھپٹ
پڑے۔ اسی طرح مکہ میں ایک مرتبہ قریش نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے نرغہ میں لیکر طرح طرح
کی اذیتیں دینی شروع کیں تو اُس وقت بھی تنہا یہی ابوبکر تھے جو اس ہجوم میں گھسے چلے گئے، کسی کو دھکا
دیا کسی کے تھپڑ رسید کیا۔ کسی کو لات ماری اور کسی کو پیٹا اور مارا اور آخر یہ کہتے ہوئے کہ ارے ظالمو کیا
تم اُس شخص کو قتل کرنا چاہتے ہو جو کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے رسول اللہ کو نرغہ میں سے نکال لائے۔
راوی کا بیان ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ یہیں تک کہہ پائے تھے کہ جی بھر آیا اور آنسوؤں کا دریا
اُمنڈ پڑا جس سے ریش مبارک تربتر ہوگئی۔[1]

حلم اور بردباری اعلیٰ کمالِ شجاعت کیساتھ حلم اور بردباری کا ہونا بھی ضروری ہے، ایک مرتبہ کسی شخص
نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور بعض صحابۂ کرام کی موجودگی میں حضرت ابوبکر کو سب وشتم کیا۔ آپ سُن کر
پی گئے اُس شخص نے دوبارہ پھر وہی بدتمیزی کی۔ آپ اس مرتبہ بھی خاموش رہے لیکن جب تیسری بار اس
نے پھر یہی حرکت کی تو آپ نے اس کا جواب دیا تاہم آپکو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا طلبی
کا اتنا خیال تھا کہ حضرت ابوبکر کا جواب سنتے ہی آپ کھڑے ہوگئے تو معاً خیال آیا کہ آپ کہیں ناراض تو نہیں ہوگئے۔
عرض کیا۔ اوجدت علی یا رسول اللہ — اے رسول اللہ! کیا آپ کو مجھ پر غصہ آگیا۔
ارشاد ہوا "یہ شخص تم کو جو کچھ کہہ رہا تھا۔ آسمان سے ایک فرشتہ نازل ہو کر خود اُس کی تکذیب کر رہا تھا
لیکن جب تم نے اُس سے بدلہ لے لیا تو بیچ میں شیطان آدھمکا پھر میرے لئے مناسب نہ تھا کہ میں وہاں
بیٹھا رہوں جہاں شیطان ہو،[2]

حضرت ابو برزہ کی روایت سے یہ واقعہ پہلے ہی گزر چکا ہے کہ عہدِ خلافت میں ایک شخص نے
حضرت ابوبکر کو اُن کے مُنہ پر بُرا بھلا کہا، اس پر ایک صحابی نے اس شخص کی گردن اڑا دینے کی اجازت
طلب کی تو آپ نے سختی سے منع کیا اور فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرنیوالے کے

[1] کنز العمال برمسند احمد ج ۴ ص ۳۵۹ [2] سنن ابی داؤد کتاب الادب باب فی الانتصار

علاوہ اور کسی کی گردن اڑانا جائز نہیں ہے۔

حسنِ خلق حسنِ خلق اسلامی اخلاق کا اصل عنوان ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "میزان قیامت میں حسنِ خلق سے زیادہ وزنی کوئی چیز نہیں ہے" نیز فرمایا "تم میں سب سے زیادہ بہتر وہی ہے جو اخلاق میں سب سے بہتر ہے" حسنِ خلق کا مظاہرہ سب سے پہلے ملاقات کے وقت علیک سلیک میں ہوتا ہے اس بارہ میں حضرت ابوبکر کا طریقہ یہ تھا کہ سلام کرنے میں پہل کرتے تھے اور اگر کوئی اس سلام کا جواب بڑھ چڑھ کر دیتا تھا تو آپ اس میں مزید اضافہ کر کے پھر سلام کی تکرار کرتے تھے' حضرت عمر بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں حضرت ابوبکر کے ساتھ ایک ہی سواری پر بیٹھا ہوا جا رہا تھا کہ راستہ میں کچھ لوگ ملے۔ حضرت ابوبکر نے کہا "السلام علیکم" ان لوگوں نے جواب دیا "السلام علیکم ورحمۃ اللہ" اب حضرت ابوبکر نے کہا "السلام علیکم ورحمۃ اللہ" تو ان لوگوں نے کہا "السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ" آخر حضرت ابوبکر نے فرمایا "آج یہ لوگ ہم سے بازی لے گئے"۔[1]

حضرت عبداللہ بن عمر خود اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک جھگڑا چکانے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق کو میرے ساتھ روانہ کیا تو راستہ میں جو لوگ ملتے تھے وہ مجھکو سلام کرنے میں پہل کرتے تھے حضرت ابوبکر صدیق نے یہ دیکھ کر مجھ سے کہا "کیا تم نہیں دیکھتے' یہ لوگ ہمکو سلام کرنے میں پہل کرتے ہیں تو ثواب کے مستحق وہی ہوتے ہیں۔ تم خود سبقت کرو' تاکہ تم کو ثواب ملے"[2]

حسنِ خلق کی دوسری علامت یہ ہے کہ آدمی دوسروں کے درد و غم میں شریک ہو۔ حضرت ابوبکر اسکا اس قدر اہتمام کرتے تھے کہ عبداللہ بن سہیل ایک قریشی تھے۔ غزوہ بدر کے موقع پر کفار کیساتھ آئے تھے لیکن یہاں توفیق ایزدی نے دستگیری کی اور مسلمانوں کیساتھ آملے' یہانتک کہ لڑ کر جام شہادت بھی نوش کیا۔ حج کے موقع پر حضرت ابوبکر کی ان کے والد سہیل بن عمرو سے ملاقات ہوئی تو آپنے بیٹے کی تعزیت کی[3]

حسن خلق میں یہ بھی داخل ہے کہ دوسروں کے عیب سے چشم پوشی کی جائے۔ اس وصف میں حضرت ابوبکر کا حال یہ تھا کہ ایک مرتبہ فرمایا "اگر میں چور کو پکڑتا تو میری سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی کہ خدا اسکے

[1] الادب المفرد ص ۱۴۵ باب فضل السلام - [2] الادب المفرد باب من بدأ بالسلام
[3] فتوح البلدان بلاذری ص ۹۲ -

جرم کی پردہ پوشی کرے[1]

لیکن جہاں امر بالمعروف کا موقع ہو وہاں لین و ملاطفت کے کوئی معنی نہیں، ایسے موقع پر تشدد برتنے کی ضرورت ہوتی ہے، چنانچہ ایک مرتبہ صحابۂ کرام کسی جنازہ کیساتھ آہستہ آہستہ جا رہے تھے، حضرت ابوبکر وہاں آنکلے تو کوڑا اٹھا کر فرمایا "تم لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیساتھ جنازہ میں تیز رفتاری سے جایا کرتے تھے"[2]

مزاح | مزاح یعنی لطیف قسم کا مذاق شگفتہ مزاجی اور جودت طبع کی دلیل ہے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاح کے متعدد واقعات حدیث و سیر کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ پھر یہ کیونکر ممکن تھا کہ خلیفۂ رسول میں یہ وصف نہ ہوتا، چنانچہ ایک مرتبہ آپ مسجد نبوی سے نماز پڑھ کر نکل رہے تھے کہ حضرت امام حسن جو اُس وقت کم سن تھے محلہ کے بچوں کیساتھ کھیلتے ہوئے نظر آئے۔ حضرت ابوبکر نے جگر گوشۂ رسول کو فرطِ محبت سے گود میں اٹھا لیا اور حضرت علی جو وہیں تھے انکی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:۔

یا بابی شبیہ النبی لیس شبیھاً بعلی[3] اے وہ جو کہ نبی کے مشابہ ہے اور علی کے مشابہ نہیں تجھ پر میرا باپ فدا ہو۔

حضرت علی نے یہ سُنا تو ہنسنے لگے۔

احتسابِ نفس | جو کچھ کرتے تھے ایک نقاد کی حیثیت سے خود ہی اُس کا جائزہ بھی لیتے رہتے تھے چنانچہ مرض الوفات میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف سے بولے کہ "مجکو کسی بات کا غم نہیں ہے البتہ تین کام ایسے ہیں جو میں نے کئے ہیں اے کاش کہ نہ کئے ہوتے۔ تین کام ایسے ہیں جو میں نے نہیں کئے اے کاش کہ میں نے کئے ہوتے اور تین باتیں ایسی ہیں کہ اے کاش وہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھی ہوتیں، پہلی تین باتوں میں سے ابو عبیدہ نے ایک کا ذکر نہیں کیا۔ باقی دو باتوں کے متعلق فرمایا "میری تمنا ہے کہ سقیفہ بنو ساعدہ کے روز میں نے عمر یا ابو عبیدۃ بن الجراح کو خلیفہ بنایا ہوتا اور میں اُنکا وزیر ہوتا، دوسری بات یہ ہے کہ جب میں نے خالد بن الولید کو مرتدین سے جنگ کرنے کیلئے بھیجا تھا تو میں خود ذوالقصہ میں قیام کرتا۔ دوسری قسم کی تین باتیں یہ ہیں کہ اے کاش اشعث بن قیس جب گرفتار ہو کر آیا تھا تو میں نے اُس کی گردن اُڑا دی ہوتی۔ الفجاءۃ کو میں نے زندہ آگ میں جلوا دیا تھا۔ اے کاش

---

[1] ابن سعد تذکرۂ زبید بن الصلت [2] ابوداؤد کتاب الجنائز باب الاسراع بالجنازۃ [3] صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۳۰

ایسا نہ کرتا اور قتل کر دیتا یا رہا کر دیتا اور خالد کو جب میں نے شام روانہ کیا تھا تو عمر کو میں عراق بھیجتا۔ اس طرح اللہ کی راہ میں میں نے اپنے داہنے اور بائیں دونوں ہاتھ دراز کر دیئے ہوتے۔ رہی وہ تین باتیں جو اے کاش میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کی ہوتیں تو اُن میں سے ایک تو خلافت کا معاملہ ہے دوسری یہ کہ کیا انصار کا اُس میں کوئی حصہ ہے تیسری یہ کہ پھوپی اور بھتیجی کا میراث میں کتنا حصہ ہے؟[1]

فضائل و مناقب

حضرت ابوبکر صدیق کے فضائل و مناقب کے مآخذ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) قرآن مجید۔

(۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات جو خاص حضرت ابوبکر کے متعلق ہیں یا حضرت ابوبکر کیساتھ حضرت عمر یا کسی اور صحابی کے ساتھ خصوصاً یا عمومی طور پر مہاجرین سے متعلق ہیں۔

(۳) صحابۂ کرام کے وہ اقوال وارشادات جو حضرت ابوبکر سے متعلق ہیں۔

'استحقاق خلافت' کے زیرِ عنوان ہم نے جو بحث کی ہے اُسکے ضمن میں بہت کچھ فضائل و مناقب کا ذکر آچکا ہے جو مذکورۂ بالا تینوں مآخذ سے ثابت ہیں، اس موقع پر عنوانِ باب کی مناسبت سے صرف اس قدر لکھدینا کافی ہوگا کہ حضرت ابوبکر کی فضیلت و منقبت کی سب سے بڑی دلیلیں دو ہیں۔

(۱) ایک یہ کہ قرآن میں جس کثرت اور تکرار سے حضرت ابوبکر کے بعض خاص خاص اعمال مثلاً تصدیق بما جاء بہ النبی علیہ الصلوۃ والسلام۔ انفاق فی سبیل اللہ اور رفاقتِ نبوی کا ذکر آیا ہے کسی اور کا نہیں آیا۔

(۲) اور دوسری دلیل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو محبت و تعلقِ خاطر آپ کے ساتھ تھا اور جس درجہ کا اعتماد آپ پر تھا وہ کسی پر نہیں تھا صحیح بخاری اور ترمذی کے کتاب المناقب میں اس مضمون کی ایک دو نہیں متعدد روایات موجود ہیں لیکن دراصل حضرت ابوبکر کی سب سے بڑی فضیلت اور منقبت جس پر دوسرے تمام فضائل و مناقب متفرع ہوتے ہیں یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو

[1] کتاب الاموال ابو عبید ص ۱۳۱ - یہی روایت ابن جریر طبری جلد ۴ ص ۵۲ (پرانا ایڈیشن) میں بھی ہے لیکن الفاظ میں کافی اختلاف ہے ہمیں یہاں اس سے بحث نہیں۔

صدیق کا لقب دیا تھا اس اجمال کی تفصیل یہ ہے :-

مقام صدیقیت | حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی نے متعدد مکتوبات میں مقام صدیقیت پر بحث کرکے بتایا ہے کہ سلوک و معرفت کے بہت سے مدارج ہیں۔ مثلاً ولایت۔ شہادت لیکن ان میں سب سے اعلیٰ مقام صدیقیت کا ہے اور اس مقام میں اور نبوت میں کوئی واسطہ نہیں چنانچہ تحریر فرماتے ہیں :-

وفوق آن (صدیقیت) مقامے نیست الا النبوۃ علیٰ اھلھا الصلوٰتُ والتسلیمات ونشاید کہ میان صدیقیت و نبوت مقامے بودہ باشد بلکہ محالست و این حکم بہ محالیت او بکشف صریح صحیح معلوم گشتہ[1]

بعض ارباب معرفت کا خیال تھا کہ صدیقیت سے بھی اوپر ایک اور مقام ہے جس کا نام قربت ہے اور یہ صدیقیت اور نبوت کے درمیان برزخ کی حیثیت رکھتا ہے لیکن حضرت مجدد صاحب اس کا رد کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ جیسا کہ خواجۂ بزرگ (خواجہ بہاؤالدین نقشبندی) نے فرمایا ہے درحقیقت وہی علوم و معارف ہیں جن کا علم اگر نظری اور استدلالی ہو تو وہ علوم شریعت ہیں اور اگر ان کا علم کشفی اور بدیہی طریقہ پر ہو تو وہ علوم سلوک و معرفت ہیں اس طرح سلوک اور شریعت میں جو فرق ہے وہ صرف اجمال و تفصیل کا یا نظر و ضرورت کا اور یا استدلال و کشف کا ہے لیکن سلوک کا مرتبہ جو بداہت اور ضرورت کا ہے یہ سب سے اعلیٰ مرتبہ ہے اور اسی کا نام صدیقیت ہے اس کے بعد جو مقام ہے وہ صرف نبوت کا ہے۔ ایک پیغمبر کو وحی کے ذریعہ جن حقائق کا علم ہوتا ہے اور وہ اسکو دوسروں تک پہونچاتا ہے۔ ایک صدیق اسکی تصدیق بے چون و چرا کرتا ہے پیغمبر کی بیان کی ہوئی حقیقت کیسی ہی مابعد الطبیعی اور بالائے فہم و قیاس ہو بہرحال صدیق کیلئے وہ بدیہی سی چیز ہوتی ہے اور وہ اس کو سنتے ہی قبول کرلیتا ہے۔[2]

مجدد صاحب نے جو لکھا ہے کہ نبوت اور صدیقیت کے درمیان کوئی فصل نہیں ہے اس کی تائید خود قرآن مجید سے بھی ہوتی ہے :-

---

[1] مکتوبات مجدد الف ثانی حصہ اول دفتر اول مکتوب ہجدہم۔ [2] حضرت مجدد صاحب مکتوب ہجدہم حصہ اول دفتر اول و مکتوب چہل و یک حصہ دوم و دفتر اول میں مقام صدیقیت کے بارہ میں جو کچھ لکھا ہے ہم نے اس کا خلاصہ اپنے الفاظ میں دیدیا ہے۔

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا (المائدہ)

اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں وہ نبیوں صدیقوں اور شہدا و صالحین جن پر اللہ نے انعام کیا ہے ان کے ساتھ ہونگے، اور کیا خوب ہونگے یہ سب لوگ ایک دوسرے کے رفیق اور ساتھی

اس کے علاوہ بخاری میں ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابو بکر حضرت عمر اور حضرت عثمان کیساتھ جبل احد پر چڑھے تو پہاڑ پر زلزلہ کی سی کیفیت طاری ہوگئی یہ دیکھ کر آپ نے فرمایا۔

اسکن احد فلیس علیك الا نبی وصدیق وشهیدان [1]

اے احد ٹھہر، کیونکہ تیرے اوپر ایک نبی ایک صدیق اور دو شہید ہی تو ہیں۔

دیکھو اس حدیث میں بھی نبی، صدیق اور شہید میں ترتیب وہی ہے جو قرآن مجید میں ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نبی کے بعد جو مرتبہ ہے وہ صدیق کا ہی ہے اور درمیان میں کوئی اور مقام حائل نہیں ہے۔

حضرت مجدد صاحب نے اسی حقیقت کی توضیح کرتے ہوئے صاف صاف یہ بھی لکھدیا ہے کہ ایک نبی اور ایک صدیق کے علوم میں فرق صرف اس قدر ہے کہ نبی کے علم کا سرچشمہ وحی ہوتا ہے جس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہوتی اسکے برخلاف صدیق کا علم الہامی ہوتا ہے اور اس بنا پر ظاہری مظنون اور غیر قطعی ہوتا ہے [2]

چونکہ فرق صرف ذریعۂ علم کا ہوتا ہے اس بنا پر اس سے یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ جہانتک قوی علمیہ وعملیہ اور اخلاق وملکات کا تعلق ہے ایک صدیق بہت کچھ نبی کے مشابہ اور مماثل ہوتا ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے مقام صدیقیت پر بڑی عمدہ اور مبسوط بحث کی ہے چونکہ یہ مقام بڑا نازک اور ذرا سی تبدیلی سے غلط فہمی کا امکان ہے اسلئے ہم اپنی طرف سے کچھ کہے بغیر صرف شاہ صاحب کی تقریر کا خلاصہ نقل کر دیتے ہیں [3]

تصوف کے مقامات واحوال کس طرح پیدا ہوتے ہیں؟ اس سلسلہ میں شاہ صاحب لکھتے ہیں:۔

"جب کوئی شخص اللہ کی کتاب اور اسکے رسولوں پر اس طرح ایمان لاتا ہے کہ اس کے تمام قوائے قلبیہ ونفسیہ کی رگ رگ میں وہ سرایت کر جاتا ہے اس کے بعد ذکر و فکر میں مشغول رہتا ہے اور اعضا وجوارح کے ساتھ حق عبودیت

---

[1] جلد اول ص ۵۲۳ باب مناقب عثمان [2] مکتوبات حصہ دوم دفتر اول مکتوب چہل ویک۔ [3] شاہ صاحب کی تقریر کا یہ خلاصہ حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ باب بقیۃ مباحث الاحسان سے ماخوذ ہے شاہ صاحب نے یہ باتیں ازالۃ الخفا مقصد دوم میں بھی مختلف عنوانات کے ماتحت لکھی ہیں لیکن وہ منتشر ہیں اور حجۃ اللہ البالغہ میں سب ایک جگہ جمع ہیں اس لئے ہمارا ماخذ یہی ہے۔

ادا کرتا ہے اور ان اعمال کو برابر بجا لاتا رہتا ہے تو ان تینوں لطیفوں (عقل۔ قلب اور نفس) میں عبودیت کی روح حلول کر جاتی ہے۔ اب یہ تینوں لطیفے عبودیت میں شرابور ہو کر اصل فطرت ہی بن جاتے ہیں اور چونکہ فطرت انسانی کے غلبہ کی حالت میں عقل کا مقتضی یہ ہو کہ جس چیز کے مناسبات اُس کے سامنے آئیں وہ اُس کی تصدیق کرے اس بنا پر عقل کی تہذیب کا تقاضا یہ ہے کہ احکام شرع پر اس طرح یقین کرے کہ گویا وہ اس کو صاف صاف نظر آ رہے ہیں۔ جو مقامات اور احوال عقل سے تعلق رکھتے ہیں ان میں اصل چیز یقین ہو اور یقین سے ہی مختلف مقامات مثلاً توحید۔ اخلاص۔ توکل۔ شکر۔ انس۔ ہیبت۔ تفرید۔ صدیقیت اور محدثیت وغیرہ پیدا ہوتے ہیں۔"

اس کے بعد شاہ صاحب نے یقین کے مختلف مراتب پر گفتگو کی ہے اور اس ذیل میں لکھتے ہیں:۔

"یقین کی تیسری شاخ صدیقیت اور محدثیت ہے اور ان دونوں کی حقیقت یہ ہے کہ اُمت میں بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو فطرتاً پیغمبروں سے مشابہ ہوتے ہیں۔ اب اگر یہ مشابہت قوائے عقلیہ میں ہو تو اُس شخص کو صدیق اور محدث کہتے ہیں اور اگر قوائے عملیہ میں ہو تو وہ شہید یا حواری کہلاتا ہے۔"

لیکن پھر صدیق اور محدث میں فرق یہ ہے کہ صدیق کی روح پیغمبر کا اثر بڑی تیزی سے قبول کرتی ہے جیسے گندھک آگ سے بہت جلد اثر پذیر ہو جاتی ہے اس بنا پر ایک صدیق جب پیغمبر کی زبان سے کوئی بات سنتا ہے تو وہ فوراً اُس کے دل میں اُتر جاتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا اُس چیز کا علم اس کو خود بخود بغیر کسی کی تقلید کے حاصل ہو گیا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق کی نسبت یہ جو روایت ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوتی تھی تو وہ جبرئیل امین کی آواز کی گنگناہٹ سنتے تھے تو اُس سے بھی دراصل اسی بات کی طرف اشارہ نکلتا ہے۔

اسکے علاوہ صدیق کے چند اور خصائص بھی ہیں۔ مثلاً وہ اس حق کی جو نبی پر نازل ہوتا ہی محبت میں اپنی جان و مال تک قربان کر دیتا ہی حق سی محبت کیوجہ سے کسی امر میں آپکی مخالفت نہیں کرتا چنانچہ آنحضرت نے ابوبکر کی ان تمام فداکاریوں کا اظہار فرمایا ہے۔ حضرت ابوبکر کی یہ خصوصیت اسلئے تھی کہ وحی کے انوار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارک سے چھن چھن کر ابوبکر صدیق کی روح پر عکس فگن ہوتے تھے اور

اس بنا پر جب تاثیر و تأثر اور فعل و انفعال کے اس عمل میں شدت و تکرار پیدا ہوئی تو اس سے فنا اور فنا اکا مقام حاصل ہوگیا۔

صدیق کی علامتیں متعدد ہیں مثلاً اُس کا عالم بالرویا ہونا۔ بغیر معجزہ کے سب سے پہلے ایمان لانا حُبّ الٰہی میں غرق رہنا خوف وخشیت سے مغلوب رہنا۔ ظاہر ہے یہ تمام صفات بکمال و تمام حضرت ابوبکر میں پائے جاتے تھے اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی براہِ راست خلافت کا مستحق آپ کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا تھا۔[1]

اس کے بعد شاہ صاحب نے تجلیات کی بحث چھیڑ دی ہے اور اس سلسلہ میں بتایا ہے کہ حضرت ابوبکر کا کیا مقام تھا لیکن چونکہ یہ بحث بہت غامض اور دقیق ہے جس کے عام قارئین متحمل نہیں ہو سکتے اسلئے ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں بہرحال اس تمام بحث سے اندازہ ہوا ہوگا کہ حضرت ابوبکر کا مقام صدیق ہونے کی حیثیت سے کس قدر اونچا تھا اور درحقیقت اُن کی سب سے بڑی فضیلت۔ سب سے بڑی منقبت اور سب سے بڑی تعریف اُن کا صدیق ہونا ہی ہے اور یہ ایک اتنا بڑا وصفِ کمال ہے جس میں حضرت ابوبکر اپنی نظیر آپ تھے۔ چنانچہ جب حضرت حسان بن ثابت نے آپ کی شان میں یہ شعر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمائش پر سنائے۔

وثانی اثنین فی الغار المنیفِ وقد — طاف العدو به اذ صعد الجبلا

وکان حِبّ رسول اللہ قد علموا — من البریۃ لم یعدل بہ رجلا

ترجمہ:۔ اور ابوبکر بلند غار (ثور) میں دو میں کے ایک تھے۔ حالانکہ جب دشمن پہاڑ پر چڑھا تو اس نے ان کا محاصرہ کر لیا تھا اور آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب تھے۔ تمام صحابہ اس بات کو جانتے تھے کہ اس خصوصیت میں دنیا کا کوئی ایک شخص بھی آپ کا حریف نہیں ہے۔

تو سرورِ عالم کو فرطِ مسرت سے ہنسی اس طرح آگئی کہ دندانِ مبارک نظر آنے لگے۔ اور ارشاد ہوا "ہاں حسان! تم نے سچ کہا۔ بیشک ابوبکر ایسے ہی ہیں۔"[2]

آپ کی یہ فضیلت بھی کچھ کم نہیں ہے کہ آپ کی چار نسلوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیساتھ

[1] حجۃ اللہ البالغہ حصہ دوم از صفحہ ۶۸ تا صفحہ ۷۰ [2] ابن سعد ج ۵ القسم الاول ص ۷ –

صحبت و معیت کا شرف حاصل ہوا۔ ان چاروں کی ترتیب یہ ہے:۔

(۱) حضرت ابوبکر کے والد ابو قحافہ (۲) خود حضرت ابوبکر (۳) حضرت ابوبکر کے صاحبزادہ عبدالرحمٰن (۴) حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر کے صاحبزادہ حضرت محمد بن عبدالرحمٰن[1]

اولیات

محدثین و مورخین نے حضرت ابوبکر صدیق کے اُن کارناموں کا الگ الگ ذکر کیا ہے جن میں آپنے سب سے پہلے سبقت کی ہم ذیل میں اُن کی فہرست یکجا دیتے ہیں۔

(۱) مردوں میں سب سے پہلے اسلام آپ نے قبول کیا۔

(۲) قرآن مجید کا نام سب سے پہلے آپ نے مصحف رکھا۔

(۳) قرآن مجید کو سب سے پہلے آپ نے جمع کرایا۔

(۴) سب سے پہلا شخص جس نے کفار قریش کیساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت میں جنگ لڑی اور ضربات شدیدہ برداشت کیں حضرت ابوبکر ہیں۔

(۵) اسلام میں سب سے پہلے جس نے مسجد بنائی وہ حضرت ابوبکر ہی ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں۔

حضرت صدیق اوّل کسے است کہ مسجد بنا کرد و اعلام اسلام نمود "[2]

(۶) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں جسکو سب سے پہلے حج کی امامت کا شرف حاصل ہوا وہ آپ ہی ہیں

(۷) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جسکو باصرار نماز کی امامت کا حکم فرمایا اور خود بھی اس کے پیچھے اقتدا کی وہ حضرت ابوبکر ہی ہیں۔

(۸) سب سے پہلے خلیفہ راشد ہیں اور سب سے پہلے شخص ہیں جو اس لقب سے پکارے گئے۔

(۹) سب سے پہلے خلیفہ ہیں جن کو باپ کی زندگی میں خلافت ملی۔

(۱۰) سب سے پہلے خلیفہ ہیں جس کا نفقہ رعایا نے مقرر کیا۔[3]

(۱۱) سب سے پہلے بیت المال آپ نے قائم کیا۔

(۱۲) سب سے پہلے اجتہاد و استنباط احکام کے اصول اربعہ آپ نے مقرر کئے۔

[1] الاستیعاب تذکرہ محمد بن عبدالرحمٰن۔ [2] ازالۃ الخفا مقصد دوم ص ۱۱ [3] ابن اثیر ج ۲ ص ۲۹۱

(۱۳) سب سے پہلے دوزخ سے نجات کی خوش خبری آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپکو ہی دی اور عتیق کے لقب سے مشرف فرمایا۔

(۱۴) سب سے پہلے شخص ہیں جنھوں نے بارگاہِ نبوّت سے کوئی لقب حاصل کیا۔

(۱۵) سب سے پہلے آپ نے ہی فرمایا "البلاءُ موکّل بالمنطق"۔

ذاتی حالات وسوانح

حلیہ حضرت عائشہ سے بعض لوگوں نے پوچھا کہ حضرت ابوبکر کا حلیہ کیا تھا؟ آپ نے فرمایا:۔

"وہ گورے چٹّے دُبلے پتلے آدمی تھے۔ دونوں رُخسارے سُتے ہوئے تھے کمر ذرا خمیدہ تھی۔ تہمد کمر پر رُک نہیں سکتا تھا نیچے کھسک جاتا تھا، چہرہ ہڈیاں نکلا ہوا تھا۔ آنکھیں اندر کی جانب دھنسی ہوئی تھیں۔ پیشانی بلند۔ انگلیوں کے جوڑ گوشت سے خالی تھے۔ پنڈلیاں اور رانیں پُر گوشت نہیں تھیں۔ قد موزوں تھا۔ مہندی کا خضاب لگاتے تھے۔" [1]

لباس وغذا نہایت سادگی پسند تھے۔ کپڑے بھی موٹے جھوٹے پہنتے اور کھانا بھی سادہ کھاتے تھے۔ بعض اوقات فاقہ کی نوبت بھی آجاتی تھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اور حضرت عمر کو مسجد میں دیکھا کہ بھوک سے بیقرار ہیں ارشاد ہوا "میں بھی تمہاری طرح سخت بھوکا ہوں۔ حضرت ابوالہیثم انصاری کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے کھانے کا انتظام کیا۔

ذریعۂ معاش آپکا اصل ذریعۂ معاش تجارت تھا اسکے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو خیبر میں ایک جاگیر بھی عنایت فرمائی تھی۔ بحرین میں بھی آپکو جاگیر ملی تھی اور اطرافِ مدینہ میں اموال بنی النضیر میں سے بیر حجر تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو عطا فرمایا تھا۔ آپ نے اسکی اصلاح کی، اس میں کھجور کے درخت لگائے اور پھر حضرت عائشہ کو دیدیا۔ اسی طرح بحرین کی جاگیر بھی حضرت عائشہ کو ہبہ کردی تھی لیکن وفات کے وقت ان سے واپس لے لی تھی تاکہ بہن بھائیوں کی حق تلفی نہ ہو۔[2]

روزینۂ خلافت خلیفہ ہونیکے بعد قوم نے آپکیلئے وظیفہ مقرر کردیا تھا؟ لیکن اسکی مقدار کتنی تھی؟

[1] طبری ج ۲ ص ۶۱۵ [2] طبقات ابن سعد سیرت خلفاء راشدین۔

اس میں اختلاف ہے۔ ابن سعد نے یہ تمام روایتیں نقل کر دی ہیں، ہماری رائے میں ان روایاتیں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ پہلے حضرت ابوبکر کا وظیفہ دو ہزار درہم سالانہ مقرر ہوا تھا لیکن جب دیکھا کہ گذر نہیں ہوتی تو اس میں اضافہ ہونے لگا اور ادھر فتوحات کے باعث اسلامی ریاست کی مالی حالت بھی بہتر ہوتی جا رہی تھی، اس بنا پر شدہ شدہ آپ کا وظیفہ چھ ہزار درہم سالانہ ہو گیا اور اس کے علاوہ پہننے کیلئے آپ کو دو چادریں دی جاتی تھیں جب وہ پرانی ہو جاتی تھیں تو اُن کی جگہ دو اور چادریں دیدیتے تھے اور وہ پرانی واپس لے لیتے تھے سفر کرتے تھے تو سواری اور اہل و عیال کیلئے اتنا ہی خرچ ان کو ملتا تھا جو خلیفہ ہونے سے پہلے انکے اس کام کیلئے کافی ہوتا تھا۔ [1]

خلیفہ ہونیکے بعد کے معمولات | جب آپ خلیفہ منتخب ہوئے تو اس زمانہ میں مدینہ کے قریب ایک مقام "سُنح" میں اپنی بیوی حبیبہ بنت خارجہ کیساتھ رہتے تھے۔ بیعت کے بعد بھی چھ مہینہ تک آپ کا قیام وہیں رہا۔ اس مدت میں صبح کے وقت کبھی پا پیادہ اور اکثر گھوڑے پر بیٹھ کر مدینہ آتے تھے جسم پر تہمد اور چادر ہوتی تھی جو گیرو رنگ کی ہوتی تھی، پورا دن آپ مدینہ میں گزارتے اور نمازوں میں امامت کرتے تھے۔ جب آپ نہیں ہوتے تھے تو حضرت عمر نماز پڑھاتے تھے [2] چھ مہینے تک یہی معمول رہا۔ اُس کے بعد مدینہ میں ہی مستقل سکونت اختیار کر لی۔

عبادت | جب نماز پڑھتے تھے تو خشوع و خضوع کا اس درجہ غلبہ ہوتا تھا کہ ایک لکڑی کی طرح سیدھے کھڑے رہتے تھے۔ [3]

حقوق العباد کا خیال | حق اللہ کے سوا حقوق العباد کا بھی اس درجہ خیال رکھتے تھے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام سے دریافت فرمایا کہ آج تم میں سے روزہ دار کون ہے؟ حضرت ابوبکر بولے "میں یا رسول اللہ!" پھر پوچھا تم میں سے آج کس نے جنازہ کی مشایعت کی ہے؟ تم میں سے کسی نے مسکین کو کھانا کھلایا ہے؟ کسی نے مریض کی عیادت کی ہے؟ جس شخص نے ان سب سوالات کا جواب اثبات میں دیا وہ صرف حضرت ابوبکر صدیق کی ذات تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

[1] ابن سعد تذکرۂ حضرت ابوبکر صدیق [2] ابن سعد تذکرۂ حضرت ابوبکر صدیق [3] کنز العمال بر مسند امام احمد ج ۴ ص ۳۶۰۔

نے یہ سُن کر ارشاد فرمایا "جس نے ایک دن میں اتنی نیکیاں کی ہیں وہ یقیناً جنت میں جائے گا۔[1]

رقتِ قلب | قلب نہایت رقیق تھا۔ قرآن شریف جب پڑھتے تھے تو آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی تھی اور اس طرح بلک بلک کے روتے تھے کہ جو لوگ اُس وقت موجود ہوتے اُن کا جی بھر آتا اور رونے لگتے تھے۔ سنہ ۱۲ھ میں جب حج کیلئے تشریف لے گئے تھے تو مکہ میں حضرت عکرمہ بن ابی جہل اور کچھ دوسرے لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعزیت کیلئے آپ کے پاس آئے تو آپ کا حال یہ تھا کہ یہ حضرات تعزیت کرتے تھے اور حضرت ابوبکر روتے جاتے تھے[2] بات بات پر سرد آہ کھینچنے کی وجہ سے آپ کا لقب ہی "اَوَّاہٌ منیب" ہو گیا تھا۔

قسم کس طرح کھاتے تھے | آپ کی بعض خاص خاص عادتیں تھیں جو صحابہ کرام میں مشہور تھیں، مثلاً اگر انکو قسم کھا کر یہ کہنا ہوتا تھا کہ ایسا ہرگز نہیں ہوگا" تو فرماتے تھے" لاھا اللہ اذاً[3]

ازواج | طبری میں ہے کہ حضرت ابوبکر نے کل چار نکاح کئے تھے۔ دو اسلام سے قبل اور دو اسلام کے بعد۔ اسلام سے پہلے آپ نے جن خواتین سے عقد کیا تھا اُنکے نام (۱) قتیلہ بنت عبد العزیٰ اور (۲) ام رومان بنت عامر بن عمیرہ ہیں اور اسلام قبول کرنیکے بعد جن خواتین سے شادی کی انکے نام (۱) حضرت اسماء بنت عمیس اور (۲) حبیبہ بنت خارجہ ہیں[4] یہ سب ملکر چار بی بیاں ہوئیں۔ لیکن بخاری میں حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ آپنے بنو کلب کی ایک عورت سے بھی جس کا نام ام بکر تھا شادی کی تھی اور ہجرت کے وقت اُن کو طلاق دے دی تھی[5]

ام رومان | قتیلہ بنت عبد العزیٰ کا اسلام مشکوک ہے۔ حافظ ابن حجر نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اگر وہ فتح مکہ تک زندہ رہیں تو غالب یہی ہے کہ مسلمان ہوگئی ہوں گی۔ البتہ ام رومان کو یہ شرف حاصل تھا۔ ام رومان سب سے پہلے عبد اللہ بن الحارث نامی ایک شخص کی بیوی تھی۔ عہد جاہلیت میں مکہ آکر اس شخص نے حضرت ابوبکر سے محالفت کر لی تھی۔ چنانچہ جب اس کا انتقال ہو گیا تو حضرت ابوبکر نے ام رومان کیساتھ

---

[1] صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۷۴ [2] ابن سعد تذکرہ حضرت ابوبکر [3] بخاری ج ۱ ص ۴۴۲ و ج ۲ ص ۹۸۱

[4] طبری ج ۲ ص ۶۱۶ ابن اثیر میں بھی یہی ہے۔ [5] بخاری ج ۱ ص ۵۵۸

شادی کرلی۔ ہجرت کے وقت حضرت ابوبکران کو مکہ میں چھوڑ گئے تھے۔ بعد میں عبداللہ بن اریقط کو بھیجکران کو بھی مدینہ بلوالیا۔ حضرت ام رومان کے سالِ وفات میں بڑا اختلاف ہے ابن سعد ماہ ذی الحجہ سنہ ۶ھ لکھتے ہیں بعض محدثین سنہ ۴ھ یا ۵ھ کو اُن کا سالِ وفات بتاتے ہیں[1] لیکن صحیح ابن سعد کی ہی روایت ہے کیونکہ حدیثِ افک میں حضرت ام رومان کا نام آتا ہے اور یہ واقعہ بے شبہ ہجرت کے پانچ سال بعد کا ہے۔ حضرت ام رومان کی فضیلت اس سے بڑھ کر کیا ہوگی کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی نعش کو قبر میں اُتارا تو اُن کیلئے دعائے مغفرت کی اور فرمایا "اے خدا تجھ پر پوشیدہ نہیں ہے کہ ام رومان نے تیرے لئے اور تیرے پیغمبر کی خاطر کیا کیا تکلیفیں اٹھائی ہیں"[2]

اسماء بنت عمیس | قبیلۂ خثعم سے تعلق رکھتی تھیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ حضرت میمونہ کی ماں شریک بہن تھیں۔ انھوں نے شروع میں ہی اسلام قبول کرلیا تھا۔ حضرت علی کے بھائی حضرت جعفر سے اُن کا پہلا نکاح ہوا تھا۔ جب حبش کی ہجرت کا حکم ہوا تو میاں بیوی بھی دونوں حبش ہجرت کرگئے تھے۔ حضرت جعفر کی شہادت کے بعد حضرت ابوبکر نے نکاح کرلیا۔ ایک مرتبہ حضرت اسماء نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ یارسول اللہ! لوگ ہمارے مقابلہ میں اپنی بڑی فضیلتیں جتاتے ہیں؟" آپ نے فرمایا "اب سے اگر کوئی تم سے ایسی بات کہے تو تم کہنا کہ "تم لوگوں نے تو ایک مرتبہ ہجرت کی ہے۔ مجھ کو دو مرتبہ ہجرت کرنیکا شرف حاصل ہے" غالباً یہی وجہ ہے کہ حضرت ابوبکر بھی انکی فضیلت اور بزرگی کے قائل تھے۔ چنانچہ آپ نے وفات کے وقت وصیت کی تھی کہ انکو غسل جنازہ حضرت اسماء دیں[3] حضرت ابوبکر کی وفات کے بعد حضرت اسماء نے حضرت علی سے نکاح کرلیا تھا[4]

حبیبہ بنت خارجہ | ان کے حالات کچھ زیادہ نہیں ملتے۔ صرف اس قدر معلوم ہے کہ مدینہ کی ہجرت کے بعد حضرت ابوبکر نے جن حضرت خارجہ بن زید کیساتھ مواخات کی تھی حضرت حبیبہ اُنہیں کی بیٹی تھیں اور حضرت ابوبکر ان کے ساتھ شادی کے بعد سنح میں انھیں کیساتھ رہتے تھے۔ حضرت ابوبکر کی وفات

---

[1] اصابہ ج ۴ تذکرۂ ام رومان [2] ایضاً [3] الاصابۃ ج ۴ ص ۲۲۵-۲۲۶
[4] الاستیعاب تذکرۂ اسماء بنت عُمَیس۔

کے بعد انھوں نے اساف بن عقبۃ بن عمرو سے نکاح کر لیا تھا[1]

اولاد حضرت ابوبکر کی اولاد چھ تھی تین لڑکے اور تین لڑکیاں۔ لڑکوں کے نام یہ ہیں:۔ عبد الرحمٰن۔ عبد اللہ اور محمد۔ اسماء۔ عائشہ اور ام کلثوم صاحبزادیوں کے نام ہیں۔

عبد الرحمٰن حضرت ابوبکر کے سب سے بڑے صاحبزادہ ہیں۔ حضرت ام رومان کے بطن سے پیدا ہوئے۔ غزوۂ بدر کے موقع پر مکہ سے کفار قریش کے ساتھ آئے تھے۔ میدان جنگ میں یہ آگے بڑھے اور مبارز طلب ہوئے تو حضرت ابوبکر نے اُن کے مقابلہ پر جانے کی اجازت طلب کی لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت نہیں دی، اس کے بعد غزوۂ احد میں بھی یہ مشرکین قریش کے ہمراہ تھے۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر اسلام سے مشرف ہوئے اور مدینہ آکر اپنے والد کے ساتھ رہنے لگے۔ شجاعت اور تیر اندازی میں تمام قریش میں ممتاز تھے۔ اسلام قبول کرنیکے بعد اُن کے یہ جوہر دین حق کی حمایت و نصرت میں صرف ہونے لگے۔ چنانچہ صلح حدیبیہ کے بعد عہد نبوت میں جو غزوات پیش آئے ان میں برابر شریک رہے۔ لیکن جنگ یمامہ میں تو انھوں نے کمال ہی کر دکھایا۔ دشمن کے سات بڑے بڑے جنگی افسروں کو تنہا انھوں نے اپنے تیر کا نشانہ بنا کر ختم کر دیا تھا اسی طرح قلعۂ یمامہ کی دیوار میں ایک شگاف تھا۔ مسلمان اس کے ذریعہ اندر داخل ہونا چاہتے تھے لیکن محکم بن طفیل نام کا ایک سردار اس کی حفاظت کر رہا تھا۔ حضرت عبد الرحمٰن نے تاک کر اسکے سینہ پر ایسا تیر مارا کہ تڑپ کر خاک کا ڈھیر تھا اور مسلمان قلعہ میں داخل ہو گئے[2]۔ حضرت عائشہ اور یہ دونوں سگے بہن بھائی تھے اور دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ بڑی محبت تھی۔ چنانچہ ۵۳ھ میں اُن کا انتقال ہوا تو حضرت عائشہ نے بڑی حسرت سے یہ شعر پڑھے:۔

وکنا کندمانی جذیمۃ حقبۃ — من الدھر حتی قیل لن یتصدعا

فلما تفرقنا کانی ومالکاً — لطول اجتماع لم نبت لیلۃ معا[3]

---

[1] الاصابہ ج ۴ ص ۲۶۱ [2] الاستیعاب برالاصابہ ج ۲ ص ۳۹۲ [3] الاستیعاب برالاصابۃ ج ۲ ص ۳۹۳ یہ اشعار صحیح بخاری میں بھی ہیں۔

عبداللہ | یہ قتیلہ کے بطن سے تھے اور حضرت اسماء کے حقیقی بھائی تھے۔ حضرت ابوبکر نے جب اسلام قبول کیا تو عبداللہ نے بھی قبول کر لیا تھا۔ ہجرتِ مدینہ کے سلسلہ میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رفیق کے ساتھ غارِ ثور میں مقیم تھے تو یہ خدمت حضرت عبداللہ کے ہی سپرد تھی کہ دن بھر کی قریش کی جو خبریں ہوتی تھیں وہ شام کو یہاں پہونچا دیتے تھے۔ عبداللہ بن ارلقیط جس نے ہجرتِ مدینہ کے وقت راہبری کی خدمت انجام دی تھی انھوں نے جب مکہ واپس پہونچکر اطلاع دی کہ حضور بخیر و عافیت مدینہ پہونچ گئے ہیں تو اب حضرت عبداللہ بن ابی بکر بھی حضرت ام رومان حضرت عائشہ اور حضرت اسماء کو لے کر مدینہ کیلئے روانہ ہو گئے۔ فتح مکہ اور حنین و طائف کے غزوات میں شریک رہے ہیں۔ اس آخری معرکہ (طائف) میں ہی ان کو ایک تیر آ کر لگا جس سے شدید زخم پہونچا۔ علاج معالجہ کے بعد زخم مندمل ہو گیا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے چالیس روز بعد پھر پھوٹ پڑا اور وہ اس سے جاں بر نہ ہو سکے[1]

محمد بن ابی بکر | یہ اولادِ ذکور میں سب سے چھوٹے تھے۔ حجۃ الوداع کے سال ماہ ذی قعدہ کے اواخر میں بمقام ذوالحلیفہ حضرت اسماء کے بطن سے پیدا ہوئے۔ اُن کے ایک بیٹے کا نام قاسم تھا۔ اسی نسبت سے حضرت عائشہ نے ان کی کنیت ابوالقاسم رکھدی تھی۔ حضرت ابوبکر کی وفات کے بعد جب ان کی والدہ نے حضرت علی سے شادی کر لی تو اس تقریب سے محمد بن ابی بکر کو آغوشِ مرتضوی میں تعلیم و تربیت حاصل کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ ثالث حضرت عثمان کے خونِ ناحق کے دھبوں سے محمد بن ابی بکر کا دامن بھی پاک نہیں تھا لیکن حافظ ابن عبدالبر نے اس کی تردید کی ہے اور لکھا ہے کہ

لم یَنَد محمد بن ابی بکر من دمِ عثمان بشیٔ[3] | حضرت عثمان کے خون سے محمد بن ابی بکر کا دامن ذرا بھی تر نہیں ہوا

حضرت عثمان نے جب یہ کہا کہ "محمد! اگر تیرا باپ تجھ کو اس حالت میں دیکھتا تو ہرگز اسے پسند نہیں کرتا" تو محمد بن ابی بکر فوراً باہر نکل گئے۔

وفات نہایت اندوہناک طریقہ پر ہوئی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ۳۷ھ میں مصر کا والی

---

[1] الاصابہ ج ۲ ص ۲۷۵ [2] ایضاً [3] الاستیعاب برالاصابہ ج ۳ ص ۳۲۹

بنا کر بھیجا تھا۔ جب یہ مصر پہونچے تو امیر معاویہ نے عمرو بن العاص کی قیادت میں ایک لشکر روانہ کر دیا دونوں میں جنگ ہوئی۔ محمد بن ابی بکر شکست کھا گئے اور سپرد تیغ کر دیئے گئے۔ حضرت عائشہ کو خبر ہوئی تو بیحد ملال ہوا اور اُن کے بیٹے قاسم کو خود اپنی تربیت میں لے لیا۔[1] حضرت عائشہ کی ہی تربیت کا یہ اثر تھا کہ حضرت قاسم کا شمار اپنے عہد کے فقہائے سبعہ میں ہوتا ہے۔

اسماء بنت ابی بکر حضرت اسماء بہنوں میں سب سے بڑی تھیں اُن کی والدہ کا نام قیلہ یا قتیلہ تھا۔ حضرت ابو بکر کے ساتھ یہ بھی اسلام لے آئی تھیں۔ حافظ ابن عبدالبر کی روایت کے مطابق اسلام لانے والوں میں ان کا نمبر اٹھارھواں تھا۔ حضرت زبیر بن عوام سے شادی ہوئی تھی ہجرت کے سلسلہ میں جب یہ مدینہ روانہ ہوئی ہیں تو حضرت عبداللہ بن زبیر سے حاملہ تھیں قبا پہونچکر ان کی ولادت ہوئی۔ آپ کا لقب "ذات النطاقین" کیوں تھا؟ اس کا ذکر ہجرت کے باب میں گذر چکا ہے۔

خلیفۂ رسول کی صاحبزادی ہونیکے باوجود بڑی محنت اور جفاکشی کی زندگی بسر کرتی تھیں۔ اپنے شوہر حضرت زبیر کے گھوڑے کیلئے دانہ خود دلتی تھیں اور اسے سر پر رکھ کر نو میل پیدل چلتی تھیں[2] حضرت ابو بکر کو اس کی اطلاع ہوئی تو ایک غلام عطا فرما دیا۔

حجاج ثقفی نے حضرت اسماء کے صاحبزادہ حضرت عبداللہ بن زبیر کو شہید کر کے اُن کی لاش تختۂ دار پر لٹکی رہنے دی تھی۔ جب تین دن گزر گئے تو حضرت اسماء ادھر سے گزریں اور بیٹے کی لاش کو دیکھ کر بولیں کہ کیا ابھی وقت نہیں آیا ہے کہ دُولہا تختِ عروسی پر سے اُتر آئے۔ حجاج نے یہ سُنکر اگرچہ گستاخی کی لیکن بہر حال لاش اتر والی۔ اس کے چند روز بعد ہی حضرت اسماء نے کم و بیش سو برس کی عمر میں ۷۳ھ میں مکہ میں انتقال کیا اور وہیں دفن ہوئیں۔ رضی اللہ عنہا[3]

حضرت عائشہ ام المومنین حضرت عائشہ حضرت ام رُومان کے بطن سے بعثتِ نبویؐ سے چار یا پانچ برس بعد پیدا ہوئیں۔ حضرت ابو بکر کی سب سے زیادہ چہیتی بیٹی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوب ترین بیوی تھیں حضرت عطاء بن ابی رباح کا قول ہے کہ۔

[1] الاصابہ ج ۳ ص ۳۵۱ [2] صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۱۸ [3] الاستیعاب بر الاصابہ ج ۴ ص ۲۲۸ - ۲۲۹

كانت عائشة افقه الناس واعلم الناس — حضرت عائشہ تمام لوگوں سے زیادہ فقیہ۔
واحسن الناس رایاً فی العامة [1] — صاحبِ علم اور صائب الرائے تھیں۔

امام زہری کا قول ہے کہ اگر تمام ازواجِ مطہرات اور سب عورتوں کے علم کا موازنہ حضرت عائشہ کے علم کیساتھ کیا جائے تو حضرت عائشہ کا علم ان سب کے علم سے افضل ثابت ہوگا۔[2] آپکی کس کس خوبی اور کمال اور کس کس فضیلت ومنقبت کو بیان کیا جائے۔

اُردو میں مولانا سید سلیمان ندویؒ کے قلم سے ایک مستقل اور مستند کتاب "سیرتِ عائشہ" کے نام سے موجود ہے۔ اُس کی مراجعت کرنی چاہیے۔ فقہی اور اجتہادی مسائل میں مرجعِ انام تھیں اور علوم کے علاوہ طب اور شعر کا بھی بہت صاف ستھرا مذاق رکھتی تھیں اپنے عہد کی بلند پایہ خطیبہ تھیں۔ جب تقریر کرتی تھیں تو سُننے والوں پر سحر کی سی کیفیت طاری ہوجاتی تھی۔ ۵۸ھ میں دوشنبہ کے دن ۱۷ ماہ رمضان کو وفات حسرت آیات ہوئی اور جنت البقیع میں دفن ہوئیں[3] رضی اللہ عنہا۔

ام کلثوم | حضرت حبیبہ بنت خارجہ کے بطن سے حضرت ابوبکرؓ کی پیشین گوئی کے مطابق آپکی وفات کے بعد پیدا ہوئی تھیں اس لئے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی اولاد امجاد میں صرف یہی ایک ایسی تھیں جو تابعیہ تھیں ان سے متعدد روایات مروی ہیں جابر بن جبیب۔ طلحۃ بن یحییٰ اور مغیرہ ابن حکیم وغیرہم نے اُن سے روایت کی ہے[4]

انگوٹھی | حضرت ابوبکر ایک انگوٹھی بھی رکھتے تھے جس پر یہ عبارت کندہ تھی۔

"نعم القادر اللہ"[5]

---

[1] الاصابہ ج ۴ ص ۳۴۹ [2] ایضاً [3] الاصابہ ج ۴ ص ۳۵۰ [4] الاصابہ ج ۴ ص ۴۶۹ [5] طبری ج ۲ ص ۶۱۷

تبصرہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ اوّل کی حیاتِ طیبہ کا پورا مرقع اب تمہارے سامنے ہے۔ اسکو غور سے دیکھو تو تم کو اس آئینہ میں ایک ایسے انسان کی شکل و صورت نظر آئیگی جو ہر حیثیت سے مکمل ہے جس میں انسانی کمالات و اوصاف بیک وقت سمٹ کر جمع ہو گئے ہیں ایک انسان کی تکمیل کا دارومدار اُس کی اُن باطنی قوتوں کی اعلیٰ تربیت و تہذیب پر موقوف ہے جو قدرت نے اُس کے اندر ودیعت رکھدی ہیں یہ قوتیں اصولی طور پر دو ہیں ایک قوتِ نظری اور دوسری قوتِ عملی" پہلی قوت کے اعتدال سے جو ملکات پیدا ہوتے ہیں وہ ذکاوت حُسنِ فہم اعتدالِ فکر۔ شہامت وغیرہ ہیں اور قوتِ عملی کے استعمال سے جو اوصاف و کمالات پیدا ہوتے ہیں وہ شجاعت۔ سخاوت۔ عفت۔ غیرت و حلم۔ خودداری وغیرہ ہیں۔ کسی شخص میں ان تمام اوصاف و کمالات کا بیک وقت جمع ہو جانا انسانی سعادت و خوش نصیبی کی معراج کمال ہے اور قرآن مجید میں اسی کو خیر کہا گیا ہے اور فرمایا گیا "ومن یوت الحکمۃ فقد اوتی خیراً کثیراً" اگرچہ عمومی طور پر اس وصفِ خاص میں دوسرے صحابۂ کرام بھی حضرت ابوبکر کے شریک ہیں لیکن جس طرح نیکی نیکی اور حسن حسن میں فرقِ مراتب ہوتا ہے اسی طرح حکمت حکمت میں بھی مدارج و منازل کا بڑا فرق و امتیاز ہے، اسی فرق کے اعتبار سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ حضرت ابوبکر کا مقام سب سے اونچا تھا اور وہ حکمت و سعادت کے اُس نقطۂ عروج پر فائز تھے جو نبوت سے نیچے اور سب سے اونچا ہوتا ہے۔

خلفائے راشدین میں حضرت عمر فاروق کو وسعتِ فتوحات۔ تدوینِ دواوین۔ نظم و نسق اور حکومت کے داخلی اور خارجی انتظامات کی وجہ سے تاریخِ اسلام میں جو اہمیت و عظمت حاصل ہے وہ ظاہر ہے لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے کہ حضرت عمر کی مدتِ خلافت دس برس ہے اور حضرت ابوبکر کی کُل سوا دو برس، اور اس سوا دو برس میں آپ نے جو خدمات انجام دی ہیں وہ فاروقی کارناموں کیلئے سنگِ بنیاد کی حیثیت رکھتی ہیں۔

فتوحات کی وسعت اور حکومت کا نظم و نسق اُس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ قوم کے اندر وحدت نہ پیدا ہو۔ اُس

میں کسی قسم کا داخلی انتشار اور طوائف الملوکی ہو، یہ قومی وحدت کس نے پیدا کی؟ پورے عرب کو متحد کس نے کیا؟ اور قومی یکجہتی کا صور کس نے پھونکا؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے فوراً بعد ارتداد و بغاوت کا سیلاب چاروں طرف سے جس زور شور سے اٹھا تھا اس کے مقابلہ میں مادی اسباب و حالات کے ماتحت ان صحابہ کرام کی جو مدینہ میں محصور ہو کر رہ گئے تھے کیا بساط تھی؟ اکابر صحابہ یہاں تک کہ خود حضرت عمر کی جبینِ استقلال و پامردی پر اضطراب و تشویش کی شکن پیدا ہو گئی تھی چنانچہ انھوں نے مشورہ دیا کہ جیش اسامہ کو شام کے سرحدی قبائل کی طرف بھیجنا ملتوی کر دیا جائے۔ مانعینِ زکوٰۃ سے جہاد و قتال نہ کیا جائے۔ لیکن خلیفۂ رسول نے جس ہمت و استقلال سے عزم و عالی حوصلگی کیساتھ ان سب حالات و حوادث کا مقابلہ کیا وہ انسانی تدبر و عزم کی تاریخ کا ایک بلند ترین شاہکار ہے۔ تدبر کا یہ عالم ہے کہ بڑے بڑے مغربی مصنفین تسلیم کرتے ہیں کہ ان حالات میں جیش اسامہ کا روانہ کرنا ایک عظیم الشان سیاسی حربہ تھا جس نے قبائل عرب کو اور ایران و روم کی طاقتوں کو نفسیاتی طور پر مرعوب کر دیا۔ عزم و استقلال اور ہمت و پامردی کی یہ کیفیت ہے کہ وہی رقیق القلب پیکرِ تقدس انسان جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام آتے ہی رو پڑتا تھا حضرت عمر جیسے انسان کو طعنہ دیتا ہے کہ تم عہد جاہلیت میں تو بڑے مضبوط تھے مگر اب تم کمزور ہو گئے۔ غرضکہ صحابۂ کرام کی اکثریت کے برخلاف وہ جیش اسامہ کی مہم بھی سر کرتا ہے۔ مانعین زکوٰۃ سے جنگ بھی کرتا ہے اور پھر اس سے فارغ ہو کر مرتد اور باغی قبائل کی سرکوبی کیلئے اپنے گیارہ لشکر پورے جزیرۃ العرب میں پھیلا دیتا ہے جس کا چند مہینوں کے اندر ہی اندر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ارتداد و بغاوت کے تمام تیرہ و تار بادل یک قلم پھٹ جاتے ہیں اور پورا جزیرۃ العرب ایک دینِ حق کے علم کے نیچے آ کر جمع ہو جاتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

"عالم تمام مطلعِ انوار ہو گیا۔"

پھر خود اعتمادی۔ اولوالعزمی اور عالی حوصلگی کی مثال اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گی کہ ابھی مرتد قبائل کی مہم سے پورے طور پر فراغت بھی نہیں ہوئی ہے کہ عرب کے خارجی استحکام و حفاظت کی مصلحت کے تقاضہ سے ایران اور روم کو جو اس وقت دنیا کی سب سے بڑی طاقتیں تھیں چیلنج کرتا ہے، اور یہ

سب کچھ یونہی دفعتہً و بغتۃً نہیں ہو جاتا بلکہ جو کچھ کرتا ہے نہایت منظم اور منضبط طریقہ پر کرتا ہے، خود خلیفۂ رسول عراق اور شام کے محاذِ جنگ سے سینکڑوں میل دُور مدینہ میں اپنے ایک چھوٹے سے اور غیر آراستہ مکان میں بیٹھا ہے۔ اور وہیں سے اسلامی فوجوں کی کمانڈ کر رہا ہے، انکو راستوں کے نشیب و فراز سمجھا رہا ہے۔ فریقِ محارب کے مورچوں کی خصوصیات بتا رہا ہے اور اُن کے پیشِ نظر خود عساکرِ اسلام میں ترتیب و تہذیب قائم کر رہا ہے۔ واقعاتِ جنگ کے ایک ایک جزئیہ پر اس کی کڑی نگاہ ہے اور اس کے لیے حسبِ موقع و مصلحت وہ احکام و ہدایات روانہ کر رہا ہے۔ شام کے محاذ پر جب جمود و تعطل پیدا ہوا تو فوراً حضرت خالدؓ کو حکم ہوتا ہے کہ عراق سے شام پہنچیں اور وہاں جو اسلامی فوجیں ہیں انکی کمانڈ اپنے ہاتھوں میں لیں، اس حکم کی فوراً تعمیل ہوتی ہے اور صورتِ حال یک بیک بدل جاتی ہے۔ غور کرو اگر عرب میں یہ اتحاد نہ پیدا ہوتا اور حیرہ کے میدانِ جنگ میں ایرانی افواج کو شکستِ فاش نہ ہوتی تو عہدِ فاروقی میں جو فتوحات ہوئیں کیا وہ پھر بھی ہو سکتی تھیں؟ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمرؓ کی نسبت فرمایا گیا کہ وہ حسنۃٌ من حسنات ابی بکر تھے اور خود حضرت عمرؓ نے اقرار کیا کہ وہ حضرت ابوبکرؓ کے سینہ کے ایک بال ہیں۔"

تاریخ کا ایک طالبِ علم کہہ سکتا ہے کہ دنیا میں سکندرِ اعظم۔ ہنی بال، چنگیز خاں اور تیمور اور بھی بڑے بڑے فاتح گذرے ہیں جنھوں نے نہایت عظیم الشان فوجی کارنامے انجام دیئے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ کیا دنیا میں کوئی عظیم الشان فاتح ایسا بھی گزرا ہے جس نے دنیا کی تاریخ کا ورق اُلٹ دیا ہو۔ لیکن اس کے باوجود نہ اُس کے سر پر تاجِ زرفشاں ہو اور نہ اورنگِ سلطانی۔ معمولی سے معمولی آدمیوں کی طرح رہتا سہتا ہو، اُس میں اور دُوسرے لوگوں میں شان و شوکت اور وجاہت و سطوت کے اعتبار سے کوئی فرق نہ ہو، وہ محلہ کی بکریوں کا دُودھ بھی دوہ دیتا ہو۔ رات کے وقت چھُپ چھُپ کر نابینا عورت کے گھر کا سارا کام بھی کر آتا ہو۔ معمولی کپڑے پہنتا ہو۔ موٹا جھوٹا کھاتا ہو۔ اُس کے پاس نہ خدم و حشم ہوں اور نہ محلات و قصور، نہ خزانے ہوں اور نہ زر و سیم کے انبار، نہ چوکیدار، نہ دربان، نہ ملٹری گارڈ اور نہ پولیس کا حفاظتی دستہ، ایک معمولی سے معمولی انسان بھی برملا اُسکو سرِ راہ ٹوک سکتا ہو۔ ایک ادنیٰ حیثیت

کا شخص بھی بھرے مجمع میں اس سے باز پرس کر سکتا ہو اور جب وہ اپنی فوج کو کسی مہم پر روانہ کرنے کے لئے کچھ دور تک مشایعت کے لئے جائے تو اس شان سے کہ وہ خود پاپیادہ ہو اور اس کا نو عمر و نوجوان امیر فوج گھوڑے پر سوار ہو۔ اُس کی بیٹی اپنے شوہر کے گھوڑوں کا دلیہ خود دلتی ہو اور پھر نو نو میل اُسے سر پر رکھ کر پیدل چلتی ہو اور خود اسکا اپنا حال یہ ہو کہ وہ کپڑوں کا گٹھر اپنے سر پر رکھکر بازاریں پھرتا ہو، بتاؤ فوجی و حربی کامگاری کیساتھ یہ جمہوریت اور یہ مساوات و برابری، یہ تواضع و فروتنی پوری تاریخ عالم میں کہیں اور بھی نظر آتی ہے؟ اس میں شبہ نہیں کہ جمہوریت اور مساوات کی جو مثال حضرت عمر نے اپنے عہد خلافت میں قائم کی وہ اپنی جگہ بے نظیر ہے۔ لیکن حضرت ابو بکر صدیق کی اس بے نفسی اور انتہائی سادگی کو دیکھ کر حضرت عمر بھی کہہ پڑے کہ "اے ابو بکر! تم نے اپنے بعد میں آنیوالوں کیلئے بڑی مشکلات پیدا کر دیں" یعنی تمہارے نقش قدم پر چلنا کسی کے بس کی بات نہیں۔

پھر فاتحین و کشور کشایان عالم میں کتنے ہیں جن کے لشکروں نے شہروں کو نہ اُجاڑا ہو۔ آبادیوں کو ویرانہ میں تبدیل نہ کر دیا ہو۔ بوڑھوں، بچوں اور عورتوں پر ترس کھایا ہو۔ کھیتوں کو آگ لگائی اور درختوں کو نہ کاٹا ہو۔ لیکن یہاں کیا عالم تھا؟ فوج روانہ ہوتی تھی تو بڑی تاکید سے ان امور کی نسبت ہدایات دی جاتی تھیں اور کسی کی مجال نہ تھی کہ فرمان خلافت سے ذرا سرتابی کر سکے۔

ان سب چیزوں کا اثر یہ تھا کہ جو لوگ میدان جنگ میں شمشیر آزما بنکر آتے تھے جب ہوا کا رُخ پلٹتا تھا تو انھیں کی زبانیں فاتحین کیلئے دعائیں کرتی تھیں۔ جنگ کے ختم ہونیکے بعد جنگ کی ہولناکیوں کا نام و نشان میدان جنگ سے باہر کہیں نظر نہیں آتا تھا اور ملک میں پہلے سے زیادہ خوشحالی اور آسودگی پیدا ہو جاتی تھی۔

یہ جو کچھ لکھا گیا حضرت ابو بکر صدیق کے کارناموں کا صرف ظاہری اور مادی پہلو تھا۔ اگر خالص شرعی و دینی اور معنوی و باطنی پہلو کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو صاف نظر آئیگا کہ جو کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں تکمیل کو نہ پہونچا تھا، خلیفۂ اوّل کے ہاتھوں اسکی تکمیل ہوئی۔ پوری عرب قوم کو متحد کرنے کے علاوہ قرآن مجید کو جمع کرنا اور اس کو ضیاع سے بچا لینا بے شبہ ایک پیغمبرانہ کارنامہ ہے

جس کی وجہ سے خود اللہ تعالیٰ کا وعدہ انّ علینا جمعہ، پورا ہوا۔ قرآن جس پر اسلامی شریعت کی اساس قائم ہے اُس کو جمع کر کے ہمیشہ کیلئے محفوظ کر دینا زکوٰۃ و صدقات کے احکام کی تبلیغ واشاعت اور ان کی تفصیل و تشریح۔ جیشِ اسامہ کی روانگی، مرتد اور باغیوں کی سرکوبی، مدعیانِ نبوت کا استیصال۔ ایران اور روم کی اُن کے اسلام دشمن منصوبوں کی بنا پر گوشمالی۔ اسلام کی تبلیغ و اشاعت ۔ قبائلِ عرب کا باہمی اتحاد و اتفاق پر لگا دینا۔ یہ سارے اہم کام جو کُل سوا دو برس کی مدت میں حضرت ابوبکر صدیق کے ہاتھوں انجام پذیر ہوئے اور کن نامساعد و ناموافق حالات میں ہوئے اور کس طرح ہوئے؟ ان سب کو سامنے رکھو اور بتاؤ کہ کیا ان سے صاف طور پر یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت ابوبکر پیغمبر نہیں تھے اور نہ ہو سکتے تھے لیکن اُن کے یہ تمام کارنامے پیغمبرانہ تھے۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہ نے ایک مرتبہ فرمایا "اگر ابوبکر نہ ہوتے تو خدا کی عبادت نہ کی جاتی"۔ گویا قرآن نے ثانی اثنین اذھما فی الغار" کہکر پیغمبر آخرالزماں کیساتھ جس کی جسمانی معیت و رفاقت پر مہرِ تصدیق ثبت کی تھی ازل میں اُس کیلئے یہ سعادت بھی مقدر کر دی گئی تھی کہ جسمانی رفاقت کیساتھ معنوی اشتراکِ عمل اور باطنی رفاقت کا بھی اس سے مظاہرہ ہو۔

اسی خصوصیت کی بنا پر شاہ ولی اللہ الدہلوی حضرت ابوبکر کے عہدِ خلافت کو صرف خلافت نہیں بلکہ خلافتِ خاصہ کا عہد کہتے ہیں، یہ مقام چونکہ بہت نازک ہے اس لئے ہم خود اپنی طرف سے اس کی کوئی تفصیل نہیں کریں گے بلکہ شاہ صاحب کی تقریر کے متفرق اقتباسات نقل کر کے انہیں پر کتاب بھی ختم کرتے ہیں۔

فرماتے ہیں :-

از میانِ اُمت جمعے ہستند کہ جوہرِ نفس ایشان قریب بجوہرِ نفوس انبیا مخلوق شدہ۔ واین جماعت در اصل فطرت خلفائے انبیا اند در امت بمثال آنکہ آئینہ آہنی از آفتاب اثرے	امت میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے نفس کا جوہر انبیاء کے جوہر نفوس کے قریب ہی مخلوق ہوتا ہے۔ یہ لوگ پوری اُمت میں فطرتاً انبیا کے خلیفہ ہوتے ہیں اور ان کی مثال اُس آئینہ جیسی ہوتی ہے جو آفتاب سے براہِ راست اثر

قبول می کند که خاک و چوب و سنگ را میسر
نیست، این فریق که خلاصۂ امت اند
از نفس قدسیہ پیغامبر صلی اللہ علیہ وسلم
بوجھے متاثر می شوند که دیگران را میسر نمی آید۔
و آنچه از آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرا گرفته اند
بشہادتِ دل فرا گرفته اند۔ گویا دلِ ایشان
آن چیزہا را اجمالاً ادراک کردہ بود و کلام
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شرح و تفصیل آن
معانی اجمالی بود .... پس خلافت خاصہ
آنست که این شخص چنان که در ظاہر حال رئیسِ
مسلمین شود بحسب وضع طبیعی که مراتب استعدادات
افرادِ بنی آدم ست در ضبط و علو فطرت الامثل
فالامثل نیز رئیسِ امت باشد۔ تا ریاستِ ظاہر
ہمدوش ریاستِ باطن گردد (ازالۃ الخفا مقصد اول ص ۹)

قبول کرتا ہے درآں حالیکہ مٹی لکڑی اور پتھر کو یہ بات
میسر نہیں، ایسے لوگ اُمت کا حاصل ہوتے ہیں اور وہ آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کے نفسِ قدسی سے اس طرح متاثر ہوتے ہیں
کہ دوسرے نہیں ہو سکتے۔ انھوں نے جو کچھ آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم سے اخذ کیا ہے خود اپنے دل کی شہادت سے اخذ کیا ہے
گویا ان حضرات کے دل نے اجمالاً ان چیزوں کو پہلے ہی
دریافت کر لیا تھا۔ آنحضرتؐ نے تو بس اُس کی شرح و تفصیل
بیان فرما دی.........
پس خلافتِ خاصہ یہ ہے کہ یہ شخص جس طرح ظاہری طور
پر مسلمانوں کا رئیس ہوتا ہے۔ وضعِ طبیعی یعنی مراتبِ استعداد
میں افراد بنو آدم کے اختلاف و تفاوت کے
اعتبار سے فطرت کی صفائی اور بلندی میں بھی رئیسِ امت
ہوتا ہے یہاں تک کہ اس کی ریاست ظاہر ہمدوش
ریاست باطن ہوتی ہے۔

جب ایک خلیفہ اس مرتبۂ عالی پر متمکن ہو جاتا ہے تو اگرچہ وہ خود پیغمبر نہیں ہوتا لیکن پیغمبر کا دست و
بازو ہوتا ہے اُس کے اعضا و جوارح ہوتا ہے اور اس بنا پر اُس کے تمام کارنامے خود گویا پیغمبر کے
کارنامے ہوتے ہیں، یہ خلیفہ تو صرف ایک واسطہ اور ذریعہ ہوتا ہے جیسے نغمہ سرائی و زمزمہ آفرینی
دراصل نے نواز کا کمال ہے۔ اگرچہ نغمہ نکلتا ہے نے سے ہی۔ چنانچہ اسی بحث میں آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

آنچه از تقاسیم رحمتِ الٰہی نصیب پیغامبر گشته
و پیغامبر صلی اللہ علیہ وسلم قبل از مباشرت آن
برفیقِ اعلیٰ پیوسته بوجھے از وجوہ سببیۃ دانا بہٗ

رحمتِ خداوندی کی تقسیم سے جو کچھ بھی آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم کے حصہ میں لکھ دیا گیا تھا اور آپ اسکو سرانجام دینے سے
پہلے ہی دنیا سے تشریف لے گئے تو اب ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ نے

آن معانی را بدست خلفا اتمام ساختہ اند وبحقیقت آن ہمہ راجع ست بہ پیغامبر والیشان بمنزلۂ جوارح پیغامبر شدہ اند لاغیر۔ پس خلافتِ خاصہ آنست کہ از خلیفہ کارہائے کہ نصیب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ومنسوب بایشان ست در قرآن عظیم وحدیث قدسی بدست وے سرانجام شود وآنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انابتِ اُورا تصریحاً وتلویحاً امارات کثیرہ اظہار فرمودہ باشند تا آن ہمہ کارہا در جریدۂ اعمال حضرت پیغامبر صلی اللہ علیہ وسلم مرقوم گردد۔ والیشان شرف وساطت حاصل نمودہ باشند لاغیر (ص ۱۰)

اصالتہً یا نیابتہً اُن چیزوں کو خلفا کے ہاتھ سے پُورا کرایا ہے اور درحقیقت یہ تمام کارنامے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ہی کارنامے کہلائیں گے اور خلفا پیغمبر کے اعضا کی طرح ہونگے اور بس۔ پس خلافتِ خاصہ کے معنٰی یہ ہیں کہ جو کام قرآن مجید یا حدیثِ قدسی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حصہ میں لکھے ہوئے ہیں وہ خلیفہ کے ہاتھوں سرانجام ہوں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحۃً واشارۃً اس کی خلافت کا اظہار بار بار کر بھی دیا ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خلیفہ کے یہ تمام کارنامے حضرت پیغامبر صلی اللہ علیہ وسلم کے دفترِ اعمال میں درج کرلیے جاتے ہیں اور خلیفہ کو بس وساطت کا شرف حاصل ہوتا ہے۔